مجموعہ تصانیف سید العلماء

شہید انسانیت

سید العلماء علامہ علی نقی نقوی

امامیہ مشن، ہند

مجموعہ تصانیف سید العلماء

شہیدِ انسانیت

سید العلماء علامہ علی نقی نقوی

امامیہ مشن، ہند

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : شہیدِ انسانیت

مصنف : سید العلماء علامہ علی نقی نقوی

ناشر : امامیہ مشن، ہند، علی گڑھ

مطبوعہ : بھارت آفسیٹ، دہلی

اشاعت : ۲۰۱۲ء

قیمت

ملنے کا پتہ

امامیہ مشن، ہند

نیشنل کالونی۔ امیر نشان۔ علی گڑھ۔ (ہند) ۲۰۲۰۰۲

عرض ناشر

زیر نظر کتاب ''شہید انسانیت'' برصغیر کے عظیم اسلامی مفکر جید مجتہد اور بلند پایہ محقق و مفسر قرآن مجید سید العلماء علامہ سید علی نقی صاحب طاب ثراہ کی ایک گرانقدر نیز ہمہ جہات کامیاب تحفۂ نگارش ہے۔ اس بے مثال تصنیف میں شدید محنت کے بعد واقعات کے بے ترتیب گھنے جنگل سے معتبر اسلامی روایات کو تلاش کر کے بڑے سلیقے اور تسلسل کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اس عظیم الشان قلمی کاوش کو سب سے پہلے یادگار حسینی لکھنؤ سے شائع کیے جانے کا شرف حاصل ہوا۔

امامیہ مشن ھند نے فیصلہ کیا ہے کہ سرکار سید العلماء علامہ علی نقی کی تمام تصانیف مجموعہ آثار کے طور پر شائع کی جائیں۔ شہید انسانیت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

''اسیف جائسی''

سکریٹری امامیہ مشن ھند۔

مندرجات

۱۔ تعارف	۷
۲۔ تمہید	۲۱
۳۔ نسبی خصوصیات، خاندان اور اس کے شاندار روایات	۳۳
۴۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ	۴۵
۵۔ اسلام اور اس کا پیغام	۴۸
۶۔ اسلام کا مزاحم طاقتوں سے تصادم	۵۸
۷۔ حسینؑ بن علیؑ کی ولادت اور ابتدائی زندگی	۶۹
۸۔ امام حسینؑ کی زندگی کا دوسرا دور، نانا کی وفات کے بعد سے باپ کی شہادت تک۔	۷۳
۹۔ بنی امیہ کا اقتدار اور ان کی سیاسی روش	۹۵
۱۰۔ پیغمبرِ خدا کے بعد اسلامی مفاد کے محافظین، ان میں اور مخالف قوتوں میں تصادم اور اسکے نتائج	۱۰۳
۱۱۔ حسن مجتبیٰؑ کی صلح اور اس کے نتائج	۱۰۷
۱۲۔ یزید کی ولیعہدی	۱۴۱
۱۳۔ معاویہ کی وفات اور یزید کی تخت نشینی	۱۵۳
۱۴۔ یزید تاریخ کی روشنی میں	۱۵۶
۱۵۔ امام حسینؑ کے بلند اخلاق و کمالات اور گراں قدر مقولات	۱۶۲
۱۶۔ یزید کا بیعت پر اصرار اور حسینؑ کا انکار	۱۸۴
۱۷۔ حسنؑ کی خاموشی اور حسینؑ کا اقدام	۱۹۴
۱۸۔ حسینی موقف کی تشریح	۲۰۰
۱۹۔ حرمِ رسولؐ سے سفر اور حرمِ خدا میں پناہ	۲۱۱
۲۰۔ دعوتِ اہلِ کوفہ اور سفارتِ مسلم بن عقیل	۲۱۸
۲۱۔ مکّے سے کربلا تک	۲۵۵
۲۲۔ یزیدی حکومت کی سرگرمی اور کربلا میں فوجوں کی آمد	۲۹۰
۲۳۔ انصارِ امام حسینؑ، ان کی قلّتِ تعداد اور اس کے اسباب	۲۹۶

۲۴- صُلح کی باتیں	۳۰۰
۲۵- بندشِ آب اور غلبۂ تشنگی	۳۰۴
۲۶- صُلح کی آخری کوشش اور اس کا انجام	۳۰۹
۲۷- شبِ عاشور یعنی محرّم کی دسویں رات	۳۱۵
۲۸- دسویں محرّم ۶۱ھ، اتمامِ حُجّت اور آغازِ حرب	۳۲۰
۲۹- انصارِ امامؑ کے حالات اور حیرت انگیز قُربانیاں	۳۴۱
۳۰- اقربائے امام، یعنی بنی ہاشم کی قُربانیاں	۴۱۸
۳۱- جہادِ آخر اور شہادت	۴۳۹
۳۲- شہادت کے بعد	۴۴۵
۳۳- اسیری اہلِ حرم کے واقعات پر ایک جامع تبصرہ	۴۶۵
۳۴- اُسرائے اہلِ بیت کے مختصر حالات	۴۷۱
۳۵- گزشتہ واقعات کی روشنی میں حُسینی شخصیت اور کارنامۂ حُسینی پر تبصرہ	۴۸۶
۳۶- فتح کس کی ہوئی؟	۴۹۳
۳۷- مجرموں کی پریشانی	۴۹۸
۳۸- عالمِ اسلامی کے تاثرات	۵۰۶
۳۹- آثارِ انقلاب، واقعۂ حرّہ، خلافتِ ابن زبیر، اضطرابِ عراق و ایران اور دیگر جزئی واقعات	۵۱۰
۴۰- جماعتِ توّابین	۵۲۳
۴۱- خونِ ناحق کا انتقام	۵۴۰
۴۲- اموی حکومت کا انجام	۵۴۱
۴۳- بنی عباس کی سلطنت	۵۴۳
۴۴- تبدیلِ ذہنیت	۵۴۶
۴۵- اخلاقی نتائج	۵۴۹
خاتمہ کتاب: عالمِ انسانی کو اصلاحِ عمل اور اتباعِ اسوۂ حسینی کی دعوت	۵۹۹

تعارف

تعارف کرایا جاتا ہے اس شے کا جو خود تو ہو غیر معروف اور تعارف کرانے والا ہو اپنی جگہ معروف و مشہور، لیکن یہاں صورتِ حال ہے برعکس۔ دنیائے شیعیت میں کون ایسا شخص ہوگا جو جناب سید العلماء السید علی نقی النقوی دامت مکارمہٗ اور ان کے کمالِ علم و فضل سے یا ان کے مصنفات کی جلالتِ قدر سے ناآشنا ہو لیکن چونکہ عالمِ اسباب میں عظیم تر ہستیوں کی پشت پر بھی تصدیق و تائید کرنے والے مناسب حضرات رکھے گئے ہیں جیسے جناب موسیٰ علیہ السّلام کی تصدیق کے لیے ہارون علیہ السلام اور حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تصدیق و تائید کے لیے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام، اسی طرح میں بھی کتاب "شہیدِ انسانیت" کے تعارف کے لیے قلم اٹھا رہا ہوں۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا رہا ہوں کہ جناب سید العلماء دام مجدہٗ علم و فضل کے بلند ترین مقام پر ہیں اور تقریباً ہر علمی شعبہ میں خداداد کمال اور ذوقِ بے مثال رکھتے ہیں اس اعتبار سے وہ مجتہد العصر ہی نہیں بلکہ وحیدِ عصر اور نادرۂ روزگار اور حقیقتاً سید العلماء ہیں۔ چونکہ ہر کلام اپنے متکلم کے صفات و کمالات کا آئینہ دار ہوتا ہے لہٰذا سید العلماء کا ہر کلام سید الکلام اور ان کی ہر کتاب کتابوں کی سید و سردار ہے۔ کتاب شہیدِ انسانیت بھی جناب موصوف کی نگارش قلم ہے۔ ابتداءً مسودۂ کتاب میں کچھ نامانوس اور غیر مشہور چیزیں آگئی تھیں لیکن موجودہ طباعت میں جناب موصوف نے نظرِ ثانی فرما کر ہر امر کا لحاظ فرماتے ہوئے ہر مضمون کو مطبوع اور مانوس حیثیت میں پیش کیا ہے۔ میں نے کتاب پیشِ نظر کو اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ صرف کتابت کے اغلاط کو درست کیا گیا ہے۔ یہ کتاب یقیناً ہر قوم و ملت کے لیے مفید ہے کیونکہ جناب موصوف نے یہ کتاب ایسی نرم اور ہموار سطح پر

تحریر فرمائی ہے جو ہر مذہب و ملت کے لیے لائقِ قبول ہو۔ ہوسکتا ہے کہ جناب مسلم بن عقیل علیہ السلام کی آخری جنگ والا حصہ کسی اور صاحبِ قلم کا ہو کیونکہ آپ کا وہ شاہکار شجاعت جو کُتبِ تاریخ میں پایا جاتا ہے پورے طور پر نمایاں نہیں ہوا۔

مسئلۂ بیعت جو واقعۂ کربلا کی اصل بنیاد ہے اگرچہ جناب موصوف نے اس کو انتہائی لطافت سے پیش کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ کتاب کو ہموار اور معتدل رکھنے کے سبب سے پوری توضیح نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے اس مسئلہ کی مختصراً توضیح کی جاتی ہے۔

یہ تو دنیا جانتی ہے کہ امام حسین علیہ السلام اور ان کے اقربا و انصار نہ کسی قتل کے قصاص میں قتل کیے گئے نہ کسی اور جرم کی پاداش میں۔ وہ قتل کیے گئے صرف اس بنا پر کہ انھوں نے بیعتِ یزید نہیں کی۔ سخن یہ کہ امامؑ نے بیعتِ یزید کیوں نہ کی، انکارِ بیعت کا سبب کیا تھا اور وہ کیا چیز تھی کہ بیعتِ یزید کے مقابلہ میں امامؑ کو اپنا سر اگھر لٹا دینا اور ہرا بھرا باغ کٹوا دینا آسان نظر آیا۔ کیا امامؑ کو یہ توقع تھی کہ اس عظیم قربانی کے بعد خلافت اپنے صحیح اصول پر آجائے گی، یزیدیت اور یزیدیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حق مانا جائے گا اور باطل مٹ جائے گا، ظلم و جور کی حکمرانی نیست و نابود ہو جائے گی۔ امتِ مسلمین حق سے وابستہ اور باطل سے کنارہ کش ہو جائے گی اور ان کی سوئی ہوئی دنیا جاگ جائے گی۔ آلِ محمدؐ اور ان کے متبعین پر جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور میرے بعد میرا خاندان اپنے متبعین کے ساتھ آرام اور عافیت کی زندگی بسر کرے گا۔ بدعتیں ختم ہو جائیں گی اور شریعتِ حقہ کا ہر طرف سے خیر مقدم ہوگا۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات ہوگئی ہوتی تو ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو سکتے تھے کہ امامؑ نے ان اغراض و مقاصد کو سامنے رکھ کر بیعت نہ کی اور اس عظیم قربانی کو قبول کیا۔ زورِ شاعری اور زورِ تقریر چاہے کسی سے یہ نتائج بیان کرائے اور نمائشی طور پر اس شہادت کے نتیجہ میں یہ سبز باغ دکھا دے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہی خلافت کا رنگ رہا، وہی ظلم و جور رہا، وہی باطل پسندی اور حق سے دوری رہی، وہی

خاندانِ رسالت اور ان کے متبعین پر ظلم و تشدد رہا۔ مسلمانوں کی دنیا میں کونسی برائی تھی جو مٹ گئی ہو اور کونسی بھلائی تھی جو پلٹ آئی ہو۔ یزید کے بعد مروان اور مروان صفت خلیفہ ہوتے رہے۔ کیا وہ یزید سے کچھ کم تھے؟ ائمۂ اہل بیتؑ کی انتہائی خاموش اور صابرانہ زندگی کے باوجود ان پر کیا کیا ظلم و ستم نہ ہوئے۔ سادات اور ان کے متوسلین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تہ تیغ کیا جاتا رہا۔ زندہ، دیواروں میں چُنا جاتا رہا۔ ان کے خون سے گارے بنائے گئے۔ مرقدِ حسینؑ کو بے نشان کرنے کے لیے پانی چھوڑا گیا۔ ہل چلائے گئے۔ روضۂ حسینی میں کتنی بار آگ لگائی گئی اور اس کو تباہ کیا گیا۔ علی مرتضیٰؑ پر کب تک سب و شتم ہوتا رہا اور گانے والیوں سے ان کی ہجو گوائی گئی۔ کیا دنیا کے ظلم و جور، قہر و استبداد کا رنگ کچھ بدلا؟ نہیں۔ دنیا جوں کی توں رہی بلکہ بد سے بدتر ہوگئی۔ پھر یہ کیسے کہا جائے کہ ان مقاصد کے لیے امام نے بیعت کرنا نامنظور اور شہادت کو منظور کیا۔ انکارِ بیعت کا سبب تو کچھ اور ہی تھا۔

یہ لفظ بھی زبانِ زدِ خاص و عام ہے کہ امامؑ نے بیعتِ یزید سے اس لیے انکار کیا کہ وہ شراب خوار تھا، زانی تھا، ظالم تھا، فاسق و فاجر تھا۔ یہ نظریہ بظاہر خوش آیند ہے کہ جو اٹھتا ہے اسی پر اپنے خیالات کی عمارت بناتا چلا جاتا ہے لیکن حقیقت سے کوسوں دُور ہے یہ نظریہ۔ ابتدا میں کچھ سوچ سمجھ کر پھیلایا گیا ہوگا جس کی اب ہر شخص بغیر سوچے سمجھے رٹ لگا رہا ہے۔ اس طریقہ سے اصل میں یہ تاثر بہم پہنچانا تھا کہ یزید وہ پہلا دعویدارِ خلافت تھا جو فاسق و فاجر تھا۔ اس سے پہلے فضا ٹھیک تھی اس لیے امام حسینؑ اور ان کے خاندان کی طرف سے یہ انکارِ بیعت کا پہلا واقعہ ہے۔

ایسا کہنے والوں سے اگر یہ پوچھا جائے کہ اچھا اگر یزید شراب خوار، زانی اور فاسق نہ ہوتا تو کیا امام اس کی بیعت کر لیتے؟ بے خبر دنیا تو شاید کہہ دے کہ کر لیتے لیکن باخبر فوراً چونک کر بولے گا کہ ہرگز نہیں۔ پھر ہرگز نہیں تو انکارِ بیعت کا سبب یہ فسق و فجور کہاں رہا؛ یہ بات تو بالکل ختم ہی ہوگئی اور امامؑ کا انکارِ بیعت تو کسی اور ہی سبب سے ہوا جس کو ہم آئندہ بیان

کریں گے۔ یہاں یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ یزید کی مبیّنہ بدکرداری اس کے باپ کی زندگی ہی میں تھی یا بعد میں رونما ہوئی؟ یاد رکھیے کہ امام نے حضرت معاویہ کی زندگی ہی میں خلافتِ یزید کی قرارداد سے انکار کیا تھا۔ اس کے بعد مدینہ میں حضرت معاویہ کی خبرِ وفات اور امامؑ سے بیعتِ یزید کی طلب یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ پہنچی تھیں لہٰذا امامؑ اور دوسروں کی نظر میں یزید کی وہی زندگی تھی جو اس کے باپ کے سامنے تھی۔ وہ جیسا بھی تھا اپنے باپ کی زندگی ہی میں تھا۔ پھر ایسے فاسق و فاجر کو خلافت کے لیے نامزد کرنا اس کا الزام نامزد کرنے والے پر آئے گا یا نامزد ہونے والے پر؟ یزید خود سے تو خلیفہ نہیں بنا، اس کو تو خلیفہ بنایا گیا۔ اب فسق و فجور کے توازن میں کس کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ پھر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ وہ کون سے ایسے سنگین گناہ تھے جن کے لیے یزید کو منفرد اور پہلا شخص کہا جا سکے اور یہ سمجھا جا سکے کہ ایسے سنگین گناہ یزید سے پہلے نہ تھے۔ بیشک شرابخواری اور زناکاری سنگین اور گناہ کبیرہ ہیں لیکن ان گناہوں کا تعلق گنہگار کی ذات سے ہے۔ ان گناہوں کے مقابلہ میں مومنین کا دیدہ و دانستہ قتلِ ناحق وہ سنگین ترین گناہ ہے جس پر قرآن کریم کے کھلے الفاظ میں وعیدِ جہنم ہے۔ مومن کے قتلِ عمد کے سامنے شراب نوشی اور زناء کیا چیز ہے؟ اور یہ قتلِ مومن کی جزاء کا جہنم ہونا اس وقت ہی ہے جبکہ یہ مقتول مومن عام مومنین میں سے ہو اور یہ قتل صرف ایک مومن کا ہو تب اس جرم کی سزا جہنم سے کم نہیں اور اگر وہ مقتول صرف مومن ہی نہ ہو بلکہ متّقی، متہجد، فقیہہ، عارف اور صحابیٔ رسولؐ بھی ہو تو اس جرم کی سنگینی کتنی بڑھ جائے گی اور ایسا مقتول اگر محض ایک ہی نہ ہو بلکہ بہت سے ہوں تو یہ جرم کہاں سے کہاں پہنچے گا؟ اور ایسے متواتر جرم کے مقابلہ میں شراب نوشی اور عیاشی کیا چیز رہ جائے گی۔ میں یہاں جنگِ صفین کا کوئی ذکر نہیں کر رہا ہوں بلکہ امام حسن علیہ السلام اور مالک اشتر ایسے حضرات کو زہر دلانے کا بھی ذکر مقصود نہیں ہے کیونکہ اس پر کچھ نہ کچھ پردہ ضرور ہے۔ یہ خدا ہی جانتا ہے کہ معاویہ نے کتنے بے خطا اور ایماندار حضرات کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تمام واقعاتِ مذکورہ

تاریخ سے قطع نظر کرکے اگر صرف حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے قتل ناحق پر ہی نظر کی جائے جو مرج عذرا میں تہ تیغ کیے گئے اور ان چھ حضرات کو ایک ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ساتویں شخص عبدالرحمٰن بن حسان نامی کو حضرت معاویہ کی ہدایت کے مطابق زیاد نے زندہ زمین میں دفن کرادیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے قتل سے اُم المومنین حضرت عائشہ اور امام حسین علیہ السلام نہایت دردناک، ملول اور شاکی ہوئے۔ حضرت اُم المومنین عائشہ نے ان لوگوں کو علمی طاقت اور فقہی قابلیت کے اعتبار سے عرب کا سر اور دماغ فرمایا۔ جن کے قتل سے باز رکھنے کے لیے حضرت عائشہ نے عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حضرت معاویہ کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ معاویہ تم حجرؓ اور ان کے اصحاب کے بارہ میں خدا سے ڈرنا لیکن ام المومنین کے قاصد مذکور کے وہاں پہنچنے سے پہلے یہ کامل الایمان حضرات قتل کیے جا چکے تھے۔ ان بے خطا لوگوں کے قتل کی خبر سنکر حضرت عبداللہ بن عمر چیخیں مار مار کر رونے لگے اور ربیع بن زیاد حارثی حاکم خراسان نے دردمند ہو کر جمعہ کے دن اس امر کی دعا کی کہ خداوندا اب جلد ربیع کی یعنی میری روح کو بھی قبض کر لے اور مجمع سے خواہش کی کہ وہ آمین کہے چنانچہ وہ مسجد سے نکلتے ہی گر کر مر گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ صحابیٔ رسولؐ عمر بن حمق الخزاعی جنکو پیغمبرؐ نے سلام کہلایا تھا اور جو بقول امام حسینؑ ایسے صالح اور عبادت گزار تھے کہ کثرت عبادت سے ان کا جسم گھل گیا تھا، بدن ڈھل گیا تھا، چہرہ پر زردی چھا گئی تھی، ان کی گرفتاری کا حکم ہوا اور حضرت معاویہ کی خصوصی ہدایت کے مطابق ان پر نیزہ کے نو وار کیے گئے حالانکہ وہ پہلے یا دوسرے ہی زخم میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یعنی ان کی شہادت کے بعد بھی کم از کم سات مرتبہ نیزہ مارا گیا۔

یہ اقدام بھی حضرت معاویہ کا کس قدر خلاف شریعت اور مخالف ارشاد نبویؐ تھا کہ انھوں نے محض اس بنا پر کہ ان کے باپ ابوسفیان نے مادر زیاد سے زنا کیا تھا زیاد کو اپنا بھائی اور ابن ابی سفیان قرار دے دیا۔

امیرِ شام کے یہاں گانے والوں کی قدر و منزلت ہوتی تھی اور وہ سرور و نشاط میں بھر کر تھرکنے لگتے تھے۔

مقدام بن معدی کرب نے خود حضرت معاویہ سے کہا کہ میں تمھارے یہاں سونے کا پہننا، درندہ جانوروں کی کھال پر بیٹھنا، پائخانوں کا رُخ قبلہ کی طرف ہونا یہ سب دیکھ رہا ہوں جو حرام اور خلافِ شریعت ہے۔ امیرِ شام مذکور نے عرفہ کے روز حج میں تلبیہ (لبیک کہنا) ممنوع قرار دے دیا۔ مدینہ میں نمازِ عشا پڑھائی تو نہ بسم اللہ پڑھی نہ بعض تکبیریں کہیں اور اہلِ مدینہ کے ٹوکنے پر بھی کوئی اعتنا نہ کی۔ یہ تمام چیزیں اسی کتاب "شہیدِ انسانیت" کے صفحہ ۱۲۴ تا ۱۲۵ میں پڑھ لیں۔ ان تمام چیزوں سے زیادہ یزید کا اس کی تخت نشینی کے وقت وہ کون سا فسق و فجور تھا جس کی وجہ سے فسق و فجور میں اس کو منفرد اور بے مثال کہا جا سکے۔ امامؑ سے طلبِ بیعت کے وقت نہ اس کے دامن پر قتلِ اہلِ بیتؑ کا دھبہ تھا نہ کعبہ کی بے حرمتی کا، نہ اہلِ مدینہ کی غارت گری کا۔ بیعتِ یزید سے امامؑ اور ان کے خاندان کا انکار کوئی پہلی اور نئی بات نہ تھی۔ کیا امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے حضرت معاویہ کو حقدارِ خلافت تسلیم کر لیا تھا؟ کیا امام حسنؑ نے ان کو صحیح حقدارِ خلافت مان کر حکومت ان کے سپرد کی تھی؟ ہرگز نہیں۔ اس صلح میں یہ قرارداد بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا بلکہ بعض جگہ تو یہ بھی مذکور ہے کہ خلافت بعدِ معاویہ پھر حسنؑ کی طرف منتقل ہوگی اور یہ امر اس بات سے بالکل ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت معاویہ نے امام حسینؑ کے وجود کو نہیں بلکہ امام حسنؑ کے وجود کو یزید کی ولیعہدی کے لیے سنگِ راہ سمجھا اور جب تک امام حسن علیہ السلام کو زہر دلا کر شہید نہ کر دیا اس وقت تک یزید کی ولیعہدی کو زبان سے نہ نکالا۔ عزت و وقار کے اعتبار سے امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں بھائی ایک جیسے تھے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ جب تک امام حسنؑ زندہ رہے یزید کی ولیعہدی کا اظہار نہ

کیا گیا اور شہادتِ حسنؓ کے بعد حسینؓ کی موجودگی میں یزید کی ولیعہدی کا چھپا ہوا منصوبہ کھُل کر سامنے آگیا۔ اگر محض امام حسنؓ کا وقار مانع تھا تو وہی وقار امام حسینؓ کا تھا۔ صرف امام حسنؓ کو زہر دلانا اور اس کے بعد دس برس تک امام حسینؓ کو چھوڑے رکھنا اور ان کے خلاف ایسا کوئی حربہ نہ استعمال کرنا جس سے ان کی شمعِ حیات گُل ہو جائے اسکی کوئی نہ کوئی وجہ ہے اور وجہ یہی ہے کہ صلحنامہ میں امام حسنؓ کے نام کی تخصیص سے یہ بات آچکی تھی کہ معاویہ کے بعد خلافت پھر امام حسنؓ کی طرف منتقل ہوگی۔ اس شرط نے یہ مسئلہ صاف کر دیا کہ امام حسنؓ نے صرف عارضی طور پر نظامِ حکومت حضرت معاویہ کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ مستقل خلیفہ قرار نہیں دیے گئے کیونکہ سنّی، شیعہ دونوں نقطۂ نظر اس پر متفق ہیں کہ ہر خلیفہ کو حق ہے کہ وہ اپنے بعد کے لیے خلیفہ معیّن کرے اور خلیفہ مابعد کی تصریح کرے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو معیّن کیا اور حضرت ۔ نے خلافت کو چھ نامزد افراد میں منحصر کیا۔ نامزدگی دونوں حضرات نے کی اور وہ عموماً تسلیم کی گئی۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے اپنے بعد کے لیے امام حسنؓ کو نامزد فرمایا اور ہر امام آخر تک اسی طرح اپنے بعد کے لیے نامزد کرتا رہا۔ جبکہ دونوں مذہب میں ہر خلیفہ کا حقِ استخلاف موجود ہے مگر غیر خلیفہ کو نہیں تو اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ خلیفہ ہے تو اسکو حقِ استخلاف بھی ہے اور جس کو حقِ استخلاف نہیں تو وہ خلیفہ بھی نہیں، لہٰذا یہ شرط کہ معاویہ کو حقِ استخلاف نہ ہوگا رکھی ہی اس لیے گئی تھی کہ دنیا ان کو خلیفہ نہ سمجھ بیٹھے۔ اگر ان کو خلیفہ مان کر حکومت دی گئی ہوتی تو ان کو استخلاف کے لیے بے بس کیوں کیا جاتا؟ جبکہ سنّی شیعہ کسی کے یہاں بھی کوئی خلیفہ حقِ استخلاف سے محروم نہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ عموماً اہلِ نظر نے بھی اس شرط اور اس معاہدہ کی افادیت پر نظر نہیں کی۔

جب یہ بات ثابت ہے کہ امام حسنؓ و امام حسینؓ اور ان کے خاندان اور متبعین نے خلافت حضرت معاویہ ہی کو تسلیم نہیں کیا (جیسا کہ اروٰی بنتِ عبدالمطلب کی اس گفتگو سے

ثابت ہے جو حضرت معاویہ سے ہوئی اور کتاب حاضر میں کسی جگہ مذکور بھی ہے تو انکار بیعتِ یزید اس گھرانے کی طرف سے کوئی پہلی مثال ہرگز نہ تھی۔ حق تو یہ ہے کہ علیؑ مرتضیٰ سے لے کر گیارھویں امام تک ہر امام کا مستقل یہ شعار رہا کہ اپنے اپنے عہد کے حکمران کی حکمرانی کو ضرور برداشت کرتے رہے اور کسی امام نے بھی اپنے حقِ حکومت کو حاصل کرنے کے لیے اگرچہ قتال و جدال نہیں کیا لیکن ان میں سے ایک امام نے بھی کسی کا استحقاقاً خلیفہ ہونا تسلیم نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری خلافت کے انعقاد کے وقت علی مرتضیٰؑ نے کسی بھی حکمران کے اتباع کی شرط کو مان کر اپنا خلیفہ ہونا پسند نہ کیا اور یہی وجہ ہے کہ علی مرتضیٰؑ سے لے کر گیارھویں امام تک ایک امام بھی کسی عہدِ حکومت میں کسی عہدۂ حکومت پر نہ آیا اور نہ لایا جا سکا۔ نہ کسی جہاد اور مہم میں شریک ہو سکا۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ یا تو امام حسنؑ اپنے باپ کے بعد تمام امیر المومنین اور خلیفۂ راشد یا صلح کے بعد اپنی دس سالہ زندگی میں صرف مدینہ کے بھی حاکم نہ رہے۔ امام حسینؑ عہدِ حکومتِ معاویہ میں بیس برس مدینہ میں رہے مگر ایک دن کے لیے بھی صرف مدینہ کے بھی حاکم نہ رہے بلکہ امامین کی موجودگی میں دوسرے ہی لوگ مدینہ کے حاکم ہوتے رہے جن کو حسنؑ و حسینؑ سے کسی طرح کوئی نسبت ہی نہیں۔ آخر ہر امام کا حکومت اور حکومت کی ہر مہم سے دور رہنا، ہر حکومت کی ان پر کڑی نگاہیں، کسی کے لیے قتل اور کسی کے لیے قید و بند یہ کیوں ہوتا؟ اگر وہ اپنے اپنے عہد کی حکومتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوتے اور حکومتیں یہ سمجھتیں کہ یہ لوگ ہم کو خلیفہ بحق تسلیم کرتے ہیں۔ انکارِ بیعتِ خلیفہ حسینؑ کے گھرانے میں شروع سے آخر تک رہا اسلیے حسینؑ وہ پہلے شخص نہیں جنہوں نے انکارِ بیعت کیا ہو خود اسی کتاب میں کسی جگہ اسکا ذکر آیا ہے کہ ابنِ زیاد کی تحریر پر ابنِ سعد نے یہ کہا کہ حسینؑ ہرگز بیعت نہ کریں گے۔ ان کے سینہ میں ان کے باپ (علیؑ) کا دل ہے۔ ابن سعد کا یہ جملہ صاف ترجمانی کر رہا ہے کہ کسی تشدد سے متاثر ہو کر علیؑ نے بیعت نہ کی تو حسینؑ ان ہی کے بیٹے ہیں اور ان کے سینہ میں علیؑ ہی کا دل ہے۔ خلافت کے ابتدائی مرحلہ میں علیؑ سے بیعت لینے کے لیے ضرور ایک بار تشدد کو آزمایا گیا تھا

لیکن متعلق حضرات نے محسوس کر لیا کہ یہ تشدد کارگر نہیں ہو سکتا بلکہ خطرناک اور مضر ہوگا، خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد یزید سے پہلے تک ہر خلیفہ اس ہی نظریہ پر رہا کہ افرادِ اہل بیتؑ جب ہماری خلافت کی بنا پر ہم سے جنگ آزما نہیں تو ہم ان کے ترکِ بیعت پر ان سے کیوں جنگ کریں۔ یزید پر جوانی اور حکومت کا نشہ سوار تھا۔ اس کو آلِ محمدؐ کی قوتِ ارادی کا صحیح اندازہ نہ تھا اس نے تشدد کی انتہا کر دی مگر امام تو امام اس گھر کا کوئی بچہ، بڑا، غلام، کنیز، فدائی، شیدائی کسی کو بھی اس کے مقامِ عزم سے نہ ہلایا جا سکا لہٰذا حسینؑ کا طرزِ عمل کوئی نیا طرزِ عمل نہ تھا البتہ جو طرزِ عمل حسینؑ کے ساتھ اختیار کیا گیا وہ ضرور نیا تھا۔

اب ہم انکارِ بیعت کے سبب پر روشنی ڈالتے ہیں:۔

بات یہ ہے کہ تمام کائناتِ عالم کا خالق صرف ایک ہے جس کا کوئی دوسرا نہیں ع "جو تیرے سوا ہے وہ ترا بندہ ہے"۔ جب تمام مخلوق کا خالق صرف ایک ہے تو اس مخلوق پر اطاعت بھی صرف اس ایک ہی ذات کی ہے دوسرے کی نہیں۔ چاہے وہ دوسرا شان و شوکت، عزت و طاقت کے اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو کیونکہ وہ بھی مخلوق ہونے میں اس ہی مخلوق کی مثل ہے۔ الا لہ الخلق والامر۔ خالق بھی صرف وہی ہے اور آمر و حاکم بھی صرف وہی، البتہ اگر وہ خالق ہی کسی کی اطاعت کا حکم دے دے تو یہ اطاعت کسی کی وجاہت کی بنا پر نہ ہوگی بلکہ حکمِ خدا کی اطاعت اور صرف خدا کی اطاعت ہوگی اور اگر اُس کے حکم کے باوجود اطاعت نہ ہوگی تو یہ اسکی نافرمانی نہ ہوگی جسکی اطاعت کا حکم خدا نے دیا تھا بلکہ حکمِ خدا کی مخالفت اور خدا کی نافرمانی ہوگی۔ اللہ نے ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ اور رسول اور اولی الامر کی اطاعت کریں۔ یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ بعض حضرات کم علمی کی وجہ سے لفظ منکم کو لفظ اولی الامر سے متصل دیکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ منکم صرف اولی الامر کے لیے کہا گیا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ لفظ منکم رسول اور اولی الامر دونوں کے لیے کہا گیا ہے۔ بلکہ اگر پہلا جملہ اطیعوا اللہ الگ نہ کر دیا گیا ہوتا اور ایک ہی جملہ قرار دے کر یہ کہا جاتا

اطیعوا اللہ والرسول واولی الامر منکم تو لفظ منکم اللہ، رسول، اولی الامر سب کے لیے ہو جاتا اور ترجمہ یہ ہوتا کہ ایمان والو، تمھاری ہی جنس سے جو اللہ، رسول، اولی الامر ہیں ان کی اطاعت کرو۔ ظاہر ہے کہ اللہ ہماری جنس سے نہیں اس لیے جملۂ اطیعوا اللہ کو الگ رکھا تاکہ لفظ منکم اللہ کے بارہ میں نہ رہے۔ رسول اور اولی الامر چونکہ ہماری جنس سے ہیں اس لیے ان کو منکم کہا اور کہا اس لیے کہ رُسُل اور اولی الامر ملائکہ میں سے بھی ہیں جیسے کہ فرمایا گیا انہٗ لقولُ رسولٍ کریم یا جیسے فرشتہ نے حضرت مریمؑ سے کہا انا رسول ربکِ یا جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کی طرف آنے والے فرشتوں کے لیے کہا گیا جاءت رُسُلنا پھر ملائکہ ہی کے بارہ میں فرمایا تنزّل الملائکۃ والرّوح فیھا باذن ربّھم من کلّ امر فالمدبّراتِ امرا (قرآن کریم) یہ رُسُل اور اولی الامر جو ملائکہ ہیں ہماری جنس سے نہیں، نہ ہم پر ان کی اطاعت ہے۔ لہٰذا آیۂ اطیعوا الرسول واولی الامر منکم میں منکم قید احترازی ہے کہ تم پر اطاعت اُن رُسُل اور اولی الامر کی نہیں جو تمھاری جنس سے نہیں ہیں بلکہ اُس رسول اور اُن اولی الامر کی ہے جو تمھاری جنس سے ہیں۔

رسول اور اولی الامر دونوں کی اطاعت کا حکم ایک جملہ میں ایک ہی شان سے دیا گیا ہے۔ حکمِ اطاعت میں نہ کسی حکم کی قید نہ کسی حکم کا استثناء۔ ہر حکم کی اطاعت ہر مومن پر فرض کی گئی جس سے ثابت ہے کہ رسول اور اولی الامر کا ہر حکم مطابق مشیتِ الٰہی ہے۔ کوئی حکم منشائے الٰہی کے مخالف نہیں ہو سکتا۔ پس وہ سب معصوم عن الخطاء ہوئے جس طرح رسول نہ کوئی خود سے ہو سکتا ہے نہ غیر خدا کے بنائے بن سکتا ہے، اسی طرح اولی الامر کا تعین بھی منجانب اللہ ہے۔ اسی لیے ان کی اطاعت بھی ہر امر میں بامر اللہ ہے۔ بلکہ لفظ منکم کی قید احترازی نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی کہ جو رُسل اور اولی الامر تمھاری جنس سے نہیں ہیں اگرچہ وہ سب اللہ ہی کے منتخب کیے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود تم پر ان کی اطاعت نہیں، تو پھر جس رسول اور جن اولی الامر کو تم نے معیّن کیا ہو ان کی اطاعت

تم پر کیسے فرض ہو سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ انسان پر صرف اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت فرض ہے جو مطلق اور بغیر کسی قید کے ہے مگر اس اطاعت کے لیے جبر و اکراہ نہیں ہے جس کا دل چاہے اطاعت کرے نہ چاہے نہ کرے مگر دنیا میں جہاں اطاعت کی بہترین مثالیں ہیں وہاں ترکِ اطاعت کی آخری مثالیں ہیں۔ حد ہے کہ خدائے حقیقی کے مقابلہ میں خدا بن گئے یا بنا لیے گئے۔ رسول کے مقابلہ میں رسول اور اولی الامر کے مقابلہ میں اولی الامر ہوئے۔ خدائے حقیقی نے تو اپنی، اپنے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کے لیے کوئی جبر و اکراہ روا نہ رکھا تھا لیکن مقابلہ والوں نے جبر و تشدد سے مطیع بنانا چاہا۔ یہیں سے حق و باطل کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ حق اپنے منوانے کے لیے کبھی تشدد نہیں کرتا کیونکہ حق اپنے نہ مانے جانے پر بھی حق ہی رہے گا مگر باطل اگر تشدد سے کام نہ لے تو وہ مانا کیسے جائے؟ اور نہ مانا جائے تو رہے کیا؟ یہی وجہ ہے کہ خدا، رسول اور اولی الامر اپنے منوانے کے لیے کبھی نبرد آزما نہیں ہوئے۔ خدائی کا دعویٰ ہو یا نبوت و امامت کا، اگر محض دعویٰ کی حد میں رہے تو ان میں سے کسی کو بھی حرب و قتال کی ضرورت نہیں۔ اپنی جگہ جس کا جو دل چاہے کہتا رہے یہ سب برداشت کیا جا سکتا ہے اور برداشت کیا گیا ہے لیکن اگر خدائی کا مدعی چاہے کہ خود خدا بھی اسکو خدا مان لے، رسالت کا مدعی اگر چاہے کہ رسولِ برحق بھی اپنی رسالت کو خیرباد کہہ کر اس کو رسول مان لے، ولایت و امارت کے مدعی اگر یہ چاہیں کہ اولی الامر بھی ان کو اولی الامر تسلیم کر لیں تو یہ ہر ایک کے لیے ناقابلِ برداشت، ناممکن اور محال ہے۔ اگر خدا نے غیر خدا کو خدا مان لیا تو یہ بات تو بعد کی ہے کہ وہ مانا ہوا خدا حقیقتاً خدا ہو گیا یا نہ ہوا لیکن خدا تو خدا نہ رہا۔ رسول نے اگر غیر رسول کو رسول مان لیا تو رسول، رسول نہ رہا۔ اگر حقیقی ولی امر نے کسی غیر کو ولی امر مان لیا تو ولی الامر تو ولی الامر نہ رہا۔ اب رسول کے رسول نہ رہنے سے اور ولی الامر کے ولی الامر نہ رہنے سے

صرف ان ہی کے منصب کو زوال نہ ہوگا بلکہ جس خدا نے ان کو اپنے کمالِ علم اور انتہائے اعتماد سے منتخب کیا تھا وہ جاہل اور بے بس ثابت ہوا۔ پھر اس کا خدا ہونا کیسا؟ جس خدا کا نمائندہ اپنے خدا سے ٹوٹ کر باطل سے مل گیا اور جس خدا کو اپنے علم اور انتخاب پر ناز تھا وہ منہ دیکھتا رہ گیا تو اب کیسا خدا، کیسا رسول، کیسے اولی الامر، کہاں کی کتاب، کہاں کا دین؟ یہ سب ملیامیٹ ہوگیا۔ خدا کے مقابلہ میں کوئی خدا بن جائے تو خدا کی شان میں کوئی نقص نہیں آتا۔ رسول اور اولی الامر کے مقابلہ میں اگر دوسرے مدعی آجائیں تو رسالت اور امامت کے دامن پر اس سے کوئی دھبہ نہیں آتا۔ دھبہ اس وقت آئے گا جب کوئی بھی ان میں سے غیر خدا کو خدا یا غیر رسول کو رسول یا غیر اولی الامر کو اولی الامر مان لے اور یہ دھبہ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے صرف مان لینے والے پر ہی نہ آئے گا بلکہ اس زنجیر کی ہر کڑی اور اس رشتہ کا ہر دانہ ایک دم ٹوٹ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر امام نے اپنے مقابلہ کی ہر صورت حال کو برداشت کیا اور اپنی امامت کو منوانے کے لیے اظہارِ حق سے آگے قدم نہ اٹھایا۔ اور خود سے کوئی تشدد کی راہ اختیار نہ کی۔ کیونکہ بندوں کو ان کی اطاعت کا حکم تھا۔ خود ان حضرات کو یہ حکم نہ تھا کہ بندوں کو اپنا مطیع بناؤ۔ ان کا فرض یہی تھا کہ وہ اپنا اولی الامر ہونا اور مقابل کا نہ ہونا ظاہر اور ثابت کرتے رہیں۔ اس کے بعد اطاعت کرنا، نہ کرنا یہ دوسروں کا کام تھا۔ لیکن رسول اور اولی الامر یہ ان کے لیے ناممکن اور محال تھا کہ وہ کسی بھی تشدد سے متاثر ہوکر اپنے خدا اور رسول کو جھٹلا کر اپنے منصب کے منکر اور غیر کے منصب دار ہونے کے مُقِر ہو جائیں۔ جس کے نتیجہ میں نہ خدا خدا رہے نہ رسول رسول رہیں اور خاتمہ ہوجائے دین، ایمان، کتاب ہر شے کا۔

بیعت تو بڑی چیز ہے، صاحب الامر تو غیر کی اقتدا میں نماز بھی نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ اس غیر پر اس نماز کے وقت بھی منجانب اللہ صاحب الامر کی اطاعت

واجب ہے ۔ تو اب صاحب الامر اس کے اتباع کی نیت ہی کیسے کر سکتا ہے جس پر خود اس کا اتباع لازم ہو۔ اس کے خلاف ایک ہی وقت میں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ صاحب الامر کر رہا ہو امام جماعت کا اتباع اور امام جماعت کر رہا ہو صاحب الامر کا اتباع۔

فرض کیجیے کہ اگر عہد رسول میں کوئی شخص مدعیٔ رسالت ہو کر چاہتا کہ رسول اپنے دعوائے رسالت سے دست بردار ہو کر اس مدعی کی رسالت کو تسلیم کر لیں اور اپنی طاقت کے بل بوتہ پر انتہائی تشدد سے کام لیتا جب کہ رسول کے انصار کم سے کم اور مدعیِ باطل کے مددگار زیادہ سے زیادہ ہوتے تو کیا ایسی صورت میں یہ ممکن ہوتا کہ رسولِ برحق اپنی رسالت کو خیرباد کہہ کر اُس کی رسالت کو تسلیم کر لیں ؟ ہرگز نہیں۔ یقیناً اگر رسول کو یہ صورت پیش آتی تو آپ مدعیٔ باطل کی کسی صورت میں بھی بیعت نہ کرتے چاہے وہ تشدد کتنا ہی سخت تر کیوں نہ ہوتا۔ نبیٔ برحق کبھی اس کی بیعت نہیں کر سکتا تھا چاہے وہ کوئی فاسق و فاجر ہوتا یا ظاہراً نیک اور پارسا ہوتا۔ اگر نبی پر انتہائی تشدد کیا جاتا تو پہلے آپ اظہارِ حق فرما کر اتمامِ حجت کرتے اور کم از کم یہ چاہتے کہ مخالف اپنی جگہ جو چاہے کہے اور کرے مگر اس پر بضد نہ ہو کہ میں اس کے دعوے کو تسلیم کر لوں۔ اگر وہ یہ بھی نہ مانتا تو آپ یہ کوشش کرتے کہ مقابل اس پہ ہی راضی ہو جائے کہ میں اپنے وطن، شہر اور ملک کو چھوڑ کر دور و دراز کسی جگہ چلا جاؤں۔ اگر یہ صورت بھی قبول نہ کی جاتی اور دشمن صف آرا ہو کر قتال شروع کر دیتا تو آپ بھی اپنے انصار کو لے کر میدانِ قتال میں آتے اور دشمن کی بھرپور طاقت اور اپنے انصار کی کمی کی پروا نہ کر کے قتال کے جواب میں قتال کرتے اور اپنا سب کچھ خدا کا بول بالا رکھنے کے لیے قربان کر دیتے۔ حسینؑ رسولؐ کے وارث بھی تھے اور خدا کے قرار دیے ہوئے صاحب الامر بھی تھے۔ یعنی

اس جماعتِ اولی الامر میں سے ایک تھے جن کی اطاعت اللہ نے کافۂ مومنین پر فرض قرار دی تھی۔ جو ایسی حالت میں رسولؐ کرتے وہی حسینؑ نے کیا۔ اپنی عزیز ترین جانوں کو دے کر اپنی اور ہر امام کی امامت پر، رسولؐ کی رسالت پر، خدا کی خدائی پر آنچ نہ آنے دی۔ حقاً کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ۔ صلی اللہ علیٰ محمدؐ و آلِ محمدؐ۔

السیّد محمّد جعفر عفی عنہٗ

خطیب جامع شیعہ کوشن نگر (اسلام پورہ) لاہور

تمہید

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاہِرِیْنَ

دنیا میں کوئی تعلیم یافتہ ایسا نہ ہوگا جس نے عرب کا نام نہ سنا ہو۔ عرب ایک ریگستانی ملک ہے جو ایشیا کی مغربی سرحد پر واقع ہے اور جس کے ساحل پر بحرِ احمر لہریں مار رہا ہے۔ اسی ملک سے ساتویں صدی عیسوی شروع ہونے کے بعد ایک انقلاب کی لہر اٹھی جس کا نام ہے "اسلام"۔ اس انقلاب کے بانی حضرت محمدؐ بن عبداللہ تھے جنھوں نے اپنی پیغمبری کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو کامل توحید کا پیغام پہنچایا اور بت پرستی، اقتدار پرستی، سرمایہ پرستی غرض کہ غیراللہ کی ہر طرح کی پرستش کی مخالفت کی۔ اس سے ان لوگوں کو مخاصمت پیدا ہوگئی جن کے اقتدار کو اس تعلیم سے نقصان پہنچتا تھا۔ انھوں نے اس انقلاب کو روکنے کی کوشش کی اور ان کے ہاتھوں پیغمبرؐ کو بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔

اس مخالفت میں بنی امیہ پیش پیش تھے۔ اس لیے کہ اگرچہ پیغمبرِ اسلامؐ کی تعلیم براہِ راست کسی خاندان کی بلندی اور کسی خاندان کی پستی کی حمایت نہیں کرتی تھی مگر آپ کی تعلیم میں بلندی اور عزت کا جو معیار قرار دیا گیا تھا وہ صرف کردار کی خوبی، فرائضِ انسانی کی بجاآوری تھی۔ اس معیار پر بنی امیہ کے اکثر افراد پورے نہ اُترتے تھے۔ چنانچہ امیہ کے پوتے ابوسفیان بن حرب نے اسلام کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ عرب کے ہٹ دھرم اور جاہل بُت پرست اس عَلَم کے نیچے جمع ہو گئے اور حضرت محمد مصطفےٰؐ کو ستانے اور تبلیغِ اسلام میں روڑے اٹکانے لگے اور آپ برابر مصیبتیں اور سختیاں جھیلتے رہے اور دائرہ آپ کے پیغام کی مقبولیت کا وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ حجاز کے دوسرے اہم شہر مدینہ کے رہنے والوں نے اس تعلیم کو قبول

کرلیا اور آپ سے نصرت کا وعدہ کرکے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو وہاں آنے کی دعوت دے دی۔ چنانچہ آپ کے ساتھ والے وہاں رفتہ رفتہ جانے بھی لگے اور زیادہ تر چلے گئے۔ جب مکہ والے آپ کے مخالفین نے یہ دیکھا تو اب انھوں نے ایکا کرکے آپ کی جان لینے کا فیصلہ کر لیا اور رات کے وقت آپ کے مکان کو آکر گھیر لیا مگر آپ اپنے چچازاد بھائی حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا کر خود ان کے حلقہ سے نکل گئے اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس واقعہ کو "ہجرت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسی سے مسلمانوں کے ہجری سن کی ابتدا ہوتی ہے۔

دشمنوں نے ہجرت کے بعد بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور کئی مرتبہ چڑھائی کرکے آپ کو قتل کرنے آئے۔ مجبوراً آپ کو کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں جن میں بدر، اُحد اور اَحزاب بہت مشہور ہیں۔ مگر ان تمام لڑائیوں میں ابوسفیان کو ہر مرتبہ شکست ہوئی اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حامیوں کی تعداد اور ان کی طاقت برابر بڑھتی رہی۔ آخر بنی امیہ کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے انھوں نے بھی قبولِ اسلام کی نقاب ڈال لی۔ مگر موقع کے منتظر رہے کہ اسلام کی طاقت کچھ بھی کمزور ہو تو انھیں اپنے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانے کا موقع ملے۔

حضرت محمد مصطفےٰ کی زندگی میں ان کی اس آرزو کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا مگر اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد حضرتؐ کی وفات ہوگئی اور مسلمانوں کے نظام میں ابتری پیدا ہو گئی۔ سلطنتِ وقت کے دنیوی مصالح نے بنی امیہ کو شام میں اپنی حکومت قائم کر لینے کا موقع دے دیا جو شروع میں صرف ایک صوبہ دار یا گورنر کی حیثیت سے تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے اقتدار اور قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر میں اس نے خود مختار سلطنت کی حیثیت حاصل کرلی۔

ان لوگوں نے شام کے ملک میں اپنا قبضہ جماتے ہی حضرت محمد مصطفےٰ کے رائج کیے ہوئے طریقوں اور اسلام کی پھیلائی ہوئی مساوات کو مٹانا شروع کر دیا اور آخر میں تو یہ حالت

ہوئی کہ قرآنی احکام کی علانیہ مخالفت ہونے لگی۔

حضرت رسولؐ کے حقیقی جانشین جو اسلامی تمدن و تہذیب کے محافظ تھے اس کو کسی طرح برداشت نہ کر سکتے تھے۔ جب علیؑ ابن ابیطالبؑ جو رسولؐ کے چچا زاد بھائی، ان کی آواز پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اور شروع سے آخر تک اسلام کی اشاعت میں ان کے دست و بازو تھے مسلمانوں کے تختِ حکومت پر آئے تو انھیں حکومتِ شام سے مقابلہ کرنا پڑا اور صفین کی خونریز لڑائی ہوئی مگر ابھی حضرت علیؑ کا ارادہ اور کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ مسجدِ کوفہ میں عین حالتِ سجدہ میں حضرتؑ کے سر پر تلوار لگائی گئی جس سے آپ نے شہادت پائی۔ حضرت علیؑ کے بعد آپ کے بڑے فرزند امام حسنؑ نے کچھ شرائط کا پابند کرنے کے بعد حکومتِ شام سے صلح کر لی مگر حکومتِ شام نے ان شرائط کی پابندی نہیں کی اور خفیہ طور پر زہر دلوا کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اب پیغمبرؐ کے خاندان میں اصولِ اسلام کے تحفظ کی پوری ذمہ داری حسینؑ پر تھی جو حضرت محمد مصطفےٰؐ کے دوسرے نواسے اور حضرت علیؑ کے چھوٹے بیٹے تھے۔

حکومتِ شام کے تخت پر ابوسفیان کا پوتا یزید بن معاویہ بیٹھا جو بڑا ہی شراب خوار اور بدکردار تھا اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب ہوتا تھا جن کا تذکرہ بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے۔ اس کے باوجود اتنے دن کے مضبوط اموی اقتدار کی ہیبت سے عوام کو دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ حکومت کے ظلم و ستم سے اتنا ڈر گئے تھے کہ خوفِ خدا کا احساس باقی نہ رہا تھا۔ مگر یزید جانتا تھا کہ حجاز کے ملک میں شہر مدینہ کے محلہ بنی ہاشم کے اندر ایک انسان ہے جو مجھ سے نہیں ڈرتا، صرف خدا سے ڈرتا ہے اور وہ اصول اسلام کا حقیقی محافظ، رسولؐ کا نواسا ہے۔ وہ خاموش سہی مگر کیا معلوم کس دن دنیا کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹ جائیں اور وہ سچائی کی طرف کھینچ جائے۔ اس بنا پر یزید کو فکر لاحق ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح وہ حسینؑ سے بیعت حاصل کر لے۔ چنانچہ اس نے مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو حکم بھیجا کہ حسینؑ سے بیعت حاصل کرو اور اس معاملہ میں کسی مراعات سے کام نہ لو۔ حضرت امام حسینؑ نے اس پیغام کے معنیٰ سمجھ لیے اور آپ اسے

پہلے ہی سے سمجھے ہوئے تھے۔

اصولاً آپ کے لیے یزید کی بیعت کرنا غیر ممکن تھا۔ سر کا قلم ہونا بیشک آسان تھا مگر حفاظت خود اختیاری کے فرض کو انجام دینے کے بعد جو اسلامی شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے۔

اس کے لیے حسینؑ نے ترکِ وطن کا فیصلہ کر لیا۔ آپ نے اپنے تمام متعلقین کو جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے اپنے ساتھ لیا اور مکّہ میں جا کر پناہ لی۔ اس طرح آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کسی سے جنگ کرنا اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کو معرضِ خطر میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے بشرطیکہ آپ کو بیعت یزید پر مجبور نہ کیا جاتا۔

مکّہ عرب کے بین الاقوامی قانون اور پھر اسلام کے رو سے ایک ایسا امن کا مقام تھا جہاں کسی متنفس کے لیے خطرہ نہ ہونا چاہیے۔ مگر فرزندِ رسولؐ کو یہاں بھی اپنے قتل کا سامان دکھائی دیا۔ آخر ایام حج میں کہ جب تمام عالمِ اسلامی مکّہ کی طرف کھنچا چلا آ رہا تھا حسینؑ کو مکّہ سے رخصت ہونا پڑا اور آپ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں کے لوگ آپ کو اصرار کے ساتھ بُلا رہے تھے اور آپ سے مذہبی رہنمائی کے طالب تھے اور آپ اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے بھیج بھی چکے تھے مگر اس دوران میں کوفہ کی حالت دگرگوں ہو گئی وہاں سنگدل حاکم عبیداللہ بن زیاد کا اقتدار قائم ہو گیا اور مسلم بن عقیل شہید کر ڈالے گئے۔ اس کے بعد کوفہ جانے کا بظاہر کوئی موقع نہ تھا مگر مکّہ اور مدینہ واپس جانے کا بھی امکان نہ تھا۔ اُدھر کوفہ سے آپ کو گرفتار کرنے کے لیے فوج بھیجی گئی جس نے آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روکا۔ مجبوراً آپ کربلا کی سرزمین پر اُتر پڑے۔ دوسرے ہی دن سے یزید کا ٹڈی دل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہو گیا۔ تمام راستے بند کر دیے گئے اور امام حسینؑ کو گھیر کر یزید کی بیعت پر اصرار کیا جانے لگا۔

حضرت امام حسینؑ کے ساتھ صرف آپکے سترہ عزیز، چند غلام اور سو ڈیڑھ سو کے قریب وہ خاص دوست تھے جو کوفہ یا بعض دوسرے مقامات سے باوجود راستوں کے بند ہونے کے کسی نہ کسی طرح آپ تک پہنچ سکے تھے۔

ساتویں محرم سے آپ پر اور آپ کے تمام ساتھیوں یہاں تک کہ چھوٹے بچوں پر پانی بند کر دیا گیا مگر چونکہ امن پسندی حقیقی معنی میں آپ کا شعارِ زندگی تھا لہٰذا اتمام حجت کے طور پر آپ نے یزیدی فوج کے افسر عمر بن سعد کے سامنے ایسے شرائط پیش کیے جن سے معاملات رو براصلاح ہو جائیں اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ آپ کا طریقۂ کار اتنا سلجھا ہوا تھا کہ عمر بن سعد کو بھی اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ حسینؑ صلح کے راستے پر گامزن ہیں چنانچہ اس نے کوفہ کے حاکم عبیداللہ بن زیاد کے پاس اسی مضمون پر مشتمل ایک خط بھیجا مگر ابن زیاد کو حکومت کا غرور اور سلطنت کا نشہ تھا۔ اُس نے حسینؑ کو پہچانا بھی نہ تھا کہ وہ مشکلات کا کہاں تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس نے آپ کی صلح پسندی کو کمزوری اور عاجزی کا نتیجہ خیال کرتے ہوئے عمر بن سعد کو لکھ بھیجا کہ حسینؑ غیر مشروط طریقہ پر اطاعت کر لیں جب ہی انکی جان بچ سکتی ہے۔ غیرت دار اور فرض شناس امام حسینؑ کے لیے ایسا ممکن نہ تھا۔

نویں محرم کی شام کو اس بڑے لشکر نے آپ پر حملہ کر دیا مگر آپ نے ایک شب کے لیے التوائے جنگ کی خواہش فرمائی جو بمشکل منظور کی گئی۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ آخری مرتبہ پوری رات عبادتِ خدا میں بسر کر لیں۔ اس کے علاوہ دوست اور دشمن دونوں کو جنگ کے قطعی طور پر طے ہو جانے کے بعد سوچنے کا موقع دے دیں۔ دشمنوں پر اتمام حجت ہو جائے اور ساتھیوں میں سے کوئی ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتا ہو تو چلا جائے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے صاف طور پر بتا دیا کہ کل ہماری زندگی کا فیصلہ ہے۔ میں تم سے اپنی بیعت کی ذمہ داری ہٹائے لیتا ہوں۔ تم اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ مگر ان جانبازوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہا اور یکزبان ہو کر کہا کہ ہم آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے۔ ان لوگوں نے جو کہا تھا وہی کر دکھایا۔

سامنے فوجوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ گرد و پیش ویرانی اور بربادی کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ عزیزوں، بھائیوں، بھتیجوں اور اولاد کے خوبصورت چہرے امام کے سامنے تھے اور آپ کے ساتھ پردہ دار عورتیں اور چھوٹے بچے بھی موجود تھے۔ دریا پر فوج کا پہرہ بیٹھا ہوا تھا اور حسینؑ اور ان کے ساتھیوں تک ایک قطرۂ آب کے پہنچنے کی اجازت نہ تھی۔ بے زبان بچے پیاس کی شدت سے

بیتاب نظر آرہے تھے مگر طاقت کی تمام نمائشیں اور ایذا رسانی کی تمام صورتیں امام حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں کو مجبور نہ کر سکیں کہ ایک فاسق و فاجر کو جائز حکمران تسلیم کریں۔

دسویں محرم کو صبح سے دوپہر کے بعد تک امام حسینؑ کے جانباز ساتھی جو آپ سے خاندانی تعلق نہ رکھتے تھے برابر اپنی جانیں حسینؑ اور آپ کے اصول کی خاطر قربان کرتے رہے۔ جب ان میں سے کوئی باقی نہ رہا تو عزیزوں کی نوبت آئی۔ اس موقع پر آپ کے لیے آسان ہوتا کہ آپ خود آگے بڑھ کر راہِ حق میں اپنے سر کا ہدیہ پیش کر دیتے مگر آپ کو اپنی قوتِ برداشت کا پورا امتحان دینا تھا۔ چنانچہ ان کے بعد آپ کے عزیز آپ سے جدا ہونے لگے۔ سب سے پہلے آپ نے اپنے جوان بیٹے علی اکبر کو جو شبیہِ پیغمبرؐ بھی تھے مرنے کے لیے بھیجا۔ ماں خیمہ میں تھیں اور باپ خیمہ کے دروازے پر اور ان کا چاند فوجِ مخالف کی گھٹا میں چھپا تھا۔ باپ نے دیکھا اور ماں نے سن لیا کہ علی اکبر تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے مگر صبر و سکون میں فرق نہ آیا۔ اس کے بعد دوسرے عزیز بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوئے اور راہِ حق میں نثار ہو گئے۔ سب سے آخر میں آپ کے جانباز بھائی عباس ابن علیؑ آپ سے رخصت ہوئے۔ یہ حسینی جماعت کے علمدار تھے جن کے قتل ہونے سے حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی مگر ہمت شکستہ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد آپ کے پاس کوئی سرمایہ حق کی بارگاہ میں نذر دینے کے لیے نہ تھا۔ مگر سب سے آخر میں آپ نے ایک ایسا معصوم ہدیہ پیش کر دیا جس پر کسی شریعت اور قانون کی رو سے مجرم ہونے کا الزام نہ آسکتا تھا۔ وہ شیر خوار بچہ جو اپنی ماں کی گود میں پیاس سے سسکیاں لے رہا تھا حسینؑ نے اس کی حالت دیکھی اور دشمن کی فوج کے سامنے اپنے ہاتھوں پر لیا، یہ تھا حسینؑ کا سب سے آخری فدیہ۔ انسانیت کے ہاتھ پیروں میں لرزہ پڑ گیا اور رحم و کرم کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ جب اس دشمن فوج کے ایک سپاہی نے تیر چلہ کمان میں جوڑا اور بچہ کی گردن کو نشانہ بنا لیا۔ حسینؑ کا یہ آخری تحفہ بھی قبول ہو گیا۔ اب کیا تھا؟ بذاتِ خود حضرت کو حق کی حمایت میں جہاد کا فرض انجام دینا تھا اور اپنی جان کی قربانی پیش کرنا تھی۔ چنانچہ آپ نے اس شکستگی اور بیکسی کے عالم میں تلوار نیام سے نکالی اور جتنا قانونِ اسلام کی رو سے آپ کو اپنا فریضہ

محسوس ہوتا تھا اس حد تک انتہائی شدید مقابلہ کیا۔ وہ مقابلہ جو ایسے حالات میں عام انسانوں کی طاقت سے یقیناً بالاتر ہے۔ مگر کہاں ایک انسانی جسم اور کہاں فولادی تلواروں کا سیلاب! جسم زخموں سے چُور ہو گیا۔ آپ گھوڑے سے زمین پر گرے اور وہ مرحلہ جو آپ کے لیے پہلے ہی آسان تھا اب زیادہ آسان ہو گیا۔ آپ کا سر قلم کر کے نیزے پر بلند کیا گیا۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں سے پامال کی گئیں۔ مال و اسباب لوٹا گیا۔ خاندانِ رسالت کی مقدّس خواتین کے سروں سے چادریں اُتاری گئیں۔ خیموں میں آگ لگائی گئی۔ مردوں میں ایک بیمار و ناتواں علی بن الحسینؑ باقی رہ گئے تھے جنھیں طوق و زنجیر پہنائے گئے اور عرب کے شریف ترین خاندان کی غیرت مندی بیاں اسیر کر کے شہر بشہر پھرائی گئیں۔

یہ ہے دنیائے تاریخ کا وہ بڑا حادثہ جو "واقعۂ کربلا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یوں تو عالم کا ہر واقعہ اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے کسی خاص جگہ، کسی خاص قوم اور کسی خاص طبقہ سے متعلق ہوتا ہے اور اس لحاظ سے واقعۂ کربلا بھی عراق کی سرزمین، عرب کے ملک، ہاشم کی نسل اور مسلمانوں کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا مگر واقعات میں ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے ان خصوصیات اور نتائج کے لحاظ سے جو کُل نوعِ انسانی سے وابستہ ہوں اور جن میں مذہب و ملّت کی کوئی تفریق نہ ہو۔ اس حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو واقعۂ کربلا متعدد وجوہ سے تمام نوعِ انسانی کے تعلق کا مرکز ہے۔

اوّل یہ کہ ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی فطرتِ بشری میں داخل ہے۔ اگر کوئی قصّہ ہمارے سامنے پیش ہو جس میں ایک طرف ظلم کا مظاہرہ ہو اور دوسری طرف مظلومیت تو چاہے اس واقعہ سے متعلق شخصیتوں سے ہم بالکل واقف نہ ہوں تب بھی ظالم سے نفرت اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جائے گی اور اس میں کسی مذہب و خیال کا امتیاز نہ ہوگا۔ حضرت امام حسینؑ پر جو مظالم کربلا میں واقع ہوئے ان کی مثال تاریخ عالم میں ناپید ہے۔ یوں تو اکثر انبیاء و مقربین ابنائے زمانہ کے ہاتھوں مظالم کا شکار ہوئے، بہت سے بے گناہ افراد قتل

کیے گئے۔ بہتوں کا مال اسباب لوٹا گیا اور بہت سے لوگ قید ہوئے مگر بحیثیت مجموعی وہ تمام مصائب جن کا سامنا فرداً فرداً بہت سے اشخاص کو کرنا پڑا۔ حضرت امام حسینؑ کی ذات میں اکٹھا ہو گئے اور ان کے بوقتِ واحد جمع ہو جانے سے آپکی ذات مظلومیت میں اپنی آپ مثال قرار پا گئی۔

لہٰذا جس قدر حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت کا درجہ بلند اور ظالم کے ظلم کا درجہ شدید ہے اسی قدر وہ ہمدردی بھی کہ جو امام حسینؑ کے ساتھ بحیثیت مظلوم ہونا چاہیے۔ ہر دوسرے مظلوم سے زیادہ ہے اور وہ نفرت بھی کہ جو آپ کے دشمنوں سے بحیثیت ظالم ہونا چاہیے تمام دنیا کے ستمگاروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

دوسرے یہ کہ حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت بے بسی کی مظلومیت نہ تھی۔ جس طرح کسی شخص پر اکیلے جنگل میں ڈاکو حملہ کر دیں اور اس کے مال و اسباب کو لوٹ لیں یا اسے قتل کر ڈالیں مظلوم یہ بھی ہے اور ہمدردی اس کے ساتھ بھی ہو گی مگر یہ مظلومیت غیر اختیاری طور پر ہے۔ اس کے ساتھ کوئی عمل ایسا شریک نہیں ہے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ مدح ہو۔ حضرت امام حسینؑ کی مظلومیت اس نوع کی نہیں ہے۔ آپ نے ایک مسلک حق کی حمایت اور ایک صحیح اصول کی حفاظت کے لیے ان تمام مصائب کو برداشت کیا۔ اس کا نام قربانی ہے۔ یوں تو قربانی کے بہت سے اقسام ہو سکتے ہیں مگر سب میں بلند جان کی قربانی ہے اور اگر اس فرض کے عائد ہونے پر کوئی اس منزل میں ثابت قدم نظر آئے تو تمام افرادِ انسانی کے نزدیک زیادہ عزت و احترام کا مستحق ہو گا اور جس قدر مقصد عزت دار اور شریف ہو گا اتنی ہی قربانی اہم اور قابلِ عزت سمجھی جائے گی۔ کربلا کی سرزمین پر حضرت حسینؑ بن علیؑ نے جو قربانی پیش کی وہ انسانی تاریخ کا ایک بیمثال کارنامہ ہے۔ حق پرستی اور حق پروری کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں اور غلبہ و اقتدار انسانی آزادی کا سر کچل کر اپنی غلامی کا اقرار لے رہا تھا۔ اس نازک موقع پر حسینؑ نے اپنے کو اور اپنے عزیزوں بلکہ بچوں تک کو میدان جہاد میں لا کر جبر و استبداد کا پردہ چاک کر دیا اور ثباتِ استقلال ضبط و صبر، ایثار و قربانی، حق پروری اور راست کرداری کا بہت بلند نمونہ پیش کیا۔ اس

لحاظ سے حضرت امام حسینؑ کسی قوم اور مذہب سے مخصوص نہیں سمجھے جا سکتے۔ حسینؑ کا تعلق تمام دنیائے انسانیت سے ہے۔ آپ نے وہ کام کیا جس سے انسانیت کے مٹتے ہوئے نقوش کو پھر سے اُبھار دیا اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نئے سرے سے زندہ کر دیا۔ آپ نے دنیائے انسانیت کو وہ پیغام دیا۔ جو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آپ نے دنیا کو سچائی اور راست بازی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرایا اور اُس موت کے معنی سمجھائے جس میں دوامی زندگی کی حقیقت مضمر ہے۔ اس لیے تمام اقوامِ عالم جو قربانی کی عزت کرتی ہیں مجبور ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کو انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں۔

تیسرے یہ کہ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اپنی قربانی سے کوئی ایسا امر نہ تھا جو مختلف مذاہب کے نقطۂ نظر سے محلِ اختلاف ہو۔ انسانی اوصاف و اخلاق کی ایک منزل وہ ہے جہاں تمام مذاہب متفق ہو جاتے ہیں۔ تمام مذاہب کی اصل اساس جس پر ان کی عمارت بلند کی گئی ہے اخلاقِ انسانی کو نقطۂ ارتقا تک پہنچانا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زمانہ کے اختلاف سے کچھ احکام میں عمداً تبدیلیاں کی گئی ہوں اور بعض مذاہب کے اصول میں بعد کی آنے والی نسلوں کی ناسمجھی سے کچھ زیادتی یا کمی ہوئی ہو مگر اصلی محور سب کا تہذیبِ اخلاق اور تکمیلِ بشریت ہے۔ حضرت امام حسینؑ کا مقصد یہی نقطۂ مشترک تھا۔ یقیناً اگر حضرت امام حسینؑ کا مقابلہ کسی دوسرے دین و ملّت کے افراد سے ہوا ہوتا یعنی کوئی غیر مسلم جماعت آپ کے سامنے ہوتی تو چاہے آپ کی قربانی کتنی ہی حقانیت پر مبنی ہوتی اور آپ کو کتنے ہی ظلم کے ساتھ شہید کیا گیا ہوتا مگر وہ مذہبی جماعت جس کے مقابلہ میں آپ تھے اور جس کے ہاتھوں آپ کو یہ مظالم برداشت کرنا پڑے تھے کسی حد تک آپ کے نام اور آپ کے کام سے بنائے مخاصمت ضرور محسوس کرتی اور واقعۂ کربلا کے ساتھ ہمدردی میں عمومیت پیدا نہ ہوتی۔ لیکن حضرت امام حسینؑ کی قربانی رسمی طور پر کسی ایک مذہب کو مٹانے اور دوسرے مذہب کو قائم کرنے کے لیے نہیں تھی بلکہ ایک ہی دین کے ظاہری ماننے والوں میں برائیوں کو مٹانے اور اچھائیوں کے قائم کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی اور چونکہ برائی اور اچھائی کے متعلق اصولی حیثیت

سے مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ یعنی ہر مذہب کے نزدیک برائیاں مٹانے کے قابل اور اچھائیاں قائم کرنے کی مستحق ہیں اس لیے ہر مذہب کے لوگوں کو حسینؑ کے مقصد سے اتفاق ہوگا اور وہ آپ کی قربانی کو عزت و احترام کا مستحق سمجھیں گے۔

چوتھے حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے واقعۂ کربلا کے دوران میں مختلف اخلاق و اوصافِ کاملہ کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ عامۂ خلائق کے لیے ایک دائمی درسِ عمل کی حیثیت رکھتی ہیں جس سے تمام افرادِ بشر یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان ہی تمام وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا نے واقعۂ کربلا کے ساتھ اپنے باہمی تفرقہ اور جذبات کی کشمکش کے باوجود یگانگی کا برتاؤ کیا اور اقوام عالم نے یکساں طور پر اس کی اہمیت کا اعتراف و اقرار کیا اور صدیاں گزرنے کے ساتھ انکی دلچسپی اس اہم حادثہ سے نہ صرف قائم رہی بلکہ مختلف اوقات میں اس میں اضافہ ہوتا رہا۔

اگر کوئی سیاح محرّم کے زمانہ میں شرق و غربِ عالم کی سیاحت کرے اور ہر مرتبہ محرّم کے پہلے دس دن ایک نئے خطۂ زمین پر گزارے تو وہ دیکھ لے گا کہ ہر جگہ اپنے اپنے معیارِ زندگی اور طرزِ معاشرت کے اعتبار سے کسی نہ کسی طرح کربلا کے شہید کو یاد کیا جاتا ہے۔

یہ سالانہ یادگار جو عزاداری کے مختلف مراسم کی شکل میں منائی جاتی ہے کربلا کے واقعہ کے بعد پہلی ہی صدی میں مسلمانوں نے قائم کر لی تھی اور اس کے حلقۂ اشاعت میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا۔

حالانکہ انسان فطرۃً خوشی کو پسند کرتا ہے اور رنج و غم سے بھاگتا ہے۔ اس لیے اگر حوادثِ زمانہ کے ماتحت غم کے اسباب پیدا بھی ہوتے ہیں تو ان کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوامِ عالم میں جتنے تہوار ہیں وہ سب خوشی کی یادگار ہیں۔ غم کی یادگاریں کبھی قائم نہیں کی گئیں۔ یہ صرف حسینؑ مظلوم کی شہادت ہے جس کی یادگار غم کی صورت میں صدہا سال سے برابر قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ فطرتِ انسانی کسی بار کو عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی۔ اس غم کی یادگار کا اس طرح برقرار رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ واقعۂ کربلا کی یاد میں انسانی زندگی کے لیے نفع بخش عناصر مضمر ہیں۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمیشہ حال کا نقش ماضی کو فراموش بنا کر اس کے اثر کو ختم کر دیتا ہے۔

لیکن اس کے برخلاف واقعۂ کربلا کی یادگار کا اس شدت کے ساتھ قائم رہنا کہ حال کا کوئی واقعہ اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ تاریخ عالم اس کے بعد سے اس وقت تک کوئی نظیر اس کی پیش نہیں کر سکی۔

باوجودیکہ واقعۂ کربلا کے بعد کتنے ہی انقلاب ہوئے۔ تمدن نے کتنی ہی کروٹیں بدلیں۔ معیار اخلاق میں کتنے ہی تغیرات ہوئے مگر حسینی قربانی کی یاد مسلسل تیرہ سو برس سے یکساں عزت و احترام کے ساتھ قائم ہے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ قربانی ایسے مشترک انسانی اصول کی حفاظت کے لیے کی گئی ہے کہ جب تک دنیا میں انسانیت قائم ہے اس اصول کی بھی قدر و منزلت ہے اور اس یادگار قربانی کی یاد بھی برقرار ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جتنا کوئی موضوع اہم ہوگا اور تاریخی حیثیت سے جس قدر کسی واقعہ میں ندرت اور اہمیت زیادہ ہوگی اسی قدر اہل فکر و قلم طبع آزمائی زیادہ کریں گے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں کربلا کے واقعہ سے بڑھ کر کسی واقعہ سے متعلق نظم و نثر کا ذخیرہ فراہم نہیں ہوا۔

کربلا کی زمین پر ابھی خونِ شہیداں کی تری خشک نہ ہونے پائی تھی کہ شاعروں کی زبان سے اس واقعہ کے متعلق اشعار تراوش کرنے لگے اور نثر میں ان خطبوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جو اہل بیت حسینؑ کی زبان یا دوسرے مقررین کے دہن سے ہنگامی حالات کے ماتحت نکلے ہیں خصوصاً اُن اقدامات کے ذیل میں جو امام حسینؑ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے سلیمان بن صُرَدِ خزاعی اور پھر مختار کی جانب سے ہوئے تھے جن کا مقصد ہی یہ تھا کہ لوگوں کو واقعۂ کربلا کی اہمیت سے متاثر کیا جائے مستقل طور سے اس واقعہ پر تصانیف کی ابتداء پہلی صدی ہجری کے اواخر سے ہوئی اور اس کے بعد برابر مورخین واقعۂ کربلا پر مقاتل لکھتے رہے اور تصانیف کا سلسلہ جاری ہو گیا اور یہ واقعہ ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے موضوع پر اتنا نہیں لکھا اور کہا گیا ہے جتنا واقعۂ کربلا کے متعلق لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ پھر بھی موضوع تشنہ ہے اور بہت کچھ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت باقی ہے۔ اس کے علاوہ اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا

اندازِ بیان زیادہ تر مذہبی معتقدات[1] سے وابستگی رکھنے والے افراد کے مذاق کے مطابق ہے جس سے اکثر غیر مذاہب کے افراد اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ کوئی ناواقف اور اجنبی شخص اگر واقعۂ کربلا اور امام حسینؑ کی شخصیت کو عالمِ اسباب کی تاریخی رفتار اور اس کے نتائج اور ان کے ضروری تفصیلات کے ساتھ جاننا چاہے تو اسکی تشنگی دور کرنے کے لیے کوئی ایک کتاب ایسی جامع نہیں ہے جس کا پتہ دیا جا سکے۔ زیرِ نظر کتاب اس ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی جا رہی ہے اور اس موقع پر جب کہ دنیائے انسانیت کے اس عظیم واقعہ کو پورے تیرہ سو برس ہو گئے ہیں اور ہر مذہب و ملت کے افراد نے متفق ہو کر حسینؑ بن علیؑ کی سیزدہ صدسالہ یادگار قائم کی ہے۔ یہ کتاب اس صدی کی یادگار کے طور پر حق، انصاف اور سچائی کی بارگاہ میں حریت، مساوات اور ایثار کی بارگاہ میں، انسانی دل، دماغ اور ضمیر کی بارگاہ میں انسانی جذبات، احساسات اور شریفانہ خیالات کی بارگاہ میں، انسانی وقار، عزت اور افتخار کی بارگاہ میں، انسانی فکر، نظر اور کردار کی بارگاہ میں اور ان سب کے ذریعہ سے ان کے پروردگار کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہے۔

حسینؑ بن علیؑ کے کارنامۂ جاوید کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ تو الفاظ کی محدود دنیا کے بس سے باہر ہے لیکن اگر اس پوری کتاب میں ایک جملہ بھی اس ایثار و قربانی کی تصویر کا کوئی رُخ آنکھوں کے سامنے لا سکے تو یہی اس خدمت کا پورا ماحصل ہوگا۔

علی نقی النقوی

---

[1] امام کی شان کیا ہوتی ہے؟ اس بارے میں جو شخص مذہب شیعہ کے معتقدات معلوم کرنا چاہے اسے عربی میں اصولِ کافی اور اس کے شروح، فارسی میں حق الیقین علامۂ مجلسی (متوفی ۱۱۱۱ھ) اور حدیقۂ سلطانیہ مصنفہ جناب سید العلماء سید حسین (متوفی ۱۲۷۳ھ) اور اردو میں مذکورہ کتابوں کے تراجم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ مختصر طور پر اصول مذہب شیعہ کے سمجھنے کے لیے خود میرے وہ تصانیف دیکھنا مناسب ہوں گے جو امامیہ مشن سے شائع ہوئے ہیں۔

پہلا باب

نسبی خصوصیات، خاندان اور اس کے شاندار روایات

نظامِ اخلاق کی تشکیل میں آباؤ اجداد کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ "توارث صفات" اور خاندانی احساسات کے لحاظ سے بھی اور اس لیے بھی کہ بچپن سے کان میں پڑے ہوئے ماضی کے تذکروں سے قوائے ادراک و شعور کی اسی طرح پرورش ہوتی ہے جس طرح دودھ سے بچہ کی جسمانی پرورش اور جس طرح دودھ خون کی شکل میں تبدیل ہو کر رگوں میں دوڑتا ہے یوں ہی بچپن کے سنے ہوئے تذکرے بجلی کی رو کے ساتھ انسان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اترتے اور نفس کے تحت الشعوری طبقوں میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مذہبی معتقدات سے قطع نظر کرتے ہوئے انسانی حیثیت سے حسینؑ کو سمجھنے کے لیے ان کے آباو اجداد کے کارناموں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی ذات بڑی حد تک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب ان کو مانتے ہیں اور وہ مذہبی طور پر مسلمانوں کے مورثِ اعلیٰ کہے جا سکتے ہیں کیونکہ قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق حضرت محمد مصطفےٰ ؐ نے اپنے کو ملتِ ابراہیم کا رہبر بتایا اور حضرت ابراہیمؑ نے ہی اس جماعت کا جو راہِ حق میں ان کے پیچھے آئی سب سے پہلے نام "مسلم" رکھا اور ابراہیمؑ کی زبانی اپنے پروردگار کی بارگاہ میں یہ دعا بھی مذکور ہے کہ خداوندا ہم کو "مسلم" قرار دے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک "امتِ مسلمہ" قرار دے۔ اس طرح مسلمانوں کی قومی زندگی اور پیغمبرِ اسلامؐ کی بعثت گویا دعائے ابراہیمؑ کا نتیجہ تھی۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ کے روایات زندگی ابنائے اسلام کے لیے ایک موروثی ترکہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور فرزندانِ اسلام کے عناصر اخلاق کی تشکیل میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ اسحاقؑ اور اسمٰعیلؑ۔ حضرت اسحاقؑ سلسلۂ بنی اسرائیل کے

اور حضرت اسمٰعیلؑ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ ؐ کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ بعض مصالح کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو شیر خوارگی کے عالم میں آپ کی والدۂ گرامی ہاجرہ کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر پہنچا دیا جس پر خانہ کعبہ واقع ہے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام انھیں باپ بیٹے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے انجام دیا جو مذہبی طور پر تمام خلقِ خدا کا محلِ اجتماع قرار پایا اور یہ آلِ ابراہیمؑ کی مرکزیت کا احساس عامۂ خلائق کے دلوں میں پیدا ہونے کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔

ان دونوں بزرگواروں کی نسبت اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ من جانب اللہ مامور ہوئے کہ اپنے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنے ہاتھ سے ذبح کریں اور آپ نے بڑی ثابت قدمی اور پُرجگری کے ساتھ حکمِ ربّانی کی تکمیل کو عمل کے آخری درجہ تک پہنچا دیا۔ اگرچہ وقت پر پروردگارِ عالم کی طرف سے بجائے انسان کے جانور کی قربانی کے عمل میں آنے کا انتظام ہو گیا مگر اس اعلان کے ساتھ کہ آئندہ اس کا معاوضہ راہِ خدا میں ایک بڑی قربانی کے ساتھ ہونا ضروری ہے (وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ)[1] اس واقعہ کو اسلام نے بڑی اہمیت دی اور عید قربان کی شکل میں اس کی مستقل یادگار قائم کر دی۔

اسمٰعیلؑ کے بارہ[12] فرزند تھے۔ ان میں سے نابت اور قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی۔ قیدار کی اولاد میں عدنان بہت مشہور ہیں اور پیغمبرِ اسلامؐ انھیں کی اولاد میں سے تھے۔[2]

حضرت کا نسب نامہ آپکی ذات سے لیکر عدنان تک متفقہ طور سے تواریخ و سیر میں موجود ہے اسطرح:- عدنان[1] - معد[2] - نزار[3] - مضر[4] - الیاس[5] - مدرکہ[6] - خزیمہ[7] - کنانہ[8] - نضر[9] - مالک[10] - فہر[11] - غالب[12] - لوی[13] - کعب[14] - مرہ[15] - کلاب[16] - قصی[17] - عبد مناف[18] - ہاشم[19] - عبد المطلب[20] - عبد اللہ[21] جو حضرت محمد مصطفےٰ ؐ کے والد بزرگوار تھے۔[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؐ سے عدنان تک اکیس پشتیں ہیں اور اگر ہر نسل کا اوسط تیس سال قرار دیا جائے تو کل پشتوں کی مدت ۶۳۰ برس ہوئی۔ قریش کا لقب ان

---

[1] قرآن مجید سورۂ صافات آیت ۱۰۷ [2] الامم والملوک للطبری ج ۲ ص ۱۹۱-۱۹۲۔

[3] سیرت ابن ہشام ج ۱ ط مصر ص ۲ طبقات ابن سعد، طبع لیدن ج ۱ ص ۲۷-۲۸۔

اکیس آدمیوں میں سے کس کو ملا۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش کا لقب سب سے پہلے نضر بن کنانہ کو ملا۔ بعض کے نزدیک فہر کو اور بعض کے نزدیک قصیٰ بن کلاب کو۔ وجہ تسمیہ میں بھی کئی قول ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تقرش سے ماخوذ ہے، تجارت اور کسب معاش کے معنی میں چونکہ یہ لوگ اپنی محنت و مشقت اور قوت بازو کی کمائی کو معیار عزت سمجھتے تھے اور عملی طور پر اس کے پابند تھے اس لیے قریش کہلائے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ تقرش بمعنی اجتماع سے ماخوذ ہے۔ چونکہ ان لوگوں نے متفرق ہونے کے بعد اجتماعی شکل اختیار کی اس لیے قریش کہے جانے لگے۔[1]

چونکہ قصیٰ کے وقت تک نسل عدنان کے لوگ مکہ کے پہاڑوں اور وادیوں میں منتشر تھے، قصیٰ نے ان سب کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس مکانوں میں آباد کیا۔ اسی لیے خود قصیٰ کو مُجَمِّع کے لقب سے یاد کیا جانے لگا جیسا کہ عرب کے شاعر نے کہا ہے:۔

ابوکم قصی کان یدعیٰ مُجَمِّعًا　　بہ جمع اللہ القبائل من فہر

(یعنی) تمہارے مورث اعلیٰ قصیٰ وہ ہیں کہ جو "مجمّع" کہلاتے تھے۔ اُنہی کے ذریعہ سے اللہ نے قبیلۂ فہر کی مختلف شاخوں کو ایک جگہ جمع کیا۔[2]

نابت بن اسمٰعیلؑ کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت جرہمی خاندان کی طرف جو اُن کے ننھیال والے تھے منتقل ہو گئی تھی اور اس طرح یہ لوگ دُنیوی اور مذہبی اقتدار دونوں کے مالک بنے ہوئے تھے۔ عرصہ تک قابض رہنے کے بعد انھوں نے کعبہ کے اموال میں تغلّب و تصرّف اور حج کو آنے والے پردیسیوں پر ظلم و ستم اور حرم مکہ کی حرمتوں کو برباد کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں بنی خزاعہ نے یمن سے نکل کر اُن پر حملہ کر دیا اور انھیں مکہ سے نکال کر خود قابض ہو گئے۔ یہ خاندان تقریباً دو سو برس تک کعبہ کا مالک بنا رہا۔ قصیٰ نے اُنھیں میں شادی کی اور جب ان کا اثر و رسوخ حجاز میں بڑھ گیا تو انھوں نے نضر بن کنانہ کی تمام اولاد کو جمع کر کے انھیں خانۂ کعبہ کی حمایت و تولیت کی ذمہ داری یاد دلائی اور آخر متفقہ طاقت کے ساتھ خزاعیوں کو شکست دے کر مکہ پر خود قابض ہوئے۔ انھوں نے مکہ معظمہ کے

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۶۰-۶۱ [2] طبری ج ۲ ص ۱۸۲

مکانات کی از سرِ نو تعمیر کی اور دارالندوہ (محلِ مشاورت) کے نام سے ایک عمارت تیار کرائی جس میں جمہور کے کام انجام دیے جاتے تھے۔ ان کے لیے معاشرت کے قوانین منضبط کیے اور خراج کی وصولیابی اور حاجیوں کے خورد و نوش کا بھی انتظام کرایا۔[1] انھوں نے شرابخواری کی مذمت اور اسکی مضرتوں کا اعلان بھی کیا۔[2]

قصی کے فرزندوں میں عبدِ مناف اوصاف و کمالات میں اپنے بزرگوں کے حقیقی جانشین تھے اس لیے اپنے باپ کی زندگی ہی میں انھوں نے ملکِ عرب میں شہرت و امتیاز کا درجہ حاصل کر لیا۔[3]

عبدِ مناف کے فرزندوں میں ہاشم جن کا اصلی نام عمرو تھا نہایت بااثر اور ممتاز تھے۔ کعبہ کی معزز خدمتیں حاجیوں کی سیرابی اور ضیافت ان کو سپرد کی گئیں جو انھوں نے بہت قابلیت سے انجام دیں۔ انھوں نے سلطنتِ روم سے خط و کتابت کر کے کچھ خاص حقوق عرب تجار کے واسطے حاصل کیے تھے۔[4] "ہاشم" ان کا لقب اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے سب سے پہلے اہلِ مکہ کو روٹیوں کے ٹکڑے شوربے میں بھگو کر کھلائے۔[5] (عربی میں ہشم، چورا کرنے کو کہتے ہیں)

ہاشم کی وفات کے بعد ان کے بھائی مُطّلب جانشین ہوئے۔ اس لیے کہ ہاشم کے فرزند شیبہ اس وقت نہایت کمسن تھے۔ جب مطّلب کی وفات ہوئی تو ان کی جگہ ان کے بھتیجے شیبہ نے حاصل کی جو عبدالمطّلب کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ شرف، عظمت اور شہرت میں اپنے بزرگوں پر بھی فوقیت لے گئے۔[6] اور "سیّد البطحا" کے خطاب سے مشہور ہوئے جو اُن کی اولاد میں باقی رہ گیا۔ چنانچہ وہ آج تک "سادات" کہے جاتے ہیں۔ عبدالمطّلب کا توکّل اور اعتماد خدا پر اس وقت پورے طور پر ظاہر ہوا جب ابرہہ نے یمن سے بڑھ کر کعبہ کو ڈھانے کے ارادے سے مکّہ پر چڑھائی کی۔ مکّہ والوں کے پاس کوئی ایسی فوجی طاقت نہ تھی جس سے وہ غنیم کا مقابلہ کرتے مگر عبدالمطّلب خداوندی امداد پر بھروسا رکھتے تھے۔ آخر غیبی طاقت ہی نے اصحابِ فیل کو تباہ و برباد کر دیا۔[7] عبدالمطّلب کے دس

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۷۱-۷۹ [2] الامالی للصدوق ص ۴ [3] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۸۱ [4] طبری ج ۲ ص ۱۸۰

[5] ابن ہشام ج ۱ ص ۸۵، طبری ج ۲ ص ۱۷۹ [6] ابن ہشام ج ۱ ص ۸۶۔

اصولِ کافی طبع لکھنؤ ص ۲۸۳، سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۲-۳۴، طبری ج ۲ ص ۱۷۲-۱۷۴۔

بیٹوں میں سے دو بیٹے عبداللہ اور ابوطالب تھے۔

عبداللہ بن عبدالمطلب کی قربانی کا واقعہ بھی کتبِ تواریخ میں مذکور ہے اور مشہور ہے کہ عبدالمطلب اپنے فرزند عبداللہ کی قربانی پر تیار تھے مگر ان کے ننھیال والوں کے اصرار پر قرعہ ڈالا گیا اور سو اونٹوں کی قربانی کے بدلے میں عبداللہ کی جان بچی[1]

چونکہ عبداللہ کا انتقال باپ کے سامنے ہوگیا۔ اس لیے عبدالمطلب کے تمام امتیازات و اختیارات ابوطالب کو حاصل ہوئے۔ "شیخ البطحاء" اور "سید القریش" کے خطابوں سے مشہور ہوئے۔ اور ان امانتوں کے ساتھ ساتھ جو ابراہیم و اسمٰعیل کی متروکہ تھیں ایک سب سے بڑی امانت جو اُن کی حفاظت میں آئی وہ عبداللہ کے یتیم فرزند محمدؐ کی ذات تھی۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ کی عمر نوجوانی کی منزل میں تھی کہ آپ کی راستبازی اور امانت داری کو تمام عرب نے تسلیم کرتے ہوئے آپ کو "امین" کا لقب دے دیا[2]۔ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوانا شروع کردیں۔ اہم معاملات میں آپ کے تصفیہ کو قابلِ قبول سمجھنے لگے۔ جب آپ کی عمر بیس سال کی تھی تو قریش میں "حلف الفضول" کا عہدنامہ[3] ہوا جو بے نظیر شریفانہ اصول پر مبنی تھا اور اس کی تحریک کا سہرا بنی ہاشم ہی کے سر رہا، اس لیے کہ زبیر بن عبدالمطلب اس کے داعی تھے۔

واقعہ یہ تھا کہ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد عرب میں مطلق العنانی اور بے آئینی کا دور دورہ ہوگیا۔ رشتہ داریوں کے لحاظ سے آپس میں کشت و خون تو نہیں ہونے پایا مگر اجنبی لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا تھا چنانچہ قبیلۂ زُبید کے ایک یمنی شخص نے جس سے کہ عاص بن وائل سہمی نے کوئی بیش قیمت چیز خرید کر قیمت ادا نہیں کی تھی تمام آلِ فہر کو مخاطب کرکے مؤثر انداز میں اس ظلم و ستم کا شکوہ بھی کیا۔

انہی واقعات سے متاثر ہوکر بنی ہاشم، زہرہ اور اسد بن عبدالعزیٰ کے قبیلے عبداللہ بن جدعان کے مکان میں جمع ہوئے اور متفقہ طور پر عہد کیا کہ ہم ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دینگے۔

---

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۹۴-۹۷ [2] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۷۶ [3] ابن سعد ج ۱ ص ۸۲

اور اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک اس کا حق ادا نہ ہو جائے۔ اس معاہدہ کا نام حلف الفضول رکھا گیا جس میں فَضل، فَضّال، مُفضِل اور فُضَیل شامل تھے اور اس لیے اس کا نام فضول قرار پا گیا تھا۔ حضرت محمد مصطفےٰ اس معاہدہ میں شریک تھے اور ہمیشہ اس پر آپ نازاں رہے بلکہ بعثت کے بعد جبکہ عرب کے تمام قدیم معاہدات اور مخاصمات کالعدم قرار دے دیے گئے تھے آپ اپنے کو اس معاہدہ کا پابند سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ آج بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اس کی صدا پر لبیک کہوں گا۔[1]

اگر آپ نے عرب کی تاریخ پڑھی ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ معاہدہ اس قوم کی عام ذہنیت کے بالکل خلاف تھا۔ وہاں تو یہ تھا کہ ہم کو اپنے قبیلہ والے کی مدد کرنا چاہیے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ اس قبائلی تعصب کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک شخص کی ذاتی جنگ قبائلی جنگ بن جاتی تھی جو چالیس چالیس برس جاری رہتی تھی۔ اس غلط ذہنیت کی سب سے پہلے مخالفت کرنے والے بنی ہاشم تھے جو دنیا کو حق و انصاف کی قدر و قیمت کا اندازہ کرا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ اس کے مقابلہ میں قومیت یا برادری کوئی چیز نہیں ہے۔

جب حضرت محمد مصطفےٰ کی عمر تیس برس کی تھی ابوطالب کے یہاں علیؑ کی ولادت ہوئی[2] اور ابھی علیؑ بن ابی طالب چند ہی سال کے تھے کہ مکہ میں قحط پڑا اور ابوطالب اقتصادی تکالیف میں مبتلا ہو گئے۔ آپ کے بار کو کم کرنے کے لیے محمد مصطفےٰ نے علیؑ کی پرورش خود سے متعلق کر لی۔ اس طرح علیؑ، محمدؐ کے آغوش تربیت میں آ گئے۔[3]

یہاں ایک مرتبہ اس پر نظر ڈال لیجیے کہ اس خاندان کی زمین شرف کس آسمان تک پہنچ چکی تھی اور اس کے قدیم روایات کس درجہ شاندار ہیں۔

۱۔ کعبہ جو تمام عرب کے مذہبی اجتماع کا مرکز ہے وہ تعمیر کیا ہوا ہے انکے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کا۔

---

[1] ابن ہشام ج ۱ ص ۱۴۲۔ ابن سعد ج ۱ ص ۸۲ [2] آپ مکہ معظمہ کے اندر ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل کو (کعبہ پر ہاتھیوں کے حملہ سے تیس برس بعد) پیدا ہوئے (مروج الذہب مسعودی، مستدرک حاکم، ارشاد شیخ مفید) [3] ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۶۔

۲۔ ان کے دادا حضرت اسمٰعیلؑ اللہ کی بارگاہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے "ذبیح خدا" کہلائے۔ پھر عبدالمطلب اور ان کے فرزند عبداللہ نے اسی سبق کو دہرا کر ثابت کر دیا کہ یہ قربانی کا جذبہ اس خاندان کا ورثہ ہے جو دنیا کو برابر یاد رہا چنانچہ ان دونوں طے شدہ قربانیوں کی بنا پر حضرت محمد مصطفےٰؐ کو "ابن الذبیحین" کے لقب سے یاد کیا گیا[1] ؏

۳۔ تمام قبائلِ مُضر کی شیرازہ بندی کا فخر ان ہی کو حاصل ہے۔

۴۔ خانہ کعبہ کے محافظ اور موسم حج کے منتظم ہونے کی حیثیت سے انھیں تمام عرب کی مرکزیت حاصل ہے۔

۵۔ تمام اندرونی اور بیرونی معاملات میں عرب قوم کی قیادت اور نمائندگی ان کا حصہ ہے۔

۶۔ وہ غریبوں کے دستگیر اور قحط سالی وغیرہ کے سخت اوقات میں مسکینوں کی خبر گیری کرنے والے ہیں۔

۷۔ وہ اسم اور مسمّٰی دونوں حیثیتوں سے سیّد (سردار) مانے جاتے ہیں۔

۸۔ وہ ایک ہی وقت میں میدانِ جنگ کے شہسوار اور عالمِ روحانی کے رازدار ہیں جس کا گواہ اصحابِ فیل کے مقابلہ میں عبدالمطلب کا طریقۂ پیکار ہے۔

۹۔ انھوں نے مظلوموں کی حمایت اور حق کی طرفداری کا بیڑا اٹھایا اور اس بارے میں تمام قریش کی رہنمائی کی تھی۔

یہ ہیں وہ نمایاں خصوصیات جو تاریخی اسناد کے ساتھ اس خاندان کے لیے ابھی تک ثابت تھے مگر اب اسی مشرق سے وہ آفتاب چمکتا ہے جس کی شعاعیں دنیائے انسانیت کو صبح قیامت تک روشن رکھیں گی۔

ساتویں صدی عیسوی کے شروع ہونے پر جبکہ دنیا تاریکی کے عظیم دور سے گزر رہی تھی جزیرہ نمائے عرب سے یہ آفتاب طالع ہوا جس کی ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کی سرزمین مکہ سے

---

[1] طبری ج ۱ ص ۱۳۵۔ ؏ شریعتِ اسلامیہ میں یہ طریقۂ قربانی کہ اپنے ہاتھ سے اللہ کی رضا کے لیے اپنا یا کسی اپنے سے متعلق انسان کا خون بہایا جائے منسوخ کر دیا گیا مگر راہِ خدا میں جب ضرورت ہو تو دشمنوں سے جہاد کرکے اپنی جان قربان کرنے کا اصول قائم رہا اور آلِ رسولؐ نے عملی طور پر اسی کی مثالیں پیش کیں۔

ظاہر ہوئی تھیں مگر رفتہ رفتہ اس کی روشنی شرق و غرب میں پھیل گئی اور دنیا کو روشن کر دیا۔ یہ عالمگیر مذہب اسلام تھا اور اس خداوندی پیغام کے پہنچانے کے لیے محمد مصطفےٰ منتخب ہوئے جن کے ذریعہ سے کائنات کو ایک خدائے توانا کے سامنے سر جھکانے کی تعلیم دی گئی اور غیر اللہ کی پرستش کو مٹانے کا اعلان کیا گیا۔ خواہ وہ سونے چاندی پتھر کے بت ہوں یا گوشت پوست سے بنا ہوا انسان جو الوہی اقتدار کے سامنے اپنی سطوت و ہیبت کا سکہ جمانا چاہتا ہو اور خلق خدا کو اپنے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کرے۔

اس وقت حضرت علیؑ بن ابی طالب کی عمر دس برس کی تھی اور چونکہ علیؑ پہلے رسولؐ کی آغوش تربیت میں تھے[1] اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ علیؑ اور اسلام میں وہی وابستگی پیدا ہوئی جو ایک آغوش میں رہنے والے دو بچوں میں آپس میں ہونا چاہیے۔

چند سال تک رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ کو ادا کیا گیا[2] اس کے بعد حکم آگیا وانذر عشیرتک الاقربین (یعنی) اپنے قریبی رشتہ داروں کو تبلیغ کیجیے[3] حضرت نے اس حکم کی تعمیل میں دعوت کا انتظام کر دیا اور تمام اولاد عبدالمطلب کو جمع کر کے اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ اور توحید الٰہی کا پیغام پہنچایا۔ پھر فرمایا کہ تم میں سے کون شخص اس دین کی اشاعت میں میرا دست و بازو بننے کے لیے تیار ہے؟ اس وعدہ پر کہ وہی میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین قرار پائے گا۔ مجمع تمام خاموش تھا۔ حضرت علیؑ اگرچہ سب سے زیادہ کمسن تھے مگر آپ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں آپ کا اس مہم میں ہر طرح سے مددگار رہوں گا آپ نے حضرت علیؑ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا بس یہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے۔ تم سب کو اس کی اطاعت لازم ہے[4]

اب علانیہ بت پرستی کی مذمت ہونے لگی جس سے قریش آپ کی مخالفت پر کمربستہ اور ایذا رسانی پر آمادہ ہو گئے مگر آپ کے چچا جناب ابوطالب کی شخصیت آپ کے سامنے سینہ سپر تھی جس کی

---

[1] طبری ج ۲ ص ۳۱۲ [2] طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۱۳۲ - طبری، ج ۲ ص ۲۱۶ - ۲۱۸ - ارشاد ص ۱۶
[3] قرآن سورۂ شعراء آیت ۲۱۴ - [4] طبری، ج ۲ ص ۲۱۷

وجہ سے ان لوگوں کو کچھ بن نہ پڑتا تھا۔ آخر اکابر قریش کا ایک وفد ابوطالب کے پاس آیا۔ اس میں عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے۔ ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا تھا کہ تمھارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی مذمت کرتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے اور ہمارے آباو اجداد کو گمراہ بتاتا ہے اس لیے یا تو تم اسے ان باتوں سے روک دو یا اسے ہمارے سپرد کر دو۔ پہلی بار ابوطالب نے نرمی سے ان کو ٹال دیا مگر کچھ عرصہ کے بعد جب یہ وفد پھر آیا تو اس نے نہایت سختی سے کہا کہ اب ہم اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یا تو تم انھیں روکو یا ہمارے تمھارے درمیان جنگ ہو کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے مناسب سمجھا کہ اب رسول اللہؐ سے اس کا تذکرہ کریں۔ حضرتؐ نے پورا واقعہ سنا تو فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا۔" اور یہ کہتے کہتے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ دیکھنا تھا کہ ابوطالب کا دل، ہل گیا۔ انھوں نے کہا کہ "اچھا تم اپنے فرض کو انجام دیتے رہو میں آخر دم تک تمھارا ساتھ دوں گا۔"[1]

چنانچہ ابوطالب نے حضرت محمد مصطفےٰؐ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور جب تک زندہ رہے رسولؐ کے لئے سینہ سپر رہے۔

مگر حضرت ابوطالب اور خدیجۂ کبریٰ کی وفات کے بعد اہل مکہ کی ایذا رسانی حضرت رسولؐ کے خلاف بہت بڑھ گئی اور آپ نے ان کے راہ راست پر آنے سے بظاہر اسباب ناامید ہو جانے کی وجہ سے یہ طے کر لیا کہ اب مکہ معظمہ کو جو آپ کا آبائی وطن تھا ترک فرما دیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اپنے متبعین کو مدینہ کی طرف جہاں کے کچھ لوگوں نے آپ کی پیروی قبول کر لی تھی روانہ فرمانے لگے۔ یہ دیکھ کر مکہ والے سب آپ کی جان لینے کے درپے ہو گئے اور ایکا ہوا کہ رات کے وقت

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱۶۲-۱۶۴۔ طبری ج ۲ ص ۲۱۹-۲۲۰

آپ کے گھر کو گھیر کر آپ کو قتل کر ڈالیں۔ آپ اپنے چچا زاد بھائی علیؑ بن ابی طالبؑ کو یہ ہدایت فرما کر کہ وہ آپ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہیں خود مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت علیؑ نے دشمنوں کی کھینچی ہوئی تلواروں کے اندر رسولؐ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر آرام کیا۔[1]

پھر مدینہ پہنچنے کے بعد جب مخالفین اسلام نے فوجی طاقتوں کے ساتھ مسلمانوں پر چڑھائی کی اور بدر و اُحد اور خندق وغیرہ کی لڑائیاں ہوئیں تو ان لڑائیوں میں حق و صداقت کی روحانی طاقت کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰؑ کی تلوار ہر موقع پر اسلام کی فتح مندی کا سبب بنتی رہی۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہراؑ جن کی اُن کے بلند اوصاف کی بنا پر آپ اتنی عزت کرتے تھے کہ جب وہ آپ کے پاس آتی تھیں تو آپ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے[2] اور بکثرت حدیثیں آپ نے ان کی فضیلت کے بارے میں ارشاد کیں جن میں ایک یہ تھی کہ وہ سردارِ زنانِ جنت اور سردارِ زنانِ اہلِ ایمان ہیں[3] اور فرمایا کہ فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّی (یعنی) فاطمہؑ میرا ایک ٹکڑا ہے[4]

ظاہر ہے کہ ایسی بیٹی کے لیے رسولؐ ایسے ہی صاحب اوصاف موزوں ترین کفو کو منتخب فرما سکتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پیغام اور نسبتیں آئیں مگر سب مسترد کر دی گئیں اور صرف علیؑ ہی کی ایک ذات جس کے لیے رسولؐ کا قول تھا کہ میں اور علیؑ ایک ہی نور سے ہیں[5]۔ اس رشتہ کے لیے موزوں سمجھی گئی اور رسولِ خداؐ نے فرمایا کہ یہ میرا ہی نہیں بلکہ اللہ کا انتخاب ہے[6]

انہی دونوں مقدس اور بزرگ مرتبہ ماں باپ سے دو فرزند پیدا ہوئے ایک حسنؑ اور دوسرے حسینؑ۔ اب کیا حسینؑ بھلا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو؟ بقول مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسن صاحب کامونپوری "حسینؑ جس نسل کی یادگار رہے تھے وہ صدیوں سے قربانی و

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۵۳۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ طبری ج ۱ ص ۲۴۴۔ [2] استیعاب ج ۲ ص ۲۵۲

[3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۷۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۹۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۔ [4] بخاری ج ۲ ص ۱۸۵ و ۱۸۹۔

[5] فردوس الاخبار دیلمی و تذکرہ سبط ابن جوزی وغیرہ۔ [6] صواعق محرقہ ص ۹۴ و ۹۷۔

فداکاری کی ایک مسلسل تاریخ تیار کر رہی تھی۔" حسینؑ نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے سنتے تو رہے کہ ہمارے مورثِ اعلیٰ ابراہیمؑ خدا کی رضا کے لیے بیٹے کے ذبح پر تیار ہو گئے۔ ہمارے پردادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کو قربانگاہِ عبودیت میں پیش کیا۔ ہمارے جدِ بزرگوار ہاشم نے اپنے مال و دولت اور اثر کو ہمیشہ خلقِ خدا کی خدمت میں صرف کیا۔ ہمارے خاندان نے مظلوموں کی امداد اور ظالموں سے مقابلہ کا حلف اٹھایا ہے[1] اس لیے اگر خلقِ خدا کسی ظالم کے ہاتھ سے پریشان ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم مظلوموں کی دستگیری کے لیے آگے بڑھ جائیں۔

حسینؑ کو معلوم ہوا کہ سچائی کی خاطر تھپکھائے اور مصیبتیں اٹھائیں۔ میرے نانا رسول اللہؐ نے۔ اور پیغمبرِ اسلامؐ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے میرے دادا ابوطالبؑ۔ اور جب اسلام کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا تو سب سے پہلے عہدِ وفاداری کرنے والے اور پھر تلواروں کے حصار میں بسترِ رسولؐ پر لیٹنے والے اور پھر ہر سخت موقع پر سچائی کے لیے جہاد کرنے والے میرے باپ علیؑ بن ابی طالبؑ تھے۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ بچے جب اپنے بزرگوں کے حالات سنتے ہیں تو ان میں بچپن ہی سے ولولہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں بھی کوئی موقع ایسے کارنامے پیش کرنے کا مل جائے۔ اس لیے عام فطرت کے تقاضوں اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ امام حسینؑ کے لیے علاوہ منصبی ذمہ داری کے خاندانی روایات اور بلند فطرت کا تقاضا یہی تھا کہ بچپن سے منتظر اور مشتاق رہیں کہ سچائی کی خدمت، غریبوں کی دستگیری اور مظلوموں سے ہمدردی کا کوئی موقع پیش آئے اور آپ بھی حق کی حمایت میں اپنے فریضہ کو انجام دے کر اپنی خاندانی روایات کو زندہ اور برقرار رکھیں۔

---

[1] حلف الفضول کو امام حسینؑ اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ ایک موقع پر جب ولید بن عتبہ حاکم مدینہ نے آپکے ساتھ ظلم و تعدی سے کام لیا تو آپ نے حلف الفضول کا حوالہ دیا تھا اور اسکی پابندی کی طرف سب کو توجہ دلائی تھی۔ جس کے نتیجہ میں عبداللہ بن زبیر، مسور بن مخرمہ بن نوفل زہری اور عبدالرحمٰن بن عثمان بن عبیداللہ تیمی متعدد اشخاص نے یہ اعلان کیا کہ اگر حسینؑ بن علیؑ اس معاہدہ کی بنا پر اپنے حق کو طلب کرنے کے لیے کھڑے ہوں تو ہم ساتھ ہوں گے۔ آخر ولید نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور حضرت کے مطالبہ کو منظور کیا (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۸۴)

شجرہ نسب آلِ عدنان[عہ]

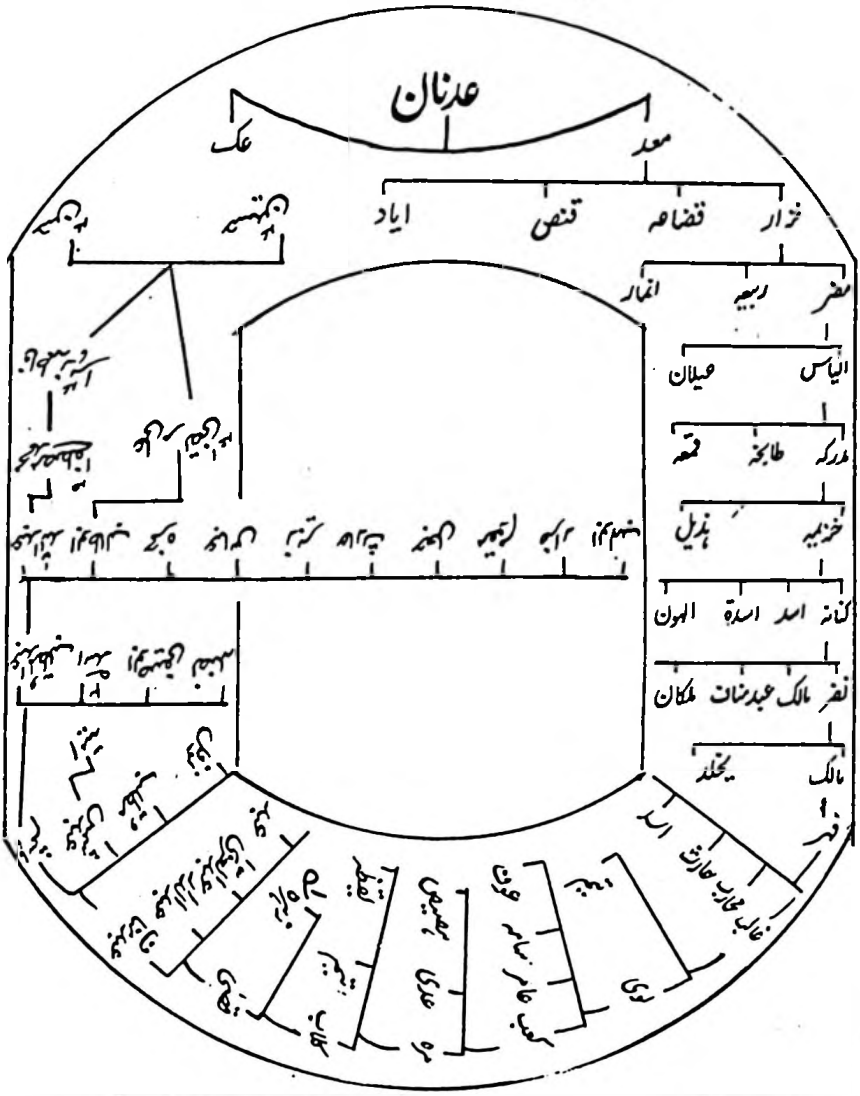
عدنان
عک
معد
نزار
قضاعہ
قنص
ایاد
مضر
ربیعہ
انمار
الیاس
عیلان
مدرکہ
طابخہ
قمعہ
خزیمہ
ہذیل
کنانہ
اسد
اسدۃ
الہون
نضر
مالک
عبدمناف
ملکان
مالک
یخلد
فہر
اسد
عبدالعزیٰ
عبدالدار
عبد
مخزوم
ہاشم
امیہ
نوفل
عبدشمس
مطلب
اسد
زہرہ
تیم
مرہ
ہذیل
تیم
عدی
مخزوم
یقظہ
عبید
عدی
تیم
مرہ
کلاب
زہرہ
تی

دوسرا باب

بنی ہاشم اور بنی امیّہ

بنی ہاشم کے بالمقابل تاریخ میں جو نام نظر آتا ہے وہ "بنی امیّہ" ہے۔ اس قبیلہ کی بنی ہاشم سے رقابت اور مخالفت کے لیے یہ حکایت بیان کی گئی ہے کہ امیّہ کا باپ عبدالشمس اور بنی ہاشم کے مورثِ اعلیٰ حضرت ہاشم یہ دونوں ماں کے پیٹ سے جڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ انگلی ایک کی دوسرے کی پیشانی سے چسپاں تھی۔ مجبوراً ان کو کاٹ کر الگ الگ کیا گیا جس سے خون بہنے لگا۔ اس وقت لوگوں نے اسے بدشگونی مان کر کہا کہ ان میں آپس میں خونریزیاں ہوتی رہیں گی[1] یہ حکایت درست ہو یا نہ ہو لیکن اس سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کی جنگ نے کتنی جڑ پکڑ لی تھی کہ لوگ اس کو ایک ناگزیر اور قدرتی چیز سمجھنے لگے تھے۔ مگر ہم جہاں تک تاریخ کے واقعات کی چھان بین کرتے ہیں ہمیں خود عبدالشمس اور ہاشم میں جنگ یا منازعت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بے شک عبدالشمس کے بعد امیّہ کی طرف سے مخاصمت کی ابتداء نظر آتی ہے جبکہ وہ حضرت ہاشم سے مقابلہ کی کوشش میں ناکام ہوا اور اس وقت سے اس نے ایک شکست خوردہ فریق کی طرح انتقامی تصادم کا سلسلہ جاری رکھا۔ واقعہ یہ تھا کہ مکّہ میں قحط پڑا جس میں قریش بہت تباہ حال ہو گئے۔ حضرت ہاشم شام کی جانب گئے اور وہاں انھوں نے بہت زیادہ مقدار میں آٹا فراہم کر کے اس کی روٹیاں پکوائیں اور انھیں اونٹوں پر بار کر کے مکہ لائے۔ ان روٹیوں کو انھوں نے چُورا کرایا اور ان اونٹوں کو نحر کر کے شوربا تیار کرایا اور بڑی بڑی دیگوں میں اُنڈلوا کر وہ تمام روٹیوں کا چُورا ان دیگوں میں ڈلوا دیا۔ اس کھانے کو عرب میں "ثرید" کہتے تھے۔ اس طرح انھوں نے تمام مکّہ کے لوگوں کو کھانے

---

[1] طبری، ج ۲ ص ۱۸۰۔

سے سیر کیا۔ اتفاق سے اس کے بعد ابر آیا، پانی برسا اور قحط سالی دور ہوگئی۔ ہر شخص کہنے لگا کہ اب کی پہلا بارانِ رحمت کا چھینٹا وہ تھا جو ہاشم کے ذریعہ سے برسا۔ "ہاشم" کے معنیٰ ہیں روٹیوں کا چورا کرنے والا۔ شاعروں نے اس واقعہ کو خاص الفاظ میں نظم کیا۔ ایک شاعر نے کہا ؎

عمرو الذی ھشم الثرید لقومہ　　قوم بمکۃ مسنتین عجاف

"عمرو (یہ ہاشم کا اصلی نام ہے) جنھوں نے اپنی قوم کے لیے روٹی کے ٹکڑے کرکے انھیں کھانا کھلایا، وہ قوم جو مکہ میں قحط سے بھوکی اور تباہ حال ہو رہی تھی۔"[1]

امیہ دولت مند آدمی تھا۔ اس نے جو دیکھا کہ حضرت ہاشم نے یہ کیا تو اسے حسد دامنگیر ہوا اور خواہ مخواہ بغرض مقابلہ اس نے بھی ہاشم کی نقل اتارنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوا اور یہ امر قریش میں اسکی رسوائی اور بدنامی کا باعث بن گیا۔ اس بارے میں ہاشم کا کوئی قصور نہیں تھا مگر لوگوں کے طعنوں تشنیعوں سے کھسیانے ہو کر وہ ہاشم کو برا بھلا کہنے لگا اور اس نے ہاشم کو "منافرت" کی دعوت دی۔ یہ ایک طرح کا مقابلہ عربوں میں رائج تھا کہ دو شخص اپنے اپنے کارناموں کو پیش کرکے کسی ثالث کو حکم بناتے تھے کہ وہ فیصلہ کردے کہ کون ان میں زیادہ صاحبِ فخر و لائقِ عظمت ہے۔ اس ثالثی کے لیے زیادہ تر کاہن منتخب کیے جاتے تھے جو علمِ قیافہ اور نجوم میں بڑے ماہر ہوتے تھے۔ حضرت ہاشم نے اپنی عمر کی بزرگی اور اپنے رتبہ کی بلندی کے لحاظ سے امیہ کے ساتھ مقابلہ سے انکار کیا مگر قریش کے عام افراد نے حضرت ہاشم کو مجبور کیا۔ آخر آپ بھی آمادہ ہوگئے اور کہا کہ میں اس شرط پر مقابلہ کرتا ہوں کہ شکست خوردہ فریق اپنے مقابل کو ۵۰ اونٹ سیاہ آنکھوں والے سپرد کرے جو سرزمینِ مکہ میں نحر کیے جائیں اور دس برس کے لیے وہ مکہ سے جلاوطن ہو جائے۔ امیہ اس شرط پر رضامند ہوگیا چنانچہ قبیلہ خزاعہ کے کاہن کو حکم مقرر کیا گیا۔ اس نے فیصلہ ہاشم کے حق میں اور امیہ کے خلاف دیا۔ حضرت ہاشم نے قرارداد کے مطابق ۵۰ اونٹ حاصل کیے اور انھیں نحر کرا کے پھر تمام اہلِ مکہ کی

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۸۵

دعوت کردی اور امیہ کو دس برس کے لیے مکہ سے جلاوطن ہونا پڑا اور وہ اس مدت تک شام میں قیام پذیر رہا۔ یہ پہلی عداوت تھی جو امیہ[1] کی اولاد میں بنی ہاشم کے مقابلہ میں نسل در نسل برقرار رہی۔ اس کے بعد ہاشم کے فرزند جناب عبدالمطلب اور امیہ کے فرزند حرب میں مقابلہ ہوا۔ اس طرح کہ جناب عبدالمطلب کے جوار میں ایک یہودی کا قیام تھا جس کا نام اذینہ تھا۔ اسے تجارت میں بہت ترقی ہوئی جس سے وہ بہت دولت مند ہو گیا تو حرب بن امیہ کو اس سے پرخاش ہو گئی۔ اس نے کچھ لوگوں کو آمادہ کر کے اسے قتل کرا دیا اور اس کا سامان لوٹوا دیا۔ جناب عبدالمطلب کو تحقیق سے قاتلوں کا پتہ چل گیا مگر یہ معلوم ہوا کہ حرب نے انھیں کہیں چھپا دیا ہے تو انھوں نے حرب کو سمجھایا کہ قاتلوں کو حوالہ کر دو لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوا بلکہ جناب عبدالمطلب سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں پھر نفیل کاہن کو ثالث بنایا گیا جس کے فیصلہ پر حرب کو یہ جرمانہ ادا کرنا پڑا کہ وہ سو اونٹنیاں جناب عبدالمطلب کے حوالے کرے جنھیں وہ اس مقتول یہودی کے وارث کو خون بہا کے طور پر دے دیں اور اس یہودی کا جو مال لوٹا گیا تھا وہ سب بھی واپس دلوایا گیا۔ چند چیزیں دستیاب نہیں ہوئیں تو ان کا تاوان حضرت عبدالمطلب نے اپنے مال سے ادا کیا۔[2] پے در پے شکست کھانے کے لازمی نتیجہ کے طور پر بنی امیہ عربی خون کی بہت سی لطافتیں کھوتے گئے اور ان میں دناءت، فریب، احساس کمتری اور دوسرے اسی طرح کے اوصاف پیدا ہوتے گئے جو مسلسل شکست کھانے والوں کی خاصیت ہوا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان عام افرادِ عرب کی نگاہوں میں اتنا تفرقہ پیدا ہوتا گیا کہ یہ چیز قابلِ غور بنگئی کہ یہ دونوں ایک ہی نسل کی دو شاخیں ہیں بھی یا نہیں۔

عرب قوم کے یہ تاثرات دیکھ کر بنی امیہ، بنی ہاشم کے خلاف ضربیں لگاتے تھے مگر ہر مرتبہ انھیں ناکامی ہی ہوتی تھی۔ حضرت محمد مصطفےٰؐ بھی اٹھے تو بنی ہاشم ہی کے یہاں سے۔ یہ آخری بڑی شکست تھی جسے بنی امیہ آسانی سے سہہ نہ سکتے تھے۔ شبلی نعمانی سیرۃ النبی جلد اوّل میں ص۵۵ پر لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی نبوت کو خاندان بنی امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرتؐ کی مخالفت کی۔"

---

[1] طبقات ابن سعد مطبوعہ لیدن (ہالینڈ) ج ا قسم ا ص۴۳ و ۴۴۔ طبری ج ۲ ص۱۸۰ [2] کامل ابن اثیر ط مصر ج ۲ ص۶

تیسرا باب

اِسلام اور اُس کا پیغام

ظہورِ اسلام سے قبل کا زمانہ "ایامِ جاہلیت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق یہ خیال درست نہیں ہے کہ عرب اس میں وحشت اور بربریت کے دور سے گزر رہے تھے اور تمدن و تہذیب سے واقف نہیں ہوئے تھے بلکہ جس طرح ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے لکھا ہے واقعہ یہ ہے کہ جنوبی عرب اسلام سے صدیوں قبل ایک بڑی تہذیب کا گہوارہ اور کاروبار تجارت کا ایک خوشحال مرکز تھا۔ حمیری بادشاہوں کے آثارِ قدیمہ، سدِ مارب، باغ شدّاد اور تختِ بلقیس ملکہ سبا وغیرہ کے تذکروں میں اس کا مکمل ثبوت موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایامِ جاہلیت کی شاعری جو کہ ادب کا بہترین نمونہ ہے اسی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایامِ جاہلیت کے عرب بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔ مثلاً بہادری، سخاوت، مہمان نوازی، وفاداری، شوہری محبت اور برادری اُنس وغیرہ۔ خلاصہ یہ کہ شاعری ان کے اخلاقیات کا دفتر ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شرافت کا کافی عنصر رکھتے تھے۔ ان کی شاعری بالخصوص ان میں سے چند کی، اس بات کو بھی ظاہر کر دے گی کہ اگرچہ وہ اس زمانے کے الہامی مذہب کو نہ ماننے کے باعث مشرک تھے اور بت پرستی بھی کیا کرتے تھے تاہم وہ مذہب کے خاص خاص عقائد سے بالکل ناواقف و بیگانہ نہ تھے۔ وہ اپنی بت پرستی کی یہ تاویل کرتے تھے کہ ان بتوں کے ذریعہ سے ہم خدائے واحد (اللہ) کی بارگاہ میں قرب حاصل کرتے ہیں۔ پھر یہ کہ عربوں کی ایک بڑی تعداد جناب اسمٰعیلؑ کی نسل سے تعلق رکھتی تھی اور یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے تعلیمات سے قطعاً بیگانہ ہو گئے ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمدنی حیثیت سے اسلام سے قبل کے زمانہ میں عرب کی جماعت ترقی کے بعد تنزل کی طرف جا رہی تھی۔ اب اس میں کچھ

عمدہ قدیم خوبیوں کا شائبہ تو موجود تھا لیکن زیادہ تر اس میں بری عادتیں داخل ہوگئی تھیں۔ وہ ہر سال مکہ میں بغرض حج جمع ہوتے تھے لیکن اس مقدس فرض کی اہمیت ان کے دلوں سے محو ہو چکی تھی۔ ان کے کاروان حجاز، عراق اور شام میں اب بھی اسباب سے لدے ہوئے جاتے تھے لیکن اب ان میں صنعت و تجارت کا جوش سرد ہو چکا تھا اور انتہائی غربت نے انھیں حریص بنا دیا تھا۔ ان میں اللہ کا ایک دھندلا اور مدھم تصور موجود تھا لیکن ان کے بُت ان کے نزدیک زیادہ مقدس تھے۔ وہ صلح پسند اور مطمئن زندگی کے فوائد سے واقف تھے اور جنگ سے متنفر رہنا چاہتے تھے جسے وہ "شعلہ در آگ" یا اس منحوس جانور سے جس کے یہاں کثرت سے توام بچے پیدا ہوتے ہیں تشبیہہ دیا کرتے تھے لیکن انکی خود غرضی اور غربت ان کو آمادہ کرتی تھی کہ وہ اپنے ہمسایہ کے مال پر دست تطاول دراز کریں۔ وہ اپنے مُردوں کا خوب ماتم کرتے تھے لیکن انتقام کشی سے اپنے کو باز نہ رکھ سکتے تھے نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ نسلاً بعد نسلٍ برابر خونریز جنگیں جاری رہتی تھیں۔ وہ اپنے بچوں سے محبت کرتے تھے، اس لیے کہ وہ ان کے جگر کے ٹکڑے ہیں جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں لیکن ان ہی میں سے بعض کو اپنی عزت کا اتنا پاس رہتا تھا کہ وہ اس خیال کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی لڑکیاں کسی ظالم بھائی یا چچا کی کنیزی میں چلی جائیں یا اُن کے رحم و کرم پر پڑ جائیں اور اس لیے وہ ان کی ہلاکت کو اپنی عزت کے برقرار رکھنے کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے۔"

یہی حالت وہ ہوتی ہے جس کی اصلاح نہایت دشوار ہے کیونکہ دورِ بربریت و وحشت سے گزرتی ہوئی قومیں سادہ لوح ہوتی ہیں۔ ان کے دلوں پر جیسا نقش بٹھلایا جائے وہ آسانی سے اتر آتا ہے اس لیے کہ اس کے خلاف کوئی نقش جما ہوا نہیں ہے مگر عربوں کی تمدنی خرابیاں وہ تھیں جو خالص مادی ساخت کے تمدن اور ہوسِ اقتدار کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انھوں نے عربوں کی افتادِ طبع کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔

احساسِ برتری قومیت سے منتقل ہو کر جب انفرادیت کی طرف آتا ہے تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے باہمی رقابت اور آپس کی خانہ جنگی۔ یہ بات عربوں میں انتہا درجہ پر پہنچ گئی تھی۔ پھر اسی کا نتیجہ

تھا کہ مساواتِ انسانی کوئی چیز نہ رہی تھی اور غلبۂ طاقت اور اقتدار سب کچھ تھا۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اس کے قاتل کو قتل نہ کیا جاتا تھا بلکہ اس کے قبیلہ کے سینکڑوں بے گناہ آدمیوں کو مار ڈالا جاتا۔ تب کہیں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے خون کا بدلہ ہُوا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہوتا تھا تو اس کا خون قصاص کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدنی گناہوں کا سرچشمہ تھی اور انسانیت کے پرخچے اڑا رہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مادیت کو سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ ماوراء المادہ کا تخیل باقی نہ رہا تھا اس لیے مادی طاقت ہی کی بنا پر وہ امتیازات قائم کرتے تھے۔ یہی حالت کم و بیش عرب کے علاوہ دوسرے ملکوں کی بھی تھی۔

مذہبی حیثیت سے عرب نہایت پستی میں تھے۔ ان میں کوئی ایک مذہب مشترک نہ تھا بلکہ وہاں متعدد مذاہب کے افراد رہتے تھے اور بڑی جماعت بُت پرستی اور ستاروں کی پرستش کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھی چنانچہ کعبہ ہی میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بُت رکھے ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کی پرستش سال کے ایک ایک دن کی جاتی تھی کیونکہ عربی سال ۳۶۰ ہی دنوں کا ہوتا ہے۔ جو مذہب رائج تھے جیسے یہود، مجوس اور نصاریٰ وہ بھی پستی کی طرف مائل نظر آ رہے تھے۔ اعمالِ ناشائستہ، دوسری جماعتوں سے نفرت، رواداری کا مفقود ہونا، آپس کی خونریزی اور ایسی ہی بہت سی خرابیاں ان میں واضح طور پر موجود تھیں اور اس لیے فطرتِ انسانی کسی ایسی منتخب ہستی کی خواہاں تھی جو دنیا کو اس مصیبت سے نجات دلائے۔

ایسے وقت میں محمدؐ بن عبداللہ اسلام کا زلزلہ افگن پیغامِ انقلاب لے کر دنیا کے سامنے آ گئے اور مردہ انسانیت کو زندگی کا مژدہ سنایا جیسا کہ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے لکھا ہے "حضرتؐ کا کام یقیناً دشوار تھا اس لیے کہ آپ محض وحشی لوگوں کو متمدن نہیں بنا رہے تھے بلکہ بگڑی ہوئی سماجی کیفیت کو سُدھارنا چاہتے تھے۔ آپ کا کام ان تمام عقائد و توہمات، روایات و مراسم کا عربوں کے دلوں سے محو کرنا تھا جو اُن کی زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکی تھی۔ رسولؐ ان لوگوں کو بردباری،

خاکساری، پاکبازی اور عفو کا سبق پڑھانا چاہتے تھے۔ جن کے نزدیک معاف کر دینا کمزوری کی دلیل اور انتقام نہ لینا ذلت اور بزدلی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ رسولؐ ان لوگوں کو مساوات اور اخوت کی تعلیم دینا چاہتے تھے جو کہ اپنے خاندانی شرف پر فخر کیا کرتے تھے اور اپنے آباؤ اجداد کے پورے شجرہ کو نہایت سختی کے ساتھ محفوظ رکھا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اسلام کو عربوں کے اور بہت سے دوسرے رجحانات سے برسرپیکار ہونا پڑا۔ مثلاً اس نے شراب کی ممانعت کر دی جس کے وہ عادی ہو چکے تھے اور جس کا استعمال وہ سخاوت کی دلیل سمجھتے تھے۔ اس نے قمار بازی بند کر دی جو کہ عربوں کے نزدیک بذل وجود کی ایک قطعی علامت تھی اور بہت سی مخرب اخلاق عادتوں کو ممنوع قرار دیا۔ عرب اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ سب سے زیادہ مقدس انسان کیونکر خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ معزز ہو سکتا ہے یا اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی پست انسان کیونکر عرب کے شریف ترین خاندانوں کے اشخاص سے برتری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔"

خواجہ غلام السیدین صاحب نے اسے بہت اچھے لفظوں میں لکھا ہے کہ "اسلام ایک ایسی دنیا کے لیے جو پجاریوں کے قبضۂ اقتدار اور دولتمندوں کے زیر حکومت مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی، پیغام آزادی لے آیا۔ آزادی پجاریوں کی قید سے جو عبد و معبود کے درمیان واسطہ بننے کے دعویدار تھے آزادی گروہ اُمرا کی حکومت سے جو نہ کسی خدائی قانون کی پروا کرتے تھے اور نہ کسی انسانی قانون کی، بلکہ بغیر روک ٹوک کے حریصانہ طریقوں پر دوسروں کی محنت و مشقت کے پھلوں سے خود لطف اندوز ہو رہے تھے، آزادی غلاموں اور نیچ ذاتوں کے لیے ان کے مالکوں کے مظالم اور خلافِ انسانیت بے رحمانہ سلوک سے، آزادی طبقۂ نسواں کے لیے اس عملی غلامی سے جس میں وہ انسانی حقوق کے ابتدائی منازل سے بھی محروم کر دی گئی تھیں، آزادی عام انسانوں کے لیے ان قیود سے جن میں وہ ذات پات، رنگ اور قوم کی تنگ نظری کی بندشوں میں مبتلا تھے جس سے ان کی حیاتِ اجتماعی فنا ہو رہی تھی اور وہ متخاصمین کے گروہ میں منقسم ہو رہے تھے گروہِ انسانی اس طرح اپنی خود ساختہ ظالمانہ قیدوں میں مقید ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے مشہور شاعر اور فلسفوف

اقبال نے اس منظر کی تصویر کشی ذیل کے اشعار میں کی ہے ؎

بود انساں در جہاں انساں پرست ۔۔۔ ناکس و نابود ماند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش ۔۔۔ بندہا در دست و پاؤ گردنش
کاہن و سلطان و پاپاؤ امیر ۔۔۔ بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ ۔۔۔ نغمہ ہا اندر نیِ او خوں شدہ

اسلام نے اسے ایک پیغامِ آزادی سنایا۔ حریت و مساوات اور انسانی برادری کی تلقین کی اور تواریخ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا کیے جس سے وہ بہ سبب قومیت، رنگ یا جنس کے یا بہ سبب غربت و فلاکت کے محروم تھے۔ غرباء مظلوم اور عام انسانوں کے عام طبقہ کو جو اب تک بڑی بیدردی سے پیسا جا رہا تھا، نئی امیدوں اور اپنے کارآمد ہونے کا نیا احساس عطا کیا ؎

تا بہ حق بہ حق داراں سپرد ۔۔۔ بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
اعتبارِ کار بنداں را فزود ۔۔۔ خواجگی از کار فرمایاں ربود
قوت او ہر کہن پیکر شکست ۔۔۔ نوعِ انساں را حصارے تازہ بست
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید ۔۔۔ بندہ را باز از خداوندان خرید
حریت زاد از ضمیرِ پاک او ۔۔۔ ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او
ناشکیبِ امتیازات آمدہ ۔۔۔ در نہاد او مساوات آمدہ
عصرِ نو کیں صد چراغ آوردہ است ۔۔۔ چشم در آغوشِ او وا کردہ است

یہ قیمتی خیالات تھے جن کو اسلام عربوں کی زندگی میں داخل کرنا چاہتا تھا اور عربوں کی وساطت سے تمام انسانوں میں پہنچانا چاہتا تھا۔"

اسلام نے اس ذہنی انقلاب کے پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے اصلی سبب کو دور کرتے ہوئے لوگوں کی نگاہ کو مادیت کے احاطہ سے نکال کر ایک غیبی طاقت کی جانب متوجہ کیا جس کے

لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے سوا مساوات قائم کرنے کے لیے دولت کو برابر تقسیم کر دیا جائے لیکن بازوؤں کی طاقت، موروثی وجاہت، قوم و قبیلہ کی تقسیم کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اسلام جانتا تھا کہ خارجی مساوات ممکن نہیں اس لیے اس نے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اس ذہنی تبدیلی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان کو برابر سمجھے۔ اس نے صحیح طور پر سمجھا کہ برادری اور برابری کی اصل کنجی کیا ہے؟ احساس اخوت و مساوات کی واحد بنیاد یہ ہے کہ جب کوئی کثرت کسی وحدت کی طرف مستند ہو جائے گی تو اس کے اجزاء میں برادری اور برابری کا احساس پیدا ہو جانا فطری ہے۔ دو بھائی کیوں ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا دعویٰ رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک باپ کے بیٹے ہیں، ایک خاندان کے آدمی کیوں آپس میں برادری اور برابری کا تصور رکھتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک مورثِ اعلیٰ کی نسل سے ہیں۔ ایک ملک کے لوگ آپس میں کیوں رابطۂ اخوت محسوس کرتے ہیں اور کیوں حقوق میں برابری کے طالب ہوتے ہیں؟ اس لیے کہ ایک سرزمین کے باشندہ ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مشرق والے آپس میں یگانگی اور مغرب والے آپس میں یکجہتی کیوں محسوس کرتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ آفتاب کے لحاظ سے ایک سمت کے رہنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کثیر افراد میں اتحاد و مساوات کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ صرف وہ ایک وسیع نقطۂ واحد ہے جس کی طرف زیادہ سے زیادہ افراد یکساں طور پر منسوب ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کلیہ یہ ہوا کہ جب کوئی کثرت وحدت کی طرف منسوب ہو تو اس کے اندر برابری اور برادری کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مذکورہ بالا اتحادوں میں سے ہر اتحاد افتراق کا پیش خیمہ قرار پایا۔ یعنی جب ایک باپ کے بیٹوں میں ایکا پیدا ہوا تو دوسرے باپ کے بیٹوں کے سامنے محاذ قائم ہوا اور جب ایک خاندان کے لوگوں میں ایکا قائم ہوا تو دوسرے خاندان والوں کے سامنے محاذ قائم ہوا جس کا نتیجہ ہوا کرتا ہے قوموں کی جنگ اور ممالک کا باہمی تصادم اور فتح و شکست کا غیر متناہی سلسلہ، جس کے کرشمے آج بھی نظر آ رہے ہیں اور جب ایک سمت والوں میں اتحاد ہوا تو دوسری سمت والوں کے سامنے محاذ قائم

ہوا۔ یہاں تک کہ یورپ والے ایک الگ قوم بن گئے اور ایشیا والے ایک الگ قوم اور جب اس کے ساتھ رنگ کے اتحاد نے اثر دکھایا تو گوروں اور کالوں کا ایسا افتراق پیدا ہوا کہ گوروں نے کالوں کو اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں کھانا کھانے سے روکا بلکہ ایک عبادت گاہ میں عبادت کے لیے ایک ہی مذہب والوں کے لیے جمع ہونا تک ممنوع قرار دیا۔ یہ سب نتیجہ تھا اس کا کہ اتحاد کی دیواریں عالم انسانیت کے بیچ میں اٹھائی گئی تھیں اس لیے ہر دیوار جو اٹھی اس نے ادھر والوں کو تو متحد کیا اور اُدھر والوں کو جدا کر دیا۔ اسلام نے اس اصل اصول کو لیتے ہوئے کہ اتحادِ افراد کا راز اتحادِ مرکزی میں مضمر ہے، ضرورت سمجھی کہ ان تمام درمیانی دیواروں کو ڈھا دیا جائے اور بیچ کے ان تمام خطوط کو مٹا کر ان کی بجائے ایک وسیع احاطہ ایسا قائم کیا جائے جہاں نسل، رنگ، ملک اور قومیت کسی چیز کی تفریق نہ ہو۔ وہ احاطہ ایسا ہو جو تمام عالم انسانی کو اپنے گھیرے میں لے لے اور چونکہ اس احاطہ کے باہر پھر کچھ رہ نہیں جائے گا اس لیے افتراق و امتیاز کا سوال ہی نہ پیدا ہو سکے گا۔ اس کے لیے کوئی مادّی چیز نقطۂ مرکزی نہیں بن سکتی تھی کیونکہ جو مادّی شے ہوگی وہ محدود ہوگی اور محدود ہونے کے ساتھ اس میں قرب و بعد نیز کمی اور زیادتی کے مدارج پیدا ہوں گے اس لیے ضرورت تھی کہ نگاہ کو تمام مادی چیزوں سے ہٹا کر اس غیر مادّی بلند و بالا تر طاقت کی طرف موڑ دیا جائے جہاں حدود و اقدار قائم نہیں ہوتے۔ اس کا سب کے ساتھ یکساں تعلق ہے جو سب کا ہے اور سب اس کے ہیں۔ یہ خالق کی ذات ہے جسے اسلام نے معبودِ برحق اور خدائے کُل ثابت کرتے ہوئے سب کا قبلۂ مقصد قرار دے دیا ہے۔

اس احساس کے پیدا ہونے کے ساتھ کہ سب خدا کے بندے ہیں۔ افرادِ انسانی میں احساس اخوّت و مساوات پیدا ہونا لازمی ہے۔ جب ایک باپ کے بیٹے آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک مورثِ اعلیٰ کی اولاد میں برادری قائم ہو جاتی ہے اور ایک سرزمین کے رہنے والے اپنی مادرِ وطن کے لحاظ سے آپس میں اخوّت محسوس کرتے ہیں اور ایک سمت کے رہنے والے اپنے میں یکجہتی کا تصور کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ایک خالق کے بندے سب آپس میں بھائی بھائی نہ بن

جائیں، یہ تھا وہ عملی سبق جو اسلام کی توحید میں مضمر تھا۔

بعض مذاہب نے خالق کے تخیل میں بھی مغائرت برتی تھی۔ انھوں نے خدا کو اپنا قرار دے لیا تھا اور یہ کہتے تھے کہ ہم اس کے بیٹے ہیں۔ اسلام نے ان لوگوں کے خیال یا زعم کا ذکر کرتے ہوئے ایک طنزیہ انداز میں اس کی مخالفت کی اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو یہ تلقین نہیں کیا کہ تم ہی اللہ کے سپوت ہو اور بس، بلکہ مسلمانوں کو اقوامِ عالم کے مقابلہ میں یہ کہنے کی تعلیم دی کہ ھو ربّنا و ربّکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم (یعنی) وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، اس طرح اسلام نے سب کو مساوات کا درجہ دیتے ہوئے ایک معیارِ امتیاز کا بھی قائم کر دیا اور وہ انسانی کردار ہے۔ اب سابق کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات مٹ کر ایک نیا معیارِ امتیاز کا قائم ہو گیا اور وہ یہ کہ جو شخص فرائضِ انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔ (انّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اس اصول کے ماتحت غلبہ، طاقت، اقتدار، قوم و قبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہ رہیں بلکہ یہ اصول قائم ہو گیا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان پر فقط احساسِ فرائض کی بنا پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے ماتحت اخلاق پر بہت زور دیا گیا۔ یہاں تک کہ بانیٔ اسلام نے اپنا مقصدِ رسالت ہی یہ قرار دیا اور اعلان کیا انّما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ دوسری لفظوں میں انّما بعثت لاتمّم حسن الاخلاق یعنی "میری بعثت محض انسان سدھارنے اور اچھے اخلاق کی تکمیل کی غرض سے ہے"[1] مسلمانوں سے صاف کہہ دیا گیا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ تمھیں تمھارے اعمال کی سزا نہ ملیگی بلکہ جو جیسے اعمال کرے گا ویسا ہی پائے گا۔ مسلمان وہ ہے جو احکامِ خدا کے آگے سرنگوں ہو جائے۔ سرکشی مسلم کی شان نہیں ہے۔ تم اللہ کے دوست جب ہی کہلائے جا سکتے ہو جب اس کے احکام کی تعمیل کرو ورنہ اس کی رحمت کے حقدار نہیں اور نہ امتِ مرحومہ میں شامل ہونیکے قابل۔

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۱۳۲

معاشرت کے باب میں اس بات پر زور دیا گیا کہ سب انسان ذات اور اصلیت کے لحاظ سے ایک ہی ہیں (خلقکم من نفس واحدۃ)[۱] قبائل اور اقوام میں ان کی تقسیم صرف تعارف اور شناخت کے لیے ہے (وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا)[۲] مگر فضیلت و بلندی کا تعلق ذات اور قومیت سے بالکل نہیں ہے۔ لا فخر للقرشی علیٰ غیر القرشی ولا للعربی علیٰ غیر العربی[۳]۔ فضیلت و بزرگی صرف پرہیزگاری اور تقویٰ یعنی انسانی اعمال اور فرائض کی بجاآوری کے ساتھ وابستہ ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم)[۴] اس کو پیغمبر نے صرف قولاً نہیں بلکہ عملاً بھی دکھایا۔ آپ نے اپنا مؤذن بلال حبشی کو قرار دیا اور جب کسی نے اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا "یہ کالے رنگ کا غلام بھی بھلا اس قابل ہے کہ اذان دے"! تو قرآن کی آیت اتری (یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر وانثیٰ) یعنی سب آدمی یکساں ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں[۵] جیسا کہ عبدالحامد صاحب بدایونی نے کہا ہے "اسلام دراصل حکومت الٰہیہ کا قیام چاہتا ہے۔ اسلامی حکومت کا دارومدار عدل و انصاف قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس بارے میں فرمایا ہے۔ واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ (سورۂ نساء) ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ واتقوا اللہ (مائدہ) یعنی اگر تو غیر مسلمین کے بارے میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر۔ بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اسلامی قانون میں شاہ و گدا یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ لیس لاحد علیٰ احد فضل الا بدین وتقویٰ (مشکوٰۃ) اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام میں سیاست حصول اقتدار کے کامیاب ذرائع کے

---

[۱] اس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا۔ [۲] ہم نے تمھیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے قرار دیا ہے کہ آپس میں شناسائی پیدا ہو۔ [۳] قرشی کو غیر قرشی اور عرب کو غیر عرب پر کوئی فخر نہیں۔ [۴] تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ [۵] اتقان سیوطی مطبوعہ دہلی ص ۱۴۸

استعمال" کا نام نہیں ہے بلکہ سیاست ملک و ملت کے صحیح نظم و ضبط اور امورِ خلق کے بہترین طریقہ پر چلانے کا نام ہے۔ اس لحاظ سے سیاسی حکومت مذہبی قیادت سے الگ نہیں ہو سکتی اور اس کی مثال خود حضرت پیغمبرؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

مگر یاد رکھنے کی بات ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰؐ نے اس مکمل اقتدار کے باوجود جس کے ماتحت اعلان کر دیا گیا کہ "ان کو ہر شخص پر خود اس کی ذات سے زیادہ حق اور اختیار ہے" کبھی اپنے کو بادشاہ کہا یا سمجھا جانا پسند نہیں کیا بلکہ اس سے انکار فرمایا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جوں ہی آپ کے سامنے کھڑا ہوا رعب سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا۔ "اپنے آپے میں آؤ۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو ایک قرشی عورت کا بیٹا ہوں، جو شوربے میں روٹی بھگو کر (غریبانہ کھانا) کھاتی تھی۔"[1]

یہ اس لیے تھا کہ مسلمانوں میں شریعتِ الٰہیہ کی رہبری سے الگ حکمران کا تخیل پیدا نہ ہو اور سوائے خداوندی اقتدار کے کسی اقتدار کے آگے مسلمانوں کی گردنیں نہ جھکیں۔

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۱ قسم ۱ ص ۴

چوتھا باب

اسلام کا مزاحم طاقتوں سے تصادم

جہاں تک کہ آئین اور نظام کی تشکیل کا تعلق ہے پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی میں یہ مقصد حاصل ہو گیا اور لاکھوں آدمی اس کے تسلیم کرنے والے اور اس کو حق کہنے والے ہو گئے اور یہ ایک انقلاب کی کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔ مگر اس انقلاب پیدا کرنے میں رسولؐ کو کتنی دقتیں درپیش ہوئیں اور کن طاقتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ یوں تو کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو جذبات کے لحاظ سے ہر قدیم شے کے ساتھ الفت رکھتے ہیں اس لیے انھیں ہر انقلاب کے محرک سے "بُغضِ للّٰہی" ہوتا ہے۔ بغضِ للّٰہی کا مطلب یہ ہے کہ چاہے اس انقلاب کا ان کی ذات سے کوئی تعلق نہ ہو اور انھیں اس سے کوئی نقصان بھی نہ پہنچتا ہو مگر وہ انقلاب سے صرف اس لیے دشمنی رکھتے ہیں کہ وہ انقلاب ہے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے خود غرضانہ مفاد قدیم رسم و رواج کے ساتھ وابستہ ہیں اور انھیں اس انقلاب سے اپنے منافع کا خون ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔ چنانچہ اسلام جو انقلاب لے کر آیا تھا اور اس نے زندگی کے ہر شعبہ میں جو تبدیلیاں کر دی تھیں ان سے بہت سی قسم کے لوگوں کو ذاتی نقصانات پہنچ رہے تھے۔ یہ نقصانات مالی بھی تھے اور وجاہت و اقتدار کے بھی۔ مثال کے طور پر اسلام کی معاشی تعلیم کہ سود خواری ممنوع ہے، اس سے کیا تمام عرب کے ان مہاجنوں کا دیوالہ نہیں نکل گیا۔ جن کی زندگی ہی حاجت مند مخلوق کا خون چوس کر اپنی ہوسِ دولت مندی کے پورا کرنے پر تھی۔ پھر اگر صرف یہ ہوتا کہ سود لو نہیں تو یہ ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام نہ قبول کر کے اپنے کو اس حکم کی پابندی سے محفوظ رکھتے مگر وہاں تو یہ تھا کہ نہ سود لو اور نہ سود دو۔ ظاہر ہے کہ سود دینا کام ہوتا ہے کم حیثیت ہی لوگوں کا جو مقناطیسی کشش کے ساتھ اسلام کے غریب پرور تعلیمات کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔ اب اگر سرمایہ دار خود اسلام نہ بھی قبول کریں تو کیا فائدہ، جب ان کی زندگی کا دار و مدار ان

لوگوں کے روپیہ پر تھا۔ انھوں نے اسلامی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور وہ اب ایک پیسہ سود کے نام سے دینے پر تیار نہیں۔ اس کے علاوہ اسلام کی یہ تعلیم کہ افراد انسانی میں امتیاز صرف اخلاق حسنہ و فرائض الٰہیہ کی بنا پر ہے۔ دوسری کسی حیثیت سے فضیلت و تفوق حاصل نہیں ہو سکتا ان لوگوں کے اقتدار پر کاری ضرب تھی جو اس کے پہلے نسلی تفوق یا مال و دولت یا قوم و قبیلہ کی کثرت کی بناء پر غلبہ و اقتدار کی جائیداد پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ اسلام نے نظریۂ تفوق و امتیاز بدل کر اس ملکیت میں داخل خارج کر دیا۔ اس طرح کے صاحبانِ اقتدار جتنے تھے وہ چونکہ اسلامی معیارِ عزت کے لحاظ سے صفر کا درجہ رکھتے تھے اس لیے وہ کچھ نہ رہے اور جو لوگ پردیسی یا محتاج یا ان لوگوں کی نظر میں نیچ ذات ہونے کی وجہ سے نگاہ اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہ سمجھے جاتے تھے وہ بڑے صاحبِ عزت ہو گئے۔ اس لیے کہ وہ عمل کی کسوٹی پر پورے اُترتے تھے اور پرہیزگاری اور تقویٰ میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ یہ بات ان لوگوں کو ٹھنڈے دل سے کیونکر گوارا ہو سکتی تھی جو اب تک عزت کی مسندوں پر اطمینان کے ساتھ براج رہے تھے اور جو خلق خدا کو خدا کے بدلے خود اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔

بنی امیّہ کے لیے ان تمام محرکات کے علاوہ ان کی دیرینہ مخاصمت بنی ہاشم کے ساتھ اور ذاتی رشک و حسد بھی تھا جس کے ماتحت ان کے سرگروہ ابوسفیان نے تقریباً تمام عرب کو حضرت محمد مصطفےٰ ؐ کے خلاف برانگیختہ کر دیا۔

آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں۔ جسم پر پتھر مارے گئے۔ سر پر کوڑا پھینکا گیا۔ نجاستیں ڈالی گئیں اور قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ یہاں تک کہ جب خطرہ بہت بڑھ گیا تو حضرت کے چچا ابوطالبؑ نے آپ کو اپنے ایک محفوظ مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک قلعہ کی صورت پر تھا منتقل کر دیا۔ تمام قریش نے باہم ایک تحریری معاہدہ کیا کہ بنی ہاشم سے نہ صرف شادی بیاہ ترک کر دیا جائے بلکہ ان کے ساتھ خرید و فروخت بھی نہ کی جائے گی۔ اس کے ماتحت محصورین تک ضروریاتِ زندگی پانی اور کھانا تک پہنچنا تقریباً غیر ممکن بنا دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ بعثت کے ساتویں سال کا ہے جو چار

برس تک قائم رہا۔ چار برس کی طویل مدت کے بعد یہ ترکِ موالات ختم ہوا اور یہ لوگ قلعہ سے باہر نکلے۔ اب کچھ دن تک مخالفتیں ٹھنڈی رہیں مگر پھر ایک ہی سال کے اندر ابوطالب اور خدیجہ دونوں کی وفات[1] کے بعد اس مخالفت نے انتہائی زور پکڑا، یہاں تک کہ اہلِ مدینہ تک اسلام کی روشنی پھیلی اور انھوں نے آپ کو مدینہ کی طرف تشریف لے جانے کی دعوت دی اور آپ نے بہت سے مسلمانوں کو وہاں بھیج دیا۔ تو اب مشرکین نے آپ کو قتل کر دینے کا پورا منصوبہ تیار کر لیا جس کے بعد آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

مدینہ میں آکر بھی مخالفین نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ایک طرف تو ان لوگوں کو جو آپ پر ایمان لائے تھے اور مجبوراً مکہ میں رہ گئے تھے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جاتیں۔ دوسری طرف آپ کے بجائے پناہ مدینہ منورہ پر فوج کشی کے انتظامات ہونے لگے۔ آپ کو اپنی حفاظت اور اپنے سے زیادہ ان لوگوں کے گھر بار کی حفاظت کے لیے جنھوں نے آپ کو پناہ دی تھی میدانِ مقابلہ میں نکل آنا پڑا۔

سب سے پہلی جنگ جو مدینہ میں آکر ہوئی بدر کی لڑائی تھی۔ اس موقع پر مسلمان بالکل تیار نہ تھے۔ صرف تین سو تیرہ آدمی[2] جن کے پاس سوار ہونے کو صرف تین گھوڑے تھے[3] اور چند تلواریں۔ مگر بنی ہاشم کی تلوار نے مقابل والوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ حمزہ بن عبدالمطلب، عبیدہ بن حارث اور علی بن ابیطالب نے وہ کارہائے نمایاں دکھلائے کہ مخالفوں کی ہمت پست ہو گئی۔ اگرچہ اسلام کو بالخصوص بنی ہاشم کو یہ بڑا نقصان پہنچا کہ عبیدہ اس جنگ میں شہید ہو گئے مگر مکہ والوں کو اور بالخصوص بنی امیہ کو بہت زیادہ نقصانات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس میں ابوسفیان کو علی بن ابیطالب کے ہاتھ سے محض اپنے بیٹے حنظلہ کے قتل ہی پر ماتم کرنا نہیں پڑا[4] بلکہ آپ نے اس کے ایک دوسرے بیٹے عمرو کو قید بھی کیا[5]۔ اس کے علاوہ اس کی بیوی ہند کو اپنے باپ عتبہ اور اپنے چچا شیبہ اور بھائی ولید کا ماتم کرنا[6]

---

[1] طبری، ج ۲ ص ۲۲۹۔ [2] طبری، ج ۲ ص ۲۷۲ [3] ابن ہشام ج ۱ ص ۴۰۷ [4] ارشاد ص ۳۸
[5] ابن ہشام، ج ۱ ص ۳۹۷ [6] ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷، طبری ج ۲ ص ۲۷۹

پڑا۔ اس کے بعد ابوسفیان نے عہد کیا کہ وہ اس وقت تک نہائے گا نہیں جب تک کہ رسول ؐ پر چڑھائی نہ کرے۔ مگر اب مشرکین میں عام طور پر مقابلہ کی ہمت نہ تھی۔ مجبوراً ابوسفیان نے صرف برائے نام اپنی قسم کو پورا کرنے کے لیے دوسو سوار قریش کے اکٹھا کیے اور ان کو لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ مدینہ کے حدود میں پہنچ کر اس نے رسول ؐ کے دو پیروؤں کو قتل کر ڈالا اور کھجور کے درختوں کو تباہ کر دیا۔ حضرت ؐ مع اپنے پیروؤں کے جنگ کے لیے نکل آئے مگر ابوسفیان مع اپنے ساتھیوں کے خوف کھا کر پہلے ہی فرار ہو چکا تھا اور سب بھاگنے کی جلدی میں اپنے سامان کے گٹھڑوں کو راستے میں پھینکتے گئے تھے۔ اس میں زیادہ تر ستو بندھے ہوئے تھے جو مسلمانوں کو حاصل ہوئے۔ اسی وجہ سے اس کو "جنگِ سویق" کہتے ہیں کیونکہ عربی میں سویق کے معنی ستو کے ہیں۔[1]

ہجرت کے تیسرے سال وہ نہایت اہم لڑائی پیش آئی جس کو اُحُد کی جنگ کہتے ہیں۔[2] عکرمہ بن ابی جہل، ابوسفیان اور ہند کو اس وقت تک چین کہاں آسکتا تھا جب تک کہ وہ مدینہ والوں سے انتقام نہ لیتے۔ مکہ والوں نے بڑی بڑی تیاریاں کی تھیں۔ ان کی فوج میں قریشیوں کے علاوہ خاندان کنانہ اور باشندگانِ تہامہ بھی شامل تھے۔[3] فوج میں تین ہزار مسلح سپاہی تھے۔[4] جن میں سات سو زرہ پوش تھے۔ ان کے بالمقابل رسولِ خدا کے ساتھ سات سو آدمی تھے جن میں صرف سو زرہ پوش تھے اور فوج میں فقط دو گھوڑے تھے۔[5] عکرمہ اور خالد بن ولید دونوں فوج کے افسر تھے اور خاص بات یہ تھی کہ فوج کے عقب میں ابوسفیان کی بیوی ہند مکہ کی دوسری عورتوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں ڈھول بجا بجا کر سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ ہند کے اشعار اس موقع کے جو وہ پڑھ رہی تھی کتبِ تاریخ میں محفوظ ہیں۔[6]

ہند کے انتقامی جذبات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُحد کی جنگ میں جب رسول ؐ کے چچا حضرت حمزہ شہید ہوئے تو ہند جذبۂ انتقام میں اپنی صنف بلکہ انسانیت کی حدود سے گزر گئی۔ اس نے اس بربریت

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۵۵ طبری ج ۲ ص ۲۹۹۔ [2] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۵ [3] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۸
[4] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۹ [5] طبری ج ۳ ص ۱۲ [6] طبری ج ۳ ص ۱۵-۱۶

کا ثبوت دیا کہ جناب حمزہ کا پہلو چاک کرا کے ان کا جگر نکلوایا اور اسے منہ میں رکھ کر چبانے کی کوشش کی۔ اور کشتوں کے کان اور ناک وغیرہ اعضائے جسم کا گلوبند اور سینہ بند بنایا[1]۔ بلکہ بعض راویوں نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ اس نے حضرت حمزہ کے جگر کو بھون کر کھا لیا[2]۔ اس سے اُس عناد اور دشمنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اس خاندان کے مردوں اور عورتوں کے دل میں بنی ہاشم، پیغمبرِ اسلام اور اسلام کے خلاف پایا جاتا تھا۔

اس جنگ میں اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی جماعت میں بڑی ابتری پیدا ہو گئی تھی مگر آخر میں بنی ہاشم اور بالخصوص علیؑ بن ابیطالبؑ کی تلوار نے مخالف جماعت کو شکست دی اور وہ ہزیمت خوردہ صورت میں واپس گئی۔ اب ان کی انفرادی طاقت رسولؐ کے مقابلہ میں ناکافی ثابت ہو چکی تھی۔ اس لیے ۵ھ میں آخری کوشش انھوں نے یہ کی کہ جتنی جماعتیں ملک عرب میں اسلام کے خلاف ان کو مل سکتی تھیں سب کو متحد کیا۔ یہاں تک کہ یہود کو ساز باز کر کے اپنے ساتھ ملایا اور اجتماعی طاقت سے دس ہزار کے لشکر کے ساتھ وہ اس جنگ کے لیے آئے جس کو اسی جتھہ بندی کی وجہ سے "جنگِ احزاب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں مسلمان تین ہزار تھے مگر فوجِ مخالف کو اس مرتبہ بھی شکست کا روزِ بد دیکھنا نصیب ہوا اور ان کا مایہ ناز سورما عمروؔ بن عبدوُد ابن ابی قیس عامری، علیؑ بن ابیطالبؑ کے ہاتھ سے تلوار کے گھاٹ اترا[3]۔ ابوسفیان کو باحالِ خستہ و تباہ مکہ واپس جانا پڑا اور اب ہمتِ مقابلہ و لشکر کشی ختم ہو گئی مگر دل میں ان شکستوں سے جو گھاؤ پڑے تھے وہ کبھی بھی بھر نہ سکتے تھے۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے جب کچھ عرصہ تک یہ دیکھا کہ اب مشرکینِ قریش کی طرف سے کوئی جنگی کارروائی نہیں ہوتی تو آپ نے ۶ھ میں خانہ کعبہ کی زیارت (عمرہ) کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے[4]۔ آپ کے پاس بدنے (قربانی کے اونٹ) تھے[5] جس سے ظاہر تھا کہ آپ لڑائی کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔ مگر جب قریش کو رسولؐ کے آنے کی خبر پہنچی تو وہ خالد بن ولید کی قیادت میں کراع الغمیم"

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۴ طبری ج ۳ ص ۲۳ [2] استیعاب ج ۲ ص ۴۸۶ طبری ج ۳ ص ۴۳ [3] ابن ہشام ج ۲ ص ۱۵۵
[4] ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۲ طبری ج ۳ ص ۴۸ [5] ابن ہشام ج ۱۲ ص ۲۱۰ طبری ج ۳ ص ۷۱ [6] طبری ج ۳ ص ۷۲

مقام تک رسولؐ کا راستہ روکنے کے لیے نکل آئے۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی ہمتیں اس کے قبل کی حاصل شدہ پے در پے فتوحات سے بڑھی ہوئی تھیں اور سامنے وہی شکست خوردہ جماعت تھی جو اس وقت جنگ کے لیے کوئی تیاری بھی نہ کر سکی تھی اس لیے یہ بہت آسان تھا کہ آپ مقابلہ کا حکم دے دیتے اور فاتحانہ صورت سے مکہ میں داخل ہوتے مگر پیغمبر اسلامؐ کو امن پسندی کا ثبوت دینا تھا۔ جونہی گرد و غبار اٹھتا نظر آیا آپ نے فرمایا، اس راستے کو چھوڑ دو کسی دوسرے راستے سے آگے نکل چلو۔ چنانچہ دائیں جانب کا رُخ کیا گیا اور آپؐ "حمص" کی پشت پر سے "ثنیۃ المرار" ہوتے ہوئے حدیبیہ کو جو راستہ جاتا ہے ادھر متوجہ ہوئے۔[1]

آپ کی اس امن پسندی کے مظاہرہ کا جماعت مخالف کو اس حد تک احساس ہوا کہ وہ بھی واپس چلی گئی اور اس نے اب نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ عروہ بن مسعود ثقفی نے آکر گفتگوئے صلح کا آغاز کیا اور حضرت رسول خداؐ کی صلح پسندانہ باتوں سے ایسی خوشگوار فضا قائم ہوئی کہ سہیل بن عمرو قریش کا نمائندہ بنا کر گفتگوئے صلح کے لیے حضرت کے پاس بھیجا گیا اور اس نے اپنی جماعت کے مطالبات پیش کر دیے۔ یہ مطالبات سب مشرکین کے حق میں تھے اور ان کے ذریعہ سے بظاہر پیغمبر اسلام کو دبایا جا رہا تھا مگر آپ نے ان سب باتوں کو منظور فرما لیا اور صلحنامہ مرتب ہو گیا۔ اس صلح نامہ کے شرائط حسب ذیل تھے:۔

۱۔ رسولؐ اس سال مع اپنے متبعین کے بغیر زیارت کیے ہوئے واپس جائیں۔

۲۔ دس سال تک آپس میں جنگ نہ ہو۔

۳۔ جو شخص قریش میں سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر رسول اللہؐ کے پاس چلا جائے اس کو آپ واپس کر دیں گے مگر جب آپ کے پاس سے کوئی نکل کر قریش کے پاس چلا جائے تو قریش واپس نہ کریں گے۔

۴۔ جو قبیلہ رسولؐ کا حلیف ہونا چاہے وہ آپ کے ساتھ معاہدۂ دوستی کر لے اور جو قبیلہ

---

[1] طبری ج ۳ ص ۷۳

قریش کے ساتھ معاہدۂ دوستی کرنا چاہے وہ ان کے ساتھ ہو جائے۔

۵۔ آئندہ سال مسلمان مکّہ کی زیارت کے لیے آسکیں گے اس طرح کہ باشندگانِ مکّہ تین دن کے لیے مکہ کو خالی کر دیں گے مگر مسلمانوں کو لازم ہوگا کہ تین دن کے اندر مکہ سے باہر نکل جائیں اور ایک آدمی بھی تین دن کے بعد مکہ میں رہنے نہ پائے۔

۶۔ مسلمان اپنے ساتھ اس طرح کے اسلحہ لاسکیں گے جیسے مسافر اپنے ساتھ رکھتے ہیں، یعنی تلواریں نیام کے اندر رکھی ہوئی۔[1]

یہ ایسی غیر متوازن شرطیں تھیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے اکثر ساتھ والوں میں جو رسولؐ کے بلند مصالح کی تہ تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ شدید بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ تاریخ کے الفاظ یہاں تک ہیں کہ "لوگوں کے دلوں میں امرِ عظیم پیدا ہوا یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عقائد میں تزلزل ہوگیا، ایسا کہ قریب تھا کہ وہ اسلام سے منحرف ہی ہو جائیں۔[2]

اسی کا نتیجہ تھا کہ جب پیغمبرِ خداؐ نے معاہدہ کی تکمیل کے بعد اصحاب سے فرمایا کہ اٹھو، قربانیاں کرو اور پھر سروں کے بال منڈوا کر واپس چلو۔ تو عالم یہ تھا کہ رسولؐ حکم دے رہے تھے اور مجمع کی اکثریت خاموش تھی۔ کوئی تعمیل کے لیے اٹھتا نہ تھا۔ یہاں تک کہ جب حضرتؐ نے ان کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کر کے خود جا کر قربانی کی اور بال منڈوائے تو مجبوراً دوسرے لوگ بھی کھڑے ہوئے اور سروں کے بال مونڈنا یا تراشنا شروع کیے مگر رنج اور صدمہ کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے۔[3]

لیکن رسولؐ نے اپنے ساتھیوں کے ان جذبات کا کوئی لحاظ نہ کیا اور کفّار کے ان جابرانہ شرائط کو منظور کر کے واپسی اختیار فرمائی۔ اس خیال سے کہ اگر اس موقع پر جنگ کر کے مکہ کو فتح کیا جاتا تو کہنے کو ہو جاتا کہ رسولِ اسلامؐ چڑھائی کر کے آئے۔ اس طرح جارحانہ حملہ کا الزام آپ پر عائد کیا جاتا

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۶۔ طبری ج ۳ ص ۷۹۔ [2] طبری ج ۲ ص ۷۹
[3] طبری ج ۳ ص ۸۰

لہٰذا آپ نے اس کا موقع نہ دیا اور صلح کے شرائط کی پابندی اس حد تک فرمائی کہ ابھی یہ تحریر خشک نہ ہونے پائی تھی کہ خود سہیل بن عمرو (جو مشرکین کی طرف سے نمائندۂ صلح تھا) کا لڑکا جو پہلے سے مسلمان ہو چکا تھا اور اسے صرف اسلام لانے کی وجہ سے گھر والوں نے لوہے میں جکڑ دیا تھا۔ اس وقت موقع پاکر پا بہ زنجیر ہونے ہی کی حالت میں واحمدّاہ، واحمدّاہ کہتا ہوا آیا اور اپنے کو رسولؐ کے سامنے ڈال دیا۔ سہیل نے جو یہ دیکھا تو وہ کھڑا ہو گیا، اسے طمانچہ لگایا اور گریبان پکڑ کر کھینچتا ہوا لے چلا۔ اس نے پکار کر آواز دی "کیوں مسلمانو! کیا میں پھر مشرکین ہی کی طرف واپس کر دیا جاؤں گا کہ وہ مجھے دین سے منحرف کرنے کی کوشش کریں۔" مگر حضرتؐ نے کوئی تعرض نہیں فرمایا اور کہا "اے ابوجندل! صبر کر یہ چند دن کی تکلیف ہے۔ اللہ تیرے لیے اور تمام کمزور مسلمانوں کے لیے جو مشرکین کے پنجہ میں گرفتار ہیں کوئی گنجائش کی صورت پیدا کرے گا۔ اس وقت تو ہم نے اس قوم کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا ہے اور اس معاہدہ کی مخالفت ہم نہیں کریں گے۔"[1]

غرض پیغمبر اسلامؐ نے ان غیر مساویانہ شرائط پر صلح کر کے مکہ سے واپسی اختیار کی اور دوسرے سال معاہدہ کے مطابق مکہ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔ مشرکین نے تین دن کے لیے شہر خالی کر دیا اور رسولؐ اپنے ساتھیوں سمیت مکہ میں داخل ہوئے۔ مراسم زیارت بجا لائے اور پھر حسب معاہدہ تین دن کے بعد مکہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ واپس چلے گئے۔[2] مگر مکہ والے اس کے بعد معاہدہ کے دوسرے دفعات عدم تعرض پر قائم نہیں رہے۔

معاہدہ میں قبائل کو جو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جس کے ساتھ چاہیں شریک ہو جائیں۔ اس کے ماتحت قبیلۂ خزاعہ پیغمبر اسلامؐ کا حلیف ہوا تھا اور بنی بکر نے مشرکین کے ساتھ حلیف ہونے کا اعلان کیا تھا چونکہ ان دونوں قبیلوں میں قدیم عداوت تھی اس لیے دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف تیار رہتے تھے۔ مگر اب جو ان میں ہر ایک ایک جانب معاہدہ کے رو سے منسلک ہو

---

[1] طبری ج ۳ ص ۷۹-۸۰۔ [2] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۴۹-۲۵۰۔ طبری ج ۳ ص ۱۰۰-۱۰۱۔ بخاری ج ۳ ص ۳۶۔ مسلم ج ۲ ص ۱۰۵

گیا اور یہ طے پا گیا کہ دس برس تک جانبین میں جنگ نہ ہوگی تو خزاعہ کے لوگ مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے اسلحہ جسم سے اتار دیے اور جنگ کی تیاریاں ترک کر دیں۔ بنی بکر نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور بنی خزاعہ پر اس وقت جب کہ وہ ایک چشمہ کے کنارے مقیم تھے حملہ کر دیا اور بہت سے لوگوں کو قتل کر ڈالا۔[1]

قریش کے آدمیوں نے بھی علانیہ نہیں تو خفیہ بنی بکر کو مدد پہنچائی اور وہ بھی خزاعہ کی تباہی کے شریک ہوئے۔

مجبوراً قبیلۂ خزاعہ کا ایک آدمی جس کا نام عمرو بن سالم تھا فریاد کرتا ہوا مدینہ گیا اور اس وقت جب پیغمبر خداؐ اصحاب کے درمیان مسجد میں تشریف رکھتے تھے اس نے انتہائی دردانگیز اشعار میں اپنے قبیلہ کی روداد غم سنائی جس کے آخر میں حسب ذیل مضمون نظم تھا:۔

"اے خدا کے رسولؐ! آپ کو معلوم ہو کہ قریش نے آپ سے عہد شکنی کی۔ بنی بکر نے ہمارے قبیلہ پر چشمہ کے کنارے کمین گاہ سے حملہ کر دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا کوئی فریادرس نہیں ہے۔ اگر ہم جنگ کے لیے تیار ہوتے تو ان کی کیا مجال تھی کہ وہ ہم سے مقابلہ کرتے۔ وہ تعداد میں بھی کم اور طاقت میں بھی ہمارے مقابلہ میں ہمیشہ سبک ثابت ہوئے۔ مگر ہم تو نماز شب میں مصروف تھے۔ انھوں نے رکوع و سجود کی حالت میں آکر ہم کو قتل کر دیا۔"

ان اشعار کے پڑھنے کے دوران میں آپ کی ہمدردی کے تاثرات اتنے شدید ہو گئے تھے کہ آپؐ نے جواب میں کوئی طویل کلام سننے کے انتظار کی زحمت بھی دینا نہ چاہی اور اشعار ختم ہوتے ہی آپؐ کی زبان سے جو جملہ نکلا وہ یہ تھا کہ "قد نصرت یا عمرو بن سالم"۔ اس کے نتیجہ میں آپ اتمام حجت کے درمیان کچھ مراحل طے کرنے کے بعد مسلمانوں کو لے کر مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب تیور بدلے ہوئے تھے۔ مشرکین میں طاقت مقابلہ تو اب تھی ہی نہیں۔ انھوں نے ہتھیار

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۲۶۰۔ طبری ج ۳ ص ۱۱۱

ڈال دینے مناسب سمجھے اور اسی مجبوری کے عالم میں ابوسفیان نے بھی ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا۔ جس کا واقعہ یہ ہے کہ عباس بن عبدالمطلب اور ابوسفیان میں پرانے زمانے کی دوستی تھی۔ اس رات کو جب رسولؐ مکہ کے قریب پہنچ چکے تھے اور مشرکین پر ہراس چھایا ہوا تھا ابوسفیان معہ چند آدمیوں کے رسولِ خداؐ کی نقل و حرکت کا حال معلوم کرنے کے لیے شہر سے باہر نکلا۔ اسی وقت عباس اس فکر میں نکلے تھے کہ اگر قریش نے پیغمبر خداؐ کی مخالفت برقرار رکھی تو یہ سب آج مارے جائیں گے۔ ابوسفیان کو وہاں پاکر انھوں نے کہا، کچھ خبر ہے؟ رسولؐ دس ہزار مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ آئے ہیں، تم ان کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ ابوسفیان نے کہا پھر آپ کی کیا رائے ہے؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ انھوں نے کہا۔ آؤ میرے ساتھ اونٹ پر بیٹھ جاؤ اور رسولؐ کے پاس چل کر امان حاصل کر لو ورنہ اگر تم اُن کے ہاتھ آگئے تو بغیر قتل کیے نہ چھوڑیں گے۔ ابوسفیان کو یہ ذریعہ غنیمت معلوم ہوا وہ ناقہ پر پیچھے بیٹھ گیا اور عباس اسے لیے ہوئے پیغمبرؐ کے پاس حاضر آئے۔ رسولِ خداؐ سے اس کے لیے امان چاہی پیغمبرؐ نے فرمایا کہ اچھا اس وقت امان ہے۔ صبح کو انھیں پھر میرے پاس لائیے گا۔ حسب الحکم صبح کو عباس نے ابوسفیان کو حاضر کیا۔ حضرتؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی۔ وہ پس و پیش کرنے لگا۔ عباس نے کہا اسلام قبول کرو نہیں تو جان کی خیر نہیں۔ یہ سن کر ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔[1]

بخاری کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی جب معلومات حاصل کرنے باہر نکلے تو اتفاق سے لشکرِ اسلام کے پہرہ داروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے اور رسولؐ کی خدمت میں حاضر کیے گئے۔ اس وقت ابوسفیان نے اسلام قبول کیا۔[2]

پیغمبرِ خداؐ کی یہ وسعتِ قلبی تھی کہ آپ نے ابوسفیان کی نہ صرف جان بخشی فرمائی بلکہ اعلان کر دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے اسے بھی امان ہے اور جو مسجد الحرام میں داخل ہو جائے اسے امان ہے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے وہ بھی امان میں ہے۔[3] دوسری روایت

---

[1] طبری ج ۳ ص ۱۱۶۔ [2] بخاری ج ۳ ص ۲۹۔ [3] طبری ج ۳ ص ۱۱۶۔

میں مسجد الحرام میں داخلہ کے بجائے یہ ہے کہ جو ہتھیار ڈال دے اسے امان ہے[1]۔ اور مکہ میں داخل ہونے کے بعد تو آپ نے سب ہی کی جان بخشی کر دی۔ آپ نے مکہ کے آدمیوں سے جو آپ کے سامنے تھے پوچھا۔ کیوں تمھارا کیا خیال ہے میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ انھوں نے کہا ہمیں نیکی ہی کا گمان ہے۔ آپ ہمارے فیاض بھائی ہیں اور فیاض بھائی کے بیٹے ہیں۔ فرمایا۔ اذھبوا انتم الطلقاء "جاؤ تم سب کو میں نے چھوڑ دیا[2]"

اس کے بعد ابوسفیان کی بیوی ہند نے بھی جس کے انتقامی جذبات کی تصویر جنگِ اُحد میں سامنے آچکی ہے اسلام قبول کیا اور جتنے سخت اور متعصب اکابر قریش اس وقت باقی تھے سب ہی مسلمان ہو گئے[3]۔

مگر مذکورہ واقعات سے ہر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ بے بس ہو جانے کے بعد آدمی سر جھکا سکتا ہے، ہاتھ روک سکتا ہے، ہتھیار ڈال سکتا ہے، زبان بند کر سکتا ہے لیکن اپنے دل میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ اپنے قلب میں یقین کی صفت پیدا نہیں کر سکتا اور اپنی نفرت کو محبت سے تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ نفرت و دشمنی جو اُن حدود تک پہنچ چکی تھی جن کا مظاہرہ گزشتہ واقعات سے ہو چکا ہے کیا اس سب کے بعد محبت و عقیدت سے تبدیل ہو سکتی ہے؟ عام اصولِ فطرت اور واقعات کی رفتار کے مطابق یہ بات غیر ممکن معلوم ہوتی ہے۔ عام فطرت کے مطابق صرف اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ دشمن جو اب تک پھنکارے مارتے ہوئے اژدہے کی طرح سامنے موجود تھا اب مارِ آستین بن کر خفیہ ریشہ دوانیوں کے لیے آزاد ہو گیا اور کوئی شبہ نہیں کہ دشمن موجودہ صورت میں پہلی صورت سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی خیال تھا ان کے بارے میں اسلام کے نقاد حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کا۔ آپ نے فرمایا ہے ما اسلموا ولکن استسلموا۔ "یہ لوگ حقیقتاً اسلام نہیں لائے تھے بلکہ اسلام کے سامنے انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور بس"۔

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۴ [2] طبری ج ۳ ص ۱۲۰ [3] طبری ج ۳ ص ۱۲۱

پانچواں باب

حسینؑ بن علیؑ کی ولادت اور ابتدائی زندگی

۳ھ - ۱۱ھ

حضرت محمد مصطفیٰؐ کو مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ آئے ہوئے تیسرا برس تھا[۱] کہ ۵ شعبان کو حسینؑ بن علیؑ کی ولادت ہوئی[۲]

حضرت فاطمہ زہراؑ اپنے پدر بزرگوار رسالتمآبؐ کی خدمت میں مولود کو لے کر حاضر ہوئیں۔ حضرت نے حسینؑ نام رکھا اور ایک مینڈھے کی قربانی کے ساتھ عقیقہ کیا[۳]

اب پیغمبر اسلامؐ کی گود جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی ان دو بچوں کی پرورش کا مرکز بنی، ایک حسنؑ اور دوسرے حسینؑ۔

ان کی آنکھوں کے سامنے ایک طرف نانا کا اسوۂ حسنہ تھا جو بانیٔ اسلام تھے، دوسری طرف باپ جو مجاہد و محافظِ اسلام تھے اور تیسری طرف ماں جو طبقۂ خواتین کے لیے تعلیماتِ پیغمبرؐ کی عملی ترجمان بننے کے لیے پیدا ہوئی تھیں۔ بقول اقبال ؎

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

مسجد میں پانچوں وقت نماز جماعت پیغمبرؐ کے بصیرت آفریں مواعظ اور خطبے، مسلمانوں کا ذوق و شوق اور جوش و خروش اور گھر میں رات دن عبادت و ذکرِ الٰہی کی آوازیں، تکبیر کی صدائیں، وحی کی آیتیں، غزوات کے تذکرے، اسلام کو ترقی دینے کے مشورے اور یا پھر غریبوں کی خبر گیری کمزوروں کی دستگیری اور مظلوموں کی دادرسی بس ہر وقت یہی ذکر ہے یہی فکر۔ یہی قصے ہیں اور یہی

---

[۱] کافی ج ۱ ص ۳۹۴ [۲] مقاتل الطالبیین ص ۵۴۔ ارشاد [۳] ارشاد

کہانیاں۔ ایک طرف فطرت کے مخصوص عطیے، دوسری جانب یہ نورانی اور روحانی ماحول اور اس پر تربیت پیغمبرؐ ایسے بلند معلم کی جن کا مقصدِ رسالت ہی قرآن کے اعلان کے مطابق تزکیۂ نفوس اور تعلیم کتاب و حکمت تھا[1] اور آپ نے خود بھی اعلان کیا تھا کہ مکارمِ اخلاق کی تکمیل میرا اصلی نصب العین ہے۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ رسولؐ اپنے اہل بیت کی تربیت میں اس فرض کو نظر انداز کر دیتے جو بحیثیت معلمِ اخلاق کے بحیثیت بزرگ خاندان کے اور بحیثیت ایک پیغمبر کے آپ پر عائد ہوتا تھا چنانچہ حضرت نے اس کمسنی ہی کے عالم میں ان بچوں کو اپنے اخلاق و اوصاف کا نمونہ بنا دیا اور ان آئینوں میں جو قدرت کی طرف سے کمال کا جوہر لے کر آئے تھے اپنی سیرت کا پورا عکس اتار دیا۔

انہی ذات و صفات کی مخصوص بلندیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ رسولؐ ان اپنے نواسوں کے ساتھ غیر معمولی محبت رکھتے تھے جس کے مظاہرات تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں یکساں طور پر درج ہیں۔ اس کے علاوہ آپ دوسروں کو بھی ان سے محبت کی تاکید فرماتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ جس نے حسنؑ و حسینؑ سے محبت رکھی، اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جس نے ان کو دشمن رکھا اس نے مجھے دشمن رکھا[2]۔ آپ اللہ کو گواہ کرتے تھے کہ میں ان سے انتہائی محبت کرتا ہوں[3]۔ مگر ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ حسینؑ اپنے نانا کی بلند سیرت، فرائض کے بارے میں اہتمام اور اسلام کے متعلق آپ کے انہماک کو دیکھتے ہوئے یہ مشاہدہ کرتے تھے کہ رسول اللہ ہم کو بہت چاہتے ہیں مگر ہم سے زیادہ آپ اپنے دین یعنی اسلام اور اس کے آئین و شریعت کو چاہتے ہیں اس لیے اگر اس دین اور شریعت پر کوئی وقت پڑے تو پیغمبرؐ تیار رہوں گے کہ ہم کو اس پر نثار کر دیں۔

سنہ ۱۰ھ میں نجران (یمن) کے عیسائیوں کے ساتھ ایک طرح کے روحانی مقابلہ کا موقع آیا

---

[1] قرآن کریم سورۂ بقرہ آیت ۱۲۹ و ۱۵۱ - آلِ عمران آیت ۱۶۵ - جمعہ آیت ۲

[2] سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۳۳ [3] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۸۲

جس کا نام "مباہلہ" ہے یعنی دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جھوٹے پر عذاب نازل ہو۔ اس موقع پر رسولؐ تشریف لے گئے تو اس طرح کہ ہاتھ میں علیؑ بن ابی طالبؑ کا ہاتھ تھا۔ حسنؑ و حسینؑ آگے آگے تھے اور فاطمہ زہراؑ پیچھے آ رہی تھیں۔ نجران والے یہ نورانی منظر دیکھ کر مرعوب ہوئے اور خراج دینے کے لیے آمادہ ہو گئے[1]۔ ظاہر ہے کہ پیغمبرِ خداؐ اس مہم کو تنہا سر کر سکتے تھے۔ پھر قرآن کی تصریح[2] کے مطابق رسول اللہؐ اپنے اہلبیت کو ساتھ لے جانے پر کیوں مامور ہوئے؟ اس کا مقصد ایک طرف حق کے کامل نمایندوں کا خلق سے تعارف تھا تو دوسری طرف تعلیم و تربیت کا انداز بھی تھا۔ گویا ابھی سے خاندانِ رسولؐ کی ان ہستیوں پر ذمہ داری کا بار ڈالا جا رہا تھا کہ ضرورت کے وقت حفاظتِ اسلام کی ان ہی سے امید ہے۔ رسولؐ ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہے تھے کہ دیکھو آج تو میں خود موجود ہوں۔ میں تم کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں لیکن اگر کسی وقت میں میں موجود نہ ہوں تو تم اسی طرح حفاظتِ اسلام کے لیے نکل کھڑے ہونا جس طرح میں نکلا ہوں۔ آج کے اس عمل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلام کی نصرت اور خدمت کے موقع پر مرد، عورت، جوان، بچہ کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا اور ضرورت پر ہر ایک کو اس مقصد میں صرف ہونا لازم ہے۔ سب سے کم سن اس جماعت میں حسینؑ تھے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے ان کا اس موقع پر ساتھ لانا قدرت کی طرف سے اس مستقبل کی تمہید ہے کہ انہی کو عملی طور پر دوبارہ اس مثال کے پیش کرنے کا موقع ملے گا جسے آج پیش کیا گیا ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰؐ سے بڑھ کر کوئی شخص جوہر شناس نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ جانتے تھے کہ آپ کے تعلیمات کی حفاظت کن کے ذریعہ سے ہو گی۔ اس لیے مختلف صورتوں سے اپنی امت کو ہدایت کی کہ میرے اہلبیت کی پیروی کرتے رہنا۔ کبھی فرمایا کہ میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں۔ جب تک تم ان سے تمسک رکھو گے گمراہی سے محفوظ رہو گے۔ ان میں سے ایک قرآن ہے اور دوسرے میرے اہل بیتؑ[3] اور کبھی فرمایا کہ میرے اہلبیتؑ کی مثال کشتیٔ نوح کی سی ہے، جو اس کشتی پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو روگرداں ہوا وہ دریائے ہلاکت میں غرق ہوا[4]۔

---

[1] ارشاد ص ۸۷ [2] سورۂ آلِ عمران آیت ۶۱ [3] مسند احمد حنبل [4] معارف ابن قتیبہ۔

خصوصیت کے ساتھ اپنے دونوں نواسوں کے بارے میں کبھی فرمایا "حسنؑ و حسینؑ جوانانِ اہلِ بہشت کے سردار ہیں[1]" اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کا کردار اتنا بلند ہے اور رہیگا کہ ان کی سیرت زندگی کی عملی حیثیت سے تقلید ہی رضائے الٰہی کا سبب بن سکتی ہے اور کبھی فرمایا کہ "یہ دونوں میرے فرزند امام (واجب الاطاعت) ہیں خواہ کھڑے ہوں اور خواہ بیٹھے[2]" آئے گا ایک مستقبل جب ایک ان میں سے صلح کر کے بیٹھا ہوگا اور ایک جہاد میں کھڑا ہوگا۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے ارشاد سے دونوں کے طرزِ عمل کے اپنی اپنی جگہ صحیح ہونے پر روشنی پڑے گی۔

اس کے ساتھ خاص امام حسینؑ کے بارے میں جو حدیثیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں[3]۔ یعنی میرا کام اور میرا نام دنیا میں حسینؑ کی بدولت قائم رہے گا۔ اس کے علاوہ بکثرت حدیثیں ہیں جو فضائل و مناقب کی کتابوں میں درج ہیں۔

افسوس کہ حسینؑ کے لیے اس لطف و محبت، بے پایاں سکون اور اطمینان کی عمر طولانی نہیں ہو سکی۔ ابھی آپ کا سن سات برس کا بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ربیع الاول ۱۱ھ میں[4] حضرت محمد مصطفیٰؐ کی وفات ہو گئی اور حسینؑ رسول اللہؐ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔

---

[1] ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۹
[2] ارشاد ص ۲۰۴
[3] ابن ماجہ ج ۲ ص ۳۳
[4] الکافی ج ۱ ص ۴۷۵، طبری ج ۳ ص ۲۰۷

چھٹا باب

امام حسینؑ کی زندگی کا دوسرا دور نانا کی وفات کے بعد سے باپ کی شہادت تک

سنہ ۱۱ھ - سنہ ۴۰ھ

حضرت رسولؐ کی وفات تمام خاندان کے لیے ایک بڑا روح فرسا حادثہ تھی۔ آپ کے اخلاق و اوصاف نے دوست اور دشمن کے دل کو مسخر کر لیا تھا اس لیے آپ کے دنیا سے اٹھ جانے کا احساس ہر فرد بشر کو موجود تھا اور اسلامی گروہ کا ہر فرد جتنا تعلق پیغمبرؐ سے رکھتا تھا، اس اعتبار سے غیر معمولی طور پر متاثر ہو رہا تھا۔

پھر خاص اہل بیتؑ کے غم و الم کا اندازہ کہاں کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً حسینؑ جن کے ساتھ پیغمبرؐ کی شفقت کا انداز ہی ایک نرالا تھا۔ وہ نانا جو اپنی گود میں بٹھاتا تھا، سینہ پر لٹاتا تھا اور کاندھے پر چڑھاتا تھا، جو ذرا سی بھی خاطر شکنی حسینؑ کی گوارا نہ کرتا تھا، آج حسینؑ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتے تھے اور وہ شفیق و مہربان نانا نظر نہ آتا تھا۔

یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ پیغمبرؐ کی حیات میں ان کی غیر معمولی محبتوں کو دیکھ کر نیز ان کے ان متواتر اعلانات کی وجہ سے کہ جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اسے حسینؑ سے محبت کرنا چاہیئے، عام مسلمان جو بھی رسولؐ کے ساتھ عقیدت اور محبت کا دم بھرتے تھے اور ان کے پسینے پر خون بہانے کا دعویٰ رکھتے تھے پیغمبرؐ کے سامنے اُن کے اِن فرزندوں کے ساتھ انتہائی لطیف ترین جذبات محبت و نیازمندی کا اظہار کرتے تھے اور اگر ذرا سا بھی اس میں کمی کا شائبہ پیدا ہوتا تھا تو پیغمبرؐ کی تیوریوں پر بل دکھائی دینے لگتے تھے۔ ایک کھلا ہوا ثبوت اس کا اس واقعہ سے ملتا ہے جب رسولؐ حسن مجتبیٰؑ کو کاندھے پر سوار کیے ہوئے تھے اور ایک صحابی نے کہہ دیا کہ "اے صاحبزادے کتنا اچھا مرکب ہے

تمہارا" رسولؐ نے فوراً ٹوک دیا اور فرمایا "یہ سوار بھی تو کتنا اچھا ہے[1]" یہ باتیں ایسی نہ تھیں جن کے بعد مزاج نبوت میں کچھ بھی درخور رکھنے والے مسلمان یا آپ کے چشم و ابرو پر چلنے والے نیازمندان صاحبزادوں کی خاطر داری اور ان کے ساتھ اظہار محبت میں ذرا بھی فروگزاشت کرتے۔ اس طرح یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ہے کہ اس دور میں حسینؑ ایک چراغ تھے جس کے گرد پروانے طواف کرتے تھے یا ایک آفتاب جس کے گرد ستارے چکر لگاتے تھے۔ عقیدت کی ایک دنیا ان کے قدموں پر نثار ہوتی تھی اور محبت کا ایک آسمان تھا جو اُن کے سر پر سایہ فگن تھا مگر دنیا ایک حال پر نہیں رہتی۔ وہ انقلابات کا مجموعہ ہے۔ آج وہ مرکز جسکی مقناطیسی کشش دنیا کو جذب کیے ہوئے تھی قبر میں پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک کیا گیا کہ حسینؑ کی دنیا بالکل بدل گئی۔ وہ ماحول بھی بالکل تبدیل ہوگیا جو آپ کے سامنے رہا تھا۔ صبح ہوئی اور رسولؐ نے دروازہ پر آکر آواز دی[2] الصلوٰۃ، الصلوٰۃ۔ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا (یعنی) اٹھو نماز کا وقت آگیا اور پھر یہ قرآن کی آیت[3] پڑھتے تھے (جو آیت تطہیر کے نام سے مشہور ہے یعنی) "اللہ کو منظور یہی ہے کہ اے اہل بیتؑ تم سے ہر طرح کی نجاست کو دور رکھے اور تم کو پاک رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے۔" سب فوراً اٹھ بیٹھے باپ اور بھائی کی طرح حسینؑ نے بھی فوراً وضو کیا۔ مسجد میں پہنچے۔ مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ پیغمبرؐ نے نماز پڑھائی۔ پھر ظہر، عصر، مغرب اور عشا ہر وقت یہی سماں۔ نمازوں کے بعد یا پہلے اور ضرورت کی صورت میں مختلف اوقات پر پیغمبرؐ کے خطبے۔ شریعت اسلام کی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ہجوم۔ قبائل عرب اور سلاطین دنیا کے وفود اور سفراء کا دور۔ مختلف جماعتوں کی سرگرمیوں کا تذکرہ اور اس کے مدافعتی انتظامات، دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کا پیش ہونا، گواہوں کے بیانات، بحث اور جرح اور مقدمات کا فیصلہ۔ مجرموں کی سزائیں۔ زکوٰۃ و خمس اور اموال غنیمت کا آنا اور مقررہ اصول و قواعد کے مطابق تقسیم۔ غرض یہ کہ دین اور دنیا کے تمام مسائل اس ایک نقطہ پر مجتمع نظر آتے تھے۔ حسینؑ اپنے نانا کے پاس تقریباً ہر وقت موجود رہتے تھے اور آنکھ

---

[1] صواعق محرقہ ص ۸۳ [2] استیعاب ج ۲ ص ۶۱۵ [3] سورۂ احزاب آیت ۳۳۔

کھول کر اسی عالم سے روشناس ہوئے تھے۔ اب پیغمبرؐ کی وفات کے بعد یہ تمام سماں آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ انقلاب اور عظیم الشان انقلاب۔

افسوس ہے کہ رسولؐ کی خلافت کا مسئلہ اتنا اختلافی بن گیا کہ آج تک اسکی بنیاد پر شیعہ اور سنی کا تفرقہ قائم ہے۔ اس کتاب میں جو واقعۂ کربلا کو غیر نزاعی طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے لکھی جارہی ہے اس پر بحث کرنا منظور نہیں ہے۔ نہ ان ناگوار واقعات کا کوئی مستقل تذکرہ مقصود ہے۔ بہرحال متفق علیہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسولؐ کے بعد کچھ افرادِ امّت نے متفق ہوکر سیاسی اقتدار خاندانِ رسولؐ سے ہٹا دیا۔ اس انقلاب کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سرکارِ رسالت کے بعد ڈیوڑھی کی چہل پہل اور رونق سناٹے سے تبدیل ہوگئی اور وہ ماحول جس میں حسینؑ زندگی بسر کررہے تھے ایک دم بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔

حسینؑ ماں کے پاس جاتے تو یہ دیکھتے کہ سوا اوقات نماز کے ہر وقت گریہ وزاری سے کام ہے کچھ دن تک تو گھر ہی پر رویا کرتی تھیں پھر اہلِ مدینہ کی اس شکایت پر کہ آپ کے نالہ وشیون نے ہم پر خواب وخور حرام کردیا ہے، آپ جنۃ البقیع میں چلی جاتی تھیں اور اس قبرستان میں گریہ کرتی رہتی تھیں[1]۔ حسینؑ باپ کے پاس آتے تو یہ دیکھتے کہ انھوں نے اہلِ زمانہ کی بے رخی کو دیکھتے ہوئے گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کردیا ہے۔ آپ ہر وقت ایک گوشہ میں بیٹھے قرآن مجید کے متفرق اجزا کو اصلی ترتیب اور شانِ نزول کے مطابق کتابی شکل میں مرتب کرتے رہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں نے عہد کیا ہے کہ عبا دوش پر نہ ڈالوں گا جب تک کہ قرآن جمع نہ کرلوں[2]۔ کیا اس صورتِ حال کو دیکھ کر حسینؑ کا دل نہ گھٹتا ہوگا۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ اے خدا یہ کیسا اندھیرا ہے جو ایک دم ہماری آنکھوں کے سامنے چھا گیا۔ بہرحال اپنے باپ کے طرزِ عمل میں یہ نصب العین نمایاں پایا کہ چاہے حالات کتنے ہی ناسازگار ہوں مگر ہمیں اسلام کی خدمت سے ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ ہمارا اور قرآن کا ساتھ ہے اس لیے قرآن کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور اس فرض کو کسی وقت نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] کشف الغمہ ص ۱۴۸ [2] صواعق محرقہ ص ۷۶

حسینؑ نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ میرے باپ کے پاس آتے ہیں اور وہ انھیں جوش دلانا چاہتے ہیں کہ آپ اسلامی حکومت کے حصول کے لیے کوشش کیجیے جو واقعی آپ کا حق ہے۔ اٹھیے اور ہم آپ کی امداد کے لیے تیار ہیں۔ ان میں سچے دوست بھی ہیں اور نمائشی بھی۔ ایک طرف رسولؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلب کہتے ہیں کہ اپنا ہاتھ بڑھاؤ، میں تمھاری بیعت کروں اس کا مسلمانوں پر بڑا اثر پڑے گا' ادر وہ کہیں گے کہ پیغمبرؐ کے چچا نے ان کے ابن عم کی بیعت کر لی، پھر کسی کو عذر نہ ہوگا اور دوسری طرف بنی امیہ کا سردار ابوسفیان بن حرب ہے اور وہ آ کر کہتا ہے کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ آپ، کے ہوتے ہوئے عرب کے ایک رذیل ترین خاندان نے غلبہ حاصل کر لیا۔ خدا کی قسم اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی امداد کے لیے مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھر دوں۔ مگر چونکہ آپ کی ذات جذبات سے بلند اور نفسانیت کے لوث سے پاک تھی اور آپ اسلام کا حقیقی درد اپنے سینہ میں رکھتے تھے اس لیے آپ اپنا حق سمجھتے ہوئے بھی ان لوگوں کے کہنے میں نہیں آئے اور آپ نے ابوسفیان کو اس طرح ڈانٹ کر جواب دیا کہ "خدا کی قسم تم ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کے دشمن رہے ہو"[1]۔ یہ اس کا عملی اظہار تھا کہ چاہے ہمارے حقوق ہاتھ سے جائیں۔ ہمارے شخصی مفاد کو نقصان پہنچے مگر ہم کو ہمیشہ اجتماعی اور اسلامی مفاد پر نظر رکھنا چاہیے اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ نتیجہ بھی اس واقعہ سے ظاہر تھا کہ ابوسفیان اور اس کے خاندان کے لوگوں کا اسلام صرف نمائشی حیثیت رکھتا ہے اور ان سے اسلام کے متعلق ہمیشہ نقصان رسانی کا اندیشہ موجود ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اسلام کو اس کے کھلے ہوئے دشمنوں کے ہاتھوں اتنا نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا ان نمائشی دوستوں سے پہنچ سکتا ہے اس لیے اگر اسلام کا تحفظ کرنا ہے تو ہمیشہ اس جماعت کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا چاہیے اور کوئی موقع نہ آنے دینا چاہیے کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔

افسوس ہے کہ رسولؐ کی وفات سے چند ہی مہینوں کے بعد گوناگوں مصائب و تکالیف اٹھانے کے ساتھ حسینؑ سے ان کی بزرگ مرتبہ ماں بھی جدا ہو گئیں۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات سے علیؑ بن

---

[1] ارشاد ص۱۰۰۔ استیعاب جلد ۲ ص۷۱۔ صواعق محرقہ ص۳۷۔ تاریخ الخلفاء ص۷۵۔ طبری ج ۳ ص۲۰۲۔۲۰۳

ابی طالبؑ اور بھی دل شکستہ ہو گئے اور حسنؑ و حسینؑ کے لیے مہر و محبت کی دنیا بڑی حد تک ویران نظر آنے لگی۔ اب ان کے لیے گہوارۂ شفقت و تربیت صرف ایک تھا اور وہ ان کے بزرگ مرتبہ باپ کی ذات۔ سات برس کی عمر سے لیکر چھتیس سال کی عمر تک انتیس سال برابر حسینؑ اپنے وہبی کمالات کے ماوراء حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ ایسے حکیم الٰہی، عالم ربانی، معلم اخلاق انسانی اور مجموعۂ فضائل نفسانی کے علمی اور عملی فیوض سے بہرہ ور ہوتے رہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عام نظام اسباب کی دُنیا میں انسانیت کی حقیقی تعمیر ہوتی ہے۔ اس عمر کے آغاز سے بلوغ کی مدت تک اوصاف و ملکات کی داغ بیلیں پڑتی ہیں۔ نوجوانی کے زمانہ میں اُن پر دیواریں اٹھتی ہیں اور جوانی کے اختتام تک یہ عمارت مکمل ہو کر اس پر نقش و نگار بن جاتے ہیں اور وہ ساز و سامان اور شیشہ آلات سے بھی آراستہ ہو جاتی ہے۔ حسینؑ کے لیے ان تمام منازل کی ظاہری تکمیل علیؑ ابن ابیطالبؑ کی نگرانی میں ہو رہی تھی۔

حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے والد بزرگوار علیؑ بن ابیطالبؑ باوجود یکہ زمانہ کی بے توجہی، حق فراموشی اور سرد مہری سے کبیدہ خاطر ضرور تھے لیکن جب کسی علمی مسئلہ میں، کسی مہم کے متعلق مشورہ میں، کسی مقدمہ کے فیصلہ میں اُنکی ضرورت پڑ جاتی ہے اور ان سے امداد کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ فوراً بلا عذر امداد کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ جذباتی انسانوں کے رویہ کے بالکل خلاف ہے۔ وہ اگر کسی منصب کے حصول سے جس کے حقدار ہوں محروم کر دیے جائیں تو وہ متعلقہ افراد سے خفا ہو کر الگ ہو جائیں گے اور اگر اس منصب سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اُن سے مدد طلب کی جائے تو وہ اپنی دلی رنجش کی بنا پر تعاون سے انکار کر دیں گے۔ اس سے اہلبیتؑ کے ہر فرد کے سامنے یہ نمونہ پیش ہو رہا تھا کہ ہم چاہے مسلمانوں کے معاملات سے کتنے ہی غیر متعلق کر دیے جائیں مگر ہمیں کبھی اپنے کو غیر متعلق سمجھنا نہیں چاہیے۔ ہمیں ہر ایسے موقع کا منتظر رہنا چاہیے کہ جس وقت ہمارے ذریعہ سے اسلامی مفاد کو حقیقی فائدہ پہنچ سکتا ہو تو اس موقع پر فوراً ہمیں اپنے فرض کو انجام دینا چاہیے اور اسلام کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھنا چاہیے۔

تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر ایسا وقت آیا کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ تختِ حکومت کو حاصل کر لیتے جبکہ خلیفۂ دوم نے اپنے انتقال کے وقت چھ آدمیوں کی کمیٹی بنا کر خلافت کو ان میں منحصر کر دیا اور ان میں سے ایک حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کو بھی قرار دیا تھا۔ تمام دوسرے ارکان حضرت علیؑ کو خلافت کے منصب پر نامزد کرنے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ آپ کتاب و سنّت کے علاوہ شیخین (ابوبکر و عمر) کی سیرت پر عمل کا بھی عہد کریں[1]۔ مگر حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے حقیقت پرور، بلند ہمت اور مستغنی طبیعت باپ نے اس موقع کو اپنے ہاتھ سے دے دیا۔ اس بنا پر کہ وہ کتاب اور سنت پر عمل کے علاوہ کسی دوسری شرط کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ جس کے نتیجہ میں وہ ظاہری خلافت کا ہما جو اُن کے سر ہمایوں پر چکر لگا رہا تھا ایک طویل عرصہ تک کے لیے ان سے علیحدہ ہو گیا۔

حسینؑ نے اس میں ایک بڑے اہم سبق کا عملی نمونہ دیکھا جس پر اُن کے آئندہ اقدامات کی بنیاد قائم تھی اور وہ یہ کہ شریعت اور مسلمان حکمرانوں کی سیرت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جو حکومتِ وقت کا آئین اور اس کا عمل ہو اس کو شریعت کی رو سے بھی صحیح ماننا پڑے بلکہ شریعت کے مستقل اصول ہیں جنھیں مقتدا ہونا چاہیے اور حکومت کے عمل کو ان کا ماتحت ہونا چاہیے اور جب ایسا نہ ہو تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کو تسلیم کرے اور حکام کے عمل کو تسلیم نہ کرے اور اگر کسی وقت ایسا موقع پیش آئے کہ حکام کا عمل کھلم کھلا شریعت کے خلاف اور آئینِ مذہب میں بنیادی تبدیلی کا باعث ہو تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ شریعت کی حمایت میں کمربستہ ہو جائے اور اس کے لیے بشرطِ ضرورت کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ اسی دور میں ۳۱ھ میں یزدجرد بادشاہِ ایران کا سراسیمگی اور کس مپرسی کے عالم میں ایک ایرانی ہی کے ہاتھ سے خاتمہ ہوا[2]۔ جس کے بعد شاہزادیاں بحیثیت قیدی کے مدینہ بھیجی گئیں اور اس موقع پر جبکہ قدیم ملک کی شاہزادیوں کو قید دیکھ کر بہت سے آدمی خوش ہو رہے ہوں گے حضرت علیؑ اور اُن کے عالی دماغ شاہزادہ حسینؑ نے انھیں کنیزی کی ذلّت سے بچا ہی نہیں لیا بلکہ انھیں خاندانِ رسول کے گھر کی ملکہ کا تاج پہنا دیا چنانچہ وہ شاہزادی جن کا نام

---

[1] طبری ج ۵ ص ۴۰ [2] طبری ج ۵ ص ۷۱

شہر بانو یا شاہ زنان مشہور ہے حسینؓ کے عقد میں آئیں اور اس طرح انھوں نے اسلام کی اس تعلیم کو زندہ رکھا جو ملکی تفریق کو مٹا دینے کی علمبردار ہے۔

تیسرے خلیفہ عثمان کے دور کا آخری حصہ بڑی بے اطمینانی اور کشمکش میں گزرا مسلمانوں کو اُن سے شکایتیں پیدا ہوئیں اور آخر اقدامات کی حد تک پہنچیں مگر حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ نے ان اقدامات کو تقویت پہنچانے کے بجائے پوری کوشش کے ساتھ ان کو روکنے کی سعی فرمائی۔ کئی مرتبہ بیچ میں پڑ کر صلح کرائی۔ مخالف جماعت کی شکایات دور کرائیں اور اسے سمجھا بجھا کر منتشر کیا[1] مگر مروان جو اس دور میں "کاتب"[2] کے عہدہ پر تھا اس کی شرارتوں نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا اور آخر اس جماعت نے حاکم وقت کے مکان کا محاصرہ کر لیا[3]۔ اس وقت بھی حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ نے یہ ہمدردی کی کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ محاصرہ کرنے والوں نے پانی بند کر دیا ہے تو آپ نے حسنؓ اور حسینؓ اپنے دونوں فرزندوں کو کچھ مشکوں کے ساتھ روانہ کیا اور ان دونوں صاحبزادوں نے اپنے کو خطرہ میں ڈال کر پانی قصرِ حکومت کے اندر پہنچا دیا۔ بہرحال نظمِ حکومت کا پیمانہ لبریز تھا اور پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ حملہ آور جماعت نے دارالحکومت کی سرزمین کو خلیفہ کے خون سے رنگین اور ان کے رشتۂ حیات کو قطع کر دیا۔ حیرت کا امر ہے کہ اتنا بڑا مسلم اکثریت کا مسلّم الثبوت فرمانروا خود اپنے دارالسلطنت میں ایک مہینہ انیس دن[4] محصور رہا اور آخر تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اس دارالسلطنت کے لوگوں میں جو پیغمبرؐ کا دارالہجرت اور مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں کے اہلِ حل وعقد خلیفہ گری کے کام کا اپنے کو واحد ذمہ دار سمجھتے تھے کوئی جوشِ مقاومت پیدا نہ ہوا۔ اس سے زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ لاش — تین دن تک بے گور وکفن رہی[5] اور عامہ مسلمین دفن کی طرف

---

[1] طبری ج ۵ ص ۹۶ و ۹۷ - ۱۱۰ - ۱۱۷ و ۱۲۲

[2] کاتب کا درجہ اس دور میں "وزیر" کا سا ہوتا تھا۔ وہ حاکم کا رازدار، مشیرِ کار، اسکی مُہر کا امانتدار اور اس کی طرف سے خط وکتابت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ [3] الوزراء والکتاب ص ۱۴۔ طبری ج ۵ ص ۱۱۱-۱۱۲

[4] طبری ج ۵ ص ۱۲۲ ۔ [5] طبری ج ۵ ص ۱۴۳

متوجہ نہیں ہوئے آخر میں راتوں رات محش کوکب" نام کے مقام پر جو مسلمانوں کے قبرستان سے الگ تھا سپردِ خاک کیے گئے۔[1]

اس عبرت خیز مرقع سے ایک حساس انسان کس قدر اہم نتائج اخذ کر سکتا تھا؟ سلطنتِ دنیا کی بے ثباتی، جمہور کی وفاداری پر عدم اعتماد نیز مروان اور دوسرے بنی امیہ کے ہاتھوں اسلام کے شیرازہ کی ابتری یہ سب کچھ حسینؑ نے دیکھا اور اپنی آیندہ زندگی کے سب سے اہم کارنامہ کی بنیادوں کو مستحکم بنانے میں ان میں سے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھا جس کے سننے اور سمجھنے کیلیے آپکو مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے۔

حالات بہت تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں اور ان حالات کے لحاظ سے جمہور کے رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس ہنگامی انقلاب کے نتیجہ میں مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور ان کے انتخاب کی نگاہیں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے چہرہ پر جم گئیں۔ انھوں نے آپ کے پاس آکر خلافتِ اسلامی کی ذمہ واری کو سنبھالنے کی درخواست کی۔ یہ بات حیرت میں ڈالنے والی تھی کہ حضرت علی باوجودیکہ اس کے پہلے ہمیشہ خلقِ خدا کی ہدایت اور ان کے نظم و نسق کی اصلاح کے لیے بے چین اور خلافتِ رسولؐ کے لیے اپنے استحقاق کا اعلان فرماتے رہے تھے۔ آج مسلمانوں کی اس متفقہ ملتجیانہ پیشکش کو مسترد فرما رہے تھے۔[2] اور اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے۔ حسینؑ خوب جانتے تھے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ حکومت اور عمالِ حکومت کے رویہ کی بدولت مسلمانوں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں اور زاویۂ نگاہ میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ اسلامی حکومت بڑی حد تک دنیوی اقتدارِ سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور کسرویت و قیصریت کے آثار اس میں نمودار ہو گئے تھے۔ یہ چیز کسی طرح اس سادگی اور مساوات کے ساتھ سازگار نہ تھی جسے پیغمبرِ اسلامؐ نے دنیا میں پھیلایا تھا اور جس پر حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نہایت سختی کے ساتھ عامل تھے اس لیے حضرت خوب جانتے تھے کہ اگر میں اس وقت حکومت کی باگ کو سنبھالوں تو یا تو مجھے زمانہ کے ساتھ ساز کر کے ہوا کے رُخ پر چلنا پڑے گا اور اس کے لیے میرا ضمیر مجھ کو اجازت نہیں دے سکتا اور یا میں زمانہ کے ساتھ جنگ کروں گا۔ بیشک اگر میں ذمہ واری اپنے سر لے لوں تو مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔

---

[1] طبری ج ۵ ص ۱۴۳ و ۱۴۴ [2] طبری ج ۵ ص ۱۵۲

مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مملکت میں خلفشار رہے گا اور بحیثیت ایک حاکم کے میرا دور ناکامیاب سمجھا جائیگا۔ آپ نے پورے طور پر انکار کیا مگر مسلمانوں کا اصرار اتمام حجت کی صورت اختیار کر گیا یعنی وہ علیؑ بن ابی طالبؑ پر یہ ذمہ واری عائد کرنے لگے کہ دنیا آپ سے ہدایت و اصلاح کی طالب ہے اور آپ اس سے گریز کرتے ہیں۔ ایک داعیٔ حق کو یہ بھی زیبا نہیں ہے کہ وہ خلق خدا پر بے اعتمادی کی آڑ پکڑ کر ان کی درخواست کو ٹھکراتا رہے اور ان کی ہدایت کی ذمہ واری کو پورا کر کے ان پر حجت تمام نہ کرے۔ مجبوراً حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو یہ ذمہ واری قبول فرمانا پڑی۔ بے شک آپ نے دنیا کو دھوکے میں مبتلا نہ رکھنے کے لیے صاف اعلان کر دیا کہ دیکھو جب تم ذمہ واری کو میرے سپرد کر رہے ہو تو میں جو ٹھیک راستہ سمجھوں گا اسی پر تمھیں چلاؤں گا اور کسی کے اعتراض اور نکتہ چینی کی پروا نہ کروں گا۔[1] لوگوں نے اس کا اقرار کر کے ذی الحجہ ۳۵ھ میں علیؑ بن ابی طالبؑ کی بیعت کی اور خلیفۃ المسلمین تسلیم کر لیے گئے۔ اس سے ایک طرف یہ ثابت کیا گیا کہ دنیا کی فضا اہلبیتؑ کے حکومت و اقتدار کے لیے موزوں نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ کہ اگر اللہ کے بندے وفاداری کے عہد کے ساتھ رہنمائی کے طالب ہوں تو جب تک حجت ان پر پورے طور سے تمام نہ ہو جائے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم بظاہر ان کے عہد و پیمان کو باور کریں اور ان کی خواہش رہنمائی کی تکمیل کے لیے قدم آگے بڑھائیں۔

خلافت کی ذمہ واری قبول کرنے کے بعد وہی ہوا جو حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ پہلے سے سمجھے ہوئے تھے کہ دنیا آپ کے تعلیمات کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ کچھ لوگوں نے تو بیعت سے پہلو تہی کی جیسے اسامہ بن زید، حسان بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور سعد بن ابی وقاص وغیرہ۔ حضرت علیؑ نے ان کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی حالانکہ تمام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے آپ کی بیعت مکمل ہو چکی تھی اور اس لیے ان کا بیعت سے انحراف ان سب کے نزدیک غلط تھا مگر جب تک وہ عملی طور سے کوئی مخالفت نہ کرتے اور اس نظام میں خلل نہ ڈالتے،

---

[1] طبری ج ۵ ص ۱۵۶

ضرورت ہی کیا تھی کہ ان سے تعرض کیا جائے جبکہ اصول مذہب میں دستور یہ ہے کہ لا اکراہ فی الدین تو خلافت کے تسلیم کرانے میں اکراہ کے کیا معنی ؟

لیکن بعض لوگوں کا یہ مشورہ کہ معاویہ اور جتنے عثمان کے زمانہ کے عامل ہیں ان سب کو آپ برقرار رکھیں اور جب وہ مطمئن ہو جائیں اور آپ کی گرفت میں آجائیں تو پھر چاہے سب کو معزول کر دیں۔ اسے آپ نے منظور نہیں فرمایا اور آپ نے کہا' اور مذہبی ذمہ داری[1] کے لحاظ سے آپ اس کے سوا کہہ ہی کیا سکتے تھے کہ سیاست دنیا کے لحاظ سے تو بیشک یہی بہتر ہے جو تم کہتے ہو مگر خدا جانتا ہوں کہ وہ ظالم اور نااہل ہیں تو انھیں اپنی طرف سے حکومت کا پروانہ بھیج کر میں ان کے مظالم میں شریک ہوں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے[2]

یہ بڑا دور رس واقعہ ہے۔ اگر علیؑ بن ابی طالبؑ اپنی ماتحتی میں معاویہ ایسے شخص کی حکومت کو دینی فریضہ کے ماتحت برداشت نہیں کر سکتے تھے تو اس کے بعد کبھی حسینؑ بیعت کر کے معاویہ سے بڑھ کر یزید ایسے شخص کی حکومت کیونکر تسلیم کر سکتے ہیں؟

پھر بھی حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے معاویہ کے نام جو خط لکھا اس میں کوئی سختی و درشتی، لب و لہجہ کی تلخی اور جنگجویانہ انداز نہ تھا بلکہ ایک برسر اقتدار آنے والے حاکم اعلیٰ کو اپنے کسی عامل کو جس طرح کا خط لکھنا چاہیے ویسا ہی تھا۔ اس خط کا مضمون جو مشہور مؤرخ واقدی کی کتاب الجمل سے منقول ہے حسب ذیل ہے:-

"تم کو معلوم ہوگا کہ میں نے مسلمانوں کے معاملات میں اپنے دامن کو کس طرح صاف رکھا اور کس طرح تختِ خلافت سے بے اعتنائی اختیار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ہوا جو ٹل نہ سکتا تھا (قتل عثمان)

---

[1] پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص مسلمانوں کی حکومت کا ذمہ دار ہو پھر وہ اپنی جانب سے کسی شخص کو والی قرار دے درانحالیکہ اس سے بہتر شخص مسلمانوں کے مفاد کے لیے موجود ہو تو اس نے خدا اور رسولؐ سے خیانت کی۔ دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی آدمی کو کوئی منصب عطا کرے، کسی جماعت کے اندر حالانکہ اس جماعت میں اس آدمی سے زیادہ پسندیدہ شخص موجود ہے تو اس نے خدا اور اس کے رسولؐ اور تمام مومنین کی خیانت کی (السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیۃ للشیخ ابن تیمیہ ص۳)

[2] طبری جلد ۵ ص ۱۵۹-۱۷۰

اور اس کے بعد میرے لیے چارۂ کار باقی نہ رہا۔ یہ واقعات بہت طولانی ہیں۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہوا اور اب جو حالات پیش ہیں وہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اب تم وہاں کے لوگوں سے بیعت حاصل کرو اور اپنے یہاں کے آدمیوں کے ایک وفد کے ساتھ میرے پاس حاضر ہو۔[1]"

معاویہ اگر مخالفت پر پہلے ہی سے تلے ہوئے نہ ہوتے تو اس خط کے مضمون پر انھیں عمل کرنا چاہیے تھا مگر وہاں تو عناد و مخالفت کی چنگاریاں پہلے سے سلگ رہی تھیں۔ آخر آپ کے مقابلہ میں قتل عثمان کا غلط الزام تراشا گیا اور اس بہانہ سے آپ کی مخالفت کا جھنڈا اونچا کیا گیا۔

معاویہ نے شام والوں کو حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے خلاف اس غلط تہمت کو ان کے ذہن نشین کر کے پورے طور پر مشتعل کر دیا۔ مسجد جامع دمشق میں ماتمی جلسے کیے گئے۔ مقتول خلیفہ کا خون بھرا کرتا منبر پر ڈال دیا گیا اور عالم یہ تھا کہ پچاس ساٹھ ہزار کا مجمع اسے دیکھ دیکھ کر نالہ وزاری کرتا اور اس جوش رقت میں ان سے کہا جاتا تھا کہ اب تمھیں علیؑ سے اس خون کا بدلا لینا ہے۔[2] اب حضرت علیؑ شام کی مہم کے تدارک کا سامان کرنا چاہ رہے تھے جو یک بیک یہ خبر آئی کہ طلحہ اور زبیر نے زوجۂ رسولؐ عائشہ بنت ابی بکر کو آمادہ کر کے آپ کے خلاف محاذ تیار کر لیا ہے۔[3]

وہ لوگ جو پچیس برس تک حضرت علیؑ کو میدان جنگ سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے خاموشی کی زندگی گزارتے دیکھ چکے تھے انھیں یقین ہوگا کہ حضرت علیؑ کسی نہ کسی طرح اس قضیہ کو رفع دفع کر دیں گے۔ اور جنگ کی نوبت نہ آنے دیں گے مگر انھوں نے دیکھ لیا کہ وہی علیؑ جو اپنی تلوار کو اتنے عرصہ تک نیام میں رکھ چکے تھے کہ جوانی گزر کے بڑھاپا آ گیا تھا، آج وہ ذمہ داری اپنے اوپر عائد ہو جانے کے بعد آئین و اصول اور حق کی حفاظت کے لیے جنگ پر بالکل تیار ہیں۔ بیشک امام حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے پدر بزرگوار نے اس اصول کی سختی کے ساتھ پابندی فرمائی کہ جب تک فریق مخالف عملاً جنگ کی ابتدا نہ کر دے، اس وقت تک تلوار نیام سے نہ نکالی جائے چنانچہ جمل[4] کے میدان میں یہی ہوا کہ جب صفوف لشکر مرتب

---

[1] نہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۴۰ [2] طبری ج ۵ ص ۱۶۳ [3] طبری ج ۵ ص ۱۶۴ [4] جمل عربی میں اونٹ کو کہتے ہیں چونکہ اس جنگ میں زوجۂ حضرت رسولؐ، عائشہ کو ایک اونٹ پر محمل میں سوار کر کے حضرت کے مقابلہ پر لایا گیا تھا اس لیے اس کا نام جنگ جمل ہوا۔

ہو چکے تو حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے ایک قرآن ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ کون ہے جو اس قرآن کو لے جا کر انھیں اس پر عمل کرنے کی دعوت دے مگر یہ بتائے دیتا ہوں کہ وہ قتل کر دیا جائے گا۔ یہ سنکر اہل کوفہ میں سے ایک جوان جس کا نام مسلم تھا کھڑا ہو گیا۔ کہا میں جاؤنگا۔ حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر بلند آواز سے کہا کون ہے جو اس قرآن کو لے جا کر انھیں اس پر عمل کی دعوت دے مگر وہ قتل ہو جائے گا۔ پھر کھڑا ہوا تو وہی جوان۔ حضرت نے پھر سکوت کیا اور پھر وہی الفاظ بلند آواز سے کہے۔ جب پھر وہی جوان کھڑا ہوا تو آپ نے وہ قرآن اس کے سپرد کیا وہ اسے لے کر صفوف مخالف کے سامنے گیا۔ ظالموں نے اس کا داہنا ہاتھ قطع کر دیا تو اس نے قرآن کو دونوں کٹے ہوئے بازوؤں سے تھام کر سینہ سے لگا لیا۔ اس حالت میں کہ خون کی اس کے کپڑوں پر بارش ہو رہی تھی۔ اس کے بعد وہ قتل کر دیا گیا۔ علیؑ بن ابیطالبؑ پکارے کہ اب ان سے جنگ حلال ہو گئی[1] اب دنیا نے دیکھا کہ وہی تلوار جو بدر، احد، خندق اور خیبر میں کسی وقت چمک چکی تھی جمل کے میدان میں چمکنے لگتی ہے۔ وہی ہاتھ ہے اور ہاتھ کی صفائی۔ وہی دل ہے اور دل کی طاقت۔ یہاں تک کہ جمل کا معرکہ فریق مخالف کی شکست پر ختم ہوا اس وقت حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے فریق مخالف کی سرگروہ ام المومنین عائشہ کے ساتھ وہ شریفانہ اور باعزت برتاؤ کیا جیسا کہ کسی فاتح نے اپنے مفتوح فریق کے ساتھ نہیں کیا ہوگا[2]۔ یہ معرکہ روز پنجشنبہ ۱۰ جمادی الثانیہ ۳۶ھ کو پیش ہوا[3]۔

ظاہر ہے کہ عام اسباب کے لحاظ سے اب جناب امیرؑ کا سن لڑائیوں کی امنگوں کا متقاضی نہیں تھا۔ انسٹھ برس کی عمر تھی مگر آپ کا پچیس برس کی خاموشی کے بعد اب میدان جنگ میں آجانا اعلان کر رہا تھا کہ حقیقتاً ہمارا حرکت و سکون سب فرض کے احساس کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ فرض کی پکار پر ہمیں ہمیشہ جواب دینا چاہیے۔ اصول اور فرض کے حدود میں جذبات کا تقاضا اور سن کا اختلاف کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر فرض ہمارا خاموشی کا ہو تو چاہے جوانی کی تمام امنگیں قدم اٹھانے پر آمادہ کر رہی ہوں پھر بھی ہم کو اپنی زندگی خاموشی کے ساتھ گزار دینا چاہیے اور جوانی سکون کے عالم میں بسر کرنا

---

[1] طبری ج ۵ ص ۲۰۵، ۲۰۶ [2] تفصیل کے لیے دیکھو طبری ج ۵ ص ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۵ [3] طبری ج ۵ ص ۲۱۹

چاہیے اور اگر فرض ہمارا عملی اقدام کا ہو تو چاہے بڑھاپے کا اضمحلال جسمانی قوتوں کو متاثر بھی کیے ہو مگر ہمیں عزم و ارادہ کے قدموں پر کھڑا ہونا چاہیے اور وہ کرنا چاہیے جو جوانمردانہ ہمت کا تقاضا ہے۔

اُدھر شام میں اشتعال انگیزی مسلسل جاری رہی۔ جناب عثمان کا خون بھرا کرتہ اور اُن کی زوجہ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں منبر پر آویزاں اور اس کے سامنے گریہ و زاری، یہ سلسلہ ایک سال تک برابر جاری رہا۔ بہت سے اہلِ شام نے قسم کھائی کہ وہ عورتوں کے قریب نہ جائیں گے سوا غسل واجب کے کسی دن نہائیں گے نہیں اور بچھونے پر سوئیں گے نہیں جب تک ان آدمیوں کو جو قتلِ عثمان میں شریک تھے قتل نہ کرلیں گے۔[1] اس طرح معاویہ نے پورے شام کو حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے خلاف برانگیختہ کر دیا مگر آپ نے اپنی جانب سے اصلاح کی کوشش جاری رکھی۔ چنانچہ اسی کے لیے آپ نے جریر بن عبداللہ بجلی کو دمشق بھیجا مگر اس کا کوئی بھی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کو صفین کی جنگ کے لیے فوجیں میدان میں آگئیں۔ اب بھی آپ نے فہمائش اور نصیحت کا سلسلہ موقوف نہیں کیا۔ بشیر بن عمرو بن محصن انصاری، سعید بن قیس ہمدانی اور شبث بن ربعی تمیمی ان تین آدمیوں کو معاویہ کے پاس روانہ فرمایا کہ وہ جا کر اتحاد و اتفاق اور اطاعت و اجتماع کی طرف دعوت دیں مگر اس امن پسندانہ پیش قدمی کا جواب یہ ملا کہ پلٹ جاؤ میرے پاس سے کیونکہ میرے تمہارے درمیان بس تلوار سے فیصلہ ہوگا۔[2] کہاں تو حاکمِ شام کے یہ جنگجویانہ انداز اور کہاں حضرت علیؑ کی وہ گفتگو جو آپ نے نمائندگانِ شام حبیب بن مسلم فہری، شرحبیل بن سمط اور معن بن یزید بن اخنس کے سامنے فرمائی تھی جس میں آپ نے کہا تھا "میں تم لوگوں کو کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ باطل کو پامال کرنے اور حق کو زندہ کرنے کی جانب دعوت دیتا ہوں۔[3]" لیکن آپ کی یہ دعوت مسترد کر دی گئی اور بالآخر مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا جانے لگا۔

اس جنگ کا آغاز، اثنا، اور انجام میں بہت سے جاذبِ توجہ امور پیش آتے رہے۔ پہلے یہ کہ اس جنگ میں بھی حضرت علیؑ نے اپنی فوج کو ہدایت کر دی کہ جب تک دشمن ابتدا نہ کرے تم جنگ نہ کرنا۔[4] آپ نے ان تمام معرکوں میں جو نام نہاد مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے ہیں برابر

---

[1] طبری ج ۵ ص ۲۳۵ [2] طبری ج ۵ ص ۲۴۳ [3] طبری ج ۶ ص ۲ [4] طبری ج ۵ ص ۲۳۵

اپنی فوج کو یہ ہدایت فرمائی کہ اس وقت تک جنگ نہ چھیڑنا جب تک کہ وہ ابتدا نہ کریں۔ اس لیے کہ تمھاری حجت بحمداللہ حقانیت کے لحاظ سے تو تمام ہے ہی اب یہ تمھارا جنگ میں ابتدا نہ کرنا اور اُدھر سے ابتدا ہونا ان کے مقابلہ میں مزید اتمام حجت کا باعث ہو جائے گا اور جب لڑائی چھڑ جائے اور پھر دشمن کو شکست ہو تو کسی بھاگتے ہوئے کا پیچھا نہ کرنا۔ کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا کسی عورت کی بے حُرمتی نہ کرنا کسی مقتول کے اعضاء قطع نہ کرنا، خیام میں بلا اجازت داخل نہ ہونا اُن کے مال و اسباب کو نہ لوٹنا اور دشمنوں کی عورتیں تمھیں اور تمھارے سرداروں کو گالیاں بھی دیں تو انھیں کوئی ایذا نہ پہنچانا۔[1]

اس کے علاوہ یہ بھی ایک واقعہ سامنے آیا کہ معاویہ کے مقدمۃ الجیش ابوالاعور سلمی نے نہر فرات پر قبضہ کر لیا اور حضرت علیؑ کے لشکر پر پانی بند کر دیا۔ مجبوراً آپ نے پانی کے لیے جنگ کا حکم دیا۔ آپ کے لشکر نے ابوالاعور سلمی کی فوج سے گھاٹ چھین لیا اور یہ ارادہ کیا کہ اب دشمن کی فوج پر اسی طرح پانی بند کر دیا جائے جیسے اُس نے ہم پر بند کیا تھا۔ مگر حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے اس کو گوارا نہ فرمایا۔ آپ نے کہا کہ وہ اُنکا فعل تھا مگر تم اُنھیں پانی سے نہ روکو۔ اطمینان کے ساتھ سیراب ہونے دو۔

اس سے یہ سبق دیا جا رہا تھا کہ ہماری مخالف جماعت انسانیت اور اخلاق میں کتنی ہی پست ہو جائے مگر ہم کو ہمیشہ بلند طرقی سے کام لینا چاہیے اور اس کے کمینہ طرزِ عمل کا معاوضہ اس کے مثل سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں انسانیت کی بلندی کا تحفظ کرنا ضروری ہے۔

جنگِ صفین میں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کو مسلمانوں کی خونریزی سے بڑی تکلیف محسوس ہو رہی تھی چنانچہ آپ نے پکار کر امیر شام سے کہا کہ اس سے کیا حاصل ہے کہ عام مسلمانوں کا خون فیاضی کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ بس تم نکل آؤ میدان میں اور میں آجاؤں اور اس جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔[2] مگر معاویہ نے اس خطرہ کو اپنی ذات کے لیے مول نہ لیا۔ وہ دوسروں کے گلے کٹواتے رہے اور خود کبھی مقابلے کے لیے میدان میں نہیں آئے۔ برخلاف اس کے حضرت علیؑ جان کو جان نہ سمجھتے ہوئے برابر مجاہدین کی صفوں

---

[1] طبری ج ۶ ص ۶ [2] طبری ج ۶ ص ۲۰۳

کے آگے آگے تھے اس لیے کہ ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ شہادت کے مشتاق تھے۔ ان کا تو قول تھا کہ میں موت کے ساتھ اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا بچہ آغوشِ مادر سے مانوس ہوتا ہے۔ بیشک وہ اس موت کو ناپسند کرتے تھے جو بزدلی کے ساتھ بستر راحت پر ہو۔ چنانچہ اصحاب سے فرماتے تھے کہ یاد رکھو اگر تم قتل نہ ہوئے تو اپنی موت مرو گے اور قسم اس خدا کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ ہزار ضربتیں تلوار کی جو سر پر پڑیں آسان ہیں فرشِ خواب پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے[1]۔ چنانچہ ان کا طرزِ عمل ہمیشہ اسی کا مظہر رہا تھا۔ ابتدائے شباب میں جب ہر انسان کو زندگی انتہائی عزیز ہوتی ہے، رسولؐ کا ارشاد کہ علیؑ میرے بستر پر سو رہو اور علیؑ کا بسر و چشم آمادہ ہو جانا اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ معلوم تھا کہ خون کے پیاسے دشمن کھنچی ہوئی تلواریں لیے قتل پر آمادہ ہیں۔ مگر وہاں راہِ حق میں موت تو خوشگوار سمجھی جاتی تھی۔

اسی جنگِ صفین میں ایک موقع پر امام حسنؑ سے فرمایا:-

"تمھارے باپ کو کوئی پروا نہیں ہے کہ موت اس پر گر رہی ہے یا وہ خود موت کے اوپر گر رہا ہے[2]۔" پھر ایسے باپ کے جو بیٹے ہوں، جن کے سامنے یہ سیرت ہو اور جن کے کانوں میں یہ باتیں پڑ رہی ہوں انھیں موت کا اندیشہ کیونکر رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حسینؑ اپنے بھائی حسنؑ اور محمد بن حنفیہ کے ساتھ اس جنگ میں برابر سے حصہ لے رہے تھے اور سخت سے سخت موقعوں پر ثبات قدم کے جوہر دکھلا رہے تھے۔ تاریخ نے ایک ایسے موقع کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہ جب علیؑ بن ابیطالبؑ کے لشکر کا بڑا حصہ شکست کھا چکا تھا لکھا ہے کہ اس وقت نہیں رہ گئے تھے علیؑ کے پاس مگر بڑے فرض شناس اور پُر جگر افراد اُس وقت آپ نے اپنے گھوڑے کا رُخ میسرہ کی جانب پھیرا کہ جدھر قبیلۂ ربیعہ کے لوگ اب تک دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ راوی جس کا نام زید بن وہب جہنی ہے بیان کرتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا علیؑ کو کہ آپ ربیعہ کی فوج کی طرف جا رہے تھے اور آپ کے فرزند حسنؑ، حسینؑ اور محمد حنفیہ آپ کے ساتھ ساتھ تھے اور تیر علیؑ کے

---

[1] ارشاد ص ۱۲۸ [2] طبری ج ۶ ص ۱۱

کان اور شانوں کے پاس سے گزر رہے تھے مگر آپ کے فرزند بڑھ بڑھ کر سپر بن جاتے تھے اور اپنے باپ کی حفاظت کرتے تھے۔[1] کیا یہ جذبۂ فداکاری اور قربانی کا معمولی مظاہرہ ہے جو علیؑ کی آنکھوں کے سامنے ان صاحبزادوں سے ظاہر ہو رہا تھا؟ کیا اس کے بعد کبھی یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ علیؑ کے یہ بہادر بیٹے موت کے ڈر سے کسی فرض میں کوتاہی کریں یا کسی باطل طاقت کے سامنے جان کے خوف سے سر جھکائیں؟

اسی صفین کے میدان میں ایک اور منظر کا بھی مشاہدہ ہوا۔ وہ یہ کہ عین جنگ کی حالت میں حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ کی نگاہ آفتاب پر تھی۔ ابن عباس نے سبب دریافت کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ دیکھتا ہوں نمازِ ظہر کا وقت آیا یا نہیں۔ ابن عباس نے عرض کیا، کیا یہ نماز کا موقع ہے؟ جنگ تو ہو رہی ہے! آپ نے فرمایا کہ اور یہ ہماری جنگ کس بات کے لیے ہے؟ اسی نماز کے لیے تو جنگ کر رہے ہیں۔

یہ عبادتِ الٰہی کے فرض کی اہمیت کا ایک بے مثل عملی درس تھا کہ تیروں کی بارش ہو یا آگ برس رہی ہو، جب نماز کا وقت آئے تو لازم ہے کہ اس فرض کے ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

جنگ کو بہت طول ہو چکا تھا۔ آخر ایک دن حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ نے طے کر لیا کہ اب مکمل فتح حاصل کرنے کے بعد ہی جنگ کو موقوف کیا جائیگا۔ ایک دن اور رات مسلسل ہنگامۂ دار و گیر برپا رہا جس کے نتیجہ میں فوجِ شام کے قدم اکھڑنے لگے اور معاویہ کو شکست کا یقین ہو گیا۔ مگر عمر بن العاص نے اس دن کے لیے ایک چال اٹھا رکھی تھی۔ وہ یہ کہ فوراً قرآن نیزوں پر بلند کر دیے گئے اور ندا دی گئی کہ بھائیو یہ کتابِ خدا ہی ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ کر دے گی۔ شام والے سب ہلاک ہو گئے تو شام کے حدود کا کون نگہبان ہوگا۔[2] حالانکہ آغازِ جنگ سے پہلے ہی حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ قرآن کے فیصلہ کی دعوت دے چکے تھے۔ مگر اس وقت کامیابی کے تخیلات کی بنا پر علیؑ کی دعوت کو مسترد کر دیا گیا۔ اب شکست کے آخری انجام سے بچنے کے لیے قرآن درمیان میں لایا جا رہا تھا۔ حضرت علیؑ نے اپنی فوج والوں کو اس مکاری

---

[1] اخبار الطوال ص ۱۸۴۔ طبری ج ۶ ص ۱ [2] طبری ج ۶ ص ۴۶

اور چالبازی سے آگاہ کیا اور صاف فرمایا کہ یہ لوگ نہ اہلِ دین ہیں نہ اہلِ قرآن[1]۔ مگر آپ کی فوج کے بہت سے لوگ آپ سے منحرف ہو کر اس بات پر مُصر ہو گئے کہ اب تلوار روک لیجیے۔ نہیں تو ہمارے آپ کے درمیان تلوار چلے گی۔ یہ بڑی کشمکش کا موقع تھا۔ دشمن سے مقابلہ کے ہنگام میں ایسی صورت پیدا ہو جانا کہ خود اپنی فوج میں تلوار چلنے لگے ایک انتہائی ہولناک صورتِ حال تھی جسے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ گوارا نہ کر سکتے تھے۔ مجبوراً آپ نے جنگ کے التوا کا حکم دیا اور طے پایا کہ ایک حکم اہلِ شام کی طرف سے نامزد ہو اور ایک اہلِ کوفہ کی طرف سے۔ مگر اہلِ شام کی طرف سے عمرو بن عاص ایسا امیرِ شام کا نفسِ ناطقہ مقرر کیا گیا اور جب حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے چاہا کہ مالک اشتر یا عبداللہ بن عباس یا کسی دوسرے ایسے ہی اپنے مخلص اور خیر خواہ کو اپنی جانب سے مقرر کریں تو وہی اپنی فوج والے پھر بگڑ گئے کہ یہ لوگ تو بالکل اس جنگ کے ذمہ دار ہیں ہم ان کو کیونکر مقرر کریں[2]۔ آخر سب نے ابوموسیٰ اشعری کو جو پہلے ہی حضرت علیؑ کی موافقت سے گریز کر چکے تھے اپنی جانب سے مقرر کیا۔ مصلحتِ وقت یہی تھی کیونکہ اپنی جماعت میں خونریزی کا انسداد اسی پر موقوف تھا کہ حضرت بادلِ ناخواستہ اس کو برداشت کر لیں۔ یہاں تک کہ نتیجہ سب کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔ تاہم آپ نے جو صلحنامہ لکھوایا اسکا مضمون حسبِ ذیل تھا:-

"علیؑ بن ابیطالبؑ ذمہ لیتے ہیں اہلِ کوفہ اور تمام ان مسلمانوں کا جو اُن کے ساتھ ہیں اور معاویہ نے ذمہ داری لے لی ہے اہلِ شام اور تمام اپنے طرفداروں کی کہ ہم اللہ اور اس کی کتاب کے فیصلہ پر دار و مدار رکھتے ہیں اور سوا کتابِ خدا کے کوئی شے ہم میں فیصلہ کن نہیں ہوگی اور کتابِ خدا ہمارے سامنے رہے گی۔ شروع سے لے کر آخر تک ہم زندہ کریں گے اسی بات کو جسے خدا زندہ کرے۔ اور مردہ کریں گے اس کو جسے کتابِ خدا مردہ کرے۔ لہٰذا حکمین کو لازم ہوگا کہ وہ کتابِ خدا پر نظر کریں اور جو کچھ اُس میں ملے اس پر عمل کریں اور اگر کتابِ خدا میں انھیں کوئی ہدایت

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۷، ارشاد ص ۱۴۴ [2] طبری ج ۶ ص ۲۸

نظر نہ آئے تو رسولِ خدا کی سنّت پر جو اختلافی نہ ہو عمل کیا جائے گا۔"

اس معاہدہ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حکمین کو اپنی ذاتی رائے سے جو کسی سیاستِ دنیوی کا تقاضا ہو فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے خود حکمین سے جو فیصلہ کے لیے مقرر ہوئے تھے فرمایا تھا کہ "تم اس شرط پر حکم ہو کہ کتاب اللہ کے رُو سے فیصلہ کرنا اور اگر تمھیں کتابِ خدا کی رُو سے فیصلہ نہ کرنا ہو تو تمھیں اپنے کو حکم نہیں سمجھنا چاہیے"[1]۔ دوسرے اشخاص کو بھی یہ بتا دیا گیا کہ حکمین پر یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ وہ قرآن کی بنا پر فیصلہ کریں اور اپنی ذاتی رائے کو کام میں نہ لائیں[2]۔

یہ اقرار نامہ ۱۳ صفر ۳۷ھ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا۔

باوجود حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی اس دور اندیشی اور احتیاط کے پھر بھی ساتھ والے معاند آدمی فتنہ و فساد برپا کرنے سے باز نہ آئے اور ابھی اقرار نامہ لکھا ہی گیا تھا کہ اسی وقت حضرت علیؑ کی فوج میں یہ آواز بلند ہو گئی کہ انسانوں کو حکم بنانا درست نہیں لَاحُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ یعنی حکم ہونا اللہ سے مخصوص ہے۔ اس آواز کا سب سے پہلا بلند کرنے والا قبیلۂ بنی تمیم کا ایک شخص عُروہ بن ادیہ تھا[3]۔

یہ جماعت خوارج کا سنگِ بنیاد تھا۔ ان لوگوں نے حضرت علیؑ سے اصرار کیا کہ چلیے معاویہ سے جنگ کیجیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ نے وہی جواب دیا جو رسولِ خداؐ صلح حدیبیہ کے بعد دیتے تھے۔

"ہم نے نوشتہ دے دیا ہے۔ شرائط طے کیے ہیں۔ عہد و میثاق کر لیا ہے۔ اب اسکی مخالفت ممکن نہیں ہے۔ قرآن میں حکم ہوا ہے کہ وفا کرو عہد و پیمان کے ساتھ اور قسم کھانے کے بعد اس کی مخالفت نہ کرو جبکہ تم نے اللہ کو اس کا ضامن بنا دیا ہے اور یقیناً اللہ تمھارے افعال و اعمال پر مطلع ہے۔"

آپ نے اس سختی کے ساتھ معاہدہ پر قیام کیا مگر حکمین نے خود شرائطِ مقررہ کی پابندی نہیں

---

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۴۶ [2] طبری ج ۶ ص ۳۲ ارشاد ص ۲۴۳ [3] طبری ج ۷ ص ۳۰ و ۳۱

کی اور کتاب خدا و سنتِ رسولؐ سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھا۔ چونکہ ابو موسیٰ سادہ لوح آدمی تھے اور جناب امیرؑ سے کوئی خلوص و محبت بھی نہیں رکھتے تھے، انھیں عمرو بن العاص نے اپنی سیاست کا شکار بنا لیا۔ اس طرح کہ جب وقت مقررہ پر دومۃ الجندل میں جو کوفہ و شام کے لحاظ سے بالکل وسط میں واقع تھا اور اس لیے فیصلہ کے لیے وہیں اجتماع طے پایا تھا۔ یہ لوگ یکجا ہوئے۔ روزانہ ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ قائم ہو گیا تو عمرو بن عاص نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب گفتگو ہو تو ابو موسیٰ اشعری کو اپنے اوپر مقدم قرار دیں اور کہیں کہ آپ بزرگ ہیں۔ رسولِ خداؐ کی صحابیت کا مجھ سے زیادہ شرف رکھتے ہیں۔ آپ پہلے تقریر کیجیے، پھر میں جو کہنا ہے کہوں گا۔ اس طرح عمرو عاص نے ابو موسیٰ اشعری پر اپنے خلوص و عقیدت کا اثر جمایا اور آئندہ کے لیے جو منصوبہ سوچا تھا اس کی تمہید قائم کر دی۔

پھر زیر بحث مسئلہ کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا اور ابو موسیٰ کو یہ پٹی پڑھائی کہ ہم دونوں فریق یعنی حضرت علیؑ اور معاویہ کو ایک ساتھ معزول کر دیں اور پھر مسلمانوں کو اختیار دیں کہ وہ از سرِ نو جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔ ابو موسیٰ اس فریب میں آ گئے اور بخیال خود متفقہ حیثیت سے یہی طے کر لیا۔

جب فیصلہ کا وقت آیا اور طرفین کے آدمی فیصلہ سننے کو جمع ہوئے تو عمرو عاص نے حسب عادت ابو موسیٰ اشعری سے کہا "بسم اللہ! آپ فرمائیے جو کچھ فرمانا ہے۔" ان کو تو عادت پڑی ہی تھی کہ ہمیشہ گفتگو میں پہل وہ کریں۔ وہ بلا عذر تقریر کے لیے آمادہ ہو گئے۔ عبداللہ بن عباس نے جو سمجھ دار آدمی تھے متنبہ بھی کیا کہ دیکھو عمرو بن عاص کہیں چوٹ نہ دے دے۔ پہلے اسے تقریر کر لینے دو۔ پھر تم تقریر کرنا۔ مگر ابو موسیٰ اشعری نے کہا کہ نہیں، ہم نے باہم متفقہ طور پر ایک چیز طے کر لی ہے۔ چنانچہ کھڑے ہو گئے اور حمد و ثنا کے بعد کہنے لگے کہ "ہم نے انتہائی غور و خوض کے بعد ایسی بہترین صورت طے کی ہے جس سے افتراق و اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم دونوں علیؑ اور معاویہ دونوں کو معزول کر دیں اور خلافت کو از سرِ نو مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔ کہ وہ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔" وہ یہ کہہ کر چپ ہو بیٹھے عمرو عاص نے کھڑے ہو کر کہا کہ "حضرات!

آپ لوگوں نے ابوموسیٰ اشعری کی تقریر سُنی وہ علیؑ کے نمائندہ ہیں اور انھوں نے علیؑ کو معزول کر دیا ہے میں معاویہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے علیؑ کے معزول کرنے میں ان سے متفق ہوں مگر معاویہ کو میں برقرار کرتا ہوں۔" یہ سننا تھا کہ ابوموسیٰ چیخ اٹھے۔

"ارے یہ تُو نے کیا کیا؛ خدا تجھ سے سمجھے، تو نے غداری کی، بے ایمانی کی۔ تُو کتّے کی طرح ہے کہ چاہے اس پر حملہ کر دیا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ بھونکنے سے باز نہ آئے گا۔"

عمرو عاص نے جواب دیا۔

"تمھاری مثال گدھے کی سی ہے جس کی پشت پر کتابیں لاد دی گئی ہوں۔"

مجمع میں سے کوئی ابوموسیٰ کی طرف جھپٹ کر حملہ آور ہوا اور کوئی عمرو عاص پر۔ غرض اس ہڑبونگ اور ان تہذیب و اخلاق کے مظاہروں کے ساتھ یہ اجتماع منتشر ہو گیا[1] ظاہر ہے کہ اس طرح کی مکارانہ دھاندلی کو کسی باضابطہ فیصلہ کا درجہ دیا ہی نہیں جا سکتا تھا چنانچہ اسے کسی نے بھی صحیح تسلیم نہ کیا اور اختلاف جوں کا توں قائم رہ گیا لیکن اس سے حضرت علیؑ کی جماعت کے انتشار میں کچھ اور زیادتی ہو گئی۔

اُدھر خوارج نے اپنی جماعت کو منظم کر کے مقابلہ کی تیاری کر دی جس سے ۳۸ھ میں جنگِ نہروان کی صورت پیش آئی۔

واقعات کے اس طویل سلسلہ میں بڑے نتائج برآمد ہوتے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ ایک قائد کو اپنے ساتھ والوں کے ہاتھوں جبکہ وہ خالص و مخلص، یکدل اور ہم آہنگ نہ ہوں کتنی کشمکش اور روحانی تکلیف کا سامنا ہوا ہے اور اس سے مقصد کو کس درجہ نقصان پہنچ جاتا ہے۔

نہروان کے بعد بھی یہ فتنے اور شورشیں بالکل ختم نہیں ہوئیں۔ ایک طرف خوارج نہروان کے ہم خیال افراد جو جنگ میں نہیں گئے تھے اور شہروں کے اندر مقیم تھے حضرت امیرؑ کے خلاف فضا میں انتشار پیدا کرتے رہتے تھے اور دوسری طرف امیر شام معاویہ جنھوں نے اہلِ کوفہ کے افتراق سے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۴۰

فائدہ اٹھاکر اپنی قوت کو زیادہ منظم کر لیا تھا برابر اطراف مملکت میں اپنی فوجیں بھیجکر بدامنی کا سلسلہ قائم کیے ہوئے تھے جس میں خفیہ اور علانیہ ہر قسم کے اقدامات شامل تھے مثلاً مصر میں جناب امیرؑ کے بہت بڑے معاون مالک اشتر کا زہر دلوا کر خاتمہ کیا[1] اس کے بعد محمد بن ابی بکر گورنر بنا کر بھیجے گئے تو عمرو بن عاص نے خطوط لکھ کر خود مصر کے بعض عمائد سے ساز باز کی اور پھر اپنی فوج لے کر حملہ کر دیا۔ اُدھر سے شام کی فوج اور اِدھر سے خود مصر والوں کا ایک مسلح لشکر محمد بن ابی بکر مع اپنی جماعت کے چکی کے دو پاٹوں[2] میں آ گئے۔ آخر اُن کی فوج نے شکست کھائی اور خود انتہائی بیدردی کے ساتھ قتل کیے گئے، ملکہ لاش کو بھی آگ میں جلا دیا گیا[3]۔ محمد ابن ابی بکر کے بعد مصر میں معاویہ کا تسلط قائم ہو گیا۔ اسی سے ان کی ہمت اور بڑھی چنانچہ ۳۹ھ میں نعمان بن بشیر کی سرکردگی میں دو ہزار کی فوج نے عین التمر پر حملہ کیا جو ناکامی کے ساتھ پسپا ہوا[4]۔ سفیان بن عوف غامدی نے چھ ہزار کی فوج کے ساتھ انبار پر حملہ کیا اور اشرس بن حسان بکری کو جو جناب امیرؑ کی طرف سے وہاں مقرر تھے ان کے تیس ہمراہیوں سمیت قتل کر دیا اور تمام مال و اسباب لوٹ کر واپس چلا گیا[5]۔ عبداللہ بن مسعدہ خزاری نے سترہ سو آدمیوں کے ساتھ تیماء پر حملہ کیا۔ حضرت علیؑ نے مسیّب بن نجبہ فزاری کو اس کے مقابلہ کے لیے بھیجا جنھوں نے جنگ کر کے اس کو شکست دی اور اس نے شام کی جانب فرار کیا[6]۔ اسی صورت سے ضحاک بن قیس کو تین ہزار فوج کے ساتھ بھیجا گیا جو لوٹ مار کرتی ہوئی قادسیہ کے حدود[7] تک پہنچ گئی اور حجر بن عدی فوج لے کر گئے تو اس نے فرار اختیار کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صفین کی جنگ کے بعد محسوس ہو گیا تھا کہ حضرت علیؑ سے کھلے میدان میں مقابلہ کر کے کامیابی حاصل کر لینا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ گوریلا جنگ کا طریقہ اختیار کر لیا گیا تھا جس سے اسلامی مملکت میں ایک مستقل خلفشار قائم رکھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ کا سب سے اندوہناک سانحہ بسر بن ابی ارطاۃ کا تین ہزار کی فوج کے ساتھ حجاز پر حملہ تھا جس نے مدینہ اور مکہ والوں

---

[1] طبری ج ۶ ص ۵۴ [2] طبری ج ۶ ص ۵۷ [3] طبری ج ۶ ص ۶۰ [4] طبری ج ۶ ص ۷۷
[5] طبری ج ۶ ص ۷۸ [6] طبری ج ۶ ص ۷۸ [7] طبری ج ۶ ص ۸۰

سے بجبر بیعت لینے کے بعد یمن کا رُخ کیا اور وہاں کئی آدمیوں کو قتل کیا۔
عبیداللہ بن عباس کا مکان لُوٹا اور اُن کے دو کمسن بچوں کو ذبح کرا دیا۔ پھر جب حضرت علیؓ نے مقابلہ کے لیے لشکر بھیجا تو وہ مع اپنی فوج کے فرار کر گیا۔[1]

یہ بزدلی کا طریقہ جنگ حضرت علیؓ کے لیے انتہائی تکلیف کا باعث تھا۔ مجبوراً پھر آپ نے تہیہ فرمالیا تھا کہ دمشق پر فوج کشی کر کے ہمیشہ کے لیے اس قصہ کو ختم کیا جائے۔ جس کے لیے آپ نے ایک نہایت پُرزور خطبہ پڑھ کر مسلمانوں کو آمادہ کر لیا مگر اس کے بعد ایک ہفتہ بھی پورا نہ ہُوا تھا کہ مسجد میں عین حالتِ نماز میں ۱۹ ماہ رمضان کو آپ کے سر مبارک پر ابن ملجم مرادی نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار لگائی[2] جس کے اثر سے ۲۱ ماہ رمضان ۴۰ھ کو آپ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔

اس وقت حسینؓ بن علیؓ چھتیس برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس طولانی دور میں حسینؓ نے اپنے والد بزرگوار علیؓ بن ابیطالبؑ سے کیا کچھ دیکھا، کیا کچھ سُنا اور کتنا اثر لیا؟

مسلّم الثبوت شیعی معتقدات سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی عام تاریخی حالات اور ظاہری اسباب کے ماتحت یہ اہم تجربات اور گراں قدر تعلیمات جو ایک ربع صدی سے زیادہ تک حضرت امام حسینؓ کو حاصل ہوتے رہے۔ ایک انسان کے بلندی اخلاق و صفات اور پختہ کاری کے قطعی ضامن اور ذمہ دار ہیں۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۸۰-۸۱ [2] طبری ج ۶ ص ۸۴-۸۵

ساتواں باب

بنی امیّہ کا اقتدار اور ان کی سیاسی روش

بنی امیّہ اور اس طرح کے اکثر لوگ جو دبدبہ اور شکوہ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے ان کی نفسیاتی کیفیت وہی تھی جو ہر دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوم کی ہوتی ہے یعنی نفرت، دشمنی، غصہ، جذبۂ انتقام اور اس کے ساتھ ساتھ ڈر جس کے نتیجہ میں وہ کھل کر اپنی عداوت کا اظہار تو نہ کر سکتے تھے مگر برابر موقع کے منتظر تھے کہ کس طرح ہم اسلام کو نقصان پہنچائیں اور اگر اس کو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم ان خصوصیات امتیازی کو تبدیل کر دیں جو اس نے قائم کیے ہیں اور جن سے ہمارے اقتدار کو صدمہ پہنچا ہے اور اسلام کے پردے میں ہی سہی ان حدود و امتیازات کو قائم کر دیں جو اسلام کے پہلے عرب میں قائم تھے۔ انھوں نے اس کی تیاری تو رسولؐ کے زمانہ ہی سے شروع کر دی تھی مگر پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی میں ان کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی۔ پیغمبرؐ نے ان کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے واسطے ہر طرح کوشش کی مگر ان کے جذبات وہی رہے اور ایک ذرا اسلام پر کوئی مصیبت پڑتی تو ان کے چہرے خوشی سے کھل جاتے اور کبھی جذباتِ دلی زبان پر آ جاتے تھے۔ چنانچہ جنگِ حنین میں جب معدودے چند کے سوا باقی تمام مسلمان میدان جنگ سے رُو بفرار ہوئے تو ابوسفیان نے کہا، بس اب یہ سمندر تک بھاگتے چلے جائیں گے۔ اور ایک نومسلم نے کہا۔ بس اب جادو ختم ہو گیا۔[1]

وفاتِ رسولؐ کے بعد ابوسفیان نے اسلام پر حملہ کرنے کی پہلی کوشش وہ کی جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے پاس آ کر آپ کو تلوار اٹھانے پر آمادہ کرنا چاہا۔

---

[1] طبری ج ۳ ص ۱۲۸

یقیناً اس موقع پر اگر کوئی جذباتی انسان ہوتا تو ابوسفیان کا یہ حربہ اتنا کاری ثابت ہوتا کہ اسلام کی بنیاد ہل جاتی۔ مسلمان اسی وقت خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتے اور اسلام کا شیرازہ درہم و برہم ہو جاتا مگر وہ نورِ الٰہی سے دیکھنے والے نباض فطرت علیؑ تھے جنھوں نے مخاطب کے مقصد کو تاڑ لیا اور باوجودیکہ خلافت کا مستحق وہ صرف اپنے کو سمجھتے تھے۔ پھر بھی ابوسفیان کو ڈانٹ کر جواب دیا کہ تم ہمیشہ اسلام اور اہلِ اسلام کے دشمن رہے ہو۔

جب ادھر سے مایوسی ہوئی تب ابوسفیان نے چولا بدلا۔ اُدھر جا کر مل گئے اور اس روش میں کامیابی بھی ہوگئی۔ اس طرح کہ ۱۳ھ ہجری کے آغاز میں خلیفۂ اول ابوبکر نے ملک شام پر فوج کشی کا بندوبست کیا اور سات ہزار کے لشکر کے ساتھ یزید بن ابی سفیان کو روانہ کیا۔[1] فوج کے دوسرے حصہ پر ابوعبیدہ جراح کو مقرر کیا گیا اور یزید بن ابی سفیان کے ساتھ سہیل بن عمرو اور دیگر شیوخ قریش کو مشیر کار بنایا گیا اور اس کے بعد جب کچھ اور فوج جمع ہوئی تو اس پر معاویہ ابن ابی سفیان کو افسر مقرر کر کے یزید کے پاس روانہ کیا گیا۔[2]

مجموعاً یہ ستائیس ہزار کی جمعیت ہوگئی۔ ان لوگوں کی امداد کے لیے خالد بن الولید کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی فوج لے کر عراق سے پہنچ جائیں چنانچہ ۹ ہزار فوج لے کر وہ پہنچے۔ اس طرح مسلمانوں کا چھتیس ہزار کا لشکر ہوگیا۔ اسی وقت ان امراء میں سے ہر ایک کو ایک جگہ کی حکومت کے لیے نامزد بھی کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ابوعبیدہ جراح کو حمص، شرحبیل بن حسنہ کو شرق اردن، عمرو بن عاص اور علقمہ بن مجزز کو فلسطین اور یزید بن ابی سفیان کو دمشق کا حاکم قرار دیا گیا۔[3]

اس فوج میں خود ابی سفیان فوج کے سرداروں کا دل بہلانے کے لیے قصہ گوئی کی خدمت انجام دیتے تھے۔[4]

ابوسفیان کی اولاد میں سے یزید اور معاویہ کے علاوہ ان کی ایک بہن جویریہ بنت ابی سفیان بھی اپنے شوہر کے ساتھ موجود تھیں اور انھوں نے جنگ میں شرکت بھی کی۔[5]

---

[1] طبری ج ۴ ص ۲۸ [2] طبری ج ۴ ص ۳۰ [3] طبری ج ۴ ص ۳۲ [4] طبری ج ۴ ص ۳۴ [5] طبری ج ۴ ص ۳۶

اس دوران میں خلیفۂ اوّل کا انتقال ہو گیا لیکن ملک شام میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ رجب ۱۴ھ میں شہر دمشق فتح ہوا اور حسب قرارداد سابق یزید بن ابی سفیان وہاں کے حاکم ہوئے[۱] اس کے بعد تدریجاً شام کے دوسرے شہر بھی فتح ہوئے۔

۱۸ھ کے طاعون میں ابوعبیدہ اور یزید بن ابی سفیان دونوں کا انتقال ہو گیا[۲]

ابوسفیان اس وقت مدینہ میں تھے۔ ان کو بیٹے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی کہ شام کے ملک کی۔ چنانچہ خلیفۂ دوم نے جب انھیں بلا کر یزید کے مرنے کی اطلاع دی تو انھوں نے فوراً یہ سوال کیا کہ آپ نے اس کی جگہ پر کسے مقرر کیا؟ جب معلوم ہوا کہ معاویہ کو وہاں کا حاکم بنا دیا گیا تو وہ خوش ہو گئے[۳]

اب معاویہ بن ابی سفیان کو دمشق اور اس کے مضافات، اور شرحبیل بن حسنہ کو شرق اردن اور اس کے مضافات کی حکومت ملی[۴]۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد شرق اردن کی حکومت بھی معاویہ ہی کو مل گئی[۵]

اس دور میں ابوسفیان وغیرہ نے خوب ہی فوائد حاصل کیے۔ یہاں تک کہ ہندہ مادرِ معاویہ کو جنھیں ابوسفیان نے اب طلاق دے دی تھی مرکزی حکومت کے بیت المال سے چار ہزار درہم کی رقم قرض دی گئی جس سے انھوں نے تجارت شروع کی اور نفع خطیر حاصل کیا اور ابوسفیان دمشق گئے تو انھیں ایک دفعہ میں سو اشرفیاں بطور پرورش حاصل ہوئیں[۶]

حالانکہ ان کے جذبات اسلام کے متعلق اب بھی خیر خواہی کے نہ تھے۔ چنانچہ جنگ یرموک میں جبکہ مسلمانوں کا مقابلہ سلطنتِ روم کے لشکر سے تھا اور معرکۂ کارزار گرم تھا اسوقت ابوسفیان دور سے کھڑا ہوا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ جب رومیوں کو غلبہ حاصل ہوتے نظر آتا تو کہتا تھا ایہ بنی الاصفر یعنی "شاباش اے ملک روم کے بہادرو" اور جب مسلمانوں کو ذرا تقویت حاصل ہوتی تھی تو ابوسفیان کی زبان سے حسرت و یاس کے ساتھ یہ شعر نکلتا تھا ؎

وبنو الاصفر امثالك ملوك الرّوم لم یبق منهم مذكور

---

[۱] طبری ج ۴ ص ۵۵ و ص ۵۹ [۲] طبری ج ۴ ص ۶۰۲ [۳] طبری ج ۵ ص ۶۹ [۴] طبری ج ۴ ص ۶۰۲ [۵] طبری ج ۵ ص ۶۹
[۶] طبری ج ۵ ص ۳۰

مطلب یہ تھا کہ "ہائے افسوس سلطنتِ روم کے پُرشوکت بادشاہوں کا نام مٹتے ہوئے نظر آتا ہے"۔ عبداللہ بن زبیر نے اس واقعہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اپنے باپ زبیر سے بیان کیا۔ اس وقت کہ جب مسلمانوں کو کامل طور پر فتح حاصل ہو چکی تھی زبیر نے کہا۔ خدا اسے غارت کرے، یہ نفاق سے باز نہ آئے گا۔ کیا ہم اس کے لیے رومیوں سے بہتر نہیں ہیں؟[1]

اس کے بعد ۲۳ھ میں جب عثمان خلیفہ ہوئے تو چونکہ وہ خاندان بنی امیہ کے ایک فرد تھے، ابوسفیان وغیرہ سمجھے کہ اب ہماری بن آئی۔ دلی جذبات اتنی قوت کے ساتھ اُبلے کہ تاب نہ رہی۔ ابوسفیان اُن کے پاس آیا۔ وہ اس وقت بہت بوڑھا تھا اور آنکھوں سے بھی معذور ہو چکا تھا۔ اس نے کہا بڑی مدت کے انتظار کے بعد اب یہ خلافت تم تک پہنچی ہے۔ اب اس کو گیند کی طرح اپنی مرضی کے مطابق گردش دو اور بنی امیہ کے ذریعہ سے اس کی بنیادوں کو مضبوط کرو۔ اس لیے کہ جو کچھ ہے وہ یہی دُنیوی سلطنت۔ رہ گیا جنت و دوزخ اس کو میں کچھ سمجھتا نہیں[2]

چنانچہ ابوسفیان کے خاندان والوں نے اس خلافت سے خوب فائدہ اٹھایا اور کوئی شک نہیں کہ ابوسفیان نے اپنے دنیوی خوابوں کی تعبیر اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ ۳۱ھ تک دمشق اور شرق اردن کے ساتھ ساتھ حمص، قنسرین اور فلسطین بھی معاویہ کے زیر نگین ہو گئے اور وہ بلا شرکت غیرے پورے ملک پر قابض قرار دے دیے گئے[3]

اسی ۳۱ھ میں ابوسفیان بن حرب ۸۸ برس کی عمر میں رہ سپارِ عالمِ آخرت ہوئے[4]

مگر وہ مشورہ جو انھوں نے خلیفۂ سوم کو دے دیا تھا وہی ان کے بعد ان کی جان جانے کا باعث ہوا۔ چنانچہ حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ نے اپنی سب سے پہلی ملاقات میں جو اصلاح حالات کے لیے خلیفۂ ثالث سے کی تھی ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ آپ اپنے قرابتداروں کے ساتھ غیر معمولی مراعاتیں برتتے ہیں۔ ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ معاویہ بغیر آپ کی مرضی کے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ عثمان کا حکم ہے۔ آپ کو اس کا علم

---

[1] استیعاب [2] استیعاب [3] طبری ج ۵ ص ۶۹ [4] طبری ج ۵ ص ۷۹

ہوتا ہے اور پھر بھی آپ معاویہ کو اس پر کوئی تنبیہہ نہیں کرتے۔[۱]

اب حضرت عثمان کے منہ پر یہ کہا جانے لگا تھا کہ ان کے بعد عالم اسلامی کی خلافت معاویہ کو ملے گی اور اس کی کوئی رد نہ کی جاتی تھی۔[۲]

غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ جب ان کا محاصرہ ہوا اور انھوں نے معاویہ کو مدد کے لیے لکھا تو معاویہ نے اپنی جگہ سے کوئی جنبش نہیں کی بلکہ نتیجہ کے منتظر ہو گئے[۳]۔ کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ ان کے بعد خلافت مجھے ملے گی اور عمرو بن عاص تو صاف صاف عثمان کے خلاف اشتعال انگیزی کرتے تھے، اور جب قصرِ حکومت کا محاصرہ ہو گیا تو وہ فلسطین جا کر اپنی کوششوں کے انتظار میں بیٹھ گئے اور ہر آنے والے سے مدینہ کا حال بڑی بیتابی سے دریافت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب قتل عثمان کی خبر ملی تو کہا، کیا کہنا میرا۔ یہ تو میری ہی کوشش کا نتیجہ ہے[۴]۔

اس کے بعد یہی عمرو بن عاص معاویہ کے دست راست بنے۔ اور بڑے مناصب حاصل کیے۔ انھوں نے خود ایک موقع پر معاویہ سے صاف کہہ دیا کہ اگر حقانیت سامنے ہوتی تو ہم تمھارا ساتھ ہی کیوں دیتے۔ علیؑ کا ساتھ نہ دیتے جن کے اسلامی خدمات، فضیلت اور رسولؐ سے قرابت سب کو معلوم ہے۔ مگر ہمارے پیش نظر تو دنیا ہے۔ اسی لیے تمھارا ساتھ دے رہے ہیں[۵]۔

آلِ ابوسفیان نے شام میں حکومت قائم کرنے کے بعد ابتدا ہی سے اپنی سیاسی روش شاہانہ رکھی۔ کوئی سیاح اگر ممالکِ اسلامیہ کا سفر کر کے اسلامی سادگی اور مساوات کی مثالیں دیکھ چکا ہوتا اور پھر شام جا کر وہاں کے تزک و احتشام کا مشاہدہ کرتا تو وہ حیرت و استعجاب کی ایک دنیا میں چکر لگانے لگتا۔ وہ سادگی جو اسلامی زندگی کا طرۂ امتیاز تھی وہاں نام و نشان کو بھی نہ تھی بلکہ اس کے بجائے ملوکانہ عظمت و جلالت کے مظاہرات پوری طاقت کے ساتھ نظر آتے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور پیغمبرِ اسلامؐ کے جاری کیے ہوئے طرزِ زندگی سے مانوس بعض صحابہ

۱؎ طبری ج ۵ ص ۹۷ ۲؎ طبری ج ۵ ص ۱۰۰، ۳؎ طبری ج ۵ ص ۱۱۵ ۴؎ طبری ج ۵ ص ۱۰۸، ۱۰۹ و ۱۱۱
۵؎ طبری ج ۵ ص ۲۳۵۔

کو اندیشہ ہوا کہ اس طرح اسلام کا اصول، قدر و قیمت اور معیارِ عظمت جو اس نے بڑی کوشش سے دنیوی جاہ و شوکت کی قدر و قیمت کو مٹا کر قائم کیا تھا فنا ہو جائے گا۔ چنانچہ معاویہ نے پانی پینے کے پیالے سونے کے زیادہ وزن پر فروخت کیے تو ابو درداء صحابی نے منع کیا اور کہا، ہم نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ زیادہ وزن پر خرید منع ہے۔ معاویہ نے کہا، میرے نزدیک تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ سنکر ابو درداء نے کہا۔ کیا خوب! میں تو رسول اللہؐ کا حکم بیان کر رہا ہوں اور تم اس پر اپنی رائے ظاہر کر رہے ہو۔ میں ایسے مقام پر جہاں تم ہو نہیں رہوں گا۔

عبادہ بن صامت (مشہور صحابی) کے ساتھ بھی سونے کی بیع و شراء کے معاملہ میں اسی طرح کا قصہ ہوا تھا اور معاویہ نے ان کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ ہم اس کو کسی طرح برا نہیں سمجھتے۔ عبادہ نے کہا، میں تو رسولِ خداؐ کا حکم بیان کرتا ہوں اور تم اپنی رائے بیان کرتے ہو، خدا مجھے اس جگہ سے نکالے۔ میں اس سرزمین پر ہرگز نہ رہوں گا جس پر تم حاکم ہو۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کشمکش دمشق کی سیاست اور پرستارانِ شریعت میں اس وقت سے شروع ہو گئی تھی۔

اس کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ عبدالرحمٰن بن سہل انصاری قیصری خلافت کے دور میں ایک جہاد کے سلسلہ میں شام کی طرف گئے تو انھوں نے دیکھا کہ اونٹوں پر شراب کی مشکیں بھری ہوئی جا رہی ہیں۔ وہ آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے نیزہ سے ان مشکوں کو چاک کر دیا۔ غلاموں نے مزاحمت کی اور یہ خبر معاویہ کو پہنچائی۔ انھوں نے کہا چھوڑو اس بڈھے کو، اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ عبدالرحمٰن نے کہا میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسول اللہؐ نے ہم کو ممانعت فرمائی ہے کہ شراب ہمارے مشکوں اور ہمارے ظروف میں داخل نہ ہو۔[2]

انہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ ان سن رسیدہ افراد کو جو صحابۂ رسولؐ میں محسوب ہوتے تھے معاویہ سے تنفر پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ معاویہ اہلِ شام کی ایک جماعت کے ساتھ

---

[1] سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۱۷۔ [2] اصابہ ج ۲ ص ۴۰۱۔ اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۹۹۔

جبکہ وہ مکہ معظمہ حج کو گئے ہوئے تھے۔ صبح سویرے سعد بن ابی وقاص کی طرف سے گزرے۔ انھیں سلام کیا مگر سعد نے جواب نہیں دیا۔ معاویہ نے اپنی خفت مٹانے کو اپنے ساتھ والوں سے کہا کہ یہ سعد ہیں، حضرت رسولؐ کے صحابی۔ ان کا اصول ہے کہ سورج طالع ہوتے تک کسی آدمی سے بات نہیں کرتے۔ سعد کو یہ خبر معلوم ہوئی۔ کہا۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں مگر بخدا میں نے اس سے بات کرنا پسند نہ کی[1]

اس کے بعد سلطنت دمشق جتنی طاقتور ہوتی گئی اتنا ہی اس نے اسلامی تمدن کے بجائے دنیا دارانہ تمدن کو فروغ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی قدر و قیمت کے معیار اور وہ امتیازات ختم ہو گئے جو اسلام کے سادہ اور غربا پرور اصول نے قائم کیے تھے۔ اس کا ایک نمونہ ہے ۳۰ھ میں حضرت ابوذر غفاری کا جلاوطن کیا جانا۔ ان کا ایک قصور یہ تھا کہ وہ اس سرمایہ پرستی کی مذمت کرتے تھے جو انھیں اس وقت اسلامی ملک میں نظر آ رہی تھی۔ وہ غریب مسلمانوں کو بھوکا مرتے دیکھتے تو دمشق کی گلیوں میں وہ آیتیں قرآن کی پڑھتے پھرتے تھے جو سرمایہ پرستی کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جو لوگ سونا چاندی خزانوں میں جمع کر رہے ہیں اور انھیں راہِ خدا میں صرف نہیں کرتے انھیں منتظر رہنا چاہیے اس وقت کا کہ جب آتش جہنم سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پشتیں داغی جائیں گی[2]

یہ بھی تھا کہ وہ حکومت کی خوشامد نہیں کرتے تھے بلکہ موقع پر سچی بات کہہ گزرتے تھے۔ چنانچہ جب معاویہ نے قصرِ خضرا کی تعمیر کی تو ابوذر سے پوچھا، کیوں اسے آپ کیسا سمجھتے ہیں؟ حضرت ابوذر نے فرمایا۔ اگر تم نے اسے خدا کے مال سے بنایا ہے تو تم نے خیانت کی اور اگر خود اپنے ذاتی مال سے بنایا ہے تو اسراف کیا[3]

مزاج قیصریت اس کا متحمل کب ہو سکتا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شکایت دارالسلطنت مدینہ میں بھیجی گئی اور وہاں سے ہدایت ہوئی کہ ابوذر کو مدینہ کی طرف روانہ کر دو[4]

---

[1] الوزراء والکتاب ص ۲۶ [2] طبری ج ۵ ص ۶۶ [3] کتاب البلدان ص ۱۵۶ [4] طبری ج ۵ ص ۶۶

ابوذر شام سے مدینہ بھیج دیے گئے اور یہاں پہنچ کر بجائے اس کے کہ معاویہ کو کچھ تنبیہہ کی جاتی اس جلیل القدر صحابی کو مدینہ سے نکلنے کا حکم ہوگیا۔ مسافرت اور بے سروسامانی، آس پاس کوئی ہمدرد کیسا شناسا تک نہیں۔ آخر یہ شدلیدنہ اُٹھ سکے ۳۳ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

جب ابوذر کی حالت خراب ہوئی پاس صرف بیوی اور ایک لڑکی تھی۔ ابوذر نے انکو وصیت کی کہ مرنے کے بعد تم دونوں مل کر مجھے غسل دینا، کفن پہنانا اور پھر لاش کو لے جاکر قافلہ کی گزرگاہ پر لٹا دینا اور جو قافلہ اُدھر سے گزرے اس سے کہنا یہ رسولِ خدا کا صحابی ابوذر ہے اس کو دفن کرادو۔ چنانچہ جب ان کا انتقال ہوگیا تو غمزدہ ماں بیٹی نے اسی ہدایت پر عمل کیا۔ لاش کے ساتھ سرراہ آکر بیٹھ گئیں۔ اتفاقاً عبداللہ بن مسعود اہلِ عراق کے ایک قافلہ کے ہمراہ جو مکہ معظمہ حج کے لیے جارہا تھا ادھر سے گزرے۔ روتی ہوئی خاتون اور بچی کو دیکھ کر ٹھہر گئے اور دریافتِ حال کیا۔ مصیبت زدوں نے کہا "لوگو! رسولؐ کے مظلوم صحابی ابوذر نے غربت کے عالم میں وفات پائی۔ انہی کا لاشہ ہے جو بے گوروکفن پڑا ہے۔ ابن مسعود اور ان کے ساتھی چیخیں مار مار کر رونے لگے اور انھوں نے ابوذر کو دفن کیا۔

یہ حکومتِ وقت کی سیاست ملوکانہ کے خلاف پہلی قربانی تھی جو رسولؐ کے مقدس صحابی حضرت ابوذر غفاری نے پیش کی۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ ابوذر غفاری اور عبدالرحمٰن بن سہل انصاری اپنی فرض شناسی کی بنا پر اسلام کے قائم کردہ حدود امتیازات میں بڑی عظمت کے مستحق تھے مگر موجودہ سیاست کے حدود میں وہ بالکل کم حقیقت اور بے وقعت ہوگئے تھے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اسلامی انقلاب کی جگہ قدامت پرستانہ انقلاب فتح پانے لگا اور اسلام کے مقرر کردہ حدود کے بجائے دوسرے حدود و امتیازات قائم ہوگئے۔

آٹھواں باب

پیغمبرِ خدا کے بعد اسلامی مفاد کے محافظین
اُن میں اور مخالف قوتوں میں تصادم اور اُس کے نتائج

یہ ایک نمایاں حقیقت ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے بعد پیغمبرؐ کے حقیقی ورثہ دار جو ان کے اہلبیتؑ تھے۔ اسلامی اقدا[illegible]ں کے خصوصیات و امتیازات کے محافظ تھے۔ دنیا میں عالی شان محل تعمیر ہو چکے تھے۔ لیکن ان کا وہی چھوٹا سا مکان تھا جس میں انھیں پیغمبرؐ نے رکھ دیا تھا۔ دنیا کے محلات میں ریشمی پردے دروازوں پر ہو گئے تھے مگر ان کے دروازے پر وہی ٹھپا ہوا پردہ اب بھی نظر آتا تھا۔ دنیا کے جسم پر حریر و دیبا نظر آتا تھا لیکن یہ کھدر کا ملبوس اب بھی زیب تن کرتے تھے دنیا مفتوحہ ممالک کی دولت سے چین کرتی اور عیش و عشرت میں زندگی گزارتی تھی مگر یہ اب بھی اپنے ہاتھ کی محنت سے روزی کمانا اور مالِ حلال کی تلاش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور جو دولت ملتی اسے غریبوں، مسکینوں، بیواؤں اور یتیموں کی نذر کر دیتے، اور اس بنا پر ان میں اور اس کے متوازی دوسرے انقلاب کے علم برداروں میں کشمکش لازمی تھی۔ حضرت علیؑ سے معاویہ کا تصادم جس کے بہت سے واقعات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اسی کشمکش کا نتیجہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت اور اس کے علاوہ جب کبھی بھی مقابلہ پڑا ہے دنیا میں آلِ رسولؐ کے ساتھی کم نکلے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ اس کے وجوہ اقتصادی بھی ہیں اور سیاسی بھی۔ نفسیاتی بھی اور نسلی بھی۔ یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام قدیم امتیازات کو مٹا کر مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا، اور اس نے امتیاز صرف فرائضِ انسانی کی زیادہ سے زیادہ بجا آوری کی بنا پر قرار دیا تھا۔ مشترکہ دولت جو مالِ غنیمت سے حاصل ہوتی ہے اس کی اس طرح تقسیم کہ

جس میں جانبداری اور عدم مساوات پیدا ہو جائے اسلام کے اصول کے خلاف تھی اور اسلام کے سچے محافظین اس کے قریب نہ جا سکتے تھے۔ اس لیے آلِ رسولؐ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ خزانہ میں روپیہ جمع کر کے دولتمند بنیں اور خصوصیت سے ان لوگوں کو زر و جواہر سے مالا مال کریں جن سے ان کو اپنے اقتدار کے قوی بنانے میں فائدہ کی امید ہو۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ جو کچھ بیت المال میں آتا ہے روز کا روز تقسیم کر دیتے ہیں اور پھر بیت المال میں جھاڑو دلوا دیتے ہیں اور وہیں پر نماز پڑھتے ہیں کہ وہ زمین خدا کے یہاں گواہی دے کہ علیؑ نے مسلمانوں کے مال کے پہنچانے میں مستحق لوگوں تک دریغ نہیں کیا۔[1]

اصفہان سے مال آتا ہے۔ اس وقت اتفاق سے سات سو ایسے صاحب استحقاق موجود ہیں آپ نے تمام مال کے سات برابر حصے کر دیے اور ایک روٹی بھی اس مال میں نظر آگئی تو اُسکے بھی سات ٹکڑے کر کے ہر حصہ میں ایک ٹکڑا رکھ دیا۔ ممکن ہے خیال کیا جائے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا آدمی کو لحاظ نہیں کرنا چاہیے اور اس روٹی کو کسی ایک حصہ میں شامل کر دیا جاتا تو بظاہر شریعت کے مطابق کوئی جرم نہ تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ذہنیتِ عوام کی تشکیل ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے۔ حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ تو عوام کی ذہنیت اسی مساوات کے سانچے میں ڈھالنے کا کام انجام دے رہے تھے جسے رسولؐ نے سکھایا تھا اور مسلمان رسولؐ کی رحلت کے بعد اُسے بھلا بیٹھے تھے۔

اس کے برخلاف امیرِ شام کے یہاں ان باتوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہاں اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کے لیے خزانہ کا منہ کھلا تھا اور جس کو مطلب کا سمجھا جاتا تھا اسے مالا مال کر دیا جاتا تھا۔ پھر لوگ جو امتیازات کے عادی ہو چکے تھے ان کا ساتھ دیتے یا اُن کا؟

دنیا کی تو یہ حالت ہے کہ چاہے ملے ملائے کچھ نہیں لیکن اگر معلوم ہو کہ کسی کے پاس روپیہ بہت ہے اور خزانہ میں دولت جمع ہے تو یہی اس کا اثر قائم ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

---

[1] استیعاب جلد ۲ ص ۴۷۸

اور اس طرح اس کی ساکھ قائم ہو جاتی ہے۔ یہاں حضرت علیؓ کی یہ کیفیت کہ منبر پر اپنی تلوار کے فروخت کا اعلان کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ مجھے ایک لباس کی ضرورت ہے جو بغیر اس تلوار کے فروخت کیے ہوئے ممکن نہیں ہے۔ عبدالرزاق محدث نے اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ اس حالت میں تھا کہ جب سوا شام کے تمام عالم اسلام کی سلطنت آپ کے قبضہ میں تھی[1] ہر ایک حریص شخص سمجھتا تھا کہ جس کے پاس خود اپنے لباس کے لیے روپیہ نہ ہو اس کے پاس ناحق کسی دوسرے کو دینے کے لیے روپیہ کہاں ہو سکتا ہے۔

دنیا ظاہری طمطراق اور آؤ بھگت سے بھی مرعوب ہوتی ہے مگر یہاں یہ حالت تھی کہ جناب امیرؑ اپنی حکومت کے زمانے میں کبھی اس کو عار نہ سمجھتے تھے کہ قنبر کی دکان پر خرید و فروخت کریں۔ بازار میں قنبر کو ساتھ لے کر گئے اور دو پیراہن خرید کیے۔ ایک سات درہم کا اور ایک پانچ درہم کا۔ سات درہم کا پیراہن قنبر کو دیا اور پانچ درہم کا خود زیب بدن کیا۔ قنبر نے کہا یہ زیادہ قیمت والا آپ لیں۔ کوئی اور ہوتا اور وہ ایسا کرتا تو شاید جواب دینا کہ میں مساوات کے پھیلانے اور غلاموں کا درجہ بلند کرنے کے لیے ایسا کرتا ہوں۔ علیؑ کا مقصد یقیناً ایسا ہی تھا لیکن اگر یہ جواب دیتے تو اس میں خود عدم مساوات کا پہلو مضمر تھا۔ سننے والے کو احساس غلامی ضرور پیدا ہو جاتا اس لیے آپ نے ایسا جواب دیا جو اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے۔ فرمایا قنبر! تم تو عمر ہو، تمھیں وہی پیراہن اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میرا کیا، میں یہی پہن لوں گا۔ ان باتوں کی قدر اہل دنیا کہاں کر سکتے تھے اور ان کے دل پہ ان باتوں کا اثر کہاں قائم ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اسلام نے ان تمام مقتدر اشخاص اور جماعتوں کے امتیازات کو ختم کیا تھا جو اس کے پہلے برسر اقتدار تھیں۔ وہ مقتدر جماعتیں آپس میں کتنی ہی رقیبانہ چشمک رکھتی ہوں لیکن اسلام سے زخم خوردہ وہ سب ہی تھیں۔ اس لیے اسلام کے حقیقی مقصد اور قائم کردہ امتیاز کے مٹانے میں وہ سب ہم آہنگ بن سکتی تھیں کیونکہ اس کے مٹانے میں ان میں سے ہر

---

[1] استیعاب ج ۲ ص ۴۷۸

ایک کے اقتدار رفتہ کی واپسی منحصر تھی اور پھر سابق کی شکستوں کا اثر سب ہی پر تھا اور سب ہی میں جذبۂ انتقام پایا جاتا تھا۔ پھر یہ بھی کہ اسلام نے اپنے اصول مساوات کی تلقین سے خود قوم عرب کا بحیثیت قوم بھی امتیاز خاص ختم کیا تھا۔ اور پردیسیوں کے حقوق پر بڑا زور دے دیا تھا اور غیر عربی عناصر جو آتے تھے انھیں عربوں کے برابر حقوق دیے جاتے تھے۔ یہ بات تمام عرب ہی کے کھلنے کی تھی۔ بنی امیہ نے اپنے دور میں عربی تعصب کا مظاہرہ کر کے عربی قومیت کے امتیاز کی حمایت کی اور موالی اور اعجام کی کور دبانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس دور کے امتیازی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ عرب اور غیر عرب کا سوال پیدا ہو گیا۔ بنی امیہ کی اس سیاسی روش کا قدرتاً یہ نتیجہ ہونا چاہیے تھا کہ عرب زیادہ تر بنی امیہ کے طرفدار ہو جاتے۔ بنی ہاشم اسلامی اصول کے حامی ہونے کی وجہ سے عربی قومیت کے اس جذبہ کی طرفداری نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کا عرب کی جانبداری کا پہلو کمزور تھا۔ اس کی تصدیق اس سے ہو سکے گی کہ اس کے بعد جب بنی امیہ کے خلاف ہاشمیین یعنی بنی عباس وغیرہ نے علم بلند کیا تو ہاشمیین کا ساتھ دینے والے موالی اور عجم زیادہ تھے۔

بنی ہاشم کے قدیمی روایات اور سیادت و شرافت کے امتیاز کی وجہ سے عرب خاندانوں کو ان سے پہلے ہی حسد و عناد تھا۔ اس لیے نسلی تعصبات بھی مخالفت پر آمادہ کرتے تھے اور عرب میں قبائلی نظام بڑی قوت کے ساتھ قائم تھا۔ ہر قبیلہ کے سرگروہ اور بڑے افراد اپنے جذبات کی بنا پر جس راستے پر جاتے تھے عوام اور پست افراد اہل قبیلہ بھی ان ہی کی پیروی کرتے تھے کیونکہ عوام کا کوئی نظریہ نہیں ہوا کرتا۔ وہ لیڈروں کے پابند ہوتے ہیں اور لیڈر زیادہ تر جذبات کے شکنجہ میں قید ہوتے ہیں۔ انہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ آل رسولؐ کے مقابلہ میں ان کے مخالفین کی تعداد زیادہ رہتی تھی۔

نواں باب

حسن مجتبیٰؑ کی صُلح اور اس کے نتائج

سنہ ۴۰ھ سنہ ۶۰ھ

انتقال فرمانے سے پہلے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے ایک تحریری وصیت نامہ امام حسنؑ کے نام لکھا اور اس پر امام حسینؑ اور محمد بن حنفیہ اور اپنی دیگر اولاد، اعزّا اور مخصوص اصحاب کی گواہیاں لکھوائیں اور وصیت نامہ حسن مجتبیٰؑ کو سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت تم اسے حسینؑ کے سپرد کر دینا[1] اس کے علاوہ ایک وصیت آپ نے حسنؑ اور حسینؑ دونوں بھائیوں سے مشترک طور پر فرمائی وہ یہ تھی کہ "میں تم کو فرض شناسی کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ تم کبھی دنیا کے طلب گار نہ ہونا، چاہے وہ دنیا خود تمھاری طلبگار رہو، اور کسی دنیوی نقصان پر کبھی رنجیدہ نہ ہونا اور ہمیشہ حق کے لیے زبان کھولنا اور ثواب کے لیے کام کرنا اور ظالم کے مدِمقابل اور مظلوم کے مددگار رہنا[2] میں تم کو اپنی تمام اولاد اور اعزّا اور ان لوگوں کو جن تک میرا پیغام پہنچے وصیت کرتا ہوں کہ ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا اور اپنے شیرازہ کو منتشر نہ ہونے دینا اور اپنے درمیانی جھگڑوں کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کرتے رہنا اور دیکھو یتیموں کا خیال رکھنا، ان کی برابر خبر گیری کرتے رہنا اور پڑوسیوں کا خیال رکھنا اس لیے کہ رسول اللہؐ نے ان کے بارے میں وصیت کی تھی، اور دیکھو قرآن کا خیال رکھنا۔ تم سے بڑھ کر کوئی قرآن پر عمل کرنے والا نہ ہو، اور نماز کا خیال رکھنا، یہ تمھارے دین کا ستون ہے۔ اور اللہ کے گھر (خانہ کعبہ) کا خیال رکھنا۔ زندگی بھر اس کو کبھی اکیلا نہ چھوڑنا، اور

---

[1] کافی ج ۱ ص ۱۸۴ [2] طبری ج ۶ ص

دیکھو خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا، اور آپس میں صلۂ رحم رکھنا، اور ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کے ساتھ پیش آنا اور دیکھو کبھی خلق خدا کو نیک اعمال کی ترغیب دینے اور بداعمالیوں سے روکنے سے باز نہ آنا تاکہ تم پر بُرے لوگوں کا اقتدار قائم نہ ہونے پائے۔[1] اور دیکھو میرے بعد ایسا نہ ہونے پائے کہ بنی ہاشم مسلمانوں میں میرے خون کے بہانے سے خونریزی شروع کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ میرے خون کے قصاص کے طور پر بس میرے قاتل کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کو ایک ضربت کی پاداش میں بس ایک ہی ضربت لگائی جائے اور اس کو ہرگز مثلہ نہ کیا جائے۔ یعنی اعضاء و جوارح قطع نہ کیے جائیں۔ اس لیے کہ رسول اللہؐ فرما گئے ہیں کہ خبردار کسی کو مثلہ نہ کرو چاہے وہ کاٹنے والا کتا ہی کیوں نہ ہو۔[2]

نفسیات کے واقفکار خوب جانتے ہیں کہ کچھ وہ حالات ہوتے ہیں جن میں بات پتھر کی لکیر کی طرح سننے والے کے دل پر جم جاتی ہے۔ یہ صورت کہ ایک بزرگ مرتبہ واجب الاطاعت باپ بستر بیماری پر ہے۔ اس کی رحلت کا ہنگام قریب ہے اور اس وقت وہ اپنے تمام اہل بیتؑ میں سے دو ایک سعید فرزندوں کو خصوصیت کے ساتھ بلا کر کوئی خاص بات کہتا ہے۔ یقیناً اس وقت کی کہی ہوئی بات ان فرزندوں کے دل و دماغ پر ایسا اثر کرے گی جیسا کسی دوسرے صبر و سکون کے لمحوں کی بات اثر نہیں کر سکتی۔

عام دنیا سے جانے والے باپ اس وقت اپنی اولاد سے وصیت اپنے گھر کے نجی معاملات کے متعلق کرتے ہیں مگر آلِ محمدؐ تو دین و شریعت، کتاب اور سنت کو اپنے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس وقت پر جو وصیتیں کی ہیں وہ سراسر مفادِ عامہ، مفادِ شریعت اور احکامِ الٰہی سے متعلق تھیں۔

یوں تو یہ فرزندوہ تھے جو خود صحیح اور مناسب ہی کام کرتے مگر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ

---

[1] نہج البلاغہ ج ۲ ص ۷۸-۷۹۔ طبری اور ابوالفرج اصفہانی نے ان میں سے اکثر فقرات کو امام حسنؑ کے نام کے تحریری وصیت نامہ میں درج کیا ہے۔ مقاتل الطالبیین ص ۲۵۔ ۲۷۔ [2] طبری ج ۶ ص ۸۶ نہج البلاغہ ج ۲ ص ۸

کو تو لیظاہر اسباب ایک مربی باپ کی طرح اپنا فرض انجام دینا تھا جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان وصیتوں کا ہر ہر لفظ سعادت شعار بیٹوں کے دل پر نقش ہو جائے۔ یہ الفاظ ان کے کانوں میں ہمیشہ گونجتے رہیں کہ فرض شناسی کو اپنا اصول رکھنا۔ دنیوی جاہ و اقتدار کے کبھی طالب نہ ہونا۔ دنیوی نقصان کی کبھی پروا نہ کرنا۔ زبان پر حق کو جاری رکھنا۔ ظالم کے مدِمقابل رہنا اور مظلوم کے مددگار رہنا۔ چنانچہ ان تمام تعلیمات کو دونوں فرزندوں نے اپنے عمل سے مجسم شکل میں پیش کیا اور آپس میں ہم آہنگی کو بھی ہر صورت میں برقرار رکھا۔

یہ الفاظ کہ "خدا کی راہ میں اپنے جان و مال اور زبان سے جہاد کرتے رہنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھی باتوں کی ہدایت اور بری باتوں سے ممانعت) کو کبھی ترک نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر بُرے لوگوں کا اقتدار قائم ہو جائے۔"

خصوصیت کے ساتھ ان کو عملی جامہ پہنانے کا جس طرح حسینؑ کو موقع ملا وہ دنیا کی تاریخ میں یادگار ہے۔

حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی وفات کے بعد تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر آپ کے بڑے فرزند امام حسنؑ کی خلافت تسلیم کی۔ آپ پر اپنے والد بزرگوار کی شہادت کا بڑا اثر تھا۔ آپ نے اس موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے فضائل و مناقب تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے خاص طور پر آپ کی سیرت اور ترکِ دنیا کا تذکرہ کیا اور اس ذکر میں گریہ آپ کے گلوگیر ہوا اور تمام حاضرین بھی آپ کے ساتھ بے اختیار رونے لگے۔ پھر آپ نے اپنے ذاتی اور خاندانی فضائل بیان کیے۔ اس کے بعد عبداللہ بن عباس نے کھڑے ہو کر لوگوں کو آپ کی بیعت کرنے کی طرف دعوت دی۔ اور سب نے برضا و رغبت آپ کی بیعت کی۔ یہ جمعہ کے دن ۲۱ ماہ رمضان ۴۰ھ کا واقعہ ہے[1] آپ نے اسی وقت لوگوں سے صاف صاف یہ قول و قرار لے لیا تھا کہ اگر میں صلح کروں تو تم کو صلح کرنا ہوگی اور اگر میں جنگ کروں تو تمھیں میرے ساتھ مل کر جنگ کرنا ہوگی۔ اس کے بعد آپ ملک کے بندوبست کی

---

[1] ارشاد ص ۱۹۲

طرف متوجہ ہوئے۔ اطراف میں عمّال مقرر کیے، حکام معیّن کیے اور مقدمات کے فیصلے کرنے لگے۔

ابھی ملک حضرت علیؑ کے غم میں سوگوار ہی تھا اور حضرت امام حسنؑ پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ معاویہ کی طرف سے آپ کی مملکت میں دراندازی شروع ہو گئی اور ان کے خفیہ کارکن ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ چنانچہ ایک شخص قبیلۂ حمیر کا کوفہ میں اور ایک شخص بنی قین میں سے بصرہ میں پکڑا گیا۔ یہ دونوں اس مقصد سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات سے دمشق میں اطلاع دیں اور فضا کو امام حسنؑ کے خلاف ناخوشگوار بنائیں۔ غنیمت ہے کہ اسکا انکشاف ہو گیا۔ حمیر والا آدمی کوفہ میں ایک قصائی کے گھر سے اور قین والا آدمی بصرہ میں بنی سلیم کے یہاں سے گرفتار کیا گیا اور دونوں کو جرم کی سزا دی گئی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت امام حسنؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "تم اپنی دراندازیوں سے باز نہیں آتے ہو۔ تم نے لوگ بھیجے ہیں کہ میرے ملک میں بغاوت پیدا کرائیں اور اپنے جاسوس یہاں پھیلا دیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ کے خواہشمند ہو۔ ایسا ہے تو پھر تیار رہو۔ یہ منزل کچھ دور نہیں ہے نیز مجھ کو خبر معلوم ہوئی ہے کہ تم نے میرے باپ کی وفات پر طعن و تشنیع کے الفاظ کہے۔ یہ ہرگز کسی ذی ہوش آدمی کا کام نہیں ہے۔ موت سب کے لیے ہے۔ آج ہمیں اس حادثہ سے دوچار ہونا پڑا تو کل تمھیں ہوگا، اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مرنے والے کو مرنے والا سمجھتے نہیں۔ وہ تو ایسا ہے جیسے کوئی ایک مکان سے منتقل ہو کر اپنے دوسرے مکان میں جائے اور آرام کی نیند سوئے۔" اس خط کے بعد معاویہ اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی ردّ و بدل ہوئی۔[1] بہرحال ان واقعات سے یہ امر بالکل ظاہر ہو گیا کہ امیر شام معاویہ کو جناب امیرؑ کی ذات سے کوئی وقتی عداوت نہ تھی ورنہ وہ ان کی شہادت کے ساتھ ختم ہو جاتی بلکہ یہ آلِ رسولؐ سے ایک مستقل دشمنی ہے جس کے نتائج آئندہ دیکھیے کیا ہوں۔ یہ بھی اس واقعہ سے ثابت ہو گیا کہ ملک میں دشمن کے جاسوسوں اور مخبروں کے لیے جائے پناہ

---

[1] ارشاد ص ۱۹۲۔۱۹۳

موجود ہے اور اگر دو ایک واقعات کا انکشاف ہوا اور دو آدمی گرفتار ہو گئے تو یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے ہی کچھ دوسرے لوگ موجود نہیں ہیں جن کا انکشاف نہیں ہو سکا ہے اور جنھیں کافی کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ بہرحال امام حسنؑ دشمن کے مقابلہ کے لیے تیار تھے اور حق کے بارے میں اس کے ساتھ کوئی مراعات کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ بیشک آپ کو اور آپ کے ساتھ حسینؑ کو اپنے ملک کی فضا کی طرف سے بے اطمینانی ضرور تھی۔ اس لیے کہ خوارج کے فتنہ کے بعد سے خود اہل کوفہ میں پھوٹ پڑ چکی تھی اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو بظاہر حضرت علیؑ کی فوج میں شامل تھے مگر قرابت، دوستی یا کسی اور وجہ سے خوارج کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ حضرت امیرؑ کو خود ان لوگوں کی شورش پسندی، اختلاف رائے اور نظم کی کمی سے اتنی تکلیف اور پریشانی تھی کہ آپ موت کے آرزومند تھے۔ تمام کتب تاریخ اور بالخصوص نہج البلاغہ میں وہ خطبے آپ کے درج ہیں جو آپ کی کبیدہ خاطری بلکہ روحانی تکلیف کے مظہر ہیں۔ آپ نے ان کو مخاطب کر کے کبھی فرمایا کہ تم نے میرا دل پیپ سے بھر دیا اور میرے سینہ کو غم و غصہ سے پُر کر دیا[1] کبھی فرمایا کہ کاش معاویہ میرے ساتھ اپنی جماعت کا تمھاری جماعت سے تبادلہ کر لیتا۔ اس طرح جیسے سونے کے سکہ کا تبادلہ چاندی کے سکہ سے ہوتا ہے۔ یعنی تم میں سے دس لے لیتا اور اپنوں میں کا ایک مجھے دے دیتا[2] کبھی فرمایا، کتنے افسوس کی بات ہے کہ اہل شام باطل راستے پر متفق ہیں اور تم حق راستے پر ہو کے باہم تعاون نہیں رکھتے[3] اہل شام اپنے حاکم کی اطاعت کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور تم اپنے امام کا کہنا نہیں مانتے درآنحالیکہ وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے[4] اور کبھی فرمایا کہ تم لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جہاد کے لیے چلو جاڑے کے زمانہ میں تو تم کہتے ہو کہ یہ کڑاکے کا جاڑا ہے ہمیں اتنی مہلت دیجیے کہ یہ سردی کم ہو جائے اور جب تم سے کہا جاتا ہے گرمی کے زمانہ میں تو کہتے ہو کہ یہ تو تڑاقے کی گرمی ہے۔ اتنی مہلت دیجیے کہ یہ گرمی کم ہو جائے۔ افسوس! تم گرمی اور سردی سے اتنا بھاگتے ہو تو تلوار کی آنچ

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۱۴۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص ۷۸ (۲) ارشاد ص ۱۶۴۔ نہج البلاغہ ج ۱ ص ۲۰۵ (۳) ارشاد ص ۱۴۸ نہج البلاغہ ج ۱ ص ۷۲ (۴) ارشاد ص ۱۶۴۔ نہج البلاغہ، ج ۱ ص ۲۰۵

سے اور زیادہ بھاگو گے۔[1]

یہی وہ جماعت تھی کہ جس سے اب امام حسنؑ کو سابقہ پڑا تھا۔ آپ ان لوگوں کی حالتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور یقیناً امیر شام کو بھی اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے یہاں کے حالات کا علم ہو گیا ہوگا اور وہ یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی جو ہیبت تمام عرب کے قلوب پر چھائی ہوئی تھی وہ بالکل اسی درجہ پر حضرت حسنؑ کے لیے ابھی حاصل نہیں ہو سکتی اس لیے انھیں ہمت ہوئی کہ وہ یکایک عراق پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لے کر جسر منبج تک پہنچ گئے۔ اب امام حسنؑ نے بھی مدافعت کے انتظامات شروع کیے اور حجر بن عدی کو بھیجا کہ وہ دورہ کر کے تمام مقامات کے عاملوں کو صورت حال کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں اور لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کریں۔ مگر اندازہ کے بالکل مطابق یہ افسوسناک صورت سامنے آئی کہ لوگوں نے حجر بن عدی کی کوشش کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال نہیں کیا۔ عام طور پر جمود اور سرد مہری سے کام لیا گیا۔ کچھ تھوڑی سی جمعیت مقابلہ کے لیے تیار ہوئی تھی تو اس میں کچھ حصہ خوارج کا تھا جو کسی نہ کسی حیلہ سے معاویہ سے جنگ کرنا ہی چاہتے تھے۔ کچھ شورش پسند اور مال غنیمت کے طلبگار اور کچھ لوگ صرف اپنے سرداران قبائل کے دباؤ سے بادل ناخواستہ ساتھ ہو گئے تھے۔ جنھیں فرض کے احساس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تھوڑے لوگ وہ ہوں گے جو واقعی حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے شیعہ سمجھے جا سکتے ہیں۔[2] بہرحال حضرت امام حسنؑ نے قیس بن سعد بن عبادہ انصاری کو بیس ہزار کی فوج کے ساتھ آگے روانہ کیا اور خود مقام دیر کعب کے قریب ساباط میں جا کے قیام کیا۔ یہاں پہنچ کر نمایاں طور سے آپ کو اپنے ساتھیوں کی سرد مہری کا مشاہدہ ہوا۔ آپ نے ان لوگوں کو جمع کر کے خطبہ ارشاد فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ "دیکھو میں تمام خلق سے زیادہ خلق خدا کا بہی خواہ ہوں اور مجھے کسی مسلمان سے کینہ نہیں۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ اتفاق و اتحاد چاہے تمھیں ناپسند ہو اختلاف و افتراق سے بہتر ہے چاہے وہ تمھیں کتنا ہی پسند ہو۔

---

[1] اخبار الطوال ص ۲۱۴، ارشاد ص ۱۵۱ نہج البلاغہ ج ۱ ص ۷۷ [2] ارشاد ص ۱۹۳

یاد رکھو کہ میں تمھارے فائدے کے لیے تم سے بہتر سوچنے کا حق رکھتا ہوں۔ تم کو لازم ہے کہ میری رائے سے انحراف اور میرے حکم کی مخالفت نہ کرو۔ آپ کی تقریر کا ختم ہونا تھا کہ مجمع میں بدنظمی پیدا ہوگئی اور خوارج نے پکار پکار کر کہنا شروع کیا کہ یہ کافر ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے آپ پر حملہ کر کے آپ کے قدموں کے نیچے سے مصلّا کھینچ لیا اور دوش مبارک پر سے چادر بھی اتار لی۔ آپ فوراً گھوڑے پر سوار ہو گئے اور آواز بلند سے پکارا کہ کہاں ہیں ربیعہ اور ہمدان۔ یہ دونوں قبیلے اِدھر اُدھر سے دوڑ پڑے اور شورش پسندوں کو آپ سے دور کیا۔[1]

ابن جریر کی روایت یہ ہے کہ کسی نے خبر اڑا دی کہ قیس بن سعد قتل ہو گئے۔ بس اس پر یہ غدر مچ گیا اور وہ خیمہ جس میں امام حسنؑ کا قیام تھا لوٹ لیا گیا۔ یہاں تک کہ جس بچھونے پر آپ تھے اسے آپ کے نیچے سے کھینچ لیا گیا۔[2]

اس کے بعد آپ مدائن کی طرف روانہ ہو گئے مگر وہاں پہنچنے پر جراح بن قبیصہ اسدی نے جو انہی خوارج میں سے تھا کمینگاہ میں چھپ کر خنجر سے حملہ کر دیا جس سے آپ زخمی ہو گئے عرصہ تک مدائن میں علاج کے بعد آپ اچھے ہوئے اور پھر معاویہ سے مقابلہ کی تیاری کی۔

معاویہ نے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جن شرائط پر چاہیں میں صلح کرنے پر تیار ہوں اور اس کے ساتھ آپ کی فوج کے ان سرداروں کے خطوط بھی روانہ کر دیے جنھوں نے خفیہ طریقہ پر معاویہ سے سازباز کرنا چاہی تھی اور دعوت دی تھی کہ آپ آئیے تو ہم حسنؑ کو گرفتار کر کے آپ کے سپرد کر دیں گے یا ان کو قتل کر ڈالیں گے۔[3]

امام حسنؑ پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی غداری سے واقف تھے اور اس لیے جنگ کو مناسب وقت خیال نہیں کرتے تھے لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو کہ باطل کی حمایت کا دھبّا بھی میرے دامن پر نہ آنے پائے۔ اس خاندان کے لوگوں کو حکومت و اقتدار کی تو ہوس کبھی رہی نہیں، انھیں تو مطلب اس سے تھا کہ مخلوقِ خدا کی بہتری ہو اور حدود و حقوقِ الٰہی کا

---

[1] ارشاد ص ۱۹۴ [2] طبری ج ۶ ص ۹۲ [3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۱، ارشاد ص ۱۹۵

اجرا ہو۔ اب معاویہ نے جو آپ سے منہ مانگے شرائط پر صلح کرنے کی آمادگی ظاہر کی تو آپ نے اپنے نانا اور باپ کی دیکھی ہوئی سیرت کے مطابق مصالحت کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو ناکام واپس نہیں کیا۔ آپ نے صلح کے شرائط مرتب کر کے معاویہ کے پاس روانہ کیے۔ وہ تمام شرائط جن سے قانونی طور پر آئین و شریعت کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ صلح کی دستاویز مکمل ہوئی اور جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ حضرت امام حسینؑ اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ کے ساتھ ان سرد و گرم حالات کا برابر مطالعہ کر رہے تھے۔ انھوں نے ان واقعات پر کبھی ایک غیر متعلق انسان کی طرح نظر نہیں ڈالی بلکہ وہ اس کو اپنی سرگزشت سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ ہمیں اسی حال پر مستقبل کی عمارت کو بلند کرنا ہے۔ اس وقت کے واقعات کا یہ پہلو بہت اہم تھا کہ ساتھیوں کی کثرت اور جمعیت پر اعتماد کا خیال کلیتہً دور از کار ہے۔ حسینؑ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ایک دفعہ ان ساتھیوں کے عمل کو دیکھ چکے تھے کہ وہ ان کے سامنے تلواریں کھینچ کر آ گئے اور اب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ساتھیوں کے طرز عمل کو دیکھ لیا کہ خود اپنی فوج کے ہاتھوں کس طرح ان کے بھائی کی جان خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ ممکن ہے کسی وجہ سے اس وقت حسین اپنے بڑے بھائی کے پاس موجود نہ ہوں اور ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس سخت اور ناگوار موقع پر کوئی تذکرہ امام حسین علیہ السلام کا نظر نہیں آتا مگر انھوں نے یقیناً ان حالات کو دردمندانہ طریقہ پر سنا اور اس زخم کو دیکھا ہو گا جو اُن کے بھائی کے جسم پر خود اپنے ساتھ والوں میں سے کسی کے ہاتھ سے آ گیا تھا اور اس کا اثر ان کے حساس دل پر جتنا بھی ہوا ہو وہ کم ہے۔

اس کے علاوہ آپ نے اپنے بزرگوں کی سیرت میں ایک دفعہ یہ نمونہ اور دیکھ لیا کہ امن عالم کے لیے نقطۂ اوّل صلح و سلامتی ہے۔ جنگ کا درجہ صلح کے بعد ہے اور صلح کے امکانات پیدا ہونے تک ہے اس لیے صلح کے خیال کو جنگ کے پہلے اور جنگ کے دوران میں ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ دشمن سے صلح کی گفتگو کو کبھی اپنی خود داری کے خلاف نہ سمجھو چاہے جذباتی لوگ اس پر معترض بھی ہوں اور چاہے اس کے لیے تمھیں اپنے جاہ و اقتدار،

راحت و آرام یا کسی دوسرے شخصی مفاد کی قربانی بھی کر دینا پڑے مگر یہ خیال ضروری ہے کہ اس صلح کے اندر کوئی ایسا اصول پامال نہ ہونے پائے جس کا محفوظ رکھنا بہرحال اپنا مقدس فریضہ ہے۔ یہی نمونہ حسینؑ نے اپنے نانا سے دیکھا تھا، یہی ان کو اپنے باپ کے یہاں نظر آیا اور یہی اب ان کو اپنے واجب الاطاعت بھائی امام حسنؑ کی جانب سے پیش نظر تھا۔

ایک بات ضمنی طور پر اور دوبارہ سامنے آگئی۔ وہ یہ کہ سچائی کے راستے میں اگر اتمام حجت کی ضرورت ہو تو دوست نہیں بلکہ دشمن کے بھی اقرار پر بھروسا کر لینا چاہیے۔

اس صلحنامہ کے مکمل شرائط جو علامہ ابن حجر مکی نے درج کیے ہیں حسب ذیل ہیں[1]:-

۱- یہ کہ معاویہ حکومت اسلام میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ اور صحیح راستے پر چلنے والے خلفائے راشدین کے طریقہ پر عمل کریں گے[2]

۲- یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

۳- یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔

۴- یہ کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی رہیں ان کے جان اور مال اور ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے[3]

۵- یہ کہ معاویہ حسنؑ بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ اور کسی کو بھی خاندان رسولؐ میں کوئی نقصان پہنچانے یا ان کی جان لینے کی کوشش نہ کریں گے۔ نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ علانیہ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا ڈرایا اور دہشت میں مبتلا نہیں کیا جائیگا۔

یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاولیٰ ۴۱ھ کو عمل میں آیا۔

اگر غور کیا جائے تو اس صلح کے ذریعہ سے حضرت امام حسنؑ نے وہ مقصد حاصل کر لیا تھا جس کے لیے ان کی اپنے فریق مخالف سے منازعت تھی۔

---

[1] صواعق محرقہ ص ۸۱ [2] شیعہ ماخذوں میں اس شرط کے آخری جزء کا ذکر نہیں ہے۔
[3] اس شرط کے ثبوت کے لیے ملاحظہ ہو طبری ج ۶ ص ۹۷۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ حضرات ذاتی اغراض کے لیے کسی سے مخاصمت نہیں رکھتے تھے۔ انکی لڑائی جو کچھ بھی تھی وہ اصولِ شریعت و مذہب کے لیے۔ حضرت امام حسنؑ نے صلحنامہ کی پہلی شرط کے لحاظ سے امیرِ شام کو پابند بنا دیا کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق عمل کریں۔ اس سے آپ نے ایک طرف تو یہ بات ہمیشہ کے لیے مسلّم بنا دی کہ اصولِ شریعت اور ہے آئینِ حکومت اور ہے۔ یہ وہ بڑی چیز تھی جس کے لیے آلِ محمدؐ برابر کوشاں رہے تھے یعنی کبھی ایسا نہ ہو کہ حکّامِ اسلام کا طرزِ عمل عین شریعت سمجھ لیا جائے۔ دوسرا امر یہ بھی آپ نے ثابت کر دیا بلکہ فریقِ مخالف سے تسلیم کرا لیا کہ اب تک جو کچھ حکومتِ شام کا رویّہ رہا ہے وہ کتاب اور سنت کے مطابق نہیں ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ صلحنامہ کی بنیادی چیزیں وہی ہوتی ہیں جو دو فریقوں میں بنائے مخاصمت ہوں۔ اگر حکومتِ شام کا سابقہ طرزِ عمل اب تک برابر کتاب و سنت کے مطابق ہوتا تو اس شرط کی ضرورت کیا تھی۔ اس کے بعد دوسری اہم شرط یہ قرار دی کہ ان کو اپنے بعد کسی کو نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس طرح آپ نے مستقبل کا تحفظ کیا کیونکہ یہ ممکن تھا کہ معاویہ اپنی زندگی بھر کتاب اور سنت کے مطابق عمل کرتے لیکن بعد میں کوئی ایسا آتا جو اس کے خلاف کرتا۔ اس لیے آپ نے آیندہ کے لیے جانشین بنانے کے حق کو سلب کر لیا۔

بہرحال صلح ہوگئی۔ فوجیں واپس چلی گئیں اور معاویہ کی گرفت تمام ممالک اسلامیہ پر مضبوط ہوگئی اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز، یمن اور ایران وغیرہ بھی ان کے تصرف میں آگئے۔ حضرت امام حسنؑ کو اس صلح کے بعد اپنے ساتھ کے بہت سے لوگوں کی طرف سے انتہائی دلخراش اور توہین آمیز الفاظ سننا پڑے جن کا برداشت کرنا انہی کا کام تھا۔ بعض لوگ ایسے جو کل تک "امیرالمومنین" کہہ کے تسلیم بجا لاتے تھے آج "مُذِلّ المومنین" یعنی "مومنین کی جماعت کو ذلیل کرنے والے" کے الفاظ سے سلام کرتے تھے مگر امام حسنؑ نے صبر و استقلال اور نفس کی بلندی کے ساتھ ان تمام ناگوار حالات کو برداشت کیا اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے لیکن معاویہ نے جنگ کے ختم اور سیاسی اقتدار کے قائم ہوتے ہی عراق میں داخل ہو کر نخیلہ میں، جسے کوفہ کی سرحد سمجھنا چاہیے قیام کیا

اور جمعہ کے خطبہ کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ میرا مقصد جنگ سے یہ نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو۔ روزے رکھنے لگو، حج کرو یا زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ سب تو تم کرتے ہی ہو۔ میرا تو مقصد جنگ سے فقط یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مسلّم ہو جائے۔ وہ حسنؑ کے اس معاہدہ کے بعد مکمل ہو گئی اور باوجود تم لوگوں کی ناگواری کے خدا نے مجھے اس مطلب میں کامیاب کر دیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کیے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں اور ان کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے ہاتھ کی بات ہے[1]۔ مجمع میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا مگر اب کس میں دم تھا کہ وہ اس کے خلاف زبان کشائی کرتا۔

اقتدارِ شاہی کی جرأت اس نقطہ تک پہنچی کہ کوفہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی موجودگی میں معاویہ نے حضرت امیرؑ اور امام حسنؑ کی شان میں ناسزا کلمات استعمال کیے۔ اس پر سکوت کرنا اعتراف و اقرار کا مرادف سمجھا جا سکتا تھا۔ اس لیے فوراً امام حسینؑ جواب دینے کے لیے کھڑے ہو گئے مگر حضرت امام حسنؑ نے آپ کو بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو کر نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں امیرِ شام کی تقریر کا جواب دیا[2]۔ حسینؑ جانتے تو پہلے ہی تھے مگر اس وقت سے محسوس کر لیا تھا کہ حالات کی رفتار کیا ہے اور ہم کو اس کا آخری مقابلہ کس طرح کرنا ہوگا۔ مگر وہ جلد باز انسان نہ تھے، نہ وہ ذمہ داریوں کے محل سے ناواقف تھے۔ انھیں صبر آزما انتظار کے ساتھ حالات کی تدریجی رفتار کے دوش بدوش اپنے کردار کی منزل کو آگے بڑھانا تھا اور اس کے پہلے ایک فرض شناس انسان کی طرح اپنے بھائی کے ساتھ وقت کی موجودہ ساکن مگر پُر اضطراب خاموشی میں غرق رہنا تھا۔

حضرت امام حسنؑ نے امورِ سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد کوفہ کا قیام ترک کر کے پھر سے مدینہ میں جا کر سکونت اختیار فرمائی تو حسینؑ نے بھی بھائی کا ساتھ دیا اور مدینہ میں جا کر قیام فرمایا۔ مگر اس اتحادِ عمل کے باوجود بھی بنی امیہ نے یہ غلط شہرت دی کہ اس صلح کے بارے میں حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں بھائیوں کی یک جہتی میں واقعی کوئی

---

[1] ارشاد ص ۱۹۶ [2] ارشاد ص ۱۹۶

فرق آجائے مگر ان کے تمام توقعات بالکل غلط ثابت ہوئے۔

حسینؓ قول، عمل اور مسلک میں اپنے بھائی امام حسنؓ کے ساتھ بالکل متحد تھے اور ہمیشہ رہے۔ آپ کو معلوم تھا کہ امام حسنؓ نے اگرچہ اتمام حجت کے لیے خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے مگر خیال ان کا بھی یہی ہے کہ آخر میں پھر تلوار درمیان میں آئے گی اور آخری فیصلہ بغیر ایک سخت اور مشکل اقدام کے نہ ہو سکے گا اور وہ اس کے لیے تیار بھی ہیں بشرطیکہ حالات کی تدریجی رفتار انہی کے دورِ حیات میں اس آخری نقطہ تک پہنچ جائے۔ جو اس آخری اقدام کے لیے ضروری ہے۔ امام حسنؓ اکثر یہ اشعار بطور تمثیل پڑھا کرتے تھے ؎

من عاذ بالسیف لاقیٰ فرصۃ عجبا　　موتا علیٰ عجل او عاش منتصفا

لاترکبوا السّھل ان السّھل مفسدۃ　　لن تدرکوا المجد حتّٰی ترکبوا العنفا

"جو تلوار کو اپنا پشت پناہ بنائے وہ عجیب سکون و اطمینان حاصل کرلیگا یا دنیا سے جلد ہی گزر جائے اور یا زندگی ایسی جو دادرسی کے ساتھ ہو۔ کبھی سہولت پسندی سے کام نہ لو۔ سہولت پسندی بڑی خرابی کی بات ہے۔ عزت حاصل کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ دشوار گزار منزل کو طے نہ کرو۔" [1]

رہ گئے موجودہ حالات، ان کے لحاظ سے امام حسینؓ بھی اس صلح سے متفق تھے چنانچہ بروایت دینوری جب حجر بن عدی اور عبیدہ بن عمرو جو صلح کے معاملہ میں اختلاف رکھتے تھے امام حسینؓ کے پاس آئے اور کہا، آپ لوگوں نے عزت کے بدلے میں ذلت کو خرید لیا۔ کم حقوق حاصل کر کے بہت سے حقوق سے دست کشی کرلی۔ اچھا اب آپ بذات خود آج ہماری ایک بات مان لیجیے۔ پھر کبھی کوئی بات نہ مانیے گا۔ وہ یہ ہے کہ آپ حضرت امام حسنؓ کو تو اس صلح کے راستے پر جو انھوں نے اختیار کیا ہے چھوڑ دیجیے۔ لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو جو کوفہ میں ہیں یا کوفہ کے باہر ہیں جمع کیجیے اور ہم دونوں کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا دیجیے۔ پھر دیکھیے گا کہ معاویہ کو خبر بھی نہ ہوگی اور ہم اچانک تلواریں مارتے ہوئے نظر آئیں گے۔ حضرت امام حسینؓ نے فرمایا، یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم عہد کر چکے اور

---

[1] کتاب البلدان لابن الفقیہ الھمدانی طبع لیدن ص ۵۳

قول و قرار ہو چکا۔ اسی طرح علی بن محمد بن بشیر ہمدانی کا بیان ہے کہ میں سفیان بن ابی لیلیٰ کی معیت میں مدینہ پہنچا اور امام حسنؑ کے پاس ملنے گیا۔ آپ کے پاس اس وقت مسیب بن نجبہ، عبداللہ بن دداک تمیمی اور سراج بن مالک خشعی موجود تھے۔ میں نے کہا۔ السلام علیک یا مذل المومنین "سلام ہو آپ کو اے مومنین کو ذلیل کرنے والے"۔ آپ نے فرمایا وعلیک السلام۔ بیٹھو۔ میں مومنین کی ذلت کا باعث نہیں ہوں۔ میں نے تو ان کی عزت رکھ لی اور ان کو خونریزی سے بچا لیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب جنگ کا جوش اور ولولہ باقی نہیں ہے اور کمزوری نمایاں ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اگر جنگ جاری رکھی گئی تب بھی ایک دن یہی ہونا ہے کہ معاویہ کی بادشاہت قائم ہو جائے"۔ اب یہ لوگ حضرت کے پاس سے اٹھ کر امام حسینؑ کے پاس گئے اور پوری گفتگو حضرت امام حسنؑ کی بیان کی۔ آپ نے فرمایا سچ کہا ابو محمد (حضرت حسنؑ) نے تمھیں لازم ہے کہ ہر شخص تم میں سے خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ جائے اور بیٹھا رہے اس وقت تک کہ جب تک یہ شخص (معاویہ) زندہ ہے"۔ [1]

یہ آخری فقرہ درحقیقت بڑا دور رس تھا۔ آپ سمجھتے تھے کہ معاہدہ کی پابندی نہیں ہوگی اور آپ جانتے تھے کہ یہ معاہدہ موت کی آخری ہچکی اس وقت لے گا جب معاویہ دنیا سے جانے لگیں گے اور اپنے بعد جانشین نامزد کر جائیں گے۔ وہ وقت ہوگا جب ہماری جانب سے کوئی دوسرا اقدام کیا جائے۔ آئندہ چل کر دنیا کو حسینؑ کے تدبر کی داد دینا پڑے گی جنھوں نے بیس برس پہلے یعنی ۴۱ھ کے آئینہ میں ۶۰ھ کی تصویر اپنی آنکھ سے دیکھ لی اور حسینؑ کی پیش بینی آئندہ چل کر حرف بحرف پوری ہو کر رہی۔

اس معاہدہ کے بعد اب بنی امیہ کی قوت بہت مستحکم ہو گئی تھی۔ ان کے راستے میں جو ایک خرخشہ تھا وہ بالکل دور ہو گیا تھا۔ اور انھیں اپنی اسکیم کے پورا کرنے کا پورا موقع مل گیا تھا۔ چنانچہ جتنی شرطیں ہوئی تھیں سب کی مخالفت کی گئی اور کسی ایک پر بھی عمل نہ ہوا۔ [2]

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۲۲ [2] طبری ج ۶ ص ۹۳

پہلی شرط یہ تھی کہ کتاب خدا اور سنتِ رسولؐ پر عمل ہوگا۔ یہ شرط مسلمانوں کے کسی فرقہ کے نزدیک بھی پوری نہیں ہوئی شیعوں کا عقیدہ تو اس بارے میں ظاہر ہے اور اہلسنت کے نقطۂ نظر سے حضرت رسول اللہؐ کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک خلافت راشدہ رہی ہے اور یہ تیس برس کی مدت ختم ہو جاتی ہے حضرت امام حسنؑ کی صلح پر۔ اس کے بعد ملوکیت و جہانبانی اور دنیا داری ہے، خلافتِ راشدہ نہیں ہے۔ اگر یہ شرط پوری ہوئی ہوتی کہ کتاب خدا اور سنتِ رسولؐ پر عمل ہو تو کوئی وجہ نہ تھی کہ معاویہ کی حکومت خلافتِ راشدہ کے حدود سے خارج ہوتی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ تک کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کا زمانہ خلافتِ راشدہ سے ملتا جلتا ہے مگر فاصلہ ہونے کی وجہ سے اس میں محسوب نہیں ہوا۔ مگر معاویہ کے دورِ حکومت کے متعلق کسی نے یہ رائے ظاہر نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک اس شرط پر عمل نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ واقعات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

ان میں سے ایک بات تھی سیاسی مصالح کی بنا پر زیاد بن سمیہ کو اپنے باپ کا ناجائز فرزند بنا کر اپنا بھائی قرار دینا حالانکہ اسلام میں ناجائز فرزند کو نسب میں شریک نہیں کیا گیا ہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ زیاد پہلے زیاد بن عبید کہلاتا تھا کیونکہ اس کی ماں سمیہ ایک ثقفی قبیلہ والے شخص کے غلام عبید کی زوجیت میں تھی اور یہ خود حارث بن کلدہ کی کنیز تھی حارث نے اسکو آزاد کر دیا تب اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا اور اس لیے زیاد غلامی سے خارج رہا اور بڑھا تو بڑا سمجھدار اور ذہین اور عقلمند اور ادیب دیکھا گیا۔ مغیرہ بن شعبہ جب خلیفۂ دوم کی طرف سے بصرہ کے حاکم ہوئے تو وہ زیاد کو اپنے ساتھ بصرہ لے گئے اور وہاں اسے لکھنا پڑھنا سکھلایا۔ جب حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ خلیفہ ہوئے تو آپ نے زیاد کو سرزمین فارس کا گورنر بنایا۔ آپ کی شہادت کے بعد معاویہ نے زیاد کو ایک تہدید آمیز خط لکھا جس پر زیاد نے مجمع عام میں خطبہ پڑھا اور کہا کہ جگر خوارہ کا لڑکا اور

نفاق کا مرکز اور دشمنانِ اسلام کا سردار مجھے ڈرانا چاہتا ہے؟ حالانکہ میرے اور اس کے درمیان رسول اللہؐ کے چچا زاد بھائی (ابن عباس) اور حسنؑ بن علیؑ نوّے ہزار اپنے شیعوں کی فوج لیے ہوئے موجود ہیں۔ خدا کی قسم اگر اس نے ادھر کا رُخ کیا تو وہ دیکھے گا کہ میں تلوار لیے ہوئے سامنے موجود ہوں گا اور بڑی شدید جنگ کروں گا۔ معاویہ کو معلوم ہو گیا کہ اس شخص کو دھمکیوں سے متاثر نہیں کیا جا سکتا۔ جب امام حسنؑ نے صلح فرمائی اور معاویہ کی سلطنت مضبوط ہو گئی تو زیاد اصطخر میں قلعہ بند ہو گیا۔[1]

معاویہ نے اسے امان نامہ لکھا کہ تم میرے پاس آ جاؤ۔ جو کچھ تم کہو گے وہ میں تمھیں دوں گا چنانچہ زیاد، معاویہ کے پاس آیا اور معاویہ کی بارگاہ میں اس کا رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ۴۴ھ میں معاویہ نے اسے اپنا بھائی ظاہر کیا۔[2] ظاہر ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے اصلی باپ کا پتہ نہ ہو اور ہو بھی تو وہ ایک غلام کے سوا کوئی نہ ہو وہ ایک دم شہنشاہِ وقت کا بھائی بن جائے اس سے بڑھ کر اس کی عزت کیا ہو سکتی ہے۔ معاویہ نے کہا، یہ میرے باپ ابوسفیان کے نطفہ سے ہے اور اس کی گواہی کس نے دی؟ ابو مریم سلولی نے جو قبل اسلام طائف میں شراب بیچتا تھا۔ اس نے کہا کہ ابوسفیان میرے شراب خانہ میں آیا اور مجھ سے ایک اس قسم کی عورت کو بلا دینے کو کہا جو اس رات اس کی دلچسپی کا باعث ہو۔ میں نے سمیہ کو اس کے پاس بلا دیا اور اس طرح ابوسفیان اور سمیہ میں تعلقات ناجائز پیدا ہوئے اور ان تعلقات سے زیاد کی ولادت ہوئی۔ ایک شخص نے قبیلۂ بنی مصطلق میں سے جس کا نام نُبَید تھا گواہی دی کہ میں نے ابوسفیان کو یہ کہتے سنا تھا کہ زیاد میرے نطفہ سے ہے۔ حالانکہ پہلے زیاد نے کوفہ میں آ کر وہاں کے لوگوں سے یہ خواہش کی تھی کہ تم معاویہ کے ساتھ میری قرابت کے لیے گواہی دے دو۔ ان سب نے انکار کیا کہ ہم جھوٹی گواہی نہ دیں گے۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ بصرہ گیا اور وہاں ایک شخص گواہی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔[3] اس ثبوت کو کافی سمجھا گیا اور زیاد معاویہ کے بھائی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۹۷ [2] الوزراء والکتاب ص ۱۷ [3] طبری ج ۶ ص ۱۲۲

قرار پا گئے۔

اس بات سے مسلمانوں میں اور بالخصوص صحابہ کے طبقہ میں بڑی بے چینی پیدا ہوئی کیونکہ پیغمبر اسلامؐ کا یہ ارشاد متواتر طور پر سب کو معلوم تھا کہ الولد للفراش وللعاھر الحجر یعنی بچہ اصلی شوہر کی طرف منسوب ہوگا اور زانی کے لیے بس پتھر ہیں۔" مگر اقتدار حکومت کے کان عوام کی چیخ پکار سننے سے بالاتر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ ان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس ذریعہ سے انھوں نے زیاد اور اسکی اولاد کو ہمیشہ کے لیے خرید لیا۔

چنانچہ جب زیاد کے ذرا سر اٹھانے کا اندیشہ پیدا ہوتا تو یہ احسان یاد دلا کر اس کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا جاتا تھا جیسا کہ ایک مرتبہ جب کہ زیاد بہت سے تحائف لے کر معاویہ کے پاس آیا جن میں جواہرات کا ایک نہایت نفیس گلوبند بھی تھا اور معاویہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تو زیاد نے بطور فخر کہنا شروع کیا۔ حضور دیکھیے میں نے آپ کے لیے کس طرح عراق کو پامال کر دیا ہے اور کس طرح وہاں کے چپے چپے پر آپ کا تسلط قائم کر دیا ہے اور وہاں کی ہر لذت و نعمت آپ کے قدموں پر لا کر ڈال دی ہے۔ یہ سن کر معاویہ ابھی کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ یزید بول اٹھا۔ تم نے یہ سب کچھ کیا تو کمال کیا کیا؟ ہم نے جو تم کو قبیلۂ ثقیف کی غلامی سے نکال کر قریشی ہونے کی عزت دے دی اور عبید کی فرزندی کے بجائے ابوسفیان کی فرزندی کا شرف عطا کر دیا اور دفتر میں قلم کی گھس گھس سے اونچا کر کے منبروں کی بلندی نصیب کر دی۔[1]

ظاہر ہے کہ یزید ایسے نوعمر کی زبان سے زیاد ایسے سن رسیدہ کا ان الفاظ کو سن کر برداشت کرنا اس احساس کمتری ہی کا نتیجہ تھا جو نسبی اعتبار سے اس میں موجود تھی۔ پھر اس صورت میں زیاد کی نسل اب کبھی معاویہ یا ان کے بعد یزید کے مقابلہ میں سرتابی کرنے کی کہاں ہمت رکھ سکتی تھی۔ یہ دور رس اثر تھا اس سیاسی اقدام کا جو زیاد کو بھائی بنا کر کیا گیا تھا۔ چاہے شریعت اس پر کتنی بھی سرزنش کا مستحق قرار دیتی ہو۔

دوسرا واقعہ: ایک شخص تھے حسّان بن زید بن علقمہ تمیمی دارمی۔ حضرت رسول اللہؐ نے ان میں

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۲۳

اور معاویہ میں مواخات قرار دی تھی، ویسی ہی مواخات جیسی ایک مرتبہ مہاجرین میں اور ایک مرتبہ مہاجرین اور انصار میں کی گئی تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اس مواخات سے نسبی احکام جاری نہیں ہوتے اور میراث ایک کی دوسرے کو نہیں ملتی۔ یہی عملدرآمد متفقہ طور پر ثابت تھا کہ ہر ایک کی میراث اس کے نسبی ورثا کو پہنچے۔ اس مذہبی بھائی کو نہیں جو مواخات کے ذریعہ سے بھائی قرار دیا گیا ہے۔ مگر اتفاق کی بات کہ حتات، معاویہ کے پاس آئے ہوئے تھے اور ان کا وہیں انتقال ہو گیا تو معاویہ نے ان کی میراث پر قبضہ کر لیا۔ یہ کہہ کر کہ یہ میرا بھائی ہے۔ اس پر بھی مسلمانوں میں شور ہوا یہاں تک کہ فرزدق نے اس بارے میں شعر بھی کہے ؎

ابوك وعمّی یا معاوی اورثا	تراثا فیحتاز التراث اقاربه
فما بال میراث الحتات اکلته	ومیراث صخر جامدلك ذائبه
فلو کان هٰذا الامر فی جاهلیة	علمت من المرء القلیل خلائبه
ولو کان فی دین سوی ذا	لنا حقّنا اوغصّ بالماء شاربه

(یعنی) تمھارے باپ نے اور میرے چچا نے اے معاویہ میراث چھوڑی تو اصول یہی رہا کہ میراث قرابتداروں کو دی جائے۔ پھر کیا بات ہے کہ حتات کی میراث تو تم نے نوش جاں فرمائی اور ابوسفیان کی میراث تمھاری ہی ملکیت قرار پائی۔ پس یہ معاملہ اگر زمانۂ جاہلیت کی رسم میں داخل ہے تو ہمیں اس کا علم ہونا چاہیے اور اگر یہ اس کے علاوہ کسی اور دین میں ہے جس کی تم نے ایجاد کی ہے تو ہمیں بھی ہمارا حق ملنا چاہیے نہیں تو یہ تمھیں ہضم نہیں ہو سکتا[1]"

مگر تاریخ نہیں بتاتی کہ معاویہ نے اس مال کو کبھی واپس کیا ہو یا حتات کے ورثاء کو اس کا معاوضہ دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں خلافِ شریعت رواج پا رہی تھیں۔ مثلاً معاویہ نے زکوٰۃ فطرہ کے متعلق کہا، ہماری رائے میں زکوٰۃ فطرہ دو مد سمراء شام ہیں یعنی شام کے گیہوں دو مُدّ، ابوسعید خدری نے فرمایا یہ معاویہ کی مقرر کردہ مقدار ہے۔ ہم نہ اس پر عمل کرتے

---

[1] اسد الغابہ ج ۱ ص ۳۷۹

ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں۔ ہم عہدِ رسولؐ میں ہر ایک چھوٹے بڑے اور غلام و آزاد کی طرف سے زکوٰۃ فطرہ ایک صاع گندم، ایک صاع پنیر یا جَو یا کھجور یا منقیٰ، اسی طرح نکالتے رہے یہاں تک کہ جب معاویہ حج کے لیے آئے تو انھوں نے کہا ہماری رائے میں دو مد گندم شام زکوٰۃ فطرہ ہے ابوسعید خدری کا قول ہے کہ میں جب تک زندہ ہوں کبھی معاویہ کے اس کہنے کے مطابق عمل نہ کروں گا۔ ابن زبیر نے معاویہ کی اس رائے کو سن کر کہا بئس الاسم الفسوق بعد الایمان۔ یعنی "ایمان لانے کے بعد فاسق ہونا بہت بُرا ہے" مقدار زکوٰۃ فطرہ تو بس صاع ہی ہے[1]

مقدام بن معدی کرب کی گفتگو جو معاویہ سے ہوئی ہے اس میں انھوں نے کہا، تمھیں خدا کی قسم بتاؤ، کیا رسولؐ نے نہیں فرمایا ہے کہ سونا پہننا حرام ہے۔ معاویہ نے کہا صحیح ہے۔ پھر مقدام نے کہا، کیا آنحضرتؐ نے درندہ جانوروں کی کھال پر بیٹھنا اور ان کا پہننا ممنوع قرار نہیں دیا تھا؟ معاویہ نے کہا، ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ مقدام نے کہا، پھر کیا بات ہے کہ میں یہ سب چیزیں تمھارے گھر میں دیکھتا ہوں؟ اس کے علاوہ شریعتِ اسلام کا حکم ہے کہ پیشاب یا پاخانہ کے وقت رو بقبلہ یا پشت بقبلہ بیٹھنا جائز نہیں ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری جب شام میں پہنچے تو تمام پاخانہ کے مقامات کو رو بقبلہ پایا۔ انھوں نے استغفار پڑھ کر منہ پھیر لیا[2]

عرفہ کے روز حج میں تلبیہ کہنا لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک۔ الخ ضروری اور لازمی شعائر حج میں سے ہے۔ رسول کریمؐ اور اصحاب برابر کہتے چلے آئے مگر اس نیک کام کو معاویہ ترک کرتے ہیں اور لوگوں کو اس سے منع کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے سعید سے عرفہ کے روز پوچھا کہ کیا وجہ ہے میں لوگوں سے تلبیہ کی آواز نہیں سنتا۔ سعید نے کہا کہ لوگ معاویہ سے ڈرتے ہیں۔ یہ سنکر ابن عباس اپنے خیمہ سے نکلے اور پکارے لبیک اللھم لبیک اور کہا۔ اگرچہ یہ معاویہ کے علی الرغم ہو۔ ان لوگوں نے علیؑ کی عداوت سے اس سنت کو ترک کر دیا ہے۔ اس طرح کی تین روایتیں کنز العمال میں درج ہیں، جن میں

---

[1] دراسات اللبیب ملا محمد معین ص ۷۷ [2] دراسات اللبیب ص ۱۳۹

ابن عباس نے بد دعا دی ہے اس بات پر کہ عرفہ کے روز تلبیہ کہنے سے اس لیے منع کرتے ہیں کہ علیؑ عرفہ کے روز تلبیہ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے یہ کد اور ضد بہت سے سنن و احکام میں ترمیم کا باعث ہو گئی۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ نماز میں بسم اللہ بلند آواز سے کہنے پر زور دیتے تھے۔ اس لیے جب بنی امیہ کو اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے بلند آواز سے بسم اللہ کہنے کی ممانعت پر زور دیا صرف اس کوشش میں کہ حضرت علیؑ کے آثار باقی نہ رہیں[1]

مدینہ میں معاویہ نے لوگوں کو نماز عشاء با جماعت پڑھائی تو نہ بسم اللہ پڑھی اور نہ بعض تکبیریں کہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو جماعت مہاجرین و انصار نے شور مچایا کہ تم نے نماز میں عمداً چوری کی ہے یا بھول گئے ہو؟ بسم اللہ اور سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیریں کہاں گئیں؟ مگر معاویہ نے کوئی اعتنا نہیں کی اور اس نماز کا اعادہ نہیں کیا[2]

اس کے ساتھ ہی بخاری اور مسلم دونوں کے یہاں یہ روایت موجود ہے کہ عمران بن حصین نے حضرت علیؑ کے ساتھ بصرہ میں نماز پڑھی اور ختم نماز کے بعد کہا کہ انھوں نے ہم کو وہ نماز یاد دلائی جو ہم رسول اللہؐ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر ذکر کیا کہ علیؑ جب سجدہ سے اٹھتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تو تکبیر کہتے تھے۔[3]

نیز مطرف بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے اور عمران بن حصین نے علیؑ بن ابی طالبؑ کے پیچھے نماز پڑھی۔ پس جب علیؑ سجدہ کرتے تھے تو تکبیر کہتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تو بھی تکبیر کہتے تھے اور جب دو رکعتوں کے بعد اٹھتے تھے تو تکبیر کہتے تھے۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا بے شک انھوں نے ہم کو حضرت رسولؐ کی نماز یاد دلادی یا یہ الفاظ کہے کہ انھوں نے ہم کو حضرت محمد مصطفیٰؐ والی نماز پڑھائی[4] ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا کہ اصحاب رسولؐ روتے تھے اور افسوس کرتے تھے چنانچہ بخاری کی روایت ہے

---

[1] تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۰۷ [2] کنز العمال ج ۴ ص ۲۱۰ [3] بخاری ج ۱ ص ۹۱ [4] بخاری ج ۱ ص ۹۱ و ۹۶ مسلم ج ۱ ص ۱۶۹

کہ ایک روز ابو الدرداء غصہ میں بھرے گھر میں آئے۔ سبب دریافت کیا گیا تو کہنے لگے کہ میں ان لوگوں میں امتِ محمدؐ ہونے کی کوئی نشانی نہیں پاتا۔ سوا اس کے کہ نماز جماعت سے پڑھ لیتے ہیں[1]

امام مالک نے روایت کی ہے کہ جو باتیں ہم پہلے پاتے تھے ان میں سے ایک بات بھی اب ہم نہیں دیکھتے۔ بجز اس کے کہ اذان دے لیتے ہیں اور زہری بیان کرتے ہیں کہ میں انس بن مالک کے پاس دمشق گیا تو ان کو روتے پایا۔ سبب پوچھا تو انس نے کہا کہ جو باتیں میں نے عہدِ رسول اللہ میں دیکھی تھیں۔ اب ان میں سے سوا اس نماز کے کوئی نظر نہیں آتی اور یہ نماز بھی ضائع کر دی گئی ہے[2]

امیر شام کے یہاں گانے والوں کی قدر و منزلت ہوتی تھی چنانچہ سائب فاثر نے جو ایک فاسق و فاجر شخص تھا انھیں گانا سنا کر اپنی تمام حاجتیں جو لے کر آیا تھا پوری کرالیں[3]

اس آغاز کا انجام اگر یزید کی شراب خواری اور رقص و سرود کے ساتھ فریفتگی کی شکل میں ظاہر ہو تو تاریخ کی طبیعی رفتار کے لحاظ سے قابلِ تعجب نہیں ہے۔

علامہ ابن الفقیہ نے لکھا ہے کہ معاویہ نے سب سے پہلے پولیس چوکی اور پہرہ دار مقرر کیے اور خواجہ سرا بنائے اور اموال خزانہ میں جمع کر کے رکھے[4] انھوں نے سلاطین روزگار کی طرح اپنے عمال کے ذریعہ سے نوروز اور مہرگان (ایرانی تہوار) کے تحائف وصول کیے جن کی مقدار ایک کروڑ درہم سالانہ تک پہنچی[5]

مذکورۂ بالا واقعات میں سے ممکن ہے کہ بعض حیرت میں ڈالنے والے ہوں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت انگیز باتیں بھی درج ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ابو سفیان کی اولاد کو بنی ہاشم سے ایک موروثی عداوت جو تھی اس کی بنا پر وہ ان کی ہر سنت، ہر رسم اور ہر طریقہ کو فنا کر دینا چاہتے تھے بلکہ سرے سے اسلام ہی کو نیست و نابود کر دینے کے درپے تھے۔ صرف مجبوری یہ تھی کہ ان کی حکومت اسلام کی بناء پر تھی اس لیے انھیں پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کا انکار ممکن نہ تھا لیکن وہ پھر بھی حضرت کی عظمت کے احساس

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۷۷ [2] بخاری ج ۱ ص ۷۵ [3] طبری ج ۶ ص ۱۸۸ [4] البلدان ص ۱۰۹
[5] الوزراء والکتاب ص ۱۵

اور اس کے اثرات کے قائم رکھنے کا کوئی جوش و ولولہ نہ رکھتے تھے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ معاویہ کو شوق پیدا ہوا ایک بڑے معمّر آدمی سے ملاقات کا جو گزشتہ زمانہ کے حالات بیان کرے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرموت میں ایک شخص ہے جس کی تین سو ساٹھ برس کی عمر ہے۔ معاویہ نے اس کے پاس آدمی بھیجے اور اسے بلوایا۔ جب وہ آیا تو پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا آبد بن آبد۔ معاویہ نے اس سے عبدالمطلب اور امیہ وغیرہ کے حالات پوچھے۔ پھر کہا تم نے محمدؐ کو بھی دیکھا ہے؟ اُسے ایک مسلمان کی زبان سے حضرت کا نام نامی اس طرح سنکر حیرت ہوئی اور اس نے کہا ومن محمدؐ یعنی محمدؐ کون؟ انھوں نے کہا "وہی رسول اللہؐ" اس نے کہا، پھر تم نے پہلے ہی ان کا نام اس شان کے ساتھ کیوں نہ لیا؟ جس کا خدا نے انھیں مستحق قرار دیا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ تم نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے[1]؟

اس سے زیادہ اور انتہائی حیرت خیز یہ ہے کہ معاویہ کو رسول اللہؐ کہہ کر سلام کیا گیا اور ان کو سزا تو درکنار معمولی سی تنبیہ بھی نہیں کی گئی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ عمرو بن عاص ایک دفعہ اہل مصر کی ایک جماعت کے ساتھ معاویہ کے پاس دارالخلافہ شام میں باریابی کے لیے آئے یہ وہ زمانہ تھا کہ عمرو بن عاص، معاویہ سے کچھ برسر پرخاش تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو سمجھا دیا کہ دیکھو جب تم معاویہ کے دربار میں جانا تو اسے خلیفہ کہہ کر سلام نہ کرنا اور جہاں تک ممکن ہو اس سے حقارت کے ساتھ بات کرنا۔ اس کی وجہ سے تمہاری ہیبت اس کے دل پر قائم ہو جائے گی۔ معاویہ کو جب ان لوگوں کے پہنچنے کی اطلاع ہوئی تو وہ اپنی ذہانت سے عمرو عاص کی سازش کو تاڑ گئے اور درباریوں سے کہا میرا خیال ہے کہ نابغہ کے لڑکے (عمرو عاص) نے ان لوگوں کی نظر میں میری منزلت کو گھٹا دیا ہوگا۔ لہٰذا تم خیال رکھو جب یہ لوگ آئیں تو ان کے ساتھ انتہائی سختی کرنا۔ یہاں تک کہ ہر شخص کو ان میں سے یقین ہو جائے کہ اس کی جان کی خیر نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص معاویہ کے سامنے دربار میں حاضر ہوا وہ یوں آداب

---

[1] کتاب المعمرین ص۸۷ و اسد الغابہ ج ۱ ص۱۱۵

بجالایا کہ السلام علیک یا رسول اللہ۔ بس پھر کیا تھا، سب نے اس کی موافقت کی اور جو آیا اس نے معاویہ کو رسول اللہ کہہ کر سلام کیا۔[1]

مثل مشہور ہے الناس علیٰ دین ملوکھم "لوگ بادشاہوں کے طریقہ پر چلتے ہیں" جب حکومت کی یہ روش ہو تو عام افراد کی نظر میں رسولؐ اور شریعتِ رسولؐ کی کیا عزت باقی رہ سکتی ہے۔ جب لوگ دیکھ رہے ہوں کہ حکومت کی طرف سے مذہب کا نیلام کرایا جاتا ہے اور تھوڑے سے سکوں کے عوض دین و مذہب کی خریداری ہوتی ہے تو لوگوں کی نگاہ میں مذہب کی کیا وقعت باقی رہ سکتی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ حجاج مجاشعی، جاریہ بن قدامہ، احنف بن قیس اور جون بن قتادہ چاروں آدمی معاویہ کے پاس آئے۔ معاویہ نے ہر ایک کو ایک ایک لاکھ درہم دیے مگر حجاج کو ستر ہزار درہم دیے۔ حجاج کو جب اس کا علم ہوا تو معاویہ سے آکر اس کی شکایت کی۔ معاویہ نے کہا کہ ان لوگوں سے میں نے ان کا دین خرید کیا ہے۔ حجاج نے پھر کہا، پھر مجھ سے بھی میرا دین خرید لیجیے۔[2]

اب جو ذرا بھی خدا ترس مسلمان تھے وہ زندگی سے عاجز ہو گئے تھے۔ چنانچہ حکم بن عمرو غفاری نے جو یمن و خراسان کے حاکم بنائے گئے تھے جب ۵۰ھ میں ایک جنگ کے بعد اموالِ غنیمت حاصل کیے اور یہ حکم نامہ پہنچا کہ لوٹ کے مال کو سپاہیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے تمام نقد و جنس خزانہ سرکاری میں بھیجدیا جائے تو انھوں نے ہمت کر کے یہ جواب لکھ دیا کہ یہ حکم قرآن کے بالکل خلاف ہے اس لیے میں عمل کرنے سے قاصر ہوں۔ مگر اس کے بعد اتنا خوف ہوا کہ خدا سے دعا کی۔ بارِ الٰہا اب مجھے زندگی درکار نہیں ہے۔ میری روح قبض فرمالے۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔[3]

آثار بنی ہاشم کے مٹانے کی سعی تعمیری یادگاروں تک بھی پہنچی۔ چنانچہ جب معاویہ نے حج کیا تو واپسی میں مدینہ بھی گئے اور منبرِ رسولؐ کو اس کی جگہ سے حرکت دی۔ چاہتے تھے کہ اسے شام لے جائیں

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۳۵۔ اسد الغابہ ص ۱۵۴ [2] طبری ج ۶ ص ۱۳۵۔ استیعاب ج ۱ ص ۱۵۴۔ اسد الغابہ ج ۱ ص ۳۷۹
[3] طبری ج ۶ ص ۱۴۰ - ۱۴۱۔

اسی وقت سورج کو گرہن ہوا۔ جابر بن عبداللہ انصاری نے کہا، معاویہ نے رسول اللہؐ کے شہر اور ان کے دارالہجرت میں بڑا حادثہ رونما کیا۔ ضرور یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ اسی سال معاویہ لقوہ میں مبتلا ہوئے [1]

یہ ۵۰ھ کا واقعہ ہے۔ منبر کو جنبش دیتے ہی سورج میں گرہن لگا ایسا کہ تارے نظر آنے لگے۔ اہل مدینہ میں اس سے اتنا ہیجان پیدا ہوا کہ معاویہ کو اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا اور کہا کہ میں نے تو منبر ہٹا کر صرف یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اسے دیمک تو نہیں لگی ہے [2]

حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے ساتھ جو دشمنی تھی وہ بھی آپ کی ذات سے خصومت کی بنا پر نہ تھی بلکہ صرف اس لیے کہ آپ بنی ہاشم کے چشم و چراغ اور اصول اسلام کے علمبردار تھے۔ اس لیے سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ ملک میں آپ کے خلاف نفرت پیدا کرائی جائے۔ قتل عثمان کا الزام بھی فقط اس سیاست کے پورا کرنے کا ایک بہانہ تھا چنانچہ علامہ ابن حجر مکی نے لکھا ہے۔ مروان بن الحکم کی زبانی منقول ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی شخص علیؑ سے زیادہ عثمان کی حمایت کرنے والا نہ تھا۔ کسی نے کہا کہ پھر تم لوگ منبروں پر انھیں گالیاں کیوں دیتے ہو؟ اس نے کہا بغیر اسکے ہمارا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا [3]

پھر جبکہ صلحنامہ کی بنیاد یعنی کتاب اور سنت کی موافقت والی شرط کا یہ انجام ہوا تو دوسری شرطوں کا نتیجہ ظاہر ہے۔ چنانچہ دوسری شرط یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا، اس کے انجام کا آئندہ ایک مستقل باب میں بیان ہوگا۔

تیسری شرط یہ تھی کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔ اس کا انجام بہت دردناک ہے۔ عراق میں زیاد بن سمیہ کے ہاتھوں جو خونریزیاں ہوئیں وہ صفحۂ تاریخ پر نمایاں حروف میں درج ہیں۔ اس شخص کے خصوصیات میں لکھا ہے کہ وہ جرم کے پہلے سزا دیتا، بدگمانی کی بنا پر بلاتحقیق و تفتیش قید کر دیتا اور شبہ پر ایذا رسانی کرتا تھا۔ انسان کی جان کا لینا اس کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھا۔ اس کا ایک عجیب نمونہ اس واقعہ میں ہے کہ اس نے یہ عام حکم

---

[1] کتاب البلدان ص۲۴ [2] طبری ج ۶ ص۱۳۱ [3] صواعق محرقہ ص۳۲

دے دیا تھا کہ جو نصف شب کے قریب گلی کوچہ میں نظر آئے اس کو قتل کر دیا جائے۔ ایک رات ایک دیہاتی عرب کو گرفتار کیا گیا اور اسے زیاد کے پاس لائے۔ اس نے اپنی صفائی پیش کی کہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں۔ دیہات سے آج ہی آیا ہوں اور مجھے آپ کے اس حکم کی اطلاع نہیں تھی۔ زیاد نے کہا کہ واللہ میرے خیال میں تو سچ کہہ رہا ہے اور بے خطا ہے مگر تیرے قتل کر دینے میں عامۂ خلائق کے لیے بہتری ہے چنانچہ فوراً اسے قتل کر دیا گیا۔[1]

زیاد کی ولایت کوفہ کے بعد بصرہ میں اس کے جانشین سمرہ بن جندب کے مظالم اس سے بھی زیادہ تھے۔ ایک بار چھ مہینہ کی مدت میں آٹھ ہزار آدمی اس نے تہ تیغ کیے۔ ابوسوار عدوی کا بیان ہے کہ سمرہ نے میری قوم میں سے ایک دن میں ۷۰ آدمی قتل کیے جو سب کے سب حافظِ قرآن تھے۔

ایک دن سمرہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شہر سے باہر نکلا۔ بنی اسد کے مکانوں کے قریب ایک شخص اس قبیلہ کا کسی ضرورت سے ایک گلی میں سے نکلا۔ لشکر کے آگے آگے کے سواروں میں سے ایک نے اسے دیکھتے ہی اپنے حربہ سے حملہ کر دیا اور وہ گر کر خاک و خون میں تڑپنے لگا۔ سمرہ بن جندب اس کی لاش پر سے گزرا اور واقعہ معلوم ہونے پر کہا کہ جب ہماری سواری گزرا کرے تو ہمارے نیزوں سے بچتے رہا کرو۔[2]

مسلم عجلی کا بیان ہے کہ ایک شخص سمرہ کے پاس آیا اور اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کی۔ پھر مسجد میں آکر نماز پڑھنا شروع کی۔ اتنی دیر میں ایک شخص آیا اور اس کی گردن اڑا دی۔ اس طرح کہ مسجد میں ایک طرف اس کا سر کٹ کر جا گرا اور دوسری طرف بدن۔

ایک دوسرے موقع پر مشاہدہ بیان کیا ہے کہ بہت سے آدمی اس طرح قتل کیے گئے کہ ان سے شہادتین کا اقرار لیا جاتا تھا۔ وہ توحید اور رسالت کا اقرار کرتے تھے اور خوارج سے برأت کا اعلان کرتے تھے اور پھر اس کے بعد ان کا سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ اور یہ سب کچھ امیر شام معاویہ کی مرضی کے مطابق ہوتا تھا۔ چنانچہ جب عرصہ کے بعد معاویہ نے سمرہ کو معزول کیا تو اس نے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۲۶ [2] طبری ج ۶ ص ۱۳۲۔

کہا، خدا غارت کرے معاویہ کو۔ اگر میں نے اللہ کی اتنی اطاعت کی ہوتی جتنی معاویہ کی اطاعت انجام دی تو وہ کبھی مجھ کو عذاب نہ کرتا۔[1]

چوتھی شرط یہ تھی کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعوں کے جان و مال و ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔ اس شرط پر قطعی عمل نہیں ہوا۔

عراق میں شیعیانِ علیؑ پر جتنے مظالم ہوئے ان میں سب سے ہلکی بات یہ تھی کہ ان کو کوفہ سے جلاوطنی پر مجبور کیا جاتا تھا اور ان کی جگہ معاویہ کے طرفداروں کو لاکر بسایا جاتا تھا۔[2] کوفہ اور بصرہ دونوں جگہ کے شیعوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ ان میں سے اکثر کو شام کے مقام قنسرین میں جو بالکل غیر آباد تھا لے جا کر فوجی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔[3]

حجر بن عدی اور ان کے ساتھی شام میں بلوا کر قتل کر دیے گئے، حالانکہ وہ اعلان کر رہے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اپنے معاہدہ پر قائم ہیں اور باغی نہیں ہیں۔[4] مگر ان کا سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ وہ محبِ اہلبیتؑ تھے اس لیے ان کے واسطے نہ حلم میں گنجائش تھی نہ رحم و کرم ان پر نگاہ ڈالنے کی اجازت دیتا تھا۔ ضبیعی بن فسیل شیبانی جو انہی میں سے ایک ممتاز فرد تھے۔ زیاد کے پاس لائے گئے تو زیاد نے پوچھا کہ تم علیؑ بن ابیطالبؑ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟ کہا بہترین رائے جو اللہ کے بندگان مومنین میں سے کسی کے بارے میں رکھی جا سکتی ہے۔ زیاد نے حکم دیا کہ اسے لکڑی سے پیٹو، اتنا کہ زمین سے لگ جائے۔ چنانچہ انھیں اتنی ہی شدت سے زدوکوب کیا گیا۔ زیاد نے کہا بس کرو۔ پھر پوچھا، ہاں اب بتاؤ علیؑ کے باب میں کیا کہتے ہو؟ کہا بخدا اگر استروں اور چھریوں سے میری بوٹیاں کاٹ ڈالو تب بھی وہی کہوں گا جو پہلے سن چکے ہو۔ کہا تجھ کو ان پر لعنت کرنا ہوگی ورنہ تیری گردن اڑا دی جائے گی۔ ضبیعی نے کہا تو پھر پہلے گردن اڑا ہی کیوں نہ دو، مجھے اس میں کوئی عذر نہیں بلکہ میں اس سے راضی اور مطمئن ہوں۔[5]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۶۴ [2] طبری ج ۳ ص ۲۴۰ [3] طبری ج ۴ ص ۲۶۰
[4] طبری ج ۶ ص ۱۴۸ و ص ۱۵۳ [5] طبری ج ۶ ص ۱۴۹

زیاد نے بارہ آدمیوں کو پابزنجیر شام کی طرف روانہ کیا[1]

حجر بن عدی کندی، ارقم بن عبداللہ کندی، شریک بن شداد حضرمی، صیفی بن فسیل، قبیصہ بن ضبیعہ عبسی، کریم بن عفیف خثعمی، عاصم بن عوف بجلی، ورقاء بن سمی بجلی، کدام بن حیات غزی، عبدالرحمٰن بن حسان غزی، محرز بن شہاب تمیمی، عبداللہ بن حویہ سعدی۔

علقمہ بن اخنس سعدی اور سعد بن نمران ہمدانی، ان دو آدمیوں کو زیاد نے بعد میں بھیجا جس کے بعد ان کی تعداد چودہ ہوگئی[2]

ان میں سے سات آدمی مختلف لوگوں کی سفارش پر چھوڑ دیے گئے، اور چھ آدمیوں کو مقام مرج عذراء میں تہ تیغ کیا گیا[3]

ایک شخص عبدالرحمٰن بن حسان غزی کے لیے معاویہ کو خود اپنی بے رحمی ناکافی محسوس ہوئی اور ان کو پھر زیاد کے پاس بھیجا۔ اس انتباہ کے ساتھ کہ یہ ان تمام لوگوں میں سب سے زیادہ شیعیت میں سخت ہے۔ تم اس کو بد سے بدتر طریقہ جو اختیار کرسکو اس طرح قتل کرو چنانچہ زیاد کے حکم سے انھیں زندہ زمین میں دفن کردیا گیا[4]

حجر بن عدی ان میں سے تھے جو مرج عذراء میں قتل کیے گئے۔ ان کو عالم اسلام میں کتنی ہر دلعزیزی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب زیاد کی مخبری کی اطلاع ام المومنین عائشہ کو پہنچی تو انھوں نے عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حسب ذیل پیغام کے ساتھ معاویہ کے پاس روانہ کیا اللہ اللہ فی حجر واصحابہ یعنی حجر اور ان کے اصحاب کے بارے میں خدا کا خوف کرنا، مگر افسوس ہے کہ عبدالرحمٰن اسوقت پہنچے جب حجر اپنے ساتھیوں سمیت قتل ہو چکے تھے۔ عبدالرحمٰن نے معاویہ سے کہا، آپ کے پاس سے کہاں چلا گیا تھا۔ ابوسفیان سے میراث میں ملا ہوا حلم؟ آپ نے اس حلم سے کام کیوں نہ لیا؟ آپ نے ان کو جیل خانہ ہی میں ڈال دیا ہوتا اور وبا وطاعون سے ہلاک ہوجانے دیا ہوتا۔ معاویہ نے طنزیہ طور پر جواب دیا کہ تمھارے ایسا کوئی مشورہ دینے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۴۴ [2] طبری ج ۶ ص ۱۵۲ [3] طبری ج ۶ ص ۱۵۴ [4] طبری ج ۶ ص ۱۵۵

والا موجود نہ تھا۔ عبدالرحمٰن نے کہا۔ اب بخدا عرب میں نہ تو آپ کے حکم کا کوئی ذکر ہوگا اور نہ آپ کی اصابت رائے قابلِ تسلیم رہی۔ آپ نے ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کو قید کر کے آپ کے پاس بھیجا گیا تھا اور وہ مسلمان تھے۔

عائشہ کو اس حادثہ کی اطلاع پہنچی تو انھوں نے کہا "اگر معاویہ کو احساس ہوتا کہ اہلِ کوفہ میں کچھ بھی جرأت و ہمت ہے تو وہ کبھی حجر اور ان کے اصحاب کو گرفتار کرا کے شام بلوانے اور قتل کرنے کی جرأت نہ کرتا، لیکن جگر خوارہ کے لڑکے کو معلوم ہے کہ آدمی فنا ہو چکے ہیں۔ خدا کی قسم یہ لوگ اپنی علمی طاقت اور فقہی قابلیت کے لحاظ سے عرب کے سر اور دماغ سمجھے جا سکتے تھے۔ لبید شاعر نے کیا خوب نظم کیا ہے اپنے دو شعروں میں جن کا مضمون یہ ہے کہ گزر گئے وہ لوگ جن کی پناہ میں زندگی بسر کی جا سکتی تھی اور رہ گیا ہوں میں ایسے پس ماندہ افراد میں جو خارشی اونٹ کی کھال کے مثل ہیں۔ نہ تو ان سے کوئی فائدہ ہے اور نہ ان سے کسی اچھائی کی توقع ہے جب وہ بات کرتے ہیں تو عیوب سے مملو ہوتی ہے چاہے وہ شور و غل برپا نہ کریں۔

جب معاویہ مدینۂ رسولؐ میں آئے اور ام المومنین عائشہ کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوئے تو سب سے پہلی بات جو عائشہ نے پیش کی وہ حجر کا معاملہ تھا اور اس گفتگو میں یہاں تک طول ہوا کہ معاویہ نے کہا، اچھا پھر چھوڑ دیجیے، مجھے اور حجر کو! خدا کے یہاں دیکھا جائے گا۔

عبداللہ بن عمر کا واقعہ ہے کہ وہ بازار میں تھے۔ ان کو حجر کے قتل کی خبر ملی تو وہ بے چین ہو گئے، نشست کو قائم نہ رکھ سکے اور کھڑے ہو کر چیخیں مار مار کر رونے لگے۔

حسن بصری کو جب حجر اور ان کے ساتھیوں کے قتل کا حال معلوم ہوا تو پوچھا کہ کیا ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی؟ کفن دیا گیا؟ اور دفن کیا گیا اور قبلہ رخ لاش رکھی گئی؟ معلوم ہوا کہ یہ سب کیا گیا۔ حسنؒ نے کہا تو پھر بخدا حجت ان کی تمام ہو گئی۔[1]

مطلب یہ تھا کہ لاشوں کے ساتھ اسلامی احکام پر عمل ان کے مسلمان سمجھے جانے کا ثبوت ہے تو پھر ان کا خون مباح کیونکر ہو سکتا ہے؟

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۵۵

ربیع بن زیاد حارثی نے جو خراسان کے حاکم تھے حجر بن عدی کے قتل ہونے اور مسلمانوں کی بے حسی کا تذکرہ کیا اور پھر جمعہ کے دن مسجد میں آکر حاضرین سے کہا، ایہا الناس میں زندگی سے عاجز ہو چکا ہوں۔ اب میں ایک دعا مانگتا ہوں، تم سب آمین کہنا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھائے اور کہا۔ خداوندا اگر ربیع کے لیے تیرے نزدیک کچھ بہتری ہے تو جلد اس کی روح قبض فرمالے۔ اس کے بعد مسجد سے باہر نکلے، کچھ دور نہ گئے تھے کہ زمین پر گرے اور انتقال کیا۔[1]

خود معاویہ کو بعد میں حجر کے بے گناہ قتل کرنے کے جرم کا احساس پیدا ہو گیا تھا چنانچہ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور تکلیف زیادہ ہوئی تو ایک روز عبداللہ بن یزید اسدی ان کے پاس آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بہت مضطرب ہیں۔ اس نے (خوشامدانہ لب و لہجہ میں) کہا، آپ کو اضطراب کی کیا ضرورت ہے؛ اگر مر گئے تو جنت میں پہنچے اور اگر زندہ رہے تو مسلمانوں کے جہاں پناہ رہے۔ معاویہ نے کہا "خدا رحمت نازل کرے تمہارے والد پر، وہ مجھے حجر بن عدی کے قتل سے منع کرتے تھے"۔ محمد بن سیرین کی روایت ہے کہ جب معاویہ کا وقت وفات قریب آیا اور انھیں گھبراہٹ لگی تو انھوں نے کہا یومی منك یا حجر یوم طویل (یعنی) "اے حجر تمہارے قتل سے مجھے طویل روز کا سامنا ہوگا"۔[2] حزن و مشقت کا زمانہ طولانی ہوتا ہے لہٰذا اس سے مقصود یہ ہے کہ مجھے اس قتل کے سبب سے روز قیامت بڑی تکلیف و زحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

عمرو بن الحمق الخزاعی ایک بزرگ تھے جن کو حضرت پیغمبرؐ نے سلام کہلوایا تھا اور اس لیے بہت بلند مرتبہ انسان سمجھے جاتے تھے۔ ان کی گرفتاری کا حکم ہوا اور معاویہ کی خصوصی ہدایت کے مطابق ان پر نو وار نیزے کے کیے گئے۔ حالانکہ پہلے یا دوسرے ہی زخم میں وہ جان بحق تسلیم ہو چکے تھے۔[3]

تاریخ کی تصریح کے مطابق سب سے پہلا سر جو اسلام میں نیزہ کی نوک پر بلند کیا گیا، وہ ان کا سر تھا۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۶۳ [2] طبری ج ۶ ص ۱۴۳ [3] طبری ج ۶ ص ۱۴۸

ان واقعات سے شیعانِ علیؑ میں تلاطم برپا ہو گیا اور حضرت امام حسینؑ پر بھی سخت اثر ہوا چنانچہ دینوری نے لکھا ہے کہ جب حجر بن عدی اور ان کے اصحاب قتل ہو گئے تو اہلِ کوفہ نے اس کو بڑی ناگوار مصیبت سمجھا اور کچھ لوگ اشرافِ اہلِ کوفہ میں سے حضرت امام حسینؑ کے پاس گئے اور آپ کو اطلاع دی۔ آپ نے کہا اِنّا لِلّٰہِ وانّا الیہ راجعون اور یہ واقعہ آپ کو بہت شاق ہوا[1] تاہم آپ نے اس واقعہ پر ایک دم کوئی انتہائی قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ آئندہ حالات کا بیچینی کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ بے شک جب معاویہ کو یہ معلوم ہوا کہ لوگ امام حسینؑ کے پاس شکایت لے گئے ہیں اور آپ نے بھی ان کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا ہے تو انھیں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں آپ مخالفت کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں۔ اس بنا پر انھوں نے آپ کے نام ایک تہدیدی خط لکھا۔ اس کے جواب میں اب حضرت امام حسینؑ خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ آپ نے ایک ایک کر کے امیر شام کی جو خلاف ورزیاں معاہدہ کے متعلق تھیں وہ گنوائیں اور خصوصیت کے ساتھ حجر بن عدی وغیرہ کے قتل کو آپ نے موثر الفاظ میں پیش کیا اور اس پر سخت احتجاج فرمایا۔ جس کا ذکر اس باب کے آخر میں آئے گا۔

پانچویں شرط یہ تھی کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ یا کسی کو بھی خاندانِ رسولؐ میں سے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے گی۔ نہ خفیہ نہ علانیہ۔ اس شرط کی بھی صریح خلاف ورزی کی گئی حالانکہ اس صلح کے بعد یہ حضرات ملکی اور سیاسی امور سے بالکل بے تعلق رہے مگر اس کے بعد بھی امام حسنؑ بنی امیہ کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں رہے۔ اس کی مختلف صورتیں تھی۔ پہلے غلط پروپیگنڈے اور بے بنیاد الزامات جن سے ان کی رفعت مرتبہ پر عام نگاہوں میں حرف آئے۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ خاندانِ پیغمبرؐ کے ان مقدس افراد کی زندگی اتنی پاک ہے کہ ان کے خلاف ایسا الزام جو کھلا ہوا اصولِ شریعت کے خلاف ہو عائد کرنا کسی طرح مفید نہ ہوگا اور وہ ہرگز مسلمانوں کی جماعت میں باور نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس طرح کے الزامات لگائے

---

[1] اخبار الطوال۔ ارشاد ص ۲۰۶۔

جو شرع کے حدود کے اندر تو ہوں مگر عام نگاہوں میں کچھ اچھی حیثیت سے دیکھے نہ جاتے ہوں مثلاً کثرت ازدواج اور کثرتِ طلاق ۔ یہ چیز بجائے خود شرعِ اسلامی میں جائز ہے لیکن بنی امیہ کے پروپگنڈے نے اس کو حضرت امام حسنؑ کی نسبت ایسے ہولناک طریقہ پر پیش کیا جس سے لوگ حضرت امام حسنؑ کی نسبت کچھ اچھی رائے قائم نہ کریں ۔ اسی طرح دونوں بھائیوں کے اختلاف طبیعت اور اختلاف رائے کا پروپگنڈا اور ایسی بہت سی چیزیں جو صرف اموی سیاست کی پیداوار تھیں۔

دوسرے عمالِ بنی امیہ اور ان کے ہواخواہوں کا حضرت امام حسنؑ سے برابر برتاؤ سخت کلامی اور دشنام طرازی جس سے کسی وقت مشتعل ہو کر حضرت امام حسنؑ یا بنی ہاشم میں سے دوسرے لوگ لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں اور اس سے ایک طرف ان پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا بے بنیاد الزام عائد کیا جا سکے دوسرے ان کی خونریزی کا ایک بہانہ ہاتھ آئے ۔ اس کا اندازہ امام حسینؑ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے مروان بن الحکم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمائے ہیں۔ اس وقت کہ جب امام حسنؑ کی وفات کے بعد آپ کے جنازہ پر مروان رو رہا تھا ۔ امام حسینؑ نے کہا "آج تم رو رہے ہو حالانکہ اس کے پہلے تم ہی ان کو غم و غصہ کے گھونٹ پلایا کرتے تھے" مروان نے کہا "ٹھیک ہے مگر وہ سب میں ایسے انسان کے ساتھ کرتا تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ قوتِ برداشت رکھنے والا تھا۔"

مگر اس انتہائی ضبط اور تحمل کے بعد بھی امام حسنؑ کی زندگی محفوظ نہ رہ سکی ۔ سلطنتِ وقت کو جب کوئی بہانہ ان کے خلاف کھلے ہوئے جور و ستم کا نہ ملا تو پھر وہ خاموش حربہ استعمال کیا گیا جو سلطنتِ بنی امیہ میں اکثر بڑی مہموں کے سر کرنے میں صرف کیا جاتا رہا تھا ۔ امیر شام معاویہ نے اشعث بن قیس کی بیٹی جعدہ کے ساتھ جو حضرت امام حسنؑ کی زوجیت میں تھی ساز باز کر کے اس کو ایک لاکھ درہم بھجوائے اور یزید کے ساتھ شادی ہو جانے کا وعدہ کیا اور اس کے ذریعہ سے حضرت کو زہر دلوا دیا جس سے آپ کے کلیجے کے ٹکڑے ہو گئے[1] ۔ جب آپ کی حالت دگرگوں ہوئی تو آپ نے اپنے مختلف البطن بھائی محمد بن الحنفیہ کو بلا کر فرمایا کہ دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ

---

[1] ارشاد ص ۱۹۷

میرے بعد حسینؑ سے تم اختلاف کرو۔ حسینؑ میرے بعد امام ہیں اور ان کی اطاعت لازم ہے۔ محمد نے نہایت خلوص کے ساتھ اقرار وفاداری کیا اور امام حسینؑ کی اطاعت کا وعدہ کیا[1]۔ پھر حضرت نے امام حسینؑ کو پاس بلایا اور وصیت کی کہ مجھے غسل و کفن کے بعد میرے جدِّ بزرگوار رسولِ خدا کے روضہ پر لے جانا تاکہ ایک مرتبہ زیارتِ رسولؐ کا شرف اور حاصل ہو جائے[2] اور مجھے یقین ہے کہ لوگ یہ خیال کرتے ہوئے کہ مجھے وہاں دفن کیا جائے گا مزاحمت کریں گے، تو خبردار اس بارے میں ایک قطرۂ خون بھی گرنے نہ پائے۔ تم مجھ کو میری دادی فاطمہ بنت اسد کی قبر کے پاس جنۃ البقیع میں دفن کر دینا[3]۔

۲۸ صفر ۵۰ھ کو وہ امن و صلح و سلامتی کا شہنشاہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ امام حسینؑ وصیت کے مطابق اپنے بھائی کو غسل کے بعد تابوت میں لٹا کر روضۂ رسولؐ کی طرف لے چلے۔ بنی امیہ کو یقین ہوا کہ آپ کو وہاں دفن کریں گے۔ سب کے سب مروان کے ساتھ ہتھیار باندھ کر نکل آئے اور بیچ میں سدِّ راہ ہوئے۔ اس وقت بنی ہاشم کو بہت زیادہ اشتعال تھا مگر حسینؑ اپنے بھائی امام حسنؑ کی وصیت اور فرض کے احساس سے مجبور تھے۔ آپ فرما رہے تھے کہ خدا کی قسم اگر بھائی کی وصیت اور ان کے اصول کا پاس نہ ہوتا تو تم دیکھتے کہ کیسی اس وقت تلوار چلتی ہے[4]۔ بہرحال حضرت امام حسنؑ کے جنازہ کو روضۂ رسولؐ سے واپس لے گئے اور جنۃ البقیع میں دفن کر دیا[5]۔ پھر یہ خبریں بھی معلوم ہوئیں کہ امیر شام نے امام حسنؑ کی وفات پر اظہارِ مسرّت کیا اور طعن و تشنیع کے کلمات کہے۔ اتفاق سے اس وقت ابنِ عباس دمشق میں تھے۔ انھوں نے یہ الفاظ سنے تو کہا کہ خوش نہ ہو تم بھی حسنؑ کے بعد عرصہ تک زندہ نہ رہو گے[6]۔

حضرت امام حسنؑ کی وفات بنی ہاشم کے لیے ایک سخت حادثہ تھی۔ چنانچہ اس سانحۂ عظیم پر بنی ہاشم ایک مہینہ کامل سوگوار رہے[7]۔ مگر اس کے بعد بھی امام حسینؑ اسی راستے پر قائم رہے جو امام حسنؑ نے قائم کر دیا تھا اور اس طرح یہ خیال بالکل غلط ثابت ہو گیا کہ آپ کو اپنے بھائی سے

---

[1] کافی ج ۱ ص ۱۸۶ [2] کافی ج ۱ ص ۱۸۵ و ۱۸۷ [3] ارشاد ص ۱۹۸ [4] ارشاد ص ۱۹۹
[5] کافی ج ۱ ص ۱۸۸ [6] الاخبار الطوال ص ۲۲۴ [7] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۷۳

اصولی اختلاف تھا۔ اور صرف ان کے دباؤ کی وجہ سے آپ اس پر قائم تھے۔ ایسا نہیں بلکہ آپ اسی راستے کو صحیح سمجھتے تھے اور اسی لیے خود صاحب اختیار ہونے کے بعد بھی اسی کو برقرار رکھا۔ حالانکہ اس وقت شیعوں میں ہیجان بھی پیدا ہوا جس کا تذکرہ تاریخ ان الفاظ میں کرتی ہے کہ جب حضرت امام حسنؑ کی وفات ہوئی تو عراق کے شیعوں میں حرکت پیدا ہوئی اور انھوں نے امام حسینؑ کو لکھا کہ ہم لوگ معاویہ کی بیعت توڑ کر آپ سے بیعت کرنے پر تیار ہیں مگر آپ نے فرمایا کہ نہیں، ہم میں اور معاویہ میں معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس کا توڑنا میرے لیے صحیح نہیں ہے۔ بیشک جب معاویہ کا انتقال ہوگا تو دیکھا جائے گا۔[1]

آپ صبر و سکون کے ساتھ تمام شرائط کی خلاف ورزی اور حکومت شام کی چیرہ دستیوں کو دیکھتے اور ان سے متاثر ہوتے رہے اور انھیں آپ نے ایک ایک کر کے اس وقت ظاہر کر دیا جب امیرِ شام نے آپ کو ایک تہدید آمیز خط لکھا ہے۔ آپ نے اس کے جواب میں ایک تاریخی مکتوب تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے:۔

"تمھارا خط ملا جس میں تم نے لکھا ہے کہ تم نے میرے متعلق اپنی مخالفت کے بارے میں کچھ خبریں سنی ہیں جن کی تم کو امید نہ تھی۔ تم کو جو خبریں پہنچی ہیں وہ تمھارے خوشامدی لوگوں اور چغلخوروں کی پہنچائی ہوئی ہیں۔ جو افترا و بہتان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں اس وقت تم سے مخاصمت اور جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اور خاموش ہوں مگر تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس خاموشی سے خوش نہیں ہوں اور یقیناً مجھے اپنے اس سکوت سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں خدا اس کی وجہ سے مجھ پر ناراض نہ ہو۔ یہ میری خاموشی تمھارے لیے اور تمھارے ہوا خواہوں کے لیے کبھی کوئی سند نہیں بن سکتی۔ کیوں معاویہ! کیا تم ہی نہیں ہو وہ شخص جس نے حجر کندی کو قتل کیا! کیا تم ہی وہ نہیں ہو جس نے ایسے نماز گزاروں

---

[1] ارشاد ص ۲۰۶

اور سرسنگاروں کو قتل کیا جو ظلم و بدعت کو پسند نہ کرتے تھے۔ اور دین کے معاملہ میں کسی شخص کی ملامت اور سرزنش کی پروا نہ کرتے تھے۔ حالانکہ تم ان کے ساتھ بڑی قسمیں کھا کر پختہ وعدے کر چکے تھے اور انھوں نے نہ کوئی فتنہ ملک میں پیدا کیا تھا اور نہ تمھاری مخالفت کی تھی مگر تم نے ان کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑا۔ کیا تم ہی وہ شخص نہیں ہو کہ جس نے عمر بن الحمق الخزاعی صحابیٔ رسولؐ کو قتل کیا جو ایسا صالح اور عبادت گزار بندہ تھا کہ کثرت عبادت سے اس کا جسم گھل گیا تھا۔ بدن دبلا ہو گیا تھا۔ قوتیں زائل ہو گئی تھیں اور چہرہ پر زردی چھا گئی تھی۔ تم نے پہلے ان کو امان دے دی تھی اور ایسا مضبوط وعدہ کیا تھا کہ اگر ایسا وعدہ کسی جانور سے بھی کیا جائے تو وہ پہاڑ کی چوٹی سے اتر کر پاس آجائے۔ پھر تم نے بڑی جسارت کے ساتھ اس عہد کو توڑ دیا اور بے جرم و خطا ان کو مار ڈالا۔ کیا تم ہی وہ شخص نہیں ہو جس نے زیاد بن سمیہ کو جو بنی ثقیف کے غلام عبید نامی کا بیٹا تھا اپنا بھائی، اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا۔ حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اس کا سمجھا جائے گا جو عورت کا اصلی شوہر ہو، اور زناکار کے لیے بس پتھر ہیں اور کچھ نہیں۔ مگر تم نے اپنی مصلحت کی بنا پر رسولؐ کو پس پشت ڈال دیا اور اس کو اپنا بھائی بنا کر عراقین کا حاکم بنا دیا۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ پیر قطع کرے اور ان کی آنکھوں کو گرم لوہے کی سلاخوں سے پھوڑے۔ اور درختوں کی شاخوں میں لٹکا کر مارے۔ کیا تم ہی وہ نہیں ہو جسے زیاد بن سمیہ نے لکھا تھا کہ حضر میین علیؑ کے دین پر ہیں۔ تم نے حکم دیا کہ جو لوگ علیؑ کے دین پر ہیں ان میں سے ایک کو زندہ نہ چھوڑو۔ اس نے سب کو مار ڈالا اور مُثلہ بھی کیا، اور جو تم نے مجھے لکھا ہے کہ میں اپنے نفس کا، اپنے دین کا اور امتِ محمدی کا خیال کروں اور ان کو فتنہ میں نہ ڈالوں اور جماعت

کی تفریق سے پرہیز کروں۔ تو میرے خیال میں کوئی فتنہ اس امت میں تمھاری خلافت وحکومت سے بڑھ کر نہیں ہے اور میں اپنے نفس، اپنے دین اور امتِ محمدی کے لیے کسی فائدہ کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھتا کہ میں ان امور میں تمھاری مزاحمت کروں۔ اگر میں ایسا کروں تو بیشک قربتِ الٰہی کا موجب ہوگا اور اگر ترک کردوں اور خاموش رہوں تو اس کے لیے خدا سے استغفار کروں گا اور اس سے رشد وصلاحیت کا طالب ہوں گا۔"

اس خط سے امام حسینؑ کے تاثرات کا پورے طور پر اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ آپ کسی اہم اقدام کے لیے اپنی ذمہ داری کو محسوس کر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد بھی آپ نے اس وقت تک بالکل خاموشی اختیار کی جب تک کہ معاہدہ کی آخری سانس بھی قائم سمجھی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد کے واقعات آنے والے ابواب میں نذرِ ناظرین ہوں گے۔

دسواں باب

یزید کی ولیعہدی

معاویہ کے لیے ان کی زندگی کا طویل دور کم نہ تھا جس میں انھوں نے مسلمانوں کی قسمت کے مالک بن کر اپنے حوصلے نکال لیے تھے۔ اور دنیا کی جاہ وحشمت اور مال و دولت کے خوب خوب مزے اٹھا چکے تھے، جس کا اعتراف انھوں نے ایک خاص انداز میں خود بھی کیا اور کہا کہ ہم تو دنیا میں غلطاں ہو گئے اور لوٹ لوٹ کے اس میں رہے[1] مگر انھوں نے اس پر اکتفا نہ کی اور یہ چاہا کہ ان کی اولاد بھی اسی طرح بہرہ اندوز ہو۔ حالانکہ وہ معاہدہ میں یہ شرط کر چکے تھے کہ میں اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد نہ کروں گا۔ پھر بھی انھیں فکر اس کی ہوئی کہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنا دیں مگر وہ یزید کے افعال وعادات کی وجہ سے سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اس پر تیار کرنا بڑا دشوار گزار مرحلہ ہے۔ اس لیے وہ اس کو زبان پر نہیں لاتے تھے۔ تاہم وہ رفتہ رفتہ اس کے انتظامات مکمل کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ایسے بااثر افراد کا جو مدعی خلافت بن سکیں ختم کرنا تھا۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید جن کا اثر اس وجہ سے شام میں بڑھ گیا تھا کہ ان کے والد کے کارنامے رومیوں کے مقابلہ میں اہل شام کے زبان زد تھے اور اس بنا پر معاویہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں اہل شام ان کو خلیفہ نہ تسلیم کر لیں لہٰذا ان کا علاج یہ کیا گیا کہ ابن آثال کے ذریعہ سے ان کو زہر دلا دیا جس سے ان کا خاتمہ ہو گیا[2]۔ معاویہ نے ابن آثال کو اس کا معاوضہ یہ دیا کہ ہمیشہ کے لیے ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا اور حمص کے خراج کی وصولیابی کا اسے والی قرار دے دیا[3]۔ مگر اسے اس رشوت سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اس لیے کہ عبدالرحمٰن کے بھائی مہاجر بن خالد نے مدینہ سے دمشق جا کر اپنی تلوار سے ابن آثال کو قتل کر دیا جس پر معاویہ نے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۶ [2] الوزراء والکتاب ص ۱۶ [3] طبری ج ۶ ص ۱۲۸

مہاجر کو قید کی سزا دی اور ایک سال کے بعد رہا کیا۔[1] دوسرا قول یہ ہے کہ عبدالرحمٰن کے بیٹے خالد بن عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید نے اپنے باپ کے قاتل کو حمص جا کر وہیں تہ تیغ کیا۔ اس پر معاویہ نے اس کو تھوڑے دن تک قید کیا، پھر دیت (خون بہا) لے کر رہا کر دیا۔[2] یہ ۴۶ھ کا واقعہ ہے۔ ان کے مقربین اور گرد و پیش کے رہنے والے اس کا اندازہ رکھتے تھے کہ معاویہ کی یہ دلی خواہش ہے کہ وہ یزید کو اپنا ولی عہد بنائیں مگر انھیں بھی اس کے بروئے کار آنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ سب سے پہلے جس نے اس تعطل اور جمود کو حرکت اور عمل میں تبدیل کیا وہ مغیرہ بن شعبہ والیٔ کوفہ تھا۔ یہ شخص بڑا ہی مدبّر اور عرب کے نہایت چالاک لوگوں میں محسوب تھا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ مغیرہ نے شاید فقط امتحان کے طور پر دمشق جا کر معاویہ کے سامنے حکومتِ کوفہ سے استعفا دینے کا خیال ظاہر کیا۔ وہ سمجھتا ہوگا کہ امیر معاویہ مجھے کسی قیمت پر ہٹانے کے لیے تیار نہ ہوں گے اور اس کے بعد میری خوشامد کریں گے۔ وہاں معاملہ برعکس ہوا اور معاویہ نے ایک دوسرے شخص کو کوفہ کی حکومت کے لیے تجویز کیا۔ جب یہ صورت پیش آئی تو مغیرہ نے حکومتِ کوفہ پر برقرار رہنے کے لیے تدبیر کی کہ وہ یزید کے پاس گیا اور اسے یہ پٹی پڑھائی کہ تم اپنے باپ سے ولیعہدی کا اعلان کیوں نہیں کرلیتے؟[3] کون کہہ سکتا ہے کہ یزید خود ہی اس کے واسطے دل ہی دل میں بیچین نہ ہوگا اور اگر اسے شراب و کباب کے مشغلوں میں اب تک اس پر غور کرنے کا موقع نہ بھی ملا ہو تب بھی مغیرہ کا یہ کہنا اس کی دیوانہ طبیعت کے لیے "ہوئے بس است" سے کم نہ تھا۔ وہ معاویہ کے پاس گیا اور ایک لاڈ پیار سے پلے ہوئے بے باک بیٹے کی طرح اپنے باپ سے بضد ہو کر اپنی ولیعہدی کے لیے خواہش کی اور مغیرہ بن شعبہ کے خیالات کو جو اس بارے میں تھے بیان کیا۔ معاویہ کو تو کبھی اس کی توقع ہوتی ہی نہ تھی کہ کوئی سنجیدہ انسان اس منصب کے لیے یزید کا نام پیش کرے گا۔ انھوں نے جو مغیرہ کی گفتگو سنی تو سمجھے کہ سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ انھوں نے مغیرہ کو بلوایا اور اس سے اس بارے میں تبادلۂ خیالات کیا۔ مغیرہ نے بڑے اعتماد

---

[1] الوزراء والکتاب ص۱۷ [2] طبری ج ۶ ص۱۲۹ [3] طبری ج ۶ ص۱۶۹

کے ساتھ بتلایا کہ اس مہم کا پورا ہونا کوئی مشکل نہیں ہے۔ کوفہ میں یزید کی موافقت پر لوگوں کو ہموار کرنے کے لیے میں کافی ہوں۔ بصرہ میں زیاد اس کام کو انجام دے گا۔ ان دو مقامات کے بعد پھر تیسری جگہ کوئی ایسی ہے نہیں جو یزید کی مخالفت کی جرأت کر سکے۔ معاویہ نے مغیرہ کی ان باتوں کو بڑی توجہ کے ساتھ سنا اور اس کو کوفہ کی گورنری پر بحال کر دیا۔ مغیرہ فوراً کوفہ پہنچا اور اس مقصد کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ اسے اپنی کارگزاری کا نتیجہ جلدی سے معاویہ کی خدمت میں پیش کر کے صلہ حاصل کرنا اور اپنی وفاداری کا سکہ جمانا تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے جو خاص بنی امیہ کے ہوا خواہ تھے ان کو بلا کر اپنے مقصد کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ "خلیفۃ المسلمین" اس امر کے متعلق مطمئن نہیں ہیں کہ کوفہ کے لوگ اس ولیعہدی کو تسلیم کریں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ یہاں سے ایک وفد ان کی خدمت میں جائے اور یہ التجا پیش کرے کہ وہ یزید کو اپنا ولیعہد قرار دیں۔ پھر بھی ایسے لوگ کم ملتے تھے جو اس وفد میں شریک ہونا پسند کریں۔ اس کے لیے مغیرہ کو اپنی جیب خاص یا خزانۂ سرکاری سے ۴۰ ہزار درہم رشوت میں صرف کرنا پڑے۔ اس طرح کوفیوں کا ایک وفد مرتب کر کے اپنے بیٹے موسیٰ کی قیادت میں معاویہ سے یزید کی نامزدگی کے لیے درخواست پیش کی۔ معاویہ اس التجا کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے وفد کو مناسب جواب دینے کے بعد علیحدگی میں موسیٰ بن مغیرہ سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کتنے پر تمھارے باپ نے ان لوگوں کے دین و ایمان کو خرید کیا؟ موسیٰ نے کہا تیس ہزار درہم میں۔[1]

معاویہ کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی رائے عامہ کے متعلق اب بھی اطمینان نہ تھا۔ انھیں جمہور کی نفرت و بیزاری کا خوف دامن گیر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغیرہ کے اس وفد کو رائے عامہ کا ترجمان نہیں سمجھا جا سکتا۔ اب انھوں نے زیاد بن ابیہ کو جسے وہ سیاسی طور پر اپنا بھائی بنا چکے تھے۔ اس معاملہ میں مشورہ لینے کے طور پر خط لکھا۔ زیاد

---

[1] کامل ابن اثیر

کو معاویہ کی اس خواہش کا اندازہ بہت عرصہ سے ہوگا۔ اب اس خط سے اس خواہش کا اظہار بھی ہوگیا اور یہ ظاہر ہے کہ ایک وفادار گورنر کی حیثیت سے اس کا کیا فرض ہونا چاہیے تھا خصوصاً جبکہ معاملہ اس کے "بھتیجے" کا تھا۔ مگر معاملہ کی نزاکت اور اس کے تمام پہلو زیاد کو لرزہ براندام بنا رہے تھے چنانچہ اس نے اپنے خاص محرم راز عبید بن کعب نمیری کو بلا کر کہا، کہ "خلیفۃ المسلمین نے مجھے خط لکھا ہے کہ انھوں نے یزید کی بیعت لینے کا ارادہ کیا ہے مگر انھیں لوگوں کی نفرت و بیزاری کا خوف ہے اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح جمہور مسلمین متفق کیے جاسکیں اور اس بارے میں مجھ سے مشورہ کیا ہے۔ اسلامی ذمہ داری کا احساس بہت اہم ہے اور یزید ایک آوارہ اور مطلق العنان شخص ہے اور شکار کا بڑا دلدادہ ہے۔ تم میری طرف سے سرکار کے پاس جا کر یزید کے افعال و حالات کا تذکرہ کرو اور کہو کہ ذرا سوچ سمجھ کر اس کام کو کریں تھوڑے دن کی تاخیر کر لینا اس سے بہتر ہے کہ جلد بازی سے کام لیا جائے جسکا نتیجہ ناکامی کی صورت میں ظاہر ہو۔ عبید نے اس میں اتنی ترمیم کی کہ معاویہ کو اسطرح دوٹوک جواب نہ دیا جائے بلکہ یزید سے ملکر اس سے کہا جائے کہ اگر آپ کو رائے عامہ اپنے موافق بنانا ہے تو ان افعال کو ترک کیجیے جنھیں مسلمان عموماً ناپسند کرتے ہیں۔ زیاد نے معاویہ کو صرف اتنا لکھا کہ اس بارے میں ذرا تاخیر سے کام لیجیے۔ تعجیل مناسب نہیں ہے[1] کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد یزید نے اپنی بہت سی بداعمالیوں کو ترک کر دیا[2] مگر بعد کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کینہ یزید کے دل میں زیاد کی طرف سے پیدا ہوگیا بلکہ شاید ہم سنی کی رقابت سے اس کو یہ خیال ہوا کہ زیاد نے یہ مخالفت اپنے بیٹے عبید اللہ کے اشارے سے کی ہے اس لیے وہ عبید اللہ بن زیاد سے بھی ایک عرصہ تک اس کے بعد بدظن رہا۔

۴۹ھ یا ۵۰ھ میں ستر برس کی عمر میں مغیرہ کا انتقال ہوگیا[3]۔ اب کوفہ میں زیاد کی حکومت ہوگئی۔ وہ ۴۵ھ میں معاویہ کی طرف سے بصرہ، خراسان اور سجستان کا حاکم

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۶۹ [2] طبری ج ۶ ص ۱۷۰ [3] طبری ج ۶ ص ۱۳۱

بنایا گیا تھا۔ پھر بحرین اور عمان بھی اس کی حکومت میں شامل کر دیے گئے[1]۔ اب مغیرہ کے مرنے کے بعد کوفہ بھی اس کی حکومت میں شامل کر دیا گیا۔ چونکہ اس تمام قلمرو میں بصرہ اور کوفہ دو اہم مقام تھے لہٰذا اب وہ سال میں چھ مہینہ بصرہ میں رہتا تھا اور چھ مہینہ کوفہ میں اور اس مدت میں بصرہ کی حکومت پر سمرہ بن جندب کو اپنا قائم مقام بنا جاتا تھا[2]۔ تین یا چار سال کی مدت گزرنے پر ۴ ماہ رمضان ۵۳ھ کو زیاد کی بھی وفات ہو گئی[3]۔ اب شاید اس اندیشہ میں کہ رہے سہے خاص خاص خیر خواہ بھی کہیں راہیٔ ملک عدم نہ ہو جائیں۔ معاویہ نے ایک تحریری فرمان یزید کی ولیعہدی کا لکھ کر مجمع عام میں اس کا اعلان کر دیا اور رعایا سے اس کا اقرار لیا گیا[4]۔

واقعات بتلاتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ بڑی حد تک کوفہ کی زمین کو ہموار بنانے کا کام کر چکا تھا اور کم از کم ہوا خواہان بنی امیہ کو اس کے لیے تیار کر لیا تھا۔ بصرہ میں بہر حال عبید اللہ بن زیاد کو اس اسکیم کی تکمیل کرنا لازم تھی۔ چاہے اس کی ذاتی رائے اس بارے میں کچھ بھی ہوتی اور وہاں کی خلقت اس کے باپ سے اور خود اس سے اس درجہ مرعوب و خائف تھی کہ وہاں کسی مخالفت کا امکان نہ تھا اور شام تو اپنا ملک ہی تھا۔ رہے دے کر وہاں ایک عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید تھے۔ جن سے اندیشہ ہوتا انھیں پہلے ہی ختم کیا جا چکا تھا۔ دوسرے مقتول خلیفہ عثمان کے بیٹے سعید تھے۔ انھوں نے ذرا خلافت یزید پر اظہار ناراضگی کیا اور خود معاویہ کے پاس آ کر کہا کہ آپ نے یزید کو مجھ پر مقدم کیا اور اس کے لیے بیعت لی حالانکہ بخدا آپ جانتے ہیں کہ میرے باپ اس کے باپ سے بہتر اور میری ماں اسکی ماں سے اچھی اور میں خود اس سے بہتر ہوں اور آپ کو جو کچھ ملا ہے یہ میرے باپ کا صدقہ ہے۔ یہ سن کر معاویہ نے کہا کہ تم نے جو اپنے باپ کے احسان کا مجھ پر ذکر کیا تو مجھے اس کا انکار نہیں مگر میں نے اس کا عوض یہ کر دیا کہ ان کے خون کا مطالبہ کیا اور قاتلوں سے ان کے بدلہ لیا اور تمھارے باپ کی فضیلت اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مجھ سے بہتر تھے۔ اور انھیں رسول خدا سے قرابت مجھ سے زیادہ حاصل

---

[1] طبری ج ۶ [2] طبری ج ۶ ص ۱۳۱ [3] الوزراء والکتاب ص ۱۶ [4] طبری ج ۶ ص ۱۷۷

تھی۔ اسی طرح تمھاری ماں کی فضیلت۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کیونکہ قریشیہ کی بزرگی کلبیہ پر ظاہر ہے لیکن یہ بات کہ تم یزید سے بہتر ہو تو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے نزدیک اگر تم ایسوں سے میرا گھر بھرا ہو وہ سب مل کر بھی یزید کے برابر نہ ہوں گے۔

وہ تو یہ جواب سنکر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہوں گے مگر پھر کہا جاتا ہے کہ یزید نے اپنے باپ سے سفارش کہ سعید میری وجہ سے کبیدہ خاطر ہو گئے ہیں تو آپ انھیں کسی صورت سے خوش کر دیجیے۔ اس پر معاویہ نے انھیں خراسان کا حاکم بنا دیا[1]۔ اس طرح یہ خدشہ بھی دور ہو گیا۔ شام اور عراق کو ہموار کرنے کے بعد معاویہ نے مکہ اور مدینہ کے متعلق خیال کیا اس زمانہ میں مروان مدینہ کا حاکم تھا۔ معاویہ نے اس کو لکھا کہ ہم نے یزید کو اپنا ولیعہد بنایا ہے اور اس کے لیے ولیعہدی کی بیعت لی جا چکی ہے تم خود بھی یزید سے بیعت کرو اور ہماری طرف سے وہاں مدینہ کے لوگوں سے یزید کے لیے بیعت لو۔ مروان نے جب معاویہ کا حکم پڑھا تو غصہ سے برافروختہ ہو کر گھر میں گیا۔ گھر والوں اور اپنے ماموں زاد قبیلہ بنی کنانہ کے لوگوں پر بھی اپنی اس ناراضگی اور رنج و غضب کا اظہار کیا اور اسی غصہ میں دمشق کی طرف معاویہ سے خود بات چیت کرنے کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر معاویہ سے ملا اور اس انداز سے چلتا تھا جس طرح دو برابر کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ معاویہ سے غصہ سے بھری ہوئی تیز و تند تقریریں کیں اور کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ چھوکروں کو امیر اور سردار بناتے ہیں۔ اس ارادہ سے باز آئیے۔ یاد رکھیے کہ آپ کی قوم میں ایسے اور بھی موجود ہیں جو آپ کے مشوروں میں شریک اور آپ کے کاموں میں آپ کے وزیر و مددگار رہے ہیں۔ معاویہ نے کہا، مروان خفا نہ ہو۔ تم بیشک خلیفۂ وقت کی نظیر ہو اور ہر مشکل میں اس کے پشت پناہ اور مددگار رہو۔ اس لیے یزید کے بعد تم کو ہی یزید کا ولیعہد ہم نے قرار دیا ہے۔ یہ تھا وہ سیاسی منتر جس نے مروان کے غصہ کو ختم کر دیا اور مروان بخیال خود مطمئن ہو کر مدینہ واپس ہوا۔ مدینہ میں مروان نے ایک جلسہ منعقد کیا اور اس میں یزید کی تخت نشینی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۱

کے متعلق ذکر کیا اور کہا معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی بیعت کا اسی طرح حکم دیا ہے جس طرح ابوبکر نے عمر کے لیے بیعت لی تھی۔ یہ سننا تھا کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر بگڑ گئے اور کہا ابوبکر نے اپنے بیٹے کی بیعت نہیں لی تھی۔ یہ تو کسریٰ و قیصر کا طریقہ ہے۔ ہم ہرگز اس شرابی و زانی کی بیعت نہ کریں گے۔ عبدالرحمٰن کے خیالات کی تائید حضرت امام حسینؓ، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر نے کی۔ جو واقعہ پیش آیا اس کی اطلاع مروان نے معاویہ کو کر دی۔ معاویہ نے کچھ دن تامل کیا۔ پھر یزید کو لے کر حج کے بہانے سے روانہ ہوئے۔ معاویہ کو خوب احساس تھا کہ ان لوگوں کو جنھوں نے خلافتِ یزید پر اعتراض کیا ہے دنیائے اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقہ کے نقطۂ نظر سے جن جن افراد کو اسلامی معاملات سے دلچسپی کا ورثہ پہنچتا تھا وہ سب ہی یزید سے اختلاف رکھنے میں متفق تھے۔ چنانچہ ایک طرف ان میں حضرت حسینؓ بن علیؓ تھے تو دوسری طرف

عبدالرحمٰن ، ابن ابی بکر
عائشہ ، بنتِ ابی بکر
عبداللہ ، ابن عمر
عبداللہ ، ابن عباس اور
عبداللہ ، ابن زبیر بھی تھے

ان ناموں کے دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو فرقہ بندی آج قائم ہے اس کا کوئی اثر یزید کی ولیعہدی کے جواز پر نہیں پڑتا۔ اصولاً یزید کی ولی عہدی سے اختلاف میں تمام وہ افراد متفق تھے جو کسی فرقہ کے نقطۂ نظر سے بھی مذہبی نمائندگی کر سکتے تھے۔ اب یہ اپنا اپنا ثباتِ قدم اور استقلال ہے کہ کوئی تمام مشکلات کے باوجود آخر وقت تک اپنی اس بات پر قائم رہے اور کوئی پھر حالات سے مجبور ہو جائے لیکن اصول اور آئین کے اعتبار سے ان سب کا متفق ہونا خود ایک بڑی وزنی حقیقت ہے۔

معاویہ نے ان لوگوں کو خوف دلاکر بھی دبانا چاہا اور لالچ دلاکر بھی مائل کرنا چاہا۔ چنانچہ سب سے پہلے جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی۔ آپ کو دیکھ کر معاویہ نے کہا نہ تمھارے لیے خوشی ہو اور نہ برکت۔ تم ایک قربانی کا دنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ خدا کی قسم یہ خون ضرور گرایا جائے گا۔ امام حسینؑ نے فرمایا، چپ رہو۔ ہم ایسے کلام کے اہل نہیں ہیں۔ معاویہ نے کہا۔ اس سے بھی بدتر کلام کے مستحق ہو۔ پھر اس کے بعد ابن زبیر سے ملے تو ان سے کہا کہ تو ایک چھپے ہوئے مکار سوسمار (گوہ) کے مانند ہے جو سر کو اپنے سوراخ میں ڈال کر دُم ہلاتا ہے۔ قسم ہے خدا کی عنقریب اس کی دم پکڑ لی جائے گی۔ دور کرو اس کو، اور پھر ان کے خچر پر چابک مارا اور ہٹا دیا۔ پھر اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکر ملے۔ ان کو کہا کہ یہ بڈھا بھی سٹھیا گیا ہے اور اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ پھر حکم دیا کہ ان کے سواری کے خچر پر بھی تازیانہ مارو اور ہٹا دو۔ پھر عبداللہ بن عمر سے بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا[1]

اس کے بعد مدینہ میں داخل ہو کر بھی خلافتِ یزید کے لیے ان حضرات کو ڈرانے دھمکانے اور قتل کی دھمکیاں دینے لگے۔

عائشہ نے جو یہ سنا تو غصہ میں معاویہ کے پاس گئیں اور کہا کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ تم پہلے میرے ایک بھائی (محمد بن ابی بکر) کو قتل کر چکے اور تم نے لاش ان کی آگ میں جلائی آج مدینہ میں آکر میرے دوسرے بھائی کو تکلیف پہنچاتے ہو اور ان کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کرتے ہو اور فرزندِ رسولؐ اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہو۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جنھیں رسولؐ نے رحم کھا کر فتح مکہ میں قتل سے آزاد کر دیا تھا۔ تم کو ایسی حرکتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں۔

طبری نے معاویہ کا مکالمہ جو عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے ساتھ درج کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:-

معاویہ نے کہا، اے عبدالرحمٰن کیسے ہاتھ پیروں کے ساتھ تم میری نافرمانی کرنے کی

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۳ ص ۴۵۴

جرأت کرتے ہو؟ عبدالرحمٰن نے کہا اس لیے کہ اس امر کے لیے میں اپنے کو زیادہ مستحق سمجھتا ہوں۔ معاویہ نے کہا کہ میں اس صورت میں تمہارے قتل کا ارادہ رکھتا ہوں۔ عبدالرحمٰن نے کہا، اگر تم ایسا کروگے تو لعنتِ خدا اور سزائے آخرت کے مستحق ہوگے[1]

یہ تو خوف دلانے کی تدبیریں تھیں۔ جب یہ کامیاب نہیں ہوئیں تو دوسری صورت بھی اختیار کی گئی چنانچہ ایک لاکھ درہم عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے پاس بھیجے۔ مگر انھوں نے روپیہ واپس کر دیا اور کہا کہ ہم دین کو دنیا کے عوض فروخت نہیں کریں گے اور مکہ سے ہجرت کر گئے۔ اسی طرح عبداللہ بن عمر کو بھی ایک لاکھ درہم بھیجے گئے، انھوں نے کہا کہ میں بڈھا ہو چکا ہوں اور میرا دین ایک لاکھ درہم سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ کہہ کر روپیہ واپس کر دیا۔ اور امام حسینؑ کو بھی بہت کچھ تحائف اور زر و مال پیش کیا گیا تھا مگر آپ نے قبول نہ فرمایا اور واپس کر دیا۔

ازواجِ رسولؐ میں سے عائشہ نے اس مخالفت میں زیادہ حصہ لیا چنانچہ حافظ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ معاویہ مدینہ میں منبرِ رسولؐ پر بیٹھے یزید کی بیعت لے رہے تھے کہ عائشہ نے اپنے حجرہ سے پکار کر کہا کہ خاموش ہو جاؤ، کیا کر رہے ہو؟ کیا تم سے پہلے شیخین نے اپنے بیٹوں کے لیے کبھی بیعت لی تھی؟ معاویہ نے کہا کہ نہیں۔ تو عائشہ نے کہا پھر تم کس کی پیروی کرتے ہو؟ معاویہ یہ سنکر شرمندہ ہوئے اور منبر سے اُتر آئے۔

اس سے ظاہر ہے کہ یزید کی ولیعہدی سب کے نزدیک اصولِ شریعت اور آئینِ اسلام کے خلاف تھی۔ اس کے علاوہ حضرت امام حسنؑ کے ساتھ شرائطِ صلح میں یہ بات طے پا چکی تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اس کے بعد معاویہ کو اپنے بیٹے کا خود نامزد کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

یہ سب اس صورت میں بھی تھا کہ جب یزید اپنے کردار کے لحاظ سے اچھا ہی آدمی ہوتا، چہ جائیکہ یزید کے اخلاق و عادات وہ تھے جو کسی شائستہ انسان اور ایک معمولی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۷

مسلمان کے بھی شایانِ شان نہیں چہ جائیکہ خلافت کے لیے جو بہرحال ایک مذہبی عہدہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید مرزا صاحب لکھتے ہیں۔ "اسلام کے شروع سے حاکمِ اسلام دین اور دنیا دونوں کا مقتدا سمجھا جاتا تھا۔ مذہب اور سیاست کا یہ اجتماع عقلمندانہ اصول پر مبنی تھا یا نہیں، یہ ایک مختلف فیہ بات ہے جس کے متعلق میں اپنی رائے کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا لیکن یہ اصول عام طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ خلیفہ اسلام میں علاوہ سیاسی قابلیت کے مذہبی اور دینی صفات بھی بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ اور یہ سب کو معلوم تھا کہ یزید اس لحاظ سے کسی طرح بھی مستحق خلافت نہیں تھا۔" اسی لیے جتنے سمجھدار انسان تھے سب ہی اس اقدام کو نازیبا سمجھ رہے تھے اور اسے ایک مہلک اقدام کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔

حسن بصری کا قول تھا کہ معاویہ نے چار باتیں ایسی کیں جن میں سے ایک بھی ہو تو وہی ہلاکت کے لیے کافی ہے۔ اوّل جاہلوں کی مدد سے بغیر امت کے مشورہ کے انھوں نے خلافت پر قبضہ کر لیا۔ حالانکہ اس وقت اصحاب رسولؐ اور صاحبانِ فضیلت موجود تھے۔ دوسرے اپنے بیٹے کو جو شراب خوار نشہ باز تھا اور ریشم پہنتا اور طنبورہ بجایا کرتا تھا اپنا جانشین بنایا۔ تیسرے زیاد کو اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اسی کا قرار دیا جا سکتا ہے جو اصلی شوہر ہو اور زنا کار کے لیے بس پتھر ہے۔ چوتھے حجر اور اصحاب حجر کا قتل کرنا۔[1]

دوسرا قول ان کا یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کی تباہی کے ذمہ وار دو شخص ہیں۔ ایک عمرو بن العاص جس نے معاویہ کو قرآن نیزوں پر بلند کرنے کی رائے دی تھی۔ چنانچہ وہ بلند بھی کیے گئے اور دوسرے مغیرہ جس نے معاویہ کو یزید کی بیعت لینے کا مشورہ دیا۔ اگر مغیرہ کی یہ رائے نہ ہوتی تو قیامت تک انتخاب کا اصول قائم رہتا۔ معاویہ کے بعد جو

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۴۵ - ابوالفداء ج ۱ ص ۱۹۶ - طبری ج ۶ ص ۱۵۷

تخت نشین ہوئے وہ سب کے سب معاویہ کی مثال کے مطابق اپنے بیٹوں کی بیعت کراتے رہے۔ مسلمانوں کی اس رائے عامہ کی نمائندگی وہ چند اشخاص کر رہے تھے جن کے نام تاریخ میں درج ہیں۔

معاویہ پر یہ امر چھپا ہوا نہیں تھا کہ اس جماعت میں سب سے نمایاں ہستی حسینؑ کی ہے اور اس بنا پر انھوں نے مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ کہ حسینؑ بن علیؑ کو بلوا کر کہا کہ اس معاملہ میں تمام لوگ ہموار ہو چکے ہیں سوا پانچ آدمیوں کے قریش میں سے جن کی سرکردگی آپ کر رہے ہیں۔ حضرت نے متعجبانہ انداز سے کہا "میں ان کی سرکردگی کرتا ہوں؟" معاویہ نے کہا "بے شک آپ ہی ان کے سرغنہ ہیں"۔ یہ سنکر حضرت نے فرمایا تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ دوسرے لوگوں کو بلوا کر ان سے بیعت کا مطالبہ کیجیے۔ اگر ان سب نے بیعت کر لی تو تنہا مجھ سے آپ کو کسی اندیشہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دفع الوقتی کامیاب ہوئی اور نتیجہ میں معاویہ کی یہ کوشش بیسود ثابت ہوئی اور وہ ناامیدی کے ساتھ شام واپس گئے۔ امام حسینؑ کا بیعت سے انکار سلطنت اقتدار کیلئے بڑی سخت ٹھوکر تھی جسے معاویہ کی قوت سیاست دانی سمجھتی تھی مگر اسے حسینؑ بن علیؑ کا ایک بڑا تدبر سمجھنا چاہیے کہ آپ نے اپنے عمل کو سلبی حدود تک محدود رکھا یعنی صرف بیعت نہ کرنا اور سکوت اختیار کرنا۔ آپ جانتے تھے کہ فریق مخالف ایک وقت میں اس سکوت کو توڑنے کے لیے تشدد سے کام لے گا جس کے لیے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام کا الزام عائد کیا جا سکے۔ دوسری طرف معاویہ نے بھی بتقاضائے سیاست اس وقت کسی عملی اقدام کو مناسب نہیں سمجھا مگر اس کے بعد نہ معاویہ تدبیروں سے غافل تھے اور نہ حسینؑ مستقبل سے بے خبر تھے۔ اصل میں حسینؑ چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں اور حریف تشدد سے کام لے اور معاویہ کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنی طرف سے عملی طور پر تشدد کی پہل نہ کریں اور حسینؑ جوش میں آکر کوئی ایسا اقدام کر بیٹھیں جو امن عام کو صدمہ پہنچانے کی ذمہ داری ان پر عائد کر دے۔

درحقیقت کربلا کی جنگ اپنے قریبی اسباب کے لحاظ سے شروع یہیں سے ہوگئی مگر یہ اس وقت ایک صبر آزما نفسیاتی کشمکش تھی جو نہ معلوم کب تک جاری رہتی۔ اگر معاویہ کا رشتۂ عمر قطع نہ ہوتا اور نوعمر، ناتجربہ کار، غرورِ سلطنت سے بدمست یزید تختِ سلطنت پر نہ بیٹھتا۔

گیارھواں باب

معاویہ کی وفات اور یزید کی تخت نشینی

۶۰ھ میں امیرِ شام معاویہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ انھیں اپنی بیماری کے عالم میں اور خصوصاً اس وقت جبکہ صحت سے مایوسی ہو گئی تھی شدید احساس تھا کہ انھوں نے یزید کی خلافت تسلیم کرانے میں کتنی محنت و مشقت برداشت کی ہے اور کس درجہ اپنے راحت و آرام اور مال و دولت اور سب سے بڑھ کر ضمیر کی قربانی کی ہے جو روحانی تکلیف کا باعث ہوتی ہے جس کا اظہار انھوں نے بصیغۂ راز مروان سے کیا۔ ملاحظہ ہو ابنِ حجر مکی کی کتاب "تطہیر الجنان واللسان" جو انھوں نے معاویہ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک روز معاویہ رونے لگے۔ مروان نے سبب دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ دنیا میں کون سی راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو۔ اب سن زیادہ ہو گیا اور ہڈیاں گھل گئیں اور جسم کمزور ہو گیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لیے راہ راست کو حاصل کر لیتا۔[1]

علامہ ابن حجر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان الفاظ میں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کر لیا ہے کہ یزید کی محبت نے ان کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرطِ محبت نے مسلمانوں کو ان کے بعد ایسے فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کر دیا جس نے ان کو تباہ کر دیا۔[2]

پھر یہ فطری بات ہے کہ جتنا زیادہ کسی نے ایک مقصد کے لیے ایثار اور کد و کاوش کی ہو اتنی ہی اسے اپنے اس مقصد کی کامیابی کی فکر ہوتی ہے اور اس میں کسی خلل

---

[1] حاشیہ صواعق محرقہ ص ۵۶ [2] حاشیہ صواعق محرقہ ص ۵۸

کے واقع ہونے کا قلق ہوتا ہے۔ معاویہ نے یزید کے لیے کیا کچھ کیا اور اس میں ان کے نزدیک خلل کیا باقی رہ گیا، اس کا تذکرہ انھوں نے خود یزید سے کیا۔ اپنے مرض الموت کی ابتدا میں جبکہ انھوں نے اسے بلا کر کہا۔ بیٹا میں نے تم کو کوچ اور مقام کی زحمتوں سے بچا دیا اور تمھارے لیے تمام انتظامات مکمل کر دیے اور تمام دشمنوں کے سر تمھارے لیے خم کرا دیے اور تمام قوم عرب کی گردن کو تمھارے واسطے جھکا دیا اور سب کو تم پر مجتمع کر دیا ہے مگر مجھے اس خلافت کے مسئلہ میں جو تمھارے لیے مکمل ہو چکا ہے۔ بس قریش کے چار آدمیوں سے کھٹکا ہے حسینؓ بن علیؓ عبداللہ بن عمر عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر[1]

ظاہر ہے کہ ان آنکھوں کی سوئیوں کے رہ جانے کا معاویہ کو کتنا خیال اور صدمہ ہوگا اور یہ صدمہ اُتنا اُتنا بڑھتا جاتا تھا جتنا جتنا ان کی موت کا وقت قریب آتا جاتا تھا۔

لیکن وہ یزید جس کے لیے انھوں نے یہ سب کچھ کیا تھا اپنے بوڑھے باپ کے آخر وقت پاس موجود بھی نہ تھا[2] اور دمشق کے باہر مقام حوارین پر رنگ رلیوں میں مصروف تھا[3] معاویہ نے اپنی علالت دگرگوں پا کر اس کے پاس بلانے کے لیے آدمی بھیجا مگر اس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو انھوں نے اپنے پولیس آفیسر ضحاک بن قیس فہری اور اپنے پہرہ داروں کے سردار مسلم بن عقبہ کو بلا کر کہا کہ جب یزید آئے تو میری وصیت اس تک پہنچا دینا اور اسے بتلانا کہ میرا حکم اس کے لیے یہ ہے کہ وہ اہل حجاز کے ساتھ مراعات سے کام لے جو لوگ وہاں سے دارالسلطنت میں آئیں ان کا اکرام و احترام کیا جائے اور جو وہاں کے اشراف اور بزرگ یہاں سے دور ہیں ان کی بھی وقتاً فوقتاً خبر گیری کی جاتی رہے اور اہل شام کو اپنا دست و بازو اور اپنا چشم و گوش بنائے رکھے اور انھیں شام کے صوبہ سے باہر زیادہ عرصہ تک نہ رکھا جائے تاکہ ان میں دوسرے مقامات کے اخلاق و اوصاف سرایت نہ کریں۔ اس کے بعد یہ بتلا دینا کہ مجھے اس کے خلاف صرف

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۹ [2] طبری ج ۶ ص ۱۸۲ [3] طبری ج ۶ ص ۱۸۳

چار آدمیوں سے خوف ہے۔ اوّل حسینؓ بن علیؓ، دوسرے عبداللہ بن عمر، تیسرے عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور چوتھے عبداللہ بن زبیر[1]

اس وصیت سے صاف ظاہر ہے کہ معاویہ بستر مرگ پر بھی اپنے دل میں تمام درد یزید کا لیے ہوئے تھے۔ ان کو نہ اپنی بیماری کا کوئی خیال تھا نہ اپنی تکلیف کا کوئی تصور نہ اپنے انجام کے متعلق کوئی فکر۔ انھیں اس وقت بھی خیال تھا، تصور تھا اور فکر تھی تو یزید اور صرف یزید کی۔ اور اس کے ساتھ آخر وقت کی پتھرائی ہوئی نگاہوں میں بھی صورتیں تھیں تو چار، جو یزید کے لیے ان کے نزدیک ایک خطرہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن میں سب سے پہلی تصویر تھی حسینؓ کی۔

رجب ۶۰ھ میں معاویہ دنیا سے رحلت کر گئے[2]۔ اڑسٹھ برس کی عمر میں وہ شام کے گورنر بنے تھے۔ ۵۸ برس کی عمر میں وہ خود مختار خلیفہ ہوئے اور ۷۸ برس کی عمر میں اب ان کی وفات ہوئی[3]

بعض مورخین کے بیان کے مطابق ان کی عمر اس سے کچھ کم ۷۳ یا ۷۵ اور بعض کے نزدیک اس سے زیادہ پچاسی سال کی تھی[4]

یزید کو اس کی شکارگاہ میں اس سانحہ کی اطلاع دی گئی جس کو سن کر وہ دمشق پہنچا۔ ایسے وقت جب معاویہ دفن بھی کیے جا چکے تھے۔ باپ کی بچھائی ہوئی مسند اس کے آنے ہی کی منتظر تھی۔ وہ تخت خلافت پر متمکن ہوا اور تمام اہل شام نے فوراً اس کی بیعت کر لی۔

---

[1] الاخبار الطوال ص۲۳۶، طبری ج ۶ ص۱۸۰ [2] طبری ج ۶ ص۱۸۰، ارشاد ص۲۰۶
[3] کتاب البلدان [4] طبری ج ۶ ص۱۸۱

بارھواں باب

یزید تاریخ کی روشنی میں

یزید کی ماں میسون بنت بحدل بن انیف کلبیہ[1] ایک صحرائی عورت تھی جو شہری زندگی سے نفرت کرتی تھی مگر وہ اپنے حسن و جمال کی بدولت معاویہ کی بہت منظورِ نظر ہو گئی تھی اور انھوں نے اس کے لیے غوطہ کے مقابل ایک قصر تعمیر کرایا تھا۔ جہاں سے اس پُر فضا جگہ کی سیر دور تک ہو سکتی تھی۔ اور اس قصر میں بڑے آرائش کے سامان اور سونے چاندی کے برتن اور دیبائے رومی کے رنگا رنگ اور منقش فرش مہیا کیے تھے۔ اور بہت سی حسین و جمیل کنیزیں خدمت کے لیے دی تھیں۔ ان شاہانہ انتظامات کے ساتھ میسون کو اس محل میں اتارا گیا تھا مگر یہ سب کچھ اس صحرائی عورت کی نگاہ میں خاک تھا۔ اس لیے کہ اسے تو اپنا جنگل اور اس میں چرتی ہوئی بھیڑ، بکریاں یاد آتی تھیں۔ ایک دن معاویہ کے محل میں آنے کا وقت تھا اور میسون ایک بہترین پوشاک پہن کر اور قیمتی زیورات پہن کر اور خوشبو لگا کر کنیزوں کے جھرمٹ میں اس کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی جو کہ غوطہ کے مرغزار کی طرف تھی۔ اس کو وہاں کے درخت نظر آ رہے تھے اور طائروں کے نغموں کی صدا اور پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس وقت اسے اپنا نجد کا بادیہ اور ہمجولیاں اور سہیلیاں یاد آئیں۔ جس کی بنا پر وہ بیساختہ رونے لگی اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگی۔ ایک خواص نے رونے کا سبب دریافت کیا۔ میسون نے ایک لمبی سانس لی اور کچھ اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا "یقین سمجھو کہ وہ ڈیرا جس میں چوبائی ہوا کے جھونکے آتے رہتے تھے مجھے اس عالی شان محل سے زیادہ محبوب ہے اور وہ بالوں کی عبا جو میرے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۳ و ج ۷ ص ۱۵

جسم پر ہوتی تھی ان باریک اور صاف پوشاکوں سے زیادہ محبوب تھی اور ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا اپنے جھونپڑے کے کونے میں بیٹھ کر کھانا مجھے ان صاف اور عمدہ روٹیوں سے زیادہ مرغوب تھا اور وہ درّہ ہائے کوہ میں ہواؤں کے تھپیڑے کی صدا میرے لیے طبلوں کی آواز سے زیادہ دلکش تھی اور وہ کتّا جو مہمانوں کے آنے کے وقت بھونکتا تھا ان خوبصورت سدھی ہوئی مرغابیوں سے زیادہ محبوب تھا۔ اور وہ سرکش اونٹ جو ہودجوں کو لے کر چلتا تھا مجھے اس زین و لجام سے آراستہ خچر سے زیادہ پسند تھا، اور میرے قوم و قبیلہ کا ایک دُبلا پتلا حقیر آدمی مجھے ایک بدخو مسٹنڈے سے زیادہ محبوب تھا۔

جب معاویہ آئے تو اس خواص نے یہ قصہ معاویہ سے دہرایا یا یہ کہ معاویہ نے میسون کو یہ اشعار پڑھتے خود سن لیا۔ بہرحال ان کو بڑا غصہ آیا اور انھوں نے کہا کہ سب تو نے اس نے مجھ کو سخت بدخو مسٹنڈا بنایا۔ میں اس کو تین طلاق دیتا ہوں۔ جاؤ اس سے کہو کہ وہ جو کچھ محل میں ساز و سامان ہے سب کچھ لے لے اور چلی جائے چنانچہ اسے نجد میں اس کے عزیزوں کے یہاں بھجوا دیا گیا۔ اس حالت میں کہ یزید اس کے پیٹ میں تھا[1] ۲۲ھ میں یزید کا تولّد ہوا[2] دو برس کے بعد جب معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس کو وہاں سے بلوا لیا[3] نوجوانی ہی کی عمر سے وہ فسق و فجور اور لہو و لعب میں مبتلا ہو گیا اور سن کے ساتھ ساتھ اس کے ان اوصاف میں بھی ترقی ہوتی گئی چنانچہ مختلف جانوروں کے ساتھ اس کے رکیک حرکات کا تاریخ میں مختلف صورتوں سے چرچا موجود ہے۔

علامہ دمیری نے لغت "مہند" کے تحت میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اس کو گھوڑے پر سوار یزید بن معاویہ نے کیا ہے[4] دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ یزید کے ایک بندر کو گدھے پر بیٹھنے کی مشق کرائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ میں اس کا بڑے شہسواروں سے مقابلہ کرایا جاتا تھا اور ایک مرتبہ وہ تمام شہسواروں سے سبقت لے گیا تو یزید نے اس پر

---

[1] حیوٰۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۰۷ [2] طبری ج ۴ ص ۲۵۹ [3] حیوٰۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۰۷
[4] حیوٰۃ الحیوان ج ۲ ص ۱۸۶

میں شعر کہے جن کا مضمون یہ تھا کہ کوئی میری طرف سے کہہ دے اس بندر سے جو ایک گدھی کی پشت پر بیٹھ کر گھوڑوں سے آگے نکل گیا کہ اے ابوقیس جب تو اس پر سوار ہوا کر تو اس سے لپٹا رہا کر کیونکہ اگر تو گر کر مر گیا تو اس گدھی سے کوئی باز پرس بھی نہ ہو سکے گی[1]

یزید نے اپنے بندر کی کنیت ابوقیس قرار دی تھی اور اپنے ساغر کی بچی ہوئی شراب اسے پلایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ بنی اسرائیل کا ایک بزرگ ہے جس نے گناہ کیا تھا تو وہ مسخ ہو گیا اور وہ اس کو ایک گدھی پر سوار کرتا تھا جو اسی مقصد سے سدھائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں وہ اسے گھوڑوں کے ساتھ چھوڑ دیتا تھا۔ ایک روز وہ گدھی آگے بڑھ گئی تو یزید بہت خوش ہوا اور یہ شعر پڑھے :-

"اے ابوقیس اس کی مہار سے لپٹا رہا کر، اگر تو گر پڑا تو اس پر کوئی ذمہ واری نہ ہو گی۔ اس گدھی نے یہ کارنمایاں کیا ہے کہ وہ تمام گھوڑوں سے آگے نکل گئی ہے"[2]

یہ تو اس کے لغو افعال تھے۔ اس کے علاوہ شرابخواری اس کی ضرب المثل تھی۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے نام ہی اس کا "سکران" یعنی بدمست رکھ لیا تھا[3] وہ کسی موقع پر مصلحتاً بھی اس عادت کو ترک کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب ولی عہدی کے دور میں معاویہ کے حکم سے وہ مکہ و مدینہ میں اپنا اثر و رسوخ جمانے کے لیے حج کو گیا تو مدینۂ رسولؐ میں پہنچ کر بھی مصاحبوں کے جھمگٹے میں شراب کا دور ضرور چلایا[4]

واقدی نے عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ خدا کی قسم ہم کو یزید کی حکومت میں یہ خوف ہو گیا تھا کہ اب آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنی سوتیلی ماؤں اور اپنی بیٹیوں اور بہنوں تک کو نہ چھوڑتا تھا اور شراب آزادی سے پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا[5]

اتنا ہی نہیں کہ وہ عملی حیثیت سے ایک لاابالی اور گنہگار شخص تھا بلکہ اس کے

---

[1] حیوٰۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۰۱ [2] تاریخ ابن الفوطی [3] الاخبار الطوال ص ۲۶۱
[4] کامل ج ۴ ص ۶۳ [5] صواعق محرقہ ص ۱۳۵

خیالات بھی ایسے ہی تھے۔ وہ اپنے افعال پر منفعل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان پر نازاں تھا۔ اس کا مظاہرہ اس کے دیوان کے ان اشعار سے ہوتا ہے جن میں اس نے احکام شریعت کا مذاق اڑایا ہے بلکہ قرآن وحدیث کے ساتھ تمسخر کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اشعار میں اکثر باتیں غیر واقعی بھی نظم ہوجاتی ہیں اور ان کے بیانات اکثر تخیلی پیرایہ رکھتے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خیالات ویسے ہی دماغ میں آتے ہیں اور اشعار ویسے ہی تراوش کرتے ہیں جیسا انسان کا مذاقِ طبیعت ہوتا ہے۔ ایک دیندار متقی اور پرہیزگار شخص سے ممکن نہیں ہے کہ وہ اشعار میں خدا یا رسولؐ یا ائمہ دین کے ساتھ اس طرح کی جسارتیں کرے جو انتہائی حقارت آمیز ہوں۔ یزید کے اشعار اسی طرح کے ہیں۔

وہ صرف لذائذ سے متمتع نہیں ہوتا تھا بلکہ نظریہ بھی یہی رکھتا تھا۔ دیکھا جائے تو عمر خیام کا یہ فلسفہ کہ آخر میں فنا ہونا ہے اس لیے جتنا ممکن ہو دنیا میں مزے لوٹ لو خیام سے پہلے یزید کے ذہن میں تشکیل پاچکا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

اقول الصحب ضمت الکاس شملهم وداعی مبابات الهویٰ یترنم
خذوا بنصیب من نعیم ولذّة فکلّ وان طال المدیٰ یتصرّم

"ان ساتھیوں سے جنھیں ساغر شراب نے ایک مرکز پر جمع کر دیا ہے اور جن کے سامنے عشق ومحبت کے محرکات نغمہ سرائی کرتے ہیں میرا یہ قول ہے کہ جتنا ممکن ہو عیش ولذّت سے بہرہ ور ہو لو کیونکہ کتنی ہی مدت طولانی ہو آخر میں تو ختم ہی ہونا ہے"۔ [1]

نماز اور شرابخواری کا موازنہ کرتے ہوئے اس نے ایک شعر میں کہا ؎

ما قال ربّك ویل للألی شربوا بل قال ربّك ویل للمصلّین

یعنی "خدا نے شرابخواروں کو عذاب سے ڈرانے کے لیے "ویل الشاربین" کہیں

---

[1] صواعق محرقہ ص ۱۳۲

نہیں کہا بلکہ قرآن میں نماز گزاروں کو "ویل للمصلّین" کہا ہے۔"
ایک جگہ اس نے شراب کے بارے میں اس طرح کہا ہے ؎

فان حرمت یوما علیٰ دین احمد　　فخذ ھا علیٰ دین المسیح ابن مریم

یعنی "اگر دینِ احمدؐ میں شراب پینے کو حرام سمجھا گیا ہے تو خیر دینِ مسیح پر ہو کر ہی پی لو۔"
اس نے آخرت کی نعمتوں کا موازنہ نغمہ و شراب سے کرتے ہوئے یوں کہا ہے ؎

معشر الندمان قوموا　　واسمعوا صوت الاغانی
واشربوا کأس مدام　　واترکوا ذکر المعانی
شغلتنی نعمۃ العید　　ان من صوت الاذان
وتعوّضت عن الحو　　رعجو زانی الدّنان

"اے حریفانِ شراب اٹھو اور گانوں کی صدا سنو، ساغر شراب پیو اور دوسری باتوں کا ذکر چھوڑ دو۔ مجھ کو ستار اور سارنگی کے نغموں سے اذان کی آواز سننے کی فرصت نہیں اور حوروں کے عوض میں نے شیشہ کی پری کو پسند کر لیا ہے۔"

یوں تو یہ اشعار تفریح طبع کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں مگر ان میں حور و قصور کی خبروں کا مضحکہ ضرور مضمر ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے حشر و نشر کے انکار کو بالکل صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے۔ اپنے ان اشعار میں ؎

علّیۃ ھاتی واعلنی وترنّمی　　بذالک انّی لا احب التّناجیا
حدیث ابی سفیان قد مات سبھا　　الا احد حتی اقام البواکیا
الا ھات اسقینی علیٰ ذاک قھوۃ　　تخیرھا العنسی کرما شآمیا
اذا ما نظرنا فی امور قدیمۃ　　وجدنا احلا لاشربھا متوالیا
وان مت یا امّ الاحیم فانکحی　　ولا تأملی بعد الفراق تلاقیا

فان الذی حدّثت عن یوم بعثنا　　احادیث طسم تجعل القلب ساھیا
ولا بدّلی من ان ازور محمّدا　　بشمولۃ صفراء تردی عظامیا

"اے نازنین محبوبہ مجھے سنا اور بلند آواز سے سنا اور گا کر پڑھ، مجھے چپکے چپکے گفتگو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ سنا ابوسفیان کا وہ پرانا قصہ، اُحد میں اسکا کارنامہ جہاں اس نے دشمنوں کے گھر میں ماتم برپا کر دیا تھا۔ ہاں اسی افسانہ کے ساتھ مجھے شراب پلاتی جا، وہ شراب جسے شام کے بہت منتخب انگور سے بنایا گیا ہو۔ ہم جب قدیمی عملدرآمد پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کا پینا حلال ہی نظر آتا ہے اور اگر میں مرجاؤں اے نازنین محبوبہ تو تُو کسی اور سے نکاح کر لینا اور یہ امید نہ کرنا کہ اس جدائی کے بعد کبھی پھر ملاقات ہوگی۔ دوسری زندگی کے متعلق تو نے جو قصے سنے ہوں گے وہ پارینہ قصے ہیں جو انسان کے دل کو نادانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ میں محمدؐ کا سامنا کروں گا ایسی شراب کے نشہ میں مست رہ کر جس کا اثر میری ہڈیوں تک پہنچ گیا ہو۔"

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے دل میں جاہلیت کے خیالات اور بدر و اُحد کا مشرکانہ جذبہ اور حضرت محمد مصطفےٰؐ سے ضد اور کد کا جذبہ موجود تھا۔ ان کے ساتھ آگے چل کر وہ اشعار بھی آئیں گے جو اس نے قتل حسینؑ کے بعد اور اہل بیتؑ کے شام میں وارد ہونے کے وقت کہے ہیں تو وہ بھی انہی خیالات کے حامل نظر آئیں گے۔ اس سب کے باوجود یہ سیاست دنیا کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا تھا کہ ایسا شخص اسلامی خلیفہ اور ایک حیثیت سے جانشین رسولؐ اور امیرالمومنین بنکر بیٹھ گیا تھا اور مسلمانوں کی اکثریت اس کی اس حیثیت کو تسلیم کر رہی تھی۔ اس کا اثر عام مسلمانوں کے اخلاق پر کیا پڑ سکتا، سوا اسکے کہ ان میں بھی مذہبی بے حسی بلکہ مذہب کو نگاہِ حقارت سے دیکھنے کا جذبہ اور وہی عیش و نشاط کی گرم بازاری پیدا ہو جاتی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

تیرھواں باب

امام حسینؑ کے بلند اخلاق و کمالات اور گراں قدر مقولات

عرب کے ایک فلسفی شاعر نے کہا ہے۔ ان العظائم کفؤھا العظماء "بڑے کارناموں کے لیے بڑے ہی نفوس درکار ہوتے ہیں"۔ ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے ؎

علیٰ قدر اھل العزم تأتی العزائم　　وتأتی علیٰ قدر الکرام المکارم

ویکبر فی عین الصغیر صغارھا　　وتصغر فی عین العظیم العظائم

(یعنی) "صاحبانِ ارادہ کی شخصیت کے مطابق ہی ہوتے ہیں ان کے ارادے اور بزرگ مرتبہ نفوس کی مناسبت ہی سے ہوتی ہیں ان کی بزرگیاں، چھوٹے آدمی کی نگاہ میں چھوٹا سا کام بھی بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے اوّل تو وہ اس کے کرنے کی ہمت نہیں کرتا اور اگر کر بھی لیتا ہے تو اس کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھ کر اس پر نازاں ہو جاتا ہے اور بڑے کی نگاہ میں بڑا کام بھی چھوٹا معلوم ہوتا ہے اس لیے وہ اسے کر گزرتا ہے اور اس پر بھی اس کا دل نہیں بھرتا بلکہ اس سے بھی بڑے کارنامہ کے لیے تیار رہتا ہے۔"

اس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مجاہدۂ کربلا ایسے عظیم الشان کارنامہ کا حامل ہونا ہی حسینؑ کے نفسِ بزرگی اور ان کے کردار کی رفعت کے متعلق وہ سب کچھ بتلا دیتا ہے جس کا شاید پورے طور پر اندازہ کرنا اور پھر اسے واضح طور پر الفاظ کے ذریعہ سے پیش کرنا مورخین کے تصور اور تحریر کی طاقتوں سے باہر تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کے نادر خصوصیات عالمِ وقوع میں آ ہی نہ سکتے تھے۔ اگر اس کے انجام دینے کے لیے حسینؑ کے ایسے بلند نفس کا انسان موجود نہ ہوتا اور واقعۂ کربلا میں

عظمت، اہمیت اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی تھی اگر اس کا تعلق حسینؑ ایسی عظیم المرتبت ذات کے ساتھ نہ ہوتا۔

یوں تو واقعۂ کربلا خود ہی ایسے نادر خصوصیات رکھتا ہے کہ بحیثیت واقعہ اس کی مثال کوئی مل ہی نہیں سکتی لیکن ان خصوصیات سمیت بھی اس کی تاثیر کا بڑا تعلق اس چیز کے ساتھ ہے کہ وہ حسینؑ ایسی بلند ہستی کے ساتھ متعلق ہے۔ کوئی معمولی شخص ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا اور بفرضِ محال کرتا بھی تو اس کی یہ تاثیر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے واقعۂ کربلا کا وقوع بھی حسینؑ کے نفس کی انتہائی عظمت کا ثبوت ہے اور اسکی وہ تاثیر بھی جو عالمِ اسلام میں پیدا ہوئی حسینؑ کے نفس کی رفعت و بلندی اور آپ کی شخصیت کی برتری کی دلیل ہے۔

مگر یہ نقطہ بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت اور کردار کا باہمی تعلق ایک متعاکس نتیجہ رکھتا ہے یعنی کسی خاص عملی کارنامہ میں اہمیت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ شخصیت کی رفعت و شہرت اور سربلندی سے اور پھر اس انسان کی شخصیت و عظمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اس کردار سے۔ اس لیے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگرچہ واقعۂ کربلا کا وجود میں آنا اور پھر اس میں یہ تاثیر پیدا ہونا ممکن نہ تھا بغیر امام حسینؑ کے، مگر امام حسینؑ کی شخصیت کی ہمہ گیری اور رہنمایانِ عالم میں آپ کی امتیازی فوقیت کے آفتاب کا بلا تفریق مذہب و ملّت ہر واقف اور منصف شخص کی نگاہ میں خطِ نصف النہار پر پہنچنا بھی واقعۂ کربلا کے سبب سے تھا، یہی وجہ ہے کہ واقعۂ کربلا سے پہلے کی آپ کی زندگی تاریخ کے صفحات پر اس حد تک محفوظ نہیں ہے جتنے کہ واقعۂ کربلا کے دوران میں آپ کی سیرت کے خط و خال اپنے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات کے ساتھ محفوظ ہیں۔ سبب اس کا صاف ظاہر ہے۔ واقعۂ کربلا کے پہلے امام حسینؑ کو مورخین کی نگاہ بس اس حد تک دیکھ سکتی تھی جتنا کہ آپ کے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ یا آپ کی اولاد میں ان اماموں کو وہ دیکھ سکی جن میں سے ہر ایک تقویٰ، عصمت اور پاکبازی کا مجسمہ تھا۔ جیسے اُن کے اوصاف و کردار کے متعلق کبھی اجمال اور کبھی کچھ تفصیل کے ساتھ بعض واقعات

سخاوت، عبادت، ریاضت وحلم وغیرہ کا تذکرہ ہے اسی طرح امام حسینؑ کے متعلق بھی جستہ جستہ اس قسم کے مختلف واقعات اور حالات کا تذکرہ صفحاتِ تاریخ پر پایا جاتا ہے۔ اس وقت کے تاریخی واقعات محفوظ کرنے والوں کو ۶۰ھ کے پہلے تک کیا معلوم تھا کہ آپ ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام دینے والے ہیں جس کی مثال تاریخ کے صفحات پر ناپید ہوگی تاکہ وہ ابتدائے عمر سے آپ کی زندگی کے ہر جزئیہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے اور انھیں سینہ بہ سینہ محفوظ کرکے لب بہ لب منتقل کرتے ہوئے کتابوں کے دامن تک پہنچاتے۔

لیکن ایک طرف تو واقعۂ کربلا کے دوران میں تمہیدی یا ضمنی طور پر تاریخ نے جو مختلف اخلاقی واقعات اور حالات حضرت امام حسینؑ کے بیان کر دیے ہیں وہ آپ کے سیرت و کردار کا ایک آئینہ پیش کرتے ہیں، دوسری طرف آپ کی سابقہ زندگی کے متعلق جن روایات کو تاریخ نے ہم تک پہنچایا ہے ان سے بھی آپ کی عظمت اور اوصاف و کمالات کے متعلق ایک روشن مرقع ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ صرف ایک مظلوم اور ستم رسیدہ، شہید ہونے کے لحاظ ہی سے دنیا کے قلوب کا مرکز نہیں ہیں بلکہ آپ کے ذاتی خصوصیات اور اوصاف و کمالات بھی آپ کو دنیا کا قبلہ بنانے کے لیے کافی تھے جن سے آپ انسانیت کی معراجِ بلندی میں سب سے زیادہ رفیع درجہ پر نظر آتے ہیں۔

ظاہری حیثیت سے ماہرینِ نفسیات کے نقطۂ نظر سے شخصیتوں کی تشکیل کے اسباب حسب ذیل ہوتے ہیں۔

پہلے خاندانی خصوصیات اور بزرگوں کے قدیم روایات۔ دوسرے ماحول اور تعلیم و تربیت تیسرے زندگی کے اہم تجربات۔ پہلی چیز وہ ہے جو انسان کے خون میں دوڑ کر اس کی صلاحیت اور استعداد اور فطری قابلیتوں کی تشکیل کرتی ہے۔ دوسری چیز ان صلاحیتوں کو فعلیت کے درجہ سے قریب تر پہنچانے کا کام انجام دیتی ہے یا بسا اوقات فعلیت میں لے آتی ہے اور تیسری چیز ان فعلی کمالات میں پختگی پیدا کرکے ملکۂ ذاتی بناتی اور ان میں استحکام پیدا

کرتی ہے۔ حضرت امام حسینؓ میں تینوں باتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ آپ کے خاندانی خصوصیات وہ تھے جن کی نظیر دوسرے شخص میں پائی نہ جاتی تھی اور یہ خصوصیت وہ تھی جس کے لحاظ سے آپ کے مخالف گروہ کو اپنی فوقیت ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہ ملتی تھی سوا ظلم و جبر اور قہر و استبداد کے۔ انھیں ایک خاص احساس کمتری کے ساتھ آپ کے بلند خصوصیات کو خود اپنی زبان پر لانا پڑتا تھا اور جواب دینے ہی کے ارادہ سے ان کا اعتراف کرنا پڑتا تھا چنانچہ یزید نے بھی اپنے دربار میں اس کا اقرار کیا کہ بے شک ان کی ماں میری ماں سے بہتر اور انکے نانا میرے نانا سے بہتر تھے[1] ان خاندانی خصوصیات کے ساتھ جو ظاہری اسباب کی بنا پر حسنِ فطرت کے ضامن ہیں حسینؓ نے تربیت ایسی بلند پائی تھی جس سے انسان کے اخلاق و اوصاف میں بلندی پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو مختلف حالات اور متضاد واقعات کے ایسے دور سے گزرنا پڑا تھا جس میں انسان کو جذباتِ نفس کے خلاف عقل کی طاقت سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے نفس میں پختہ کاری، تدبر اور استقلال پیدا ہونا لازمی ہے۔

ان واقعات سے ایک ایسا شخص بھی جو امام حسینؓ کی بحیثیت ایک معصوم ذات کے معرفت نہ رکھتا ہو، یہ ماننے کے لیے مجبور ہے کہ حسینؓ کوئی جذباتی انسان نہ تھے۔ وہ متحمل اور بردبار تھے اور کبھی غصہ اور جوش میں آکر کوئی کام ایسا نہ کرتے تھے جو نظم و ضبط اور سکون کے خلاف ہو۔ سخت سے سخت مواقع پر خاموشی آپ کا ایک مستقل کردار بن گئی تھی بشرطیکہ اس خاموشی سے اُن مقاصد کو کوئی ضرر نہ پہنچے جن کے وہ خود اور ان کے نانا، باپ اور بھائی محافظ رہے تھے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسی صلح کل متحمل اور امن پسند ذات کسی ایسے اقدام کے لیے تیار نہیں ہو سکتی جس میں وہ اور اس کے تمام ساتھی ایک دم تہ تیغ ہو جائیں۔ جب تک ایسے اہم اور غیر معمولی اسباب پیدا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۶

نہ ہو جائیں جن کے بعد وہ ایسا کر گزرنا خالق کی طرف سے اپنا فرض سمجھے چنانچہ جب ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ ایسا کر گزرتا ہے اور اس سے اُس کے نفس کی ارادی طاقت اور عملی قوت کی پختگی اور اپنے ذاتی جذبات کو فرائض کے مقابلہ میں فنا کر دینے کی وہ بلند منزل ظاہر ہوتی ہے جس پر ہر انسان نہیں پہنچ سکتا۔

نفسانیت کی فنا اور فرض شناسی کا ملکہ یہی وہ ایک جامع اور وسیع مفہوم ہے جس کے تحت میں انسانی کردار کے تمام مظاہرات جزئی و کلی طور پر داخل ہو جاتے ہیں مگر حضرت حسینؑ کے کمالات و اوصاف کی تشریح کے لیے جب اہلِ معرفت نے قلم اٹھایا تو اس پر اجمالی تبصرہ کے لیے بھی بلند ترین الفاظ تلاش کرنا پڑے اور تفصیل کے موقع پر بھی زریں روایات سامنے آئے۔

ابن ابی شیبہ مشہور محدث نے امام حسینؑ کا حال درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کان عالما بالقرآن عاملا علیہ زاھد اتقیا ورعا جوادا فصیحا بلیغا عارفا باللہ و دلیلا علیٰ ذاتہ تعالیٰ "آپ قرآن کے عالم اور اس پر عامل، زہد و تقویٰ کے جوہر کے حامل، پاکیزہ خصال، پرہیزگار، سخی، شیریں بیان اور شیوا زبان خدا کی معرفت رکھنے والے اور ذاتِ الٰہی کا ایک ثبوت تھے۔"

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ لکھنے والا پہلے تو اوصاف کے اظہار میں مجبوری ان الفاظ کو صرف کرتا رہا جو معمولی درجہ کے علماء اور زہاد کے متعلق بھی صرف ہوتے رہتے ہیں۔ پھر اس کا حوصلۂ اظہار ان الفاظ کی کوتاہی سے تنگی کرنے لگا اور اس نے آخری الفاظ میں صفات انسانی کی معراج کمال کا پتہ دے دیا کہ وہ اپنے خالق کے اوصاف کا مظہر بن جائے۔ علامہ ابن عربی نے اسی لیے پہلے ہی کوتاہ دامن الفاظ کے دفتر کو تہہ ہی رکھنا مناسب سمجھا اور انھوں نے کہہ دیا کان الحسین السبط اٰیۃ من اٰیات اللہ "سبطِ رسولؐ امام حسینؑ خدا کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی تھے۔" یہ اختصار بیان اوصاف میں وہ ہوتا ہے جو ہزار تفصیلوں سے بڑھ کر فائدہ دیتا ہے۔

حسینؑ بے شک ذاتِ الٰہی کا ثبوت اور اس کی بڑی نشانی تھے۔ اسی لیے خدا کو نہ ماننے والوں کا بھی حسینؑ کو دیکھ کر دل چاہنے لگتا ہے کہ خدا کو مان لیں یا ماننے لگتے ہیں۔ جیسا کہ جوشؔ ملیح آبادی نے کہا ہے ؎

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنا ثبات — کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگِ کائنات — اک کارساز ذہن ہے اک ذی شعور ذات

سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

عبادت آپ کی یعنی وہ جسے عام طور پر عبادت سمجھا جاتا ہے ورنہ حقیقت کے لحاظ سے تو آپ کا ہر عمل رضائے پروردگار کی غرض سے اور فرض کے احساس کا نتیجہ ہوتا تھا۔ اس لیے کوئی حرکت و سکون بھی آپ کا عبادت سے باہر نہ تھا مگر اس محدود مفہوم کے لحاظ سے بھی جس کے اعتبار سے لوگ انسان کو عابد کہتے ہیں آپ کی عبادت دنیا کے لیے ایک بے مثال نمونہ تھی۔ رات دن کی نماز گزاری اور مسلسل روزہ داری کے علاوہ ۲۵ حج آپ نے پا پیادہ کیے[۱]

ان تمام حجوں کے واقعات اور زمانہ کی تعیین سے ہمارے موجودہ معلومات کوتاہ ہیں ایک مرتبہ کے سفرِ حج کا تذکرہ یہ ملتا ہے کہ خلیفۂ ثالث کے زمانہ میں امام حسینؑ اپنے والد بزرگوار جناب امیرؑ کی معیت میں حج کے لیے متوجہ ہوئے مگر آپ سقیا اور عرج کے درمیان تھے کہ بیمار پڑ گئے۔ عبداللہ بن جعفر آپ کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت علیؑ شاید کچھ آگے بڑھ چکے تھے۔ آپ کو بھی خبر دی گئی۔ آپ اسماء بنتِ عمیس کو لے کر تشریف لائے تقریباً بیس دن تک اور ایک روایت کے مطابق چالیس دن تک تیمارداری ہوتی رہی، تب آپ صحت یاب ہو کر مدینہ واپس آئے[۲] لیکن یہ واقعہ اگر درست ہو تو اس

---

[۱] تہذیب الاسماء نووی ج ۲ [۲] تفسیر جامع البیان طبری ج ۲ ص ۲۴

تعداد سے خارج ہوگا۔ ہاں ایک مرتبہ کا یہ تذکرہ ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی امام حسنؑ دونوں شاہزادے پیادہ حج کے لیے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستے میں حاجیوں کا قافلہ بھی ان تک پہنچ گیا۔ اب جوان شاہزادوں کو لوگوں نے پیادہ دیکھا تو ہر شخص جس کی نظر پڑتی وہ فوراً ان کے احترام کے لحاظ سے سواری سے اُتر پڑتا۔ کچھ دیر تو لوگ ساتھ ساتھ پیادہ چلتے رہے۔ آخر طاقتِ رفتار نے جواب دیا۔ سب مل کر سعد بن ابی وقاص کے پاس آئے جو اس قافلہ میں سن رسیدہ صحابی تھے۔ ان سے آکر کہا کہ اب تو راستہ چلنا ہم لوگوں پر بہت بار ہے۔ مگر یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم لوگ سوار ہوں اور یہ دونوں شہزادے پیادہ رستہ طے کریں۔ سعد، امام حسنؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ حضور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعض پر پیادہ چلنا نہایت شاق ہو رہا ہے۔ مگر لوگ جب آپ دونوں بزرگواروں کو پیادہ چلتے دیکھتے ہیں تو ان کا دل نہیں چاہتا کہ وہ سوار ہو کر راستہ چلیں، اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ دونوں حضرات سوار ہو جائیں۔ امام حسنؑ نے فرمایا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کیونکہ ہم نے اپنے اوپر فرض یہی قرار دیا ہے کہ ہم خانہ کعبہ کی طرف اپنے پیروں سے چل کر جائیں۔ مگر لوگوں کو تکلیف دینا بھی ہمیں گوارا نہیں ہے اس لیے ہم اس راستے کو چھوڑے دیتے ہیں چنانچہ وہ دونوں بزرگوار شاہراہ سے ہٹ کر دوسرے راستے سے روانہ ہو گئے۔[1] ایک مرتبہ کے حج کا یہ تذکرہ ہے کہ آپ کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن حسنؑ آپ کے ساتھ تھے اور حالتِ احرام میں ابواء کے مقام پر ان کی وفات ہو گئی۔[2]

عبادتِ الٰہی کے ساتھ جو دلی وابستگی تھی اس کا اندازہ آپ کو امام حسینؑ کے ان الفاظ سے بھی ہو سکتا ہے جو ۹ محرم کی سہ پہر کو آپ نے ایک شب کی مہلت طلب کرنے کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ آپ نے کہا کہ اس شب کو ہم عبادت و ذکرِ الٰہی میں بسر کر لیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے اس کی عبادت و ذکر سے کتنی محبت ہے۔[3] چنانچہ یہ شب آپ نے اور آپ کے

---

[1] ارشاد ص ۲۶۶ [2] ارشاد ص ۲۰۳ [3] ارشاد ص ۲۴۳

ساتھیوں نے اس طرح گزاری کہ لھم دوی کدوی النحل یعنی ان کے تسبیح و تہلیل اور ذکر و مناجات کی آواز رات کے تاریک سناٹے میں اس طرح گونج رہی تھی کہ جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز بلند ہوتی ہے۔ اور روز عاشورا ایسے سخت وقت میں نماز باجماعت ادا کی جب کہ موت کا بازار گرم تھا۔ کربلا کی زمین پر خون کی بارش الگ تھی۔ تیروں کی بارش الگ تھی اور گرمی سے آگ الگ برس رہی تھی مگر اس موقع پر ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ یوں ادا ہوئی کہ دو جان نثاروں کو محافظت کے لیے سامنے کھڑا کیا کہ جو تیر آئے اسے اپنے سینہ پر روکیں ادھر نماز تمام ہوئی اور اُدھر ان میں سے ایک صحابی سعید بن عبداللہ حنفی زخموں سے چور ہو کر زمین پر گرے۔ اس طرح حسینؑ نے خالق کی عبادت اور فریضۂ نماز کی اہمیت دنیا میں ثابت کی۔

اسی کے ساتھ آپ فیاض تھے۔ اور خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کی فکر رکھتے تھے۔ اس کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔

خود رسول اللہؐ نے اپنے اس نواسے کے اندر بچپنے ہی سے اس صفت کو کچھ ایسا نمایاں پایا کہ ارشاد فرمایا۔ امّا الحسن فان لہ ھیبتی و سوددی و امّا الحسین فان لہ جودی و شجاعتی (یعنی) حسنؑ کے لیے میرا رعب و داب اور شانِ سرداری ہے اور حسینؑ میں میری سخاوت اور میری بہادری[1] یوں تو حسینؑ اوصافِ رسولؐ کے وارث تھے ہی لیکن خصوصیت سے اپنی سخاوت و شجاعت بخشنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کے یہ اوصاف دیگر اوصاف سے ضرور کچھ امتیاز رکھتے ہیں۔

خدمتِ خلق اور نوعِ انسانی کی ہمدردی کے بہترین جذبہ کے ساتھ ساتھ آپ نے اس کی بھی تلقین فرمائی ہے کہ اس بارے میں حفظِ مراتب کا خیال رکھنا چاہیے۔ یعنی سائل جتنا صفات کے اعتبار سے قابلِ عزت ہو اور علم و معرفت میں بلند درجہ رکھتا ہو اتنا اس کے ساتھ سلوک بہتر کیا جائے۔ اس کا بہترین ثبوت یہ واقعہ ہے کہ ایک اعرابی امام حسینؑ کی خدمت

---

[1] ارشاد ص ۱۹۱

میں حاضر ہوا اور تسلیم بجالایا اور عرض حال کرتے ہوئے کہنے لگا کہ میں نے آپ کے جدِ بزرگوار کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کوئی حاجت پیش کرنا ہو تو چار قسم کے آدمیوں میں سے کسی ایک کے سامنے پیش کرنا۔ یا تو شریف النفس عرب یا سخی سردار یا حاملِ قرآن یا وجیہہ و شکیل انسان۔ آپ میں یہ چاروں صفتیں جمع ہیں۔ عرب قوم اس کو تو شرف آپ کے جدِ بزرگوار سے حاصل ہوا۔ اور سخاوت، یہ آپ کا شیوہ اور خصلت ہے۔ اور قرآن، وہ آپ ہی کے گھر میں نازل ہوا اور خوبصورتی، اس کے متعلق میں نے آپ کے جدِ بزرگوار کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر مجھے دیکھنا ہو تو حسنؑ و حسینؑ کو دیکھ لینا۔ یہ پُر معرفت تقریر سنکر حضرت نے فرمایا کہ تمھاری حاجت کیا ہے؟ اس نے اپنی حاجت زمین پر لکھ دی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کا یہ قول سنا ہے کہ ہر انسان کی قدر و قیمت وہی ہے کہ جو اس میں ہُنر موجود ہے، اور میں نے اپنے جدِ بزرگوار کا ارشاد یہ سنا ہے کہ احسان بقدر معرفت ہونا چاہیے۔ اس لیے میں تم سے تین سوال دریافت کرتا ہوں۔ اگر تم نے ایک سوال کا جواب ٹھیک دیا تو تم کو میں ایک تہائی مال دے دوں گا۔ اگر دو جواب تم نے ٹھیک دیے تو دو تہائی مال دوں گا اور اگر تم نے تینوں سوالوں کا جواب درست دیا تو جو کچھ میرے پاس موجود ہے وہ سب میں تمھیں دے دوں گا۔ میرے پاس مالِ دنیا سے اس وقت یہ ایک تھیلی ہے، زرِ نقد کی جو عراق سے بھیجی گئی ہے۔ اس نے کہا۔ پوچھیے! اللہ میری مدد کرے گا۔ آپ نے فرمایا۔ بتاؤ کونسا عمل سب میں بہتر ہے؟ اس نے کہا اللہ پر ایمان لانا۔ پوچھا کہ اچھا بندہ کی نجات کا ذریعہ ہلاکت سے کیا ہے؟ اس نے کہا اللہ پر بھروسا رکھنا۔ حضرت نے فرمایا۔ انسان کی زینت کیا ہے؟ اس نے کہا علم جس کے ساتھ عقل موجود ہو۔ فرمایا، اگر یہ نہ ہو؟ اس نے کہا پھر مال ہو جس کے ساتھ سخاوت ہو۔ فرمایا اگر یہ بھی نہ ہو؟ اس نے کہا پھر فقیری ہو جس کے ساتھ صبر موجود ہو۔ حضرت نے فرمایا اور اگر یہ بھی نہ ہو تو؟ اس نے کہا، تو پھر ایک بجلی گرے اور اس شخص کو جلا کر خاکستر کر دے۔ حضرت ہنسنے لگے اور وہ پوری تھیلی اس کی جانب پھینک دی۔[1]

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۔ ص ۲۷۲ ۔ غرائب القرآن ج ۱ ص ۱۳۶

یہ طرزِ عمل غرباء اور مساکین کو معلومات مذہبی حاصل کرنے کا بہترین محرک تھا اور اس ذریعہ سے عوام میں علوم و معارف کی اشاعت ہوتی تھی۔ یہ اس لیے تھا کہ آپ خود اپنے تمام صفاتِ جلیلہ کے ساتھ ساتھ عالم تھے۔ ایسے، جن سے لوگ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں رجوع کرتے تھے۔ عرب کی مثل ہے الناس اعداء لما جھلوا "لوگ دشمن ہوتے ہیں اس چیز کے جس کو وہ نہ جانتے ہوں"۔ رؤساء اور حکام جو خود علم و ہنر سے بے بہرہ ہوا کرتے ہیں۔ اپنی اس کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے عام افراد کی علمی سطح کو پست رکھنے کی فکر کرتے اور لوگوں کی نظر میں علم و ہنر کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسلام کے حقیقی رہنما ہمیشہ مسلمانوں کی علمی سطح کے بلند کرنے میں منہمک رہے۔ حضرت علیؑ کی زندگی اسی میں گزری اور آپ کے فرزند اسی راستے پر قائم رہے۔

علاوہ ان خطب اور اشعار کے جو آپ کی زبانی منقول ہیں اور جو علم الٰہیات اور معارفِ حقہ کے خزانہ دار ہیں یا ان دعاؤں اور مناجاتوں کے جو آپ کی زبان سے نکلی ہیں اور جن میں سے بعض کا مجموعہ "صحیفۂ حسینیہ" کے نام سے اس وقت بھی موجود ہے اور خالق و مخلوق کے باہمی ربط کی بے نظیر آئینہ دار ہیں اگر جوامع حدیث کی سیر کی جائے تو ان میں مسائل فقہیہ کے بارے میں کثیر احادیث آپ سے منقول ملیں گے۔

اس وقت بھی جب آپ اہلِ حرم کو لے کر مکہ معظمہ سے برآمد ہوئے ہیں اور سفرِ غربت اختیار کیا ہے تو راستے میں فرزدق بن غالب شاعر سے ملاقات ہوئی اور اس نے کچھ مسائل آپ سے نذر اور مناسک حج کے متعلق دریافت کیے اور ان کا جواب حاصل کیا۔[1]

اسی کا نتیجہ ہے کہ کربلا میں آپ کے اصحاب کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عوام نہیں تھے بلکہ اس وقت کی اسلامی جماعت کی پوری روح اور علم و عمل کا مکمل خزانہ تھا جو حسینؑ پر نثار ہو رہا تھا۔ ان میں حافظانِ قرآن بھی تھے، عالمانِ کتاب بھی اور حاملانِ حدیث بھی۔ ان کے جذب اور کشش کا مرکز کوئی ہو ہی نہیں سکتا سوا ایسی ذات کے جو خود

---

[1] ارشاد ص ۲۲۸

ان صفات میں بلند تر درجہ رکھتی ہے۔ بلکہ جو آپ کے خاندانی مخالف تھے وہ بھی آپ کی بلندیٔ مرتبہ اور برتریٔ صفات کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مسجدِ نبوی میں ایک مجمع تھا جس میں ابوسعید خدری اور عبداللہ بن عمرو بن العاص بھی موجود تھے۔ ادھر سے حضرت امام حسینؑ کا گزر ہوا اور آپ نے تعلیمِ اسلام کے مطابق مجمع کو سلام کیا۔ سب نے جوابِ سلام دیا۔ اس وقت عمرو بن العاص کے فرزند عبداللہ چپ رہے۔ جب سب جواب دیکر خاموش ہو گئے تو انھوں نے آواز بلند کی اور کہا وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پھر مجمع کی طرف مخاطب ہو کر کہا، کیا میں آپ لوگوں کو بتلاؤں کہ اہلِ زمین میں سب سے زیادہ محبوب شخص اہلِ آسمان کا کون ہے؟ سب نے کہا، ضرور بتلائیے۔ انھوں نے کہا وہ یہی راستے سے گزرنے والا ہے۔ انھوں نے مجھ سے جنگِ صفین کے بعد سے اب تک بات نہیں کی اور اگر یہ مجھ سے کسی طرح راضی ہو جائیں تو یہ میرے لیے سرخ رنگ کے اونٹوں سے زیادہ محبوب چیز ہوگی[1]

یہ عبداللہ خاندان بنو امیہ میں زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں مشہور تھے مگر جنگِ صفین میں اپنے باپ عمرو بن العاص کے ساتھ حضرت علیؑ سے جنگ کرنے کے لیے آ گئے تھے۔ اس وقت سے حضرت امام حسینؑ نے ان سے بات کرنا چھوڑ دی تھی، مگر اس کے باوجود ان کے دل پر حضرت کے بلند اوصاف کا اس درجہ اثر قائم تھا۔

راست بازی میں داخل ہے، اخلاقی جرأت۔ حسینؑ میں اخلاقی جرأت ایسی تھی کہ بچپنے میں خلیفۂ دوم کو منبر پر ٹوک دیا اور فرمایا انزل عن مجلس ابی۔ "اتر پڑ میرے باپ کی جگہ سے"۔ حضرت عمر نے کہا، سچ کہتے ہو صاحبزادے، تمھارے ہی باپ کا منبر ہے، خدا کی قسم میرے باپ کا منبر نہیں۔

راست بازی اور راست کرداری کا کھلا ہوا نمونہ یہ تھا کہ آپ نے معرکۂ کربلا کے پہلے

---

[1] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۳۵

مکہ سے روانگی کے بعد اپنی جماعت کی تعداد کو قائم رکھنے کے لیے کبھی آئندہ کے خطرات کو پوشیدہ نہیں کیا بلکہ برابر صورت حال سے مطلع کرتے رہے اور بار بار آئندہ کے خطرات کو یقینی بنا کر ساتھ والوں کی حفاظتِ جان و مال کے لیے الگ ہو جانے کا مشورہ دیا اور یہ طریقہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ کسی ایک شخص کے بھی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا امکان سمجھا جا سکتا تھا۔

آپ امن پسند بھی ایسے تھے کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی خود اپنی طرف سے کوشش جاری رکھی مگر اس کے ساتھ عزم و استقلال اور ہمت ایسی رکھتے تھے کہ جان دے دی مگر جو راستا پہلے دن صحیح سمجھ کر اختیار کر لیا تھا اس سے ذرہ بھر بھی نہ ہٹے۔

انھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہو کر بھائی کی اطاعت کی اس طرح کہ ان کی وفادارانہ اطاعت میں کبھی کمزوری نظر نہ آئی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا کے واقعہ میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی۔ اس طرح کہ ان کے نظمِ قیادت کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس کے ساتھ آپ کی نگاہ نے مردم شناسی کا وہ حیرت انگیز نمونہ پیش کیا کہ اتنے سخت اور دشوار گزار راستے کے لیے جن ساتھیوں کو منتخب کر کے اپنے ساتھ لے لیا تھا ان میں سے ایک نے بھی وفاداری اور جان نثاری میں کمی نہ کی اور سب یکجان و یک دل ہو کر مقصدِ حق کے لیے کوشاں رہے یہاں تک کہ جانیں قربان کر دیں۔

امام حسینؑ کے مقولات

بلند مرتبہ افراد میں بھی بیشتر وہی افراد ہوتے ہیں جن کے اقوال کو ان کے اعمال پر نمایاں فوقیت حاصل ہوتی ہے مگر حسینؑ کا کردار بذاتِ خود اتنا بلند تھا کہ اس نے دنیا کی زبان اور اس کے قلم کی تمام تر توجہ کو اپنے لیے مخصوص کر لیا لہٰذا آپ کے مقولات کو یکجا کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کی گئی۔ پھر بھی آپ کے مقولات متفرق طور سے مختلف کتابوں میں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتے ہیں اور وہ بڑی حد تک آپ کی زندگی کے مختلف رخوں کی ترجمانی کرتے

نظر آتے ہیں۔ ان میں نظم بھی ہیں اور نثر بھی۔
چنانچہ آپ نے فرمایا ہے کہ:۔

۱۔ من جاد ساد ومن بخل ذل۔ "جس نے دیا لیا، اس نے سرداری پائی اور جس نے کنجوسی کی اس نے ذلت اٹھائی۔"

۲۔ اجود الناس من اعطیٰ من لا یرجوہ۔ "سخی وہی ہے جس نے اس کو بھی دیا جو اس سے کوئی توقع وابستہ نہ رکھ سکتا ہو۔"

۳۔ من انعم اللہ منکم فلیتنعم علےٰ غیرہ۔ "جس کو خدا نے دیا ہے وہ اوروں کو بھی دے۔"

۴۔ حوائج الناس الیکم من نعم اللہ علیکم۔ "اہلِ حاجت کا تمھارے پاس آنا بھی تم پر خدا کی نعمتوں میں سے ہے۔"

۵۔ اغن عن المخلوق بالخالق تغن عن الکاذب والصادق
واسترزق الرحمٰن من فضلہ فلیس غیر اللہ من رازق
من ظنّ ان الناس یغنونہ فلیس بالرحمٰن بالواثق
اوظن انّ الناس یکنونہ ذلّت بہ النعلان من حالق

"خدا سے لَو لگا کر مخلوق سے بے نیاز ہو جاؤ تو پھر کسی جھوٹے سچے کی تمھیں پروا نہ رہے گی۔ مانگنا ہو تو خدا ہی سے مانگو۔ غیر خدا روٹی دینے والا نہیں ہے۔ جس کا خیال ہو کہ لوگ اس کو غنی کر دیں گے اس کو خدا پر اعتماد نہیں اور جو یہ سمجھتا ہو کہ لوگ اس کے لیے کافی ہیں وہ یقیناً بڑی پستی میں گرنے والا ہے۔"

۶۔ کلّما زید صاحب المال مالا زید فی ھمہ وفی الاشغال

"اِدھر تو مال والوں کے مال بڑھتے ہیں اور اُدھر ان کے افکار و اشغال میں اضافہ ہوتا ہے۔"

۷۔ من وصل الی اللہ انقطع عن غیرہ۔ "جو خدا سے متصل ہوا اس کے غیر سے جدا ہو گیا۔"

ابن کثیر نے "ہدایۃ النہایۃ" میں اسحٰق بن ابراہیم کی روایت سے نقل کیا ہے کہ امام حسینؑ نے جنۃ البقیع میں قبورِ شہداء کی زیارت کی اور حسب ذیل اشعار پڑھے:۔

ناديت سكان القبور فاستكوا	فاجابني عن صمتهم ترب الحشا
قالت اتدري ما صنعت ليا كني	مزقت لحمهم وخرّقت الكسا
وحشوت اعينهم ترابا بعد ما	كانت تأذى باليسير من القذا
اما العظام فانني مزقتها	حتى تباينت المفاصل والشوىٰ
قطعت ذا من ذا ومن هذا كذا	فتركتها ممّا يطول بها النبلا

"میں نے قبروں کے رہنے والوں کو آواز دی تو وہ خاموش رہے مگر مجھے جواب دیا ان کی خاموشی پر خاکِ مرقد نے، کہ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں نے اپنے رہنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ میں نے ان کے گوشت کو ٹکڑے ٹکڑے اور کھال کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور ان کی آنکھوں کے اندر مٹی بھر دی ہے حالانکہ اس کے پہلے ذرا سا تنکا پڑ جاتا تھا ان کی آنکھ میں تو چین نہ آتا تھا۔ رہ گئیں ہڈیاں، وہ بھی جدا جدا ہو گئیں۔ یہاں تک کہ جوڑ بند صاف ظاہر ہیں۔ میں نے اِس کو اُس سے اور اُس کو اِس سے الگ کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ بوسیدگی و کہنگی کے آثار ان سے ہویدا ہو گئے ہیں۔"

ذهب الذين احبهم	وبقيت فيمن لا احبّه
فيمن اراه يسبّني	ظهر المغيب ولا اسبّه
يبغي فسادي ما استطاع	وامره ممّا اريبه
حتى فايدبّ الى الفرا	ء وذاك ممّا لا ادبّه

ترید ذباب الشر من	حولی لیطن ولا یذبه
واذا خبا وعن الصدر	رفلا یزال به لیشبه
فلا یعیبه بعقله	افلا یثوب الیه لبه
افلا یری ان فعله	مما یسور الیه غبه
حسبی بربی کافیا	ما اخشی والبغی حبه
ولقد من یبغی علیه	فیما کفاه الله ربه

"گزر گئے وہ افراد جن کو میں محبوب رکھتا تھا۔ اور اب میں رہ گیا ہوں ایسے لوگوں میں جو مجھے کسی طرح پسند نہیں۔ ان کا کردار یہ ہے کہ میں انھیں ذرا بھی بُرا بھلا نہیں کہتا۔ مگر وہ پیٹھ پیچھے مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ میرے نقصان کے درپے رہتے ہیں درانحالیکہ میں ان کو فائدہ پہنچاتا رہتا ہوں۔ وہ گرد و پیش شرارتوں کے مگس اڑتے دیکھتے ہیں مگر اتنا نہیں کرتے کہ انھیں ہٹا دیں بلکہ جب دلوں میں عداوت کی آگ بجھنے لگی ہے تو وہ اسے اور ہوا دے دیتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی سمجھ سے کام لیں؟ کیا ایسا نہ ہوگا کہ ان کی طرف عقل واپس آئے؟ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا یہ طرزِ عمل نتیجتہً خود اُنھی کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ میرے لیے میرا پروردگار کافی ہے جس کے ہوتے ہوئے مجھ کو کوئی اندیشہ نہیں۔ ناممکن ہے کہ کسی پر ظلم و ستم کیا جائے اور خدا اس کی مدد نہ کرے۔"

ابن صباغ مالکی نے "فصول مہمہ" میں علی بن عیسیٰ اربلی نے "کشف الغمہ" میں ابن خشاب کی روایت سے حسب ذیل اشعار نقل کیے ہیں:۔

اذا ما عضنک الدھر	فلا تجنح الی خلق
ولا تسأل سوی اللہ	تعالیٰ قاسم الرزق

فلو عشت وطوّفت من الغرب الی المشرق
لما صادفت من یقد ران لیسعد اولیشقی

"جب زمانہ کے دانت تمھیں زخمی کریں تو خلق خدا کی طرف کبھی نہ جھکو اور سوا خدائے برتر کے جو رزق کا تقسیم کرنے والا ہے۔ کسی سے سوال نہ کرو اس لیے کہ مغرب سے مشرق تک چکر لگانے کے بعد بھی تم کو کوئی شخص ایسا نہ ملے گا جو مقدر کو بنا یا بگاڑ سکتا ہو۔"

وان تکن الدنیا تعد نفیسۃ فدار ثواب اللہ اعلیٰ وانبل
وان تکن الابدان للموت انشأت فقتل امرئ بالسّیف فی اللہ افضل
وان تکن الارزاق قسما مقدّرا فقلۃ حرص المرء فی الرزق اجمل
وان تکن الاموال للترک جمعھا فما بال متروک بہ المرء یبخل

"اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ دنیا کوئی اچھی جگہ ہے تب بھی خدا کے اجر و ثواب کا محل زیادہ بلند و برتر ہے اور جب کہ یہ صحیح ہے کہ اجسام پر موت کا طاری ہونا لازم ہے تو انسان کا راہ خدا میں تہ تیغ کر دیا جانا زیادہ بہتر ہے۔ اور جب کہ یہ حقیقت ہے کہ رزق میں ہر ایک کا حصّہ معین ہے تو اس کے بارے میں ہوس سے کام نہ لینا ہی انسان کے لیے مناسب ہے۔ اور جب کہ یہ یقینی ہے کہ اموال جمع ہوتے ہیں بعد میں چھوڑ جانے کے لیے تو کیا یہ حماقت نہ ہوگی کہ ایسی چیز کے بارے میں انسان بخل سے کام لے۔"

ایک شخص نے حضرت کو لکھا کہ مجھے دو جملوں میں موعظہ فرمائیے۔ آپ نے تحریر فرمایا۔

"من حال وامراً بمعصیۃ اللہ کان افوت لما یرجو واسرع لمجیئ مایحذر" "جو شخص اللہ کی نافرمانی کر کے کسی مقصد کو حاصل کرنا چاہے گا اپنے توقعات میں ناکام اور خطرات سے زیادہ نزدیک ثابت ہوگا۔"

مندرجہ بالا مقالات اور اشعار کو نظرِ غائر سے دیکھنے پر حسب ذیل تعلیمات ان میں نمایاں طور پر موجود پائے جاتے ہیں:-

ا - ذاتِ الٰہی پر توکل۔ یعنی ہم کو کسی نفع کی امید، کسی ضرر سے تحفظ کی توقع اور کسی خواہش کی تکمیل کا آسرا اللہ کے غیر سے نہ رکھنا چاہیے۔ یہ وہ دشوار منزل ہے کہ کہنے کو جو بھی چاہے کہہ دے لیکن حقیقتاً عملی حیثیت سے اس راہ میں جو بھی قدم رکھے وہ ماسوی اللہ سے بے نیاز ہو جائے۔

انسان سچائی کے راستے سے الگ ہوتا ہے۔ زیادہ تر طمع مال و زر کی بدولت یا پھر خطرۂ امروز اور اندیشۂ فردا کے سبب سے مگر جب یہ خیال پورے طور پر کسی کے دل و دماغ پر چھا جائے کہ خدا کی مشیت کے خلاف نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے راہِ حق سے منحرف نہیں کر سکتی۔

ملحوظ رہے کہ اللہ اپنے ماننے والوں کے صحیح عقیدہ کے مطابق وہ پاک و منزّہ ذات ہے جو صرف نیکی کو پسند کرتی ہے اور برائی سے نفرت رکھتی ہے۔ لہٰذا جب کوئی ایک ایسی بزرگ و برتر ذات کو اپنے تفکرات و احساسات کا مرکز بنالے گا تو اس کے لیے ناممکن ہے کہ بھول کر بھی وہ برائی یا ظلم کے قریب جائے۔ چنانچہ امام حسینؑ کی جگہ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا جو دنیوی نفع اور نقصان کی پروا کرتا یا کسی مادی طاقت کو قبلۂ حاجات سمجھتا یا اس کے اقتدار سے مرعوب کیا جا سکتا تو بالفرض وہ یزید کی بیعت شروع میں نہ بھی کرتا تو اس وقت تو ضرور کر لیتا کہ جب حکومتِ باطل کا ہزاروں کا لشکر اس کے خلاف صف بستہ ہوتا اور ان کے ظلم و تشدد کی بجلیاں آنکھوں کے سامنے کوندنے لگتیں مگر حضرت امام حسینؑ، آپ تو دنیا کی کسی طاقت اور نعمت کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے اس لیے راہِ حق سے آپ کو کوئی شئے ہٹا ہی نہیں سکتی تھی۔

۲ - خلقِ خدا کی بہر حال بہی خواہی اور فائدہ رسانی کی فکر ہونا جس کا بلند معیار یہ ہو کہ

اس بارے میں اپنے اور پرائے، دوست اور دشمن کی تفریق کو بھی کام میں نہ لایا جائے۔

یہ بات اس صورت میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی کہ جب ہمارے تعلقات دوسروں کے ساتھ مادی بنیادوں پر قائم ہوں اس لیے کہ ایسی صورت میں طبعی میلانات و رجحانات کی بنا پر نزدیک و دور اور موافق و مخالف کے امتیازات کا بروئے کار آنا لازمی ہے۔ البتہ یہ بات اس وقت ہوسکتی ہے کہ جب ہمارا تعلق دوسروں کے ساتھ اس مشترک رشتہ کی بنا پر ہو جو ہم سب کو ایک خالق کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے اور جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی ایک سلسلۂ وحدت میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں ہم اس قابل ہوسکیں گے کہ صحیح معنیٰ میں غرض خلقت کو سمجھتے ہوئے عمومی طور پر تمام خلق کو اپنی ذات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں اور اس کو اپنے اوپر خدا کا ایک احسان سمجھیں کہ اس نے ہمارے ذریعہ سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے لوگوں پر بھی احسان کیا جائے گا جو عام عادات و خصائل کی بنا پر اس سے توقع نہ رکھتے ہوں۔ مثلاً ایک دشمن اپنے دشمن سے کب اس کی امید کرسکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرے گا مگر بلند معیار فیاضی کا یہی ہے کہ اس کو بھی اپنے انعام سے محروم نہ کیا جائے۔

۳۔ مادی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر توجہ، ان کا لحاظ رکھنے سے تمام لذائذ دنیا ہماری نظر میں ہیچ ہو جائیں گے اور ہم اللہ کے ساتھ وابستگی پیدا کر کے نیکی کے راستے پر قائم رہنے ہی کو اپنی بہترین کامیابی سمجھنے لگیں گے۔

مجموعی حیثیت سے مذکورہ بالا تمام تعلیمات میں وزن پیدا ہوا ہے حسینؑ کے عمل اور بلندیٔ کردار سے جس نے ان میں سے ہر ہر مقولہ اور تعلیم کو چلتی پھرتی تصویر کی شکل میں آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اس طرح کہ یہ مقولات صرف آپ کے خیالات ہی کے حامل نہیں رہے بلکہ ایک سچے عملی انسان کی تاریخ زندگی بن گئے۔

امام حسینؑ کے اس طرح کے اقوال آپ کی زندگی کے کسی ہنگامی یا الفاقی موقع سے

متعلق نہ تھے بلکہ آپ کے روزمرہ کے نظام زندگی کا ایک جزو تھے چنانچہ روزانہ کی نمازوں میں جو مختلف قنوت آپ پڑھا کرتے تھے وہ بھی اسی طرح کے مضامین پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک قنوت کے الفاظ درج ذیل ہیں:۔

اللّٰھم منك البدء ولك المشیئة ولك الحول ولك القوة۔ اللّٰھم وانی مع ذلك کله عائذ بك لائذ بحولك وقوتك راض بحکمك الذی سبق الی فی علمك جار بحیث اجریتنی قاصد ما امضیتنی غیر ضنین بنفسی فیما یرضیك عنی اذبه قد رضیتنی ولا تاصر بجهدی عما الیه ندبتنی مسارع لما عرفتنی شارع فیما اشرعتنی مستبصر فیما بصرتنی مراع ما ارعیتنی فلا تخلنی من رعایتك ولا تخرجنی من عنایتك لاتقعد نی عن حولك ولا تخرجنی عن مقصد انال به ارادتك واجعل علی البصیرة مدرجتی وعلی الهدایة محجتی وعلی الرشاد مسلکی حتی تنیلنی امنیتی ومحل بی علی ما به اردتنی ولخلقتنی والیه أدیت بی۔

"خداوندا تیری ہی طرف سے انعام و احسان کی ابتدا ہے اور جو کچھ مشیت اور طاقت و قوت ہے وہ صرف تیری ہے۔ اس سب کے ہوتے ہوئے میں تیری ہی طرف پناہ لیتا ہوں اور تیری ہی قوت و طاقت کا سہارا ڈھونڈتا ہوں اور تیرے اس فیصلہ پر راضی ہوں جو میرے بارے میں تو پہلے ہی کر چکا ہے۔ میں چلنے والا ہوں اسی راستے پر جس پر کہ مجھے تو نے چلایا ہے اور قصد رکھتا ہوں وہی جو تیری مرضی کے مطابق ہو اور ان امور کے متعلق جو تیری رضامندی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اپنے نفس کی ذرا بھی رعایت نہیں کرتا۔ نہ میں اپنی طرف سے تیرے

احکام کی تعمیل میں جد و جہد کے سلسلہ میں کوئی کوتاہی ہونے دیتا ہوں، بلکہ تیزی سے چلتا ہوں اسی راستے پر جس کی تو نے مجھے ہدایت کی، اور عہدہ برآ ہوتا ہوں میں ان فرائض سے جن کا تو نے مجھے محافظ قرار دیا ہے۔ اب تو بھی مجھے اپنی حمایت میں رکھ اور اپنی نظرِ رحمت سے مجھے علیحدہ نہ کر اور اپنی طاقت کی امداد سے مجھے محروم نہ کر اور اس مقصد سے الگ نہ کر جس کے ماتحت میں تیری مشیئت کو پورا کرنا چاہتا ہوں، اور بصیرت پر قرار دے میری رفتار کو اور ہدایت پر میرے مسلک کو اور صحیح منزل کی سمت میرے راستے کو، یہاں تک کہ مجھے پہنچا تو میری آرزو تک، اور مجھے اتار تو اسی منزل پر جس کا تو نے میرے لیے ارادہ کیا اور جس کے لیے تو نے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تو نے مجھے متوجہ کیا۔"[1]

کیا اس قنوت کے الفاظ ظاہر بظاہر آپ کے کسی عزم مستقل کی ترجمانی نہیں کرتے؟ کیا ان سے مجمل طور پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ آپ بس کسی خاص مقصد کی خاطر اپنی زندگی کو وقف کیے ہوئے تھے اور یہ کہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ خالق کے اشاروں کا تابع تھا۔

۶۰ھ تک یہ الفاظ قول تھے اور ۶۱ھ ہجری میں وہ عمل بن کر آنکھوں کے سامنے آگئے۔

یہ دعا بھی حضرت امام حسینؑ کی ہے جو آپ قنوت میں پڑھتے تھے :-

اَللّٰھم من اَوٰی الیٰ مأوی فانت مأوای ومن لجأ الیٰ ملجأ فانت ملجای واحرسنی فی بلوای من افتتان الامتحان ولمّۃ الشّیطان لعظمتك التی لایشوبھا ولم نفس بتفتین ولا وارد طیف تبظنین ولا یلّم بھا فرح حتیٰ تقلبنی الیك بارادتك غیر ظنین ولا مظنون ولا مراب ولا مرتاب۔

خداوندا تیرے سوا کسی کی طرف اگر کوئی پناہ لیتا ہے تو لیا کرے۔ میرا پناہ دینے والا

---

[1] منہج الدعوات ص ۔ ۱۷

تو صرف تو ہے۔ تو اپنی اس عظمت کے ساتھ جس پر نہ کسی کی نفسانی خواہش اثر انداز ہو سکتی ہے اور نہ بدظنی اور نہ اس میں کسی طرح کی بدگمانی اور کسی وقتی خوش مزاجی کا دخل ہے آزمائش کے موقع پر مجھے محفوظ رکھ فتنہ میں مبتلا ہونے اور شیطانی جماعت سے مرعوب ہو جانے سے۔ یہاں تک کہ تیری طرف میری بازگشت ہو۔ تیرے منشاء کے مطابق۔ اس طرح کہ نہ میرے دل میں بُرے خیالات ہوں اور نہ دوسرے میری نسبت بُرے خیالات قائم کر سکیں۔ نہ دوسروں کے متعلق میں کسی شک میں مبتلا ہوں اور نہ میرے متعلق دوسروں کو شک ہو سکے۔" [1]

آپ صبح و شام دونوں وقت حسب ذیل دعا پڑھا کرتے تھے۔

اللّٰھم انّی اسلمت نفسی الیك و وجھت وجھی الیك و فوّضت امری الیك اللّٰھم انك تکفینی من کل احد ولا یکفینی منك احد۔

"خداوندا میں تیرے سپرد کیے ہوئے ہوں اپنے نفس کو اور تیری طرف موڑے ہوئے ہوں اپنے رخ کو اور دیے ہوئے ہوں اپنے کو تیرے ہاتھ میں۔ خداوندا تو ہر دوسرے شخص کے شر سے محفوظ رکھ سکتا ہے مجھ کو لیکن تیرا غیر مجھ کو تیرے قہر سے نہیں بچا سکتا۔" [2]

بھلا جس شخص کا مستقل عقیدہ یہ ہو اور جس کی زندگی کا نصب العین یہ ہو جس نے رات دن اسی کو سوچا ہو اور اسی کو اپنی زبان سے دُہراتا جا رہا ہو وہ کہیں ممکن ہے کہ کسی طاغوتی طاقت سے دب جائے اور خدائے قادر و توانا کو بھول کر دُنیوی جبروت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے؟ یزید، حسینؑ سے اسی کا تو طالب تھا کہ "آپ خدا کے راستے سے ہٹ کر شیطان کے راستے پر اس کے ساتھ ہو جائیں"۔ مگر حسینؑ نے جو اپنے جان و روح کو کلیتہً خدا کے حوالے کر چکے تھے اس کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا۔

---

[1] نہج الدعوات ص ۷۳ [2] نہج الدعوات ص ۲۴۱

اس لیے کہ آپ کو یقینِ کامل تھا کہ یزید میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جب تلواریں آپ کے جسمِ اطہر کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں اس وقت بھی آپ اپنے اسی یقین پر قائم تھے۔ چنانچہ جب معرکۂ کربلا کے نتائج دنیا کی آنکھوں کے سامنے آگئے تو عالمِ ظاہر میں سب کو اس کا مشاہدہ ہو گیا کہ حسینؑ کا خیال حرف بحرف صحیح تھا۔ اس لیے کہ کہنے کو خون بہا حسینؑ اور انصارِ حسینؑ کی گردنوں سے، مگر دراصل شہ رگ قطع ہوئی یزید کے اقتدار کی۔ حسینؑ زندۂ جاوید ہو گئے اور یزید صحیح معنیٰ میں ہلاک و فنا ہوا، جو نتیجہ تھا محض حسینؑ کی اس قوتِ ارادی کا جس کا مظاہرہ آپ کے اقوال برابر کرتے رہتے تھے

لذتِ حیاتِ دنیا سے سرشار تنگ ظرفوں کے نزدیک اپنے مخالف کو دھمکانے کا سب سے بڑا ذریعہ موت کا تصور پیدا کر دینا ہے مگر وہ افراد جو راہِ حق میں موت آنے کو بآلِ زندگی سمجھتے ہوں اس دھمکانے سے کب متاثر ہو سکتے ہیں؟

حسینؑ کا فلسفۂ زندگی وہی تھا جس کی امام حسینؑ کو آپ کے والدِ بزرگوار حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کی طرف سے مخصوص وصیت ہوئی تھی کہ اصبر علی الحق وان کان مرّاً "سچائی کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو اس پر قائم رہو اور ہر مشکل کا مقابلہ کرو۔" یہی وصیت حسینؑ نے اپنے فرزند زین العابدینؑ کو کی اور اسی پر وہ خود مکمل طور سے کاربند رہے۔[1]

---

[1] کافی جلد ۱ ص ۴۱۲

چودھواں باب

یزید کا بیعت پر اصرار اور حسینؓ کا انکار

تختِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد یزید کے لیے عیش و آرام کی کمی نہ تھی۔ دنیا تمام زیب و زینت کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی اور تاج و تخت، مال و دولت، حشم و خدم اور عیش پرستی و شہوت رانی کے تمام اسباب پوری فراوانی کے ساتھ مہیا تھے۔ لیکن ایک خیال تھا جو اس کے دل و دماغ کو پریشان کیے ہوئے تھا اور اس کی نظروں میں اس تمام جاہ و حشم کو خاک سیاہ بنائے ہوئے تھا اور وہ ان چند آدمیوں کا بیعت سے انکار تھا کہ جن میں اوّل درجہ کی شخصیت حسینؓ بن علیؓ کی تھی۔ یزید کے نفسیات اس کے کسی طرح متحمل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ جوانی کا نشہ اور پھر شراب کی ترنگ۔ بے زحمت و مشقت کے حاصل شدہ سلطنت کا غرور۔ اپنے باپ کی کوششوں کی کامیابی کا گھمنڈ اور تمام ملک عرب کے سر اطاعت خم ہو جانے کا غرّہ۔ ناآزمودہ کاری ناعاقبت اندیشی سیاسیاتِ حکومت سے ناشناسی اور نظمِ سلطنت سے بے خبری۔ اس کے بعد مرنے والے باپ کا مرتے مرتے اسی بات کو یاد کرنا اور نفس کے آخری آمد و شد تک اسی فکر و اضطراب کی کشمکش میں مبتلا رہنا۔ یہ وہ باتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے یزید کو یہ کد ہو گئی تھی کہ ان انگلیوں پر گنے جانے والے اشخاص سے جلد از جلد بیعت حاصل کر لی جائے۔ کوئی شک نہیں کہ ان سب کی اور بالخصوص امام حسینؓ کی بیعت سے علیحدگی اور خاموشی معاویہ کو بھی اتنی ہی شاق تھی جتنی یزید کو مگر معاویہ کو تشدد کے نتیجہ کا اندازہ تھا اور یزید کو نہ تھا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر معاویہ کی زندگی اور طولانی بھی ہوتی تو ان کی طرف سے ایسا غیر مدبرانہ طرزِ عمل نہ اختیار کیا جاتا جیسا یزید کی طرف سے اختیار کیا گیا مگر واقعات یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ

معاویہ کا رویہ یزید کے آئندہ اقدامات میں ہمت افزائی کا باعث ضرور ہوا۔ مثال کے طور پر معاویہ کا مدینہ پہنچنے کے وقت حضرت امام حسینؓ کو ان الفاظ سے مخاطب کرنا کہ "تم ایک قربانی کا دنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ قسم ہے خدا کی یہ خون ضرور گرایا جائے گا"۔

یزید اپنی ذہنیت کے مطابق اس سے یہی نتیجہ نکال سکتا تھا کہ میرے باپ کا ارادہ اس دشمن سلطنت کے ساتھ اس طرح کا تھا جیسے انھوں نے قسم کھا کر ظاہر کیا تھا۔ اور انھیں اس کی تکمیل کا موقع نہیں ملا۔ پھر "اگر پدر نتواند پسر تمام کند"، خصوصاً جبکہ آخر وقت تک معاویہ اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو ان ہی چند منکرین بیعت کے خطرہ کی طرف بار بار متوجہ بھی کرتے رہے۔ یقینی گزشتہ دھمکی سے جو خیال یزید کے دماغ میں پیدا ہو چکا تھا اس کے ساتھ یہ آخری وقت کی وصیتیں یہی اثر پیدا کر سکتی تھیں کہ یزید اپنا سب سے پہلا نصب العین اور مقصد زندگی اپنے باپ کے بعد اسی کو قرار دے لے کہ خطرہ کو کسی طرح دور کیا جائے اور باپ کا جو مقصد تھا اور جس کی تکمیل کا انھیں موقع نہ مل سکا اب اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ یزید نے تختِ سلطنت پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلا جو سیاسی کام کیا وہ یہی کہ اپنے چچا زاد بھائی ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو جو مروان کی معزولی[1] کے بعد اس زمانہ میں مدینہ کا حاکم تھا خط لکھا کہ خلیفۂ وقت یزید کی طرف سے ولید بن عتبہ کو معلوم ہو کہ معاویہ ایک خدا کے بندے تھے جنھیں اس نے عزت دی اور سلطنت عطا کی اور اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا۔ وہ جب تک مقدر میں تھا زندہ رہے اور جب عمر پوری ہو گئی تو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خدا ان پر رحمت نازل کرے کہ انھوں نے قابلِ تعریف زندگی گزاری اور پرہیزگاری و نیکوکاری کے ساتھ

---

[1] مروان ایک مرتبہ معاویہ کی طرف سے مدینہ کا حاکم آٹھ برس دو مہینہ تک رہا اور پھر ربیع الاول ۴۹ھ میں معزول کیا گیا اور سعید بن عاص کو حاکم مدینہ مقرر کیا گیا (طبری ج ۶ ص ۱۳۸) دوبارہ ۵۴ھ میں سعید کی معزولی کے بعد مروان کو حاکم مدینہ مقرر کیا گیا (طبری ج ۶ ص ۱۶۴) پھر ۵۷ھ یا ایک قول کے مطابق ۵۸ھ میں اسے معزول کیا گیا اور ولید بن عتبہ کو حاکم مدینہ بنایا گیا (طبری ج ۶ ص ۱۷۲)

عالمِ آخرت کو سدھارے۔ والسلام۔

اس خط میں تو صرف معاویہ کے وفات کی اطلاع ہے۔ ایسے رسمی الفاظ میں جو عموماً خبرِ وفات کے طور پر لکھے جایا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا پرچہ بھی ولید کو بھیجا گیا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ "حسینؑ اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر کو بیعت پر سختی سے مجبور کرو اور بغیر بیعت لیے ہوئے انھیں ذرا سا بھی موقع نہ دو۔ والسلام"[1]

یہ خط ہے کہ جس میں شروع ہی سے سخت گیری کا عنصر نمایاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اب صورتِ حال خاموشی کے حدود پر باقی نہیں رہ سکتی۔ یعنی حضرت امام حسینؑ کا یہ لائحہ عمل کہ ہم شریکِ ظلم نہ ہوں اور یزید کی خلافت کو تسلیم کر کے اس کے افعال و اعمال کی ذمہ داری اپنے اوپر نہ لیں لیکن اس کے ساتھ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسا اقدام بھی نہ کریں کہ ملک کے امن و امان کو صدمہ پہنچے اور شورش و ہنگامہ برپا ہو۔ یہ منفی طرزِ عمل نبھنا ناممکن ہے۔ اب تو عمل کی منزل ہے۔ یا تو مختتم اقرار یا مختتم انکار۔ مگر انکار ایسا جس میں نتائج کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

یزید کا خط ولید کو پہنچا۔ ولید ابوسفیان کا پوتا اور معاویہ کا بھتیجا سہی لیکن وہ ایک حد تک امام حسینؑ کی عظمت و شخصیت سے متاثر تھا۔ اس میں بظاہر اتنی سفاکی اور ستم کیشی بھی نہ تھی کہ ایک بے گناہ کا خون بہاتے ہوئے اس کو لذت محسوس ہو۔ یزید کے فرمان شاہی نے اس کے باطنی جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور وہ اس شش و پنج میں پڑ گیا کہ یزید کے اس حکم کو کس طرح انجام دیا جائے۔ لہٰذا اس نے مروان بن الحکم سے جو اس وقت مدینہ میں موجود تھا مشورہ کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے ولید کے مدینہ کی حکومت پر آنے کے وقت سے اس میں اور مروان میں اس حد تک کشیدگی ہو گئی تھی کہ مروان نے ولید کے یہاں کی آمد و رفت ترک کر دی مگر اس وقت ولید کو ضرورت یہی معلوم ہوئی کہ مروان کو مشورہ میں ضرور شریک کرے شاید اسی لیے کہ کہیں جو طرزِ عمل وہ اختیار کرنا چاہتا ہے اموی سیاست کے خلاف نہ ہو۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۵۸

اور مروان اس کے خلاف جاسوسی یا چغلخوری کا کام انجام نہ دے۔ مروان نے جو رسول اللہ ؐ کے زمانہ ہی میں ایسی شرارتیں کر چکا تھا کہ رسول اللہ ؐ نے اس کو اور اس کے باپ کو مدینہ سے باہر نکال دیا تھا، کہا کہ عبداللہ بن عمر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی تم فکر نہ کرو۔ وہ تو طالب خلافت ہوں گے نہیں۔ ہاں حسینؑ بن علیؑ اور عبداللہ بن زبیر کو پابند بنانا ضروری ہے۔ لہٰذا تم ابھی ان لوگوں کو بلوا بھیجو اور وفاتِ معاویہ کی خبر پھیلنے کے قبل ہی ان سے بیعتِ یزید کا مطالبہ کرو اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو قتل کر دو۔ اس لیے کہ اگر انھیں معاویہ کے انتقال کی خبر ہو گئی پھر ایک ایک طرف کھڑا ہو جائے گا اور علانیہ مخالفت کرنا اور خود اپنی طرف لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دے گا۔[1]

ولید محسوس کرتا تھا کہ اس پورے مشورہ پر وہ عمل نہیں کر سکتا، تاہم اس نے اسی وقت عبداللہ بن عمر بن عثمان کو جو ایک کمسن لڑکا تھا حضرت امام حسینؑ اور عبداللہ بن زبیر کو بلانے کے لیے بھیجا۔ یہ دونوں آدمی اس وقت مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے اور بوقت واحد دونوں کو یہ پیغام پہنچا کہ امیر نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ اس وقت ولید کبھی باہر نہ بیٹھتا تھا۔ اور لوگوں کی ملاقات نہ ہوتی تھی۔ ان حضرات نے کہا کہ تم چلو ہم آتے ہیں۔ آدمی واپس گیا۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا، کہ یہ ولید کے بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، اس وقت بلانے کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟ کچھ آپ کے خیال میں آتا ہے یہ کیا بات ہے؟ امام حسینؑ نے فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ ان کا ظلم کا دیوتا دنیا سے اُٹھ گیا ہے اور ہمیں اس وقت صرف بیعت کے لیے بلایا گیا ہے کہ لوگوں میں ابھی خبر پھوٹنے نہ پائے اور ہم لوگ پابند کر لیے جائیں۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ پھر اب کیا کرنا چاہیے؟ امام نے فرمایا۔ میں تو ابھی اپنے خاندان کے جوانمردوں کو جمع کرتا ہوں اور ان سب کے ساتھ وہاں جاتا ہوں۔ ان لوگوں کو دروازہ پر کھڑا کر دوں گا اور میں اندر جاؤں گا۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا، مجھے اس میں آپ کی جان کا اندیشہ ہے۔ کہیں

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۲۹

آپ قتل نہ کر دیے جائیں۔ آپ نے فرمایا۔ میں جاؤں گا تو کچھ سمجھ کے جاؤں گا۔ اتنا سامان کر لوں گا کہ مجھے خطرہ نہ باقی رہے۔

امام حسینؑ اپنے مکان پر تشریف لے گئے اور اعزاء اور مخصوصین کو جمع کر کے ان کے ساتھ ولید کے دروازہ پر پہنچے۔ اصحاب سے فرمایا کہ تم دروازے پر ٹھہرو اور میں اندر جاتا ہوں۔ اگر میں تمھیں بلاؤں یا تم سنو کہ ولید کی آواز بلند ہوئی تو سب کے سب اندر چلے آنا اور اگر ایسا نہ ہو تو تم سب ٹھہرے رہنا۔ یہاں تک کہ میں واپس آؤں۔ حضرت اندر تشریف لے گئے۔ ولید اور مروان آج خلاف معمول پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ امام حسینؑ نے فرمایا "اتفاق و اتحاد بہ نسبت نزاع و اختلاف کے بہتر ہے۔ خدا تم دونوں کے تعلقات کو خوشگوار بنائے۔" اس کا کوئی جواب نہیں ملا اور آپ بیٹھ گئے۔ ولید نے یزید کا خط پڑھ کر سنایا۔ غالباً وہی حصہ جس میں معاویہ کی وفات کا تذکرہ تھا اور اس کے بعد بیعت یزید کا مطالبہ کیا۔ امام نے فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون[1] (یہ وہ فقرہ ہے جو ہر مصیبت کے موقع پر کہا جاتا ہے) خدا تم لوگوں کو اس مصیبت میں صبر عطا کرے۔ بیعت کے بارے میں یہ ہے کہ میرے ایسے شخص کی بیعت کو مخفی طور سے تو غالباً تم کافی نہ سمجھو گے جب تک کہ علانیہ بیعت نہ ہو اور عام طور سے لوگوں کو اس کا علم نہ ہو۔ ولید نے کہا، بے شک۔ آپ نے فرمایا۔ تو پھر جب مجمع عام میں وفات معاویہ کا اعلان کرو اور تمام لوگوں سے یزید کی بیعت لو اسی وقت مجھ سے بھی کہنا تاکہ یکسوئی کے ساتھ اس قضیہ کا فیصلہ ہو جائے۔[2] ولید شاید اپنے مقام پر یہ سمجھے ہوئے تھا کہ امام حسینؑ یزید کی بیعت کا سوال سنتے ہی فوراً مخالفت پر تیار ہو جائیں گے اور سخت سختی کے ساتھ جواب دیں گے اور اس صورت میں اسے فکر ہوگی کہ مجھے یزید کے حکم کی تعمیل کے لیے کیا

---

[1] ہم اللہ کے ہیں اور اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے (قرآن۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۵۶)

[2] طبری ج ۶ ص ۱۸۹۔ الاخبار الطوال ص ۲۲۹۔

صورت اختیار کرنا پڑے گی۔ اب اس نے جو آپ سے اس طرح کا ملائم انداز کا جواب سنا تو وہ اسے غنیمت سمجھا اور خوش ہو کر اس نے کہا کہ "بہتر آپ واپس جایئے اور سب کے ساتھ پھر آیئے گا۔" مروان ابھی تک خاموش بیٹھا صورتِ حال کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اب جو اس نے ولید کا یہ نرم طرزِ عمل دیکھا تو بے اختیار بول اٹھا۔ "ولید کیا غضب کرتے ہو۔ اگر حسینؑ اس وقت تمہارے ہاتھ سے نکل گئے اور بیعت نہ کی تو پھر ایسا موقع حاصل نہ ہوگا۔ جب تک کہ بہت سے لوگ طرفین کے قتل نہ ہو لیں۔ بہتر ہے کہ ابھی ان کو گرفتار کر لو اور تمہارے گھر سے جانے نہ پائیں جب تک کہ بیعت نہ کر لیں یا قتل نہ کر دیے جائیں۔"

یہ سنکر امام حسینؑ کو غصہ آگیا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ "کیا مجال ہے تیری یا ولید کی جو مجھے قتل کرے۔ غلط کہا تو نے بخدا اور گنہگار ہوا۔" یہ فرما کر آپ باہر نکل آئے اور اپنے اصحاب کی معیت میں گھر واپس تشریف لے گئے۔[1] مروان نے ولید سے کہا "تم نے میرا کہا نہ مانا۔ اب ایسا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔" ولید نے کہا، مروان! یہ کسی اور سے کہو! تم نے مجھے وہ صورت بتائی تھی جس میں میرے مذہب کی موت تھی۔ خدا کی قسم مجھے یہ پسند نہیں کہ تمام شرق و غرب کا مال و دولت میرے قبضہ میں دے دیا جائے پھر بھی میں حسینؑ کو قتل کروں، سبحان اللہ! میں حسینؑ کو قتل کروں؟ صرف اتنی بات پر کہ وہ کہتے ہیں، میں بیعت نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ جو شخص حسینؑ کے خون کا مجرم ہوگا وہ خدا کے یہاں روزِ قیامت میزانِ عمل میں انتہائی سُبک ہوگا۔[2]

مروان نے کہا کہ اچھا یہ عقیدہ تمہارا ہے تو بیشک تم نے بہت اچھا کیا۔[3]

بہت ممکن ہے کہ اس کے بعد مروان نے ولید کی شکایت یزید کو لکھ بھیجی ہو اور اس تمام روداد کی اطلاع دی ہو۔ اور اسی کا نتیجہ ہو کہ اس کے بعد ولید مدینہ کی گورنری سے ہٹا دیا گیا ہو اور عمر بن سعید الاشدق کو مدینہ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۹ [2] الاخبار الطوال ص ۲۲۹ [3] طبری ج ۶ ص ۱۹۰

یہ اس کی ایک دلیل ہے کہ خط میں بیعت نہ کرنے کی صورت میں حسینؑ کے قتل کے متعلق ضرور لکھا تھا۔ ظاہری اسباب کی بنا پر بھی کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ حضرت امام حسینؑ نے اسی وقت صورت حال کی نزاکت کا پورا احساس کر لیا اور یقیناً اس کے بعد جو کچھ طے کیا وہ تمام نتائج سوچ لینے کے بعد، آپ نے یہ طے کر لیا کہ میں یزید کی بیعت ہرگز نہیں کروں گا۔ ابھی تک دنیا نفی کے معنی نہیں سمجھ سکی تھی کیونکہ وہ انکارِ بیعت کی صورت میں ان تشدد کے درجوں کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی جو بعد میں حسینؑ کے سامنے آئے لیکن حسینؑ جس وقت کہہ رہے تھے کہ میں بیعت نہیں کروں گا اس وقت وہ بیعت نہ کرنے کے معاوضہ میں ظلم و تشدد کے تمام امکانات پر غور کر کے اور اپنے نفس کی قوتِ برداشت کا پورا جائزہ لے کر کامل اعتماد کے ساتھ بیعت کی نفی کر رہے تھے اور اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ تشدد اپنی آخری حد پر پہنچ گیا مگر حسینؑ کے صبر و برداشت کی قوت ختم نہ ہو سکی۔ وہ اپنی بات پر آخر تک قائم رہے۔ اسی عزم و استقلال کے ساتھ جس کو انھوں نے پہلے دن طے کر لیا تھا۔

یہاں پر یہ بحث پورے طور پر صاف ہو جانی چاہیے کہ آخر یزید کی رسمی بیعت اختیار کر لینا کون سا ایسا ناقابلِ برداشت امر تھا جسے حضرت امام حسینؑ کسی صورت سے گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے ایک نظر حسینؑ کی ان ذمہ داریوں پر ڈالنا ہوگی جو خاندانِ رسولؐ کے اس وقت سب سے بڑے ذمہ دار رکن ہونے کے اعتبار سے ان پر عائد تھیں اور ان قدیم روایات کو دیکھنا ہوگا جو اسلام اور حقانیت کی حفاظت کے لیے امام حسینؑ کے آباؤ اجداد کی ذات سے وابستہ رہی تھیں اور جن کے اس وقت حسینؑ ذمہ دار تھے اور پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ اس وقت حسینؑ اپنے فرض کی تکمیل کس طرح کر سکتے تھے۔ یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ یزید کو حضرت امام حسینؑ سے بیعت لینے کے لیے اس قدر کد و کاوش کی ضرورت کیا تھی؟ جبکہ جمہوریت کے اصول پر اکثر افراد کا کسی حکومت کو قبول کر لینا آئینی طور پر اس کے مسلّم ہو جانے کے لیے کافی اور اقلیت کی رائے ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس کے ساتھ۔ کوئی قانون نہیں کہ اقلیت کو جبری طور پر اپنی رائے بدلنے کے لیے مجبور کیا جائے۔

جبکہ اس کی طرف سے عملی طور پر کوئی شورش انگیزی نہ کی جا رہی ہو۔ خلافت کے ہر دور میں کچھ لوگ ایسے رہے جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ خود حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کے زمانۂ خلافت میں حسّان بن ثابت، کعبؓ بن مالک اور زیدؓ بن ثابت وغیرہ کئی آدمی ایسے تھے جنھوں نے آپ کی بیعت سے کنارہ کشی کی تھی۔ مگر صرف بیعت نہ کرنا کوئی قابلِ سزا جرم نہیں سمجھا گیا۔ یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معاویہ نے مکّہ اور مدینہ میں چاہے کتنی ہی بڑی کانفرنس یزید کی بیعت لینے کے لیے منعقد کی ہو لیکن یقیناً مکّہ اور مدینہ کی مردم شماری کے اعتبار سے سیکڑوں ہزاروں آدمی ایسے رہ گئے ہوں گے جو گھروں میں بیٹھے ہوں گے اور جنھوں نے یزید کی بیعت نہیں کی ہوگی لیکن کسی کے لیے بیعت کی ضد نہیں کی گئی اور سلطنت کو ان سے کاوش پیدا نہیں ہوئی۔ پھر ایک حسینؓ میں کیا بات ایسی تھی کہ آپ سے بیعت حاصل کر لینے کے لیے سلطنت شام کی پوری مشینری حرکت میں آجائے اور شاہی جبروت کی تمام طاقت صرف کر دی جائے۔ ماننا پڑے گا کہ حسینؓ سے بیعت بحیثیت ملک عرب کے ایک فرد کے نہیں طلب کی جا رہی تھی بلکہ اس بنا پر کہ ایک فردِ ایک جماعت یا قوم بن جاتی ہے۔ نمائندگی کے اعتبار سے۔ حقیقت میں حسینؓ فقط حسینؓ ہی نہ تھے وہ تو اس وقت خاندانِ رسالت کی بزرگ ترین ہستی ہونے کے لحاظ سے اس ورثہ کے حامل تھے جو دینِ خدا کی صحیح معنی میں حفاظت سے متعلق تھا اور جو پیغمبرِ اسلامؐ کے بعد ان کے اہلِ بیت میں یکے بعد دیگرے منتقل ہو رہا تھا اور اسی لیے خاندانِ رسولؐ یا خاندانِ علیؓ بن ابی طالبؓ میں محمد بن حنفیہ بھی تو تھے۔ عبداللہ بن جعفر بھی تو تھے۔ حضرت عباس بن علیؓ اور ان کے بھائی بھی تو تھے۔ کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کسی نے یزید کی بیعت نہیں کی مگر تاریخ نہیں بتا سکتی کہ ان میں سے کسی سے بھی بیعت طلب کی گئی ہو۔ صرف اس لیے کہ ان میں سے کسی کو حسینؓ کی موجودگی میں وہ ذمہ دارانہ حیثیت حاصل نہ تھی جو حسینؓ کو حاصل تھی۔

یزید کو حسینؓ سے بیعت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر وہ صرف دُنیوی

قسم کی ایک سلطنت کا دعویدار ہوتا۔ مگر وہ جس قسم کی سلطنت کے مالک ہونے کا مدعی تھا وہ تو خلافتِ اسلامیہ والی حکومت تھی جو رسول اللہؐ کی جانشینی کی مرادف سمجھی جاتی تھی۔ اس کا نصب العین یہ تھا کہ بادشاہ مذہب کے جزء و کُل کا مالک ہو اور مذہبی قوانین بادشاہ کی خواہشوں کے پابند ہوں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ وہ پیغمبرِ اسلامؐ کے مذہبی وارث سے اپنی حکومت کو تسلیم کرائے اور وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس وراثت کی حامل اس وقت صرف حسینؑ کی ذات ہے اس لیے وہ لازم سمجھتا تھا کہ آپ سے اپنی بیعت حاصل کرے۔

حسینؑ سمجھتے تھے کہ اگر اس وقت میرے بھائی حضرت امام حسنؑ زندہ ہوتے تو بیعت کی خواہش ان سے کی جاتی مجھ سے نہ کی جاتی۔ اگر میرے پدر بزرگوار حضرت علیؑ ہوتے تو جھگڑا ان سے کیا جاتا، مجھ سے نہ کیا جاتا اور اگر میرے جدِّ بزرگوار رسول اللہؐ ہوتے تو اپنی حکومت کے جواز کی تصدیق ان سے حاصل کرنے کی کوشش ہوتی مجھ سے نہ ہوتی۔ مگر اب تو وہ دیکھ رہے تھے کہ میرے نانا رسول اللہؐ نہیں ہیں، میرے بابا علی مرتضیٰؑ نہیں ہیں اور میرے بھائی حسنؑ مجتبیٰؑ بھی نہیں ہیں۔ اب تو میں ہوں اس لیے مجھ سے بیعت طلب کی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر میں نے بیعت کر لی تو وہ ایسا ہے جیسے میرے بھائی حسنؑ ہوتے اور وہ بیعت کر لیتے۔ میرے بابا علیؑ ہوتے اور وہ سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ اور میرے نانا رسول اللہؐ ہوتے اور وہ اس حکومت کو جائز تسلیم کر لیتے۔ انھوں نے اس سخت احساسِ ذمہ داری کی بنا پر تمام مشکلات کو برداشت کرنا گوارا کر لیا اور یہ طے کیا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔

یہ عزتِ نفس، شرفِ حق اور وقارِ دینی کا سوال تھا اور پہلے ہی دن آپ نے اس مرحلہ میں آخر تک ثابت قدم رہنے کا عزم کر لیا تھا جس کا آخری نتیجہ بھی معلوم تھا۔ اس کا آپ نے کوئی بلند بانگ اعلان نہیں کیا تب بھی آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سننے والوں کو اس کا پتہ دے رہے تھے۔ چنانچہ ابو سعید مقبری کا بیان ہے کہ میں نے امام حسینؑ کو مدینہ کی مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے ساتھ اس وقت دو آدمی تھے جن کے

کاندھے پر باری باری ہاتھ رکھ کر چل رہے تھے اور آپ کی زبان پر ابن مفرغ کے یہ اشعار تھے ؎

لا ذعرت السّوام فی فلق الصبح مغیرا ولا دعیت یزیدا
یوم اعطی من الھبابۃ ضیما والمنایا یرصدننی ان احیدا

"ان کا مطلب یہ ہوا کہ خدا وہ دن نہ لائے کہ موت کی طاقتیں کینگا ہوں سے حملہ کرکے مجھے میرے راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں اور میں ان کے خوف سے ذلت کو برداشت کرلوں۔"

ابوسعید کا بیان ہے کہ ان اشعار کو سنکر اسی وقت میری سمجھ میں آیا کہ آپ کسی خاص اقدام کا ارادہ رکھتے ہیں۔

دو ہی دن گزرے تھے کہ معلوم ہوا آپ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔[1]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۱

پندرھواں باب

امام حسنؑ کی خاموشی اور امام حسینؑ کا اقدام

اس مقام پر اکثر یہ سوال پیش کیا جاتا ہے کہ آخر حضرت امام حسنؑ نے بھی تو یزید کے باپ معاویہ سے مصالحت کر لی تھی۔ اسی طرح اگر امام حسینؑ صلح کر لیتے تو کیا حرج تھا؛ بظاہر دونوں بھائیوں کے طرزِ عمل میں اختلاف ہے اور اسی سے سلطنتِ بنی امیہ کے ہواخواہوں نے دونوں بھائیوں کے اختلاف رائے کی حکائتیں بھی تصنیف کی ہیں لیکن تاریخی واقعات کی رفتار کا بغور مطالعہ اس اختلاف طبیعت کے سوال اور اس خیال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حالات مختلف ہوتے ہیں اور ان حالات کے لحاظ سے فرائض کا تقاضا بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ ابنائے زمانہ زیادہ تر جذبات کے پابند ہوتے ہیں اور جذبات اکثر افراط و تفریط کی بنا پر حدِ اعتدال سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اخلاقِ انسانی میں کامل اشخاص ہر موقع پر فرض کا اندازہ کرتے ہیں۔ انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ ابنائے زمانہ کے جذبات کے مطابق ہے یا مخالف اس لیے ان کا طرزِ عمل اکثر عام افرادِ انسانی کو متضاد نظر آتا ہے اور اکثر ان پر دونوں طرح کے معترض پائے جاتے ہیں۔ کبھی ان پر اقدام پسند طبائع اعتراض کرتے ہیں اور کبھی رجعت پسند طبیعتیں معترض ہوتی ہیں لیکن وہ ان اعتراضات کی کوئی پروا نہیں کرتے اور اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہی ان کے نزدیک فرض کا تقاضا ہوتا ہے۔

یہی صورت ہم کو پیغمبرِ اسلامؐ کے طرزِ عمل کے متعلق ملتی ہے۔ یہی علیؑ مرتضیٰؑ کی سیرت اور یہی ان کے بعد حسنؑ اور حسینؑ کے طرزِ عمل کے متعلق نظر آتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حسن مجتبیٰؑ کی صلح جس کے واقعات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ وہی مجاہدۂ کربلا

کی تمہید تھی اس لیے کہ ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو وہ مفید، نتیجہ خیز اور مؤثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے عمل میں لایا جائے تو وہ نتیجتہً مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے مرتکب کو اکثر ہمیشہ کے لیے مورد الزام بنا دیتا ہے۔

واقعات کی رفتار یکساں حالت پر نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور ان کا طریقۂ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر زخم رسیدہ پکے ہوئے جزو بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو، پھاہے لگاؤ، مرہم بدلو، ضرورت ہو تو بار بار نشتر دلواؤ، پھر اگر نہ اچھا ہو اور اس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خوف ہو تو اسے کاٹ کر بھی پھینک دو کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا، لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی اور کوئی علاج معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالتے تو ضرور مورد الزام ہوتے اور عام طور پر بے عقل سمجھے جاتے حالانکہ یہ طرز عمل وہی ہے جو بعد میں اختیار کیے جانے پر ممدوح و مستحسن قرار پائیگا۔

دشوار گزار حالات کی اصلاح کے لیے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب اور مؤثر ترین حربہ ہے لیکن سب سے آخری، جب تمام وسائل اور ذرائع ختم ہو جائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اسی وقت اس کا درجہ ہے۔ وہ جہاں تک آخری رہے وہیں تک مؤثر ہے اور اگر اس سے پہلے عمل میں آجائے تو جلد بازی غیر موقع شناسی اور ناعاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آجانا ضروری ہے جس کے بعد اس کو حق بجانب نہیں سمجھا جا سکتا اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی اور تاثیر رخصت۔

حالات کی اصلاح کے لیے احتجاج، استغاثہ، مصالحت اور معاہدۂ مودّت یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا اختیار کیا جانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔ بیشک جب یہ سب ذرائع اختیار کیے جانے پر ناکام ثابت ہوں تو پھر عربی مثل من جرّب المجرّب حلت به النّدامة اور فارسی مثل "آزمودہ را آزمودن جہل است" کے مطابق انسان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہو سکے گا اور اس کی رفتار عمل کو آگے بڑھ کر دوسرے اقدام تک پہنچنے کا حق ہوگا۔ یہی تدریجی رفتار اقدام

عمل میں جب تک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہو جانے پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے والا مغضوب الغضب کہا جائے گا۔ وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں برخلاف اس کے اگر تمام دیگر ذرائع و اسباب سے اتمامِ حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد کے لیے جان دینے پر تیار ہو جائے تو فداکاری و جان نثاری اور مؤثر قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے اعمال و افعال میں توازن کو ملحوظ رکھتا ہے اور اپنی کارگزاریوں میں صرف جذبات کا فرمانبردار نہیں بلکہ عقلی غور و تدبّر کا پابند ہے تو اسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔ شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بے شک مذہب خطرہ میں تھا اور حق و راستی پامال ہو رہی تھی جس کی اصلاح کے لیے قربانی درکار تھی لیکن اس قربانی کے حق بجانب قرار پانے کے لیے دوسرے پُرامن اور صلح پرور وسائل و ذرائع صرف کیے جانے کی ضرورت تھی۔ اگر امام حسینؑ بغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے اچانک یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے باوجود فقدان اعوان و انصار مخالفت پر جس کا لازمی نتیجہ آپ کا قتل ہونا تھا تیار ہو جاتے اور ایسا کرنے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آخر امام نے اتحادِ عمل کے ساتھ حالات کی درستی کی کوشش کیوں نہ کی؟ مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کر کے ان مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا؟ کم سے کم امورِ سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر کے مدینۂ رسولؐ میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کربلا آ کر اپنے کو معرضِ خطر میں کس لیے ڈالا؟

ان سوالات کے پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی بظاہر موجود نہ ہوتا یقینی آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لیے نہ قابلِ ستائش ہوتا اور نہ مؤثر و کامیاب مگر یہاں صورتِ حال یہ تھی کہ امام حسینؑ کا اقدام ایک مکمل نظام کے تحت میں واقع ہو رہا تھا جس کے لیے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لا رہے تھے یہاں تک کہ سنہ ۶۰ھ سے لے کر سنہ ۶۱ھ تک میں اس کا وقت آ گیا۔

شروع شروع میں جناب امیرؑ کا اپنے حقوق کی پامالی کے باوجود ۲۵ سال خاموش رہنا

اس کے بعد لوگوں کے انتہائی اصرار پر خلافت قبول کرنا اور بنی امیہ کا آپ کے مقابلہ میں برسرِ پیکار ہو جانا، آپ کا شہید ہونا اور امام حسنؑ کا مسندِ خلافت پر متمکن ہونا لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے صلح کر لینا اور مخصوص شرائطِ معاہدہ کے ساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے دستکش ہو کر دس برس خاموشی کی زندگی بسر کرنا اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسینؑ کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر زبانی یا مکتوبی احتجاج کرتے رہنا لیکن باوجود اس کے حالات کا رُو باصلاح ہونے کے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا، شرائطِ معاہدہ کو ٹھکرا دیا جانا، صلح نامہ کی دفعات کا پامال ہو جانا، زبانی احتجاج و استغاثہ پر کوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ اپنے انسانیت سوز اور اسلام کش افعال پر بیش از بیش اصرار کیا جانا اور اس سلسلہ میں پانی کا سر سے اونچا ہو جانا اور معاملات کا حد سے گزر جانا وہ تھا جس نے امام حسینؑ کے لیے اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کر دیا تھا کہ جو انھوں نے کربلا کی سرزمین پر انجام دیا۔

حسینؑ کے سامنے اب صلح کا سوال آ ہی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ صلح کی منزل کو امام حسینؑ طے کر چکے تھے اور اب شرائطِ صلح کی مخالفت ہی وہ صورت حال تھی جو امام حسینؑ کے سامنے تھی حالانکہ معاویہ اپنے اعمال میں بہرحال کچھ نہ کچھ پردہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر جب معاویہ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام رہی تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنیٰ؟

پھر امام حسنؑ نے جو صلح کی اس کی نوعیت تو یہ تھی کہ پہلے حضرت امام حسنؑ مسندِ خلافت پر متمکن تھے۔ صلح کے ذریعہ سے آپ نے حکومتِ ظاہری کو چھوڑ دیا اور مخصوص شرائط کے ماتحت معاویہ کے سپرد کر دیا مگر اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ نے خلافتِ الٰہیہ، امامت یا تمدنِ اسلامی کے بارے میں اپنے دینی مسلک اور معاشرتی و اجتماعی اصول سے دست برداری اختیار کر لی۔ یہ صلح اس کے بعد سے صرف ایک معاہدۂ عدم تعرّض کی حیثیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے روحانیت کا مرکز دنیوی اقتدار کے مرکز سے ایک عرصہ تک کے لیے علیٰحدہ ہو گیا اور بس! اسی لیے حضرت امام حسنؑ کی زندگی اس معاہدہ کے بعد بھی محفوظ نہیں رہی سلطنتِ شام

امام حسینؑ سے اس عدم تعرض پر اکتفا کرنے والی ہوتی تو طلبِ بیعت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ عدم تعرض تو ان حضرات کی جانب سے قائم ہی تھا۔ دمشق کی سیاست اب اس پر رضامند نہیں تھی کہ روحانیت کا مرکز مادی اقتدار کے مرکز سے الگ دنیا میں موجود رہے۔ معاویہ کا معاہدہ وقتی طور پر ایک مجبوری کا نتیجہ تھا۔ بغیر اس کے حضرت امام حسنؑ کی تسلیم شدہ حیثیت جو مسلمانوں میں باعتبار حکومت حاصل تھی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد ان کو خود اور ان کے بعد یزید کو شدت کے ساتھ اس کا احساس تھا کہ یہ کانٹا ہمیشہ کے لیے راستے سے نکل جائے۔ تسخیرِ ممالک اور تسخیرِ قلوب مختلف چیزیں ہیں۔ ایک کو دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ فاتحِ ممالک کو فاتحِ قلوب سے ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ یہی خطرہ تھا جس کی وجہ سے اہلِ بیتِ رسولؐ سلطنتِ دمشق کی نظر میں بہرحال قابلِ مزاحمت تھے خواہ وہ مزاحمت کریں یا نہ کریں۔

ان حالات کے ہوتے ہوئے امام حسینؑ کے لیے اس طرح کی صلح کا کوئی محل نہ تھا جیسی صلح امام حسنؑ کر چکے تھے۔ وہ صلح ایسی تھی کہ اگر اس وقت ذمہ دارانہ حیثیت امام حسینؑ کی ہوتی، تب آپ بھی اس صلح کے مسلک کو اختیار کر کے مسلمانوں میں امن قائم کر دیتے آپ کے سامنے تھا بیعت کا سوال۔ اس کے معنی تھے اس روحانی مرکز کی شکست جس کے حسینؑ ذمہ دار تھے۔ اس کے معنی تھے اس تمدن اور نظامِ سیاست کو قبول کر لینا جو سلاطینِ دمشق نے قائم کیا تھا۔ یہ ایسی چیز تھی جو آلِ محمدؐ کے لیے کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی خواہ حسینؑ ہوتے یا ان کے بجائے اس وقت امام حسنؑ ہوتے۔

پھر سابق زمانہ میں تو خلفاء اپنے کو کتاب اور سنت کا محافظ ظاہر کیا کرتے تھے اور بیعت بھی اسی پر لی جاتی تھی کہ کتاب و سنت پر عمل ہوگا۔ مگر یزید کے دور میں سلطنت کی مطلق العنانی اور خودسری اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ بیعت لی جاتی تھی اس بات پر کہ ہم خلیفہ کی ملکیت ہیں۔ وہ ہمارے جان و مال اور اولاد کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔ مدینہ میں یزید بن عبداللہ بن زمعہ بن الاسود اسی جرم پر قتل کیے گئے کہ وہ کتاب اور سنت پر بیعت کرنے کے لیے تیار تھے۔

مگر مذکورہ الفاظ میں یزید کی غلامی کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔[1]

ان ہی باتوں کا نتیجہ تھا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوگا کہ امام حسینؑ کو آپ کے اس اقدام کے سلسلہ میں مختلف اوقات میں بہت سے مشورے دیے گئے۔ یہ کہا گیا کہ مدینہ ہی میں قیام کیجیے۔ یہ کہا گیا کہ مکہ کو مستقر بنائے رکھیے۔ یہ کہا گیا کہ طائف یا یمن کی طرف چلے جائیے۔ یہ کہا گیا کہ کوہِ اجا میں چل کر پناہ لیجیے۔ مگر یہ کسی عزیز یا دوست نے مشورہ نہیں دیا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجیے کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی کہ یزید کی بیعت امام حسینؑ کے لیے کسی طرح ممکن نہیں۔

یزید کی بیعت کرنے کے معنی یہ تھے کہ حسینؑ ہر قسم کے شریفانہ شعور اور مسلمانوں کے ہر قسم کے حقوق کو بیچ ڈالتے۔ حسینؑ کے لیے محال تھا کہ حسینؑ فضیلت اور فضالت کو ایک درجہ میں رکھتے۔

عبداللہ بن عباس، عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ نے بھی یزید کی خلافت کو پسند نہیں کیا۔ ان سب نے معاویہ کے سامنے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ ان کا یہ طریق عمل کسی طرح جائز نہیں ہے۔ پھر حسینؑ ہر دوسرے شخص سے زیادہ اسلام کا درد رکھتے تھے۔

حسینؑ زیادہ حق رکھتے تھے کہ وہ یزید کے مطالبات کو حقارت کی نظر سے دیکھیں اور ہر قسم کی قربانی اسلام کی حمایت میں پیش کریں۔

---

[1] اخبار الطوال ص ۲۱۶

سولھواں باب

حسینی موقف کی تشریح

جب کوئی صورت سمجھوتے اور مصالحت کی بھی نہیں تو پھر اب کیا رہ جاتا ہے؟ جنگ! مگر مادی طور پر جنگ کرنے کا سوال اس وقت پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ تاریخی صورت حال یہ ہے کہ اس وقت حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی وفات کو بیس برس گزر چکے تھے۔ بنی امیہ کی طاقت جو شام میں تھی حضرت علیؑ ہی کے زمانہ میں اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ حضرت علیؑ کی قوت سے صفین میں گویا برابر کی ٹکر لے سکی اور حضرت امام حسنؑ کو اس سے مقابلہ میں ایک شدید خونریزی کے آثار نظر آئے جس کی وجہ سے آپ نے صلح کرنا بہتر سمجھا حالانکہ اس وقت شیعانِ علیؑ کی جمعیت منظم تھی مگر اب بیس برس کی طولانی مدت گزرنے پر وہ جتھا پراگندہ ہو چکا تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے ضمیر خریدے جا چکے تھے۔ بہت سے ثابت قدم لوگوں کے سر قلم کیے جا چکے تھے اور بہت سوں کو جیلوں میں بھرا جا چکا تھا۔ بقیہ لوگ خوف و دہشت اور بد دلی سے ادھر اُدھر پریشان و پاشان ہو گئے تھے۔ ایسی صورت میں دمشق کے شہنشاہی اقتدار کے مقابلہ میں جنگ کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا تھا؟ اس کے علاوہ آپ کا مقصد جو یزید کے مقابلہ میں تھا وہ مادی جنگ سے حاصل بھی نہیں ہو سکتا تھا اس کی تشریح آئندہ کی جائے گی۔

اس کے بعد حضرت امام حسینؑ بیعت سے انکار کر رہے تھے تو کیا کریں گے؟ اسے اگر حسینؑ کر کے نہ دکھلاتے تو ہماری ہرگز سمجھ میں نہ آتا۔ حسینؑ نے یہی طے کیا کہ وہ جنگ کریں گے مگر جنگ کا طریقہ بدل دیا۔ جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں ان میں طاقت کا مقابلہ طاقت

سے ہوتا ہے۔ حسینؓ نے سب سے پہلے یہ نمونہ پیش کرنا چاہا کہ آپ طاقت کا مقابلہ کردار سے کریں گے۔ آپ نے یہ طے کیا کہ آپ اقتدار کا مقابلہ بے بسی سے، کثرت کا مقابلہ قلت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت کسے ساتھ کریں گے اور یہ وہ طریقۂ جنگ تھا جس کا مشاہدہ اس سے پہلے دنیا نے نہیں کیا تھا۔

آپ محسوس کر رہے تھے کہ تعلیماتِ اسلام پر ایسا غلاف چڑھ گیا ہے جس سے آئندہ صدیوں کو اور قیامت تک آنے والی نسلوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ حقیقتاً وہ تمدن، وہ آئین معاشرت اور وہ نظامِ زندگی کیا تھا جسے پیغمبرِ اسلامؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے سابقہ حالات معلوم کرنے کا ذریعہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو وہ کتب تواریخ۔ یہی تاریخ کی دوربین وہ ہے جس کے ذریعہ سے صدیوں اور ہزاروں برس پہلے کے حالات کا انسان مطالعہ کرتا ہے۔ اسلامی دنیا میں سلاطینِ اسلام کا شاہنشاہی اقتدار اتنا نمایاں تھا کہ اگر اسلامی تمدن و تہذیب کی جانچ کے لیے کوئی طالبِ تحقیق تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالتا تو اس کو اسلام کی سرزمین پر دمشق اور بغداد کے اونچے قصر نظر آتے۔ وہ بڑے بڑے پھاٹک دکھائی دیتے جن پر زرتار پردے پڑے ہوئے ہیں وہ ایوان جلوہ دکھاتے جہاں دیواروں پر زر و جواہر کا کام بنا ہوا ہے اور سونے چاندی کے دروازے ہیں اور اگر محل کے اندر باریابی ہو جاتی تو زر و جواہر سے مرصع تخت نظر آتا اور زریں کمر غلام صف باندھے ایستادہ، مہ جبینوں کا جھرمٹ، شراب کے دور، مغنی کی صدا اور ساز و طرب کے نغموں کی گونج۔ "پیشوائے اسلام" کی بارگاہ میں نماز کا وقت آتا ہے تو وہ بھی سلام کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ مؤذن کی صدا آتی ہے مگر نشاط و طرب کے نقار خانہ میں طوطی کی آواز بن کر سنائی نہیں دیتی۔ جب وہ نظارہ دیکھتا تو کیا یہی رائے قائم نہ کرتا کہ اسلام کا تمدن یہی ہے اور یہی وہ تہذیب ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں؟ یقیناً ایسا ہی ہوتا کہ وہاں کا آئین و نظام بطور مثال پیش کیا جاتا۔ ان کے افعال مسلمانوں کے افعال بتلائے جاتے اور انکا کردار

ہی ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کی تصویر نظر آتی۔ کہاں نظر آتے محلہ بنی ہاشم کے وہ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر جن میں کچھ بوڑھے کچھ جوان اور کچھ بچے اپنے خالق کی یاد میں مصروف ہیں۔ وہ دروازے جہاں غریب، محتاج اور مسکین آتے ہیں تو اپنے سامنے کا کھانا اٹھا کر دے دیا جاتا ہے اور خود فاقہ سے دن گزار لیے جاتے ہیں۔ جہاں غلام اور کنیز سے مساویانہ برتاؤ کیا جاتا ہے، کہاں نظر آتے وہ چہرے جن پر محنت و مشقت برداشت کرنے سے زردی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ ہونٹ جو ذکرِ الٰہی سے خشک ہو گئے ہوں، وہ افراد جن کا نصب العین یہ ہے کہ کسی غریب کو اٹھاؤ، کمزور کی مدد کرو، کسی محتاج و بے کس کی دستگیری کرو، کسی مظلوم کو ظلم سے نجات دلاؤ اور دنیا کو اپنے اخلاق سے نمونۂ جنت بناؤ۔

بس حسینؑ بن علیؑ کا مقصد یہ تھا اور وہ یزید کی بیعت کا انکار کرتے ہوئے اسی پر کمربستہ ہو گئے تھے کہ تو سہی وہ انسانیت کی نگاہ کو ان اونچے مناظر سے ہٹا دیں۔ ان قصروں اور مینارو سے موڑ دیں اور اسلامی اصول کی برق تجلّی کو عمل کی اس معراج پر آنکھوں کے سامنے لائیں کہ نظر اٹھتے ہی سب سے پہلے اسی پر جا پڑے اور اسی کی چمک دمک میں محو ہو جائے۔ انھوں نے چاہا کہ اپنے کردار کو ایسی بلندی پر لے جائیں جہاں وہ ستارے کی طرح چمک اٹھے۔ سلاطین دنیا کے بڑے بڑے محل اور مینار نظر نہ آئیں بلکہ آپ کا کردار نظر آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسانیت کے کانوں کو اس نقارہ خانۂ ساز و نغمہ سے بہرا بنا دیں اور حقانیتِ اسلام کی اس سریلی اور دلکش آواز سے شناسا کر دیں جو موجودہ فضا میں سنائی نہیں دیتی۔

دوسرے لفظوں میں آپ کا مطلب یہ تھا کہ ایک مرتبہ دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پوری شدت و قوت سے پیش کر دیں کہ حکومت و شہنشاہیت اور ہے اور اسلامی تہذیب و تمدن اور اس کے اصول اور ہیں۔

حضرت امام حسینؑ جس مقصد کو لے کر اٹھ رہے تھے وہ اپنی نوعیت و خصوصیت میں کوئی نیا نہ تھا۔ وہ تو وہی تھا جسے تمام انبیاء لے کر آئے تھے اور جس کے لیے تمام مصلحین ہمیشہ

کوشش کرتے رہے مگر اس کو جس صورت سے آپ نے حاصل کیا وہ ایک ایسی مثال ہے جو نہ اس سے پہلے نظر آئی اور نہ بعد کو۔

سیاسیاتِ امم کے واقف کار خوب جانتے ہیں کہ ظلم و جور کی طاقت اور شہنشاہیت جس وقت افرادِ انسانی کو اپنے شکنجہ میں قید رکھنا چاہتی ہے تو کچھ ذرائع اختیار کرتی ہے اور ان تمام ذرائع کا اصلی مقصد دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ عوام سے قوتِ احساس کو سلب کیا جائے دوسرے جراءتِ اظہار کو ختم کیا جائے۔ شام کی اموی حکومت نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ان ہی دو باتوں پر پوری طاقت صرف کر دی تھی ورنہ مسلمان جن کو پیغمبرؐ نے محنت و مشقت کے ساتھ اصولِ انسانیت کی تلقین کی ہو اور جنھوں نے دیکھا ہو کہ پیغمبرؐ کس طرح مادی ساز و سامان کو ہیچ سمجھتے تھے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو کہ پیغمبرؐ کے دروازے پر پھٹا ہوا پردہ پڑا رہتا تھا جنھوں نے دیکھا ہو کہ تین تین دن تک پیغمبرؐ کے گھر سے دھواں نہیں اٹھتا، جتنا روپیہ آتا ہے غریبوں اور مسکینوں کو دے دیا جاتا تھا۔ وہی کیونکر اس کو برداشت کر سکتے کہ بادشاہ کے خزانہ میں غریبوں کا خون چوس کر روپیہ جمع ہو اور اس کو رنگ رلیوں میں صرف کیا جائے۔ خلیفہ کی بارگاہ میں رقص و سرود کی محفلیں ہوں اور شراب و کباب کے مشغلے رہیں۔ مسلمان اس کو صرف خاموشی سے دیکھتے ہی نہ رہیں بلکہ ایسے شخص کو پیشوا تسلیم کریں۔ یہ فطرت کا انقلاب مسلمانوں میں کس طرح پیدا ہو سکتا تھا؛ صرف قوتِ احساس ختم ہونے اور جراءتِ اظہار کے سلب ہونے سے۔

قوتِ احساس ختم کرنے کی صورتیں بہت سی ہیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عوام صاحب رائے نہیں ہوتے۔ ان کے پاس دل ہوتا ہے مگر دماغ نہیں ہوتا۔ دماغ رکھنے والے ممتاز افراد اور لیڈر ہوتے ہیں۔ خاص خاص لیڈروں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے تو جدھر یہ لیڈر لے جانا چاہیں عوام بے خبری کے ساتھ اسی طرف چلے جائیں گے خواہ یہ راستہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو۔ کی بنا پر عموماً جمہوریتوں میں ظاہری کثرت رائے حقیقی رائے عامہ کی ترجمان نہیں ہوتی۔ اموی

سیاست نے خواص کو اپنے قبضہ میں کیا۔ اس طرح کہ جس کو ذرا مخالفانہ رجحان رکھتے ہوئے پایا اس کی جیب میں اشرفیوں کی ایک تھیلی پہنچا دی گئی۔ اگر اس نے قبول کر لی تو سمجھ لیجیے کہ جتنا ان اشرفیوں کا وزن تھا اتنا ہی اس کی مخالفت کا سر جھک گیا۔ "پھر چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی" جہاں خیال پیدا ہوا کہ اب کی دفعہ دو توڑے ملے ہیں اس کے بعد بجائے دو کے چار ملیں گے۔ وہیں قوتِ احساس ختم ہو گئی یعنی یہ خیال ہونے لگا کہ دنیا کے لیے چاہے جیسے ہوں یہ حکام ہمارے لیے تو بہت اچھے ہیں۔ اس طرح بہت سے لوگوں کا ضمیر خرید لیا گیا اور بہت سے اصول کے پختہ جن کے سر اٹھے ہی رہے ان کے سر اور جسم میں جدائی پیدا کر دی گئی اور اگر یہ حربہ خطرناک معلوم ہوا تو شہد کا ایسا جام جو لب تک پہنچتے ہی موت کی میٹھی نیند سلا دے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے یہ سوچنا موقوف کر دیا کہ ہو کیا رہا ہے اور بہت سے لوگوں نے جب کچھ سوچا تو ان لوگوں کے انجام کو دیکھا جو اس کے پہلے کچھ سوچ کر اختلاف کا اظہار کر چکے تھے کہ آج صفحۂ ہستی ان کے نقشِ وجود سے خالی ہے۔ اس طرح جرأتِ اظہار ختم ہوئی۔

یہی دو چیزیں ایسی تھیں جن کو از سرِ نو پیدا کرنے کا بیڑا اٹھا کر حضرت امام حسینؑ میدان میں آئے۔ آپ نے سوچا کہ قوتِ احساس کیونکر پیدا کی جائے؟ اس کے لیے ایک حاذق طبیب کی طرح مرض کے سبب پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ آخر مسلمانوں کی اس بے حسی کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ واقعی مسلمان نہیں رہے؟ دیکھا تو اب بھی لوگ اسلام کو مانتے ہیں اور اپنے کو مسلمان کہنا فخر سمجھتے ہیں مگر ان کے احساساتِ اسلامی پر غشی چھا گئی ہے جیسے کوئی آدمی بیہوش ہو جائے تو اس میں نفس کی آمد و شد قائم رہتی ہے جو زندگی کا پتہ دیتی ہے مگر آثارِ زندگی مفقود ہوتے ہیں احساس اور حرکتِ ارادی دونوں چیزیں گم ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس وقت حاملۂ اسلامیہ میں کلمۂ توحید کے نفس کی آمد و شد ہے جو ان کے ظاہری طور پر اسلام کی دلیل ہے مگر اسلامی روح کام کچھ نہیں کر رہی ہے اور احساسات اسلامی فنا ہو گئے ہیں۔ ہر ایک کو معلوم ہو گا کہ جب کسی کو غش آجاتا ہے تو اس کے چہرے پر چھینٹا دیا جاتا ہے۔ جتنی گہری بے ہوشی ہو اتنا ہی تیز چھینٹا دیا جائے گا۔ امام حسینؑ

نے بس یہ چاہا کہ مسلمانوں کے بیہوش احساسات پر ایک ایسا تیز چھینٹا دے دیں جس کے بعد وہ پھر بری لے کر آنکھ کھول دیں اور گھبرا کر یہ دیکھنے لگیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ بھی قابلِ غور امر تھا کہ اس بیہوشی کا سبب کیا ہے؟ یقیناً اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جماعت جو تعلیماتِ اسلامی کو مٹا رہی ہے اگر صاف صاف کوئی غیر مسلم جماعت ہوتی تو مسلمان جلدی سے چونک پڑتے لیکن وہ جماعت جو اس وقت تعلیماتِ اسلام کو برباد کر رہی ہے اپنے چہرہ پر اسی رسمی اسلام کی نقاب ڈالے ہوئے تھی اور مسلمانوں کی جماعت میں داخل تھی اس لیے مسلمان بیدار نہیں ہوتے تھے۔ حضرت امام حسینؑ نے یہ ارادہ کر لیا کہ اپنی مقابل جماعت کے چہروں سے اسلام کی اس نقاب کو اتار کر پھینک دیں اور دنیا کو دکھلا دیں کہ اس نقاب کے پیچھے کیسے لوگ چھپے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کو اسلام سے حقیقتاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح ایک تو موجودہ مسلمان ان سے بیزار ہو جائیں گے اور ان کے خلاف انقلاب پیدا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے، دوسرے بعد میں مسلمانوں کے لیے ان کے افعال سند نہ رہیں گے۔ جب مسلمانوں کو ان کے اسلام کی صحیح تصویر معلوم ہو جائے گی تو مسلمان دھوکا کھا کر ان کے دام میں نہ پھنس سکیں گے۔ نیز غیر مسلم دنیا کے سامنے اسلام کی جانب سے صفائی پیش ہو جائے گی۔ اگر بنی امیہ کے اوصاف و اخلاق کو اسلام کے خلاف پیش کیا جائے گا تو مسلمانوں کی گردنیں جھکیں گی نہیں بلکہ حسینؑ بن علیؑ کا کردار مسلمانوں کے سر کو بلند کرے گا کہ اگر یزید کے افعال کو اسلام سے کوئی تعلق ہوتا تو پیغمبر اسلامؐ کا نواسا اپنے کو خطرہ میں کیوں ڈال دیتا۔ یہی مقاصد وہ تھے جو تمام و کمال مادی جنگ سے حاصل نہ ہو سکتے تھے۔ مادی جنگ سے جو فتح حاصل ہوتی ہے اس سے افراد و اشخاص قتل ہوتے ہیں مگر ذہنیت قتل نہیں ہوتی۔ سلطنتوں میں انقلاب ہو سکتا ہے مگر افراد جامعہ کے احساسات میں انقلاب نہیں ہوتا۔ حسینؑ بن علیؑ اشخاص کو قتل کرنے نہیں اٹھے تھے۔ یزید کو ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو یزیدیت کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یزید ختم ہو جاتا اور اس کے تمام عمّال اور فوجی افسر بھی ہلاک ہو جاتے پھر بھی یہ نہیں سمجھا جا سکتا

تھا کہ یزیدیت ختم ہوگئی اور یزیدی مسلک فنا ہوگیا۔ ذہنیت دنیا کی جب ماؤف تھی تو اگر عسکری طاقت لے کر جنگ کرتے تو جو اسکی واقعی حیثیت تھی اس کے سمجھنے والے بہت کم ہوتے، اور یہ سمجھنے والے زیادہ ہوتے کہ حکومت وسلطنت کی غرض سے دو بادشاہوں کی جنگ ہے اور سیاسی حیثیت سے یزید کا پلہ گراں رہتا اس لیے کہ وہ بادشاہ تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اس صورت میں اگر آپ کو فتح حاصل بھی ہوتی جو گزشتہ اسباب کی بناء پر بظاہر غیر ممکن تھی تو اس کا اثر ایک وقتی انقلاب سلطنت کی صورت سے ہوتا جس کا نتیجہ دیرپا نہ ہوتا اور بنی امیہ پر جو ظاہری اسلام کا پردہ تھا وہ اسی طرح پڑا رہتا اور اگر کچھ لوگ حسینؓ کو حق پر سمجھتے بھی ہوتے تو فریق محارب کو خطاء اجتہادی کی سند دے دیتے جیسا کہ اس سے پہلے صفین کی جنگ کے متعلق ہو چکا تھا۔ اس صورت میں بنی امیہ کے باطنی حالات کا اس درجہ انکشاف کہ جو ان سے ہمدردی کا کوئی گوشہ انسانیت کے دل میں باقی نہ رکھے ہرگز نہیں ہوسکتا تھا اور جب تک ان سے نفرت انتہائی درجہ پر پیدا نہ ہوتی اس وقت تک ان امتیازات واقتدار کی مکمل شکست نہیں ہوسکتی تھی، جنھیں بنی امیہ نے عملی طور پر قائم کرنا چاہا تھا۔

اگر امام حسینؓ طاقت کے ذریعہ سے یزید کی طاقت کو شکست دیتے تو پھر بھی دنیا اس چیز کو نہ سمجھتی کہ حقانیت اور حکومت دو الگ چیزیں ہیں۔ حسینؓ بن علیؓ کی فتح ویسی فتح سمجھی جاتی جو بادشاہوں کی فتح ہوتی ہے۔ یعنی اگر آپ یزید کو شکست دے کر سلطنت پر قابو حاصل کر لیتے تو آپ کی سلطنت کو دنیا سلطنت ہی سمجھتی اسلام کی حقیقت نہ سمجھتی۔ حالانکہ تاریخی حالات بتلاتے ہیں کہ اس طرح کی مکمل فتح آپ کو کبھی حاصل ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ بڑی سے بڑی مادی کامیابی بھی آپ کی محدود حیثیت رکھتی، یعنی اس صورت میں کہ جب کوفہ میں حالات سازگار ہوتے اور سب لوگ آپ کی حکومت تسلیم کر لیتے تو زیادہ سے زیادہ وہی ہوتا جو حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کو وقت سے مجبور ہو کر کرنا پڑا تھا یعنی عراق وحجاز وغیرہ کی حکومت امام حسینؓ کے پاس اور شام کی حکومت یزید کے پاس ہوتی۔ دونوں طرف کی

حکومتوں میں مقابلہ ہوتا اور مسلمانوں کی طاقتیں آپس میں لڑکر پاش پاش ہوتی رہتیں۔ مگر امام حسینؑ ایسی کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے جو نہ باعتبار حدودِ مملکت محدود ہو اور نہ باعتبار حدودِ زمانہ محدود۔

ممکن ہے یہ سوال اٹھایا جائے کہ حسینؑ کے واقعۂ شہادت کے بعد بھی تو بہت سے سلاطین انہی افعال کے مرتکب ہوتے رہے جن کا یزید ارتکاب کرتا تھا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حسینی مقاومت نے اسلام کے تمدن و اصول کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب اس کے خلاف جو افعال ہوتے ہیں وہ انفرادی اور شخصی جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں آئینی اور مذہبی درجہ نہیں حاصل ہوتا یعنی یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا ہے کہ انہی کو اسلام کا مستقل اصول اور طریقِ معاشرت سمجھ لیا جائے کیونکہ امام حسینؑ نے اسلام کی آئینی عظمت کا نہ مٹنے والا نقش قائم کر دیا ہے۔

گزشتہ بیانات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حسینؑ بن علیؑ کے لیے اپنے مقصد کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہی جسے انھوں نے اختیار کیا اور اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔

آپ اس راستے میں موت کے استقبال پر ہمیشہ سے تیار تھے جو آپ کے الفاظ اور مخاطبات سے ظاہر تھا۔

چنانچہ مکہ سے روانگی کے وقت اپنے خطبہ میں آپ نے ارشاد کیا کہ "موت انسان کی گردن سے اسی طرح وابستہ ہے جیسے گلوبند جوان عورت کی گردن سے۔" بادی النظر میں تو آپ کو اس سے صرف اتنا ظاہر کرنا مقصود تھا کہ انسان کے گلے میں موت کا پھندا پڑا ہوا ہے اور بہرحال اس کو ایک نہ ایک دن اس دارِ فانی سے رخصت ہونا ہے مگر آپ نے اس تلخ حقیقت کا کچھ ایسے دلکش انداز سے تذکرہ فرمایا ہے جس سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک موت کوئی ناگوار شے نہیں بلکہ حسین و دیدہ زیب چیز ہے۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ انسان کی جیسی ذہنیت ہوتی ہے۔ ویسے ہی الفاظ اس کی زبان پر آتے ہیں۔ چونکہ حسینؑ اس گھرانے کے ایک فرد تھے جس کے افراد عمومی حیثیت سے موت کو کبھی خاطر میں لاتے ہی نہیں تھے اور آپ کے پیش نظر بقائے

حقانیت کا اہم ترین مقصد بھی تھا لہٰذا آپ کے تاثرات اس بارے میں بہت زیادہ قوی تھے۔

چنانچہ مکہ سے روانگی کے بعد پہلی ہی منزل پر جب آپ کی فرزدق شاعر سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے کوفہ کی حالت آپ سے بیان کی کہ "لوگوں کے دل تو آپ کی طرف ضرور ہیں مگر تلواریں ان کی بنی امیہ کے ساتھ ہونگی" تو آپ نے فرمایا۔ "تم سچ کہتے ہو، لیکن ہر بات خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھاتا ہے۔ خدا کی تقدیر اگر ہماری خواہش کے مطابق ہوئی تو ہم خدا کی حمد کریں گے اور ادائے شکر کے لیے اسی سے مدد کے طالب ہوں گے اور قضائے الٰہی ہمارے سدِّ راہ ہوئی تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اس کی نیت میں سچائی اور اس کے ضمیر میں پارسائی کا خیال باقی رہے۔" [1]

عراق کے راستے میں حُر کے ساتھ جو آپ کی گفتگو ہوئی تھی وہ بھی آپ کے اسی مستقل نظریہ کے ماتحت تھی یعنی یہ کہ حُر نے کہا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں آپ اپنے اوپر رحم کریں، اس لیے کہ اگر آپ نے جنگ کی تو آپ یقیناً قتل کر دیے جائیں گے اور آپ تباہ ہوں گے۔ تو آپ نے جواب دیا کہ تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؟ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو؟

اس کے بعد آپ نے قبیلۂ اوس کے ایک شاعر کا یہ شعر پڑھا کہ ؎

سامضی وما بالموت عار علی الفتیٰ اذا ما نوی حقا وجاهد مسلما

"میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت سے دوچار ہونے میں جوانمرد کے لیے کوئی عار و ننگ نہیں ہے جب کہ اسکی نیت میں سچائی ہو اور وہ راہِ حق میں جہاد کر رہا ہو۔" [2]

یہ بظاہر عجیب چیز ہے۔ انسانی نگاہ میں آخری اور انتہائی انجام قتل ہوتا ہے لیکن حضرت امام حسینؑ فرماتے ہیں کہ "کیا اس سے زیادہ تم کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو" یعنی آپ قتل ہونے کو ایک درمیانی منزل قرار دیکر آخری معیار فتح و شکست کا کچھ اور قرار دے رہے ہیں۔

---

[1] ارشاد ص ۲۲۸ [2] ارشاد ص ۲۳۶۔ ۲۳۷

ذوحسم ہی کے مقام پر جب حرؑ کا لشکر امام کی مزاحمت کے لیے آچکا ہے تو حضرت نے اپنے اصحاب کے سامنے خطبہ ارشاد کیا جس میں حمد و ثنائے باری کے بعد فرمایا:-

"صورتِ حال جو پیش آئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو اور یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے اور اس کی نیکی رخصت ہو چکی ہے اور اس میں کچھ رہ نہیں گیا ہے۔ سوائے تھوڑے حصہ کے جو پانی بہنے کے بعد برتن میں بچ رہتا ہے، اور ایک پست زندگی مثل زہریلی گھاس کے کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی نہیں اختیار کی جاتی اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزومند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے ساتھ وبالِ جان ہے"۔[1]

اسی کے ساتھ، آپ نے حکام اور عوام کے حقوق و فرائض کے حدود قائم کر دیے اور بتایا کہ حکومت عوام کی ذہنی و عملی ترقی اور دین کے احکام نافذ کرنے کے لیے ہے اور وہ اس وقت تک قابلِ احترام ہے جب تک عوام کی زندگی کو اس سے فائدہ پہنچ رہا ہو۔ ایک موقع پر آپ نے حاکم کے اوصاف ان الفاظ میں بیان فرمائے "حاکم کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی دستور پر چلتا ہو۔ عدل و انصاف سے پیش آتا ہو۔ حق کا پابند ہو اور رضائے الٰہی میں اپنے نفس کو مقید کیے ہوئے ہو"۔[2] اور جس حکومت کے خلاف آپ احتجاج کرتے رہے اس کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کئی بار اظہارِ خیال کیا۔ حرؑ کے لشکر کے سامنے آپ نے فرمایا "رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ جو ظالم بادشاہ کو دیکھے کہ وہ عہدِ خدا اور سنتِ رسولؐ کی مخالفت کر رہا ہے اور بندگانِ خدا کے ساتھ ظلم و تعدی سے پیش آتا ہے اور وہ قول یا فعل سے اس ظالم کو نہ روکے تو خدا اسے بھی اس پیرہ دست بادشاہ کے زمرہ میں شمار کرے گا۔ دیکھو موجودہ حکومت شیطان کی حلیف بن گئی ہے اور خدا کی فرماں برداری سے روگردانی کر رہی ہے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۹ [2] ارشاد ص ۲۱۰

فتنہ وفساد برپا کر رکھا ہے اور حدود و آئین کو بے کار بنا دیا ہے۔ ملک کے سارے سرمایہ کو اپنی ملکیت بنا لیا ہے۔"

عمر سعد کے لشکر سے خطاب کر کے فرمایا۔ تم دیکھتے نہیں کہ حکومت حق پر عمل نہیں کر رہی ہے اور باطل سے باز نہیں آتی۔ یہ وہ وقت ہے کہ مومن کو موت کی تمنا کرنا چاہیے۔ میں تو اس ماحول میں موت کو اپنے لیے آسودگی اور نیک بختی اور ظالموں کے ساتھ زندگی کو سراسر تکلیف سمجھتا ہوں۔"

شب عاشور کے خطبہ میں اعوان و انصار کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "میں باعزت مرجانے کو زندگی سمجھتا ہوں اور ذلت کی زندگی بسر کرنے کو موت خیال کرتا ہوں۔"

کربلا میں روز عاشور کے خطبہ میں آپ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنے کو تمھارے قبضہ میں نہ دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح تمھارے سامنے سے بھاگوں گا۔" یہ تھا بہادری اور جانبازی کی موت کا اعلان۔

پھر ارشاد کیا :۔

"میں پناہ مانگتا ہوں ایسے ہر شخص سے جو نخوت و غرور رکھتا ہو اور روز قیامت پر ایمان نہ رکھتا ہو[1]۔ موت عزت کے ساتھ بہتر ہے اس زندگی سے جو ذلت کے ساتھ ہو۔" پہلے فقرہ میں جبار و سرکش یزید کے جبروت سلطنت کی تحقیر ہے اور دوسرے فقرہ میں اس کی تشریح ہے کہ مادی طاقت کے آگے بلند مقاصد کے خلاف سر جھکا دینا عزت انسانی کے خلاف ہے اور اس زندگی سے جو اس طرح ہو موت بہتر ہے۔

---

[1] ارشاد ص ۲۴۸

سترھواں باب

حرمِ رسولؐ سے سفر اور حرمِ خدا میں پناہ

ولید سے گفتگو کے بعد وہ وقت آگیا کہ جب امامؑ نے مدینہ کو ترک کرنا ہی اپنے لیے ضروری سمجھا۔ یہ خیال کرنا کہ آپ مدینہ ہی میں قیام فرماتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے، تاریخ کے مسلسل واقعات سے بیخبری یا ان کے نتائج سے غفلت کا مظاہرہ ہوگا۔

وفاتِ رسولِ خداؐ کے بعد ہی سے مدینہ پر کچھ ایسے اثرات چھائے ہوئے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر یہ توقعات غلط ثابت ہوتے ہیں۔

آخر یہ مدینہ ہی تو تھا جہاں وفاتِ رسولِ خداؐ کے بعد ہی حضرت فاطمہ زہراؑ پر مصائب کی یورش تھی مگر اہلِ مدینہ کی طرف سے ان کے ساتھ ہمدردی کا کوئی مظاہرہ کہیں تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

پھر وہ مدینہ ہی تھا جہاں حضرت علیؑ نے گوناگوں دلشکن حالات کا پچیس برس تک مقابلہ کیا مگر اہلِ مدینہ نے ان کے ساتھ کسی بھی محبت و غم خواری کا ثبوت نہیں دیا۔

اس کے بعد اسی مدینہ میں وہ موقع آنکھوں کے سامنے آیا کہ حضرت امام حسنؑ کے جنازہ کو روضۂ رسولؐ پر لے جانے میں مزاحمت کی گئی مگر مدینہ کے لوگوں نے ذرہ بھر بھی اس پر احتجاج نہیں کیا۔ کیا یہ واقعہ ایسا اہم نہ تھا کہ مدینہ کے جسم میں اگر روح ہوتی تو اس میں حرکت پیدا ہوتی اور کسی قسم کے احساس کا مظاہرہ کیا جاتا؟

یہ تو کربلا کے پہلے کے کچھ نمونے ہیں اور خود ۶۱ھ میں حیرت انگیز مگر ناقابلِ انکار صورت

سے اہلِ مدینہ کی خاندانِ رسولؐ کے بارے میں بے حسی کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ جب شہید ہو گئے اور آپ کے دردناک مصائب و مظالم کا بتفصیل اہلِ مدینہ کو حال معلوم ہو گیا تب بھی اہلِ مدینہ نے خونِ حسینؑ کے انتقام کے لیے کسی بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا اور باوجودیکہ عراق میں تلاطم ہو رہا تھا حجاز اس بارے میں بالکل خاموش تھا۔

وہ تو امام حسینؑ کی قربانی کا طبعی اثر تھا کہ یزید کی بداعمالیوں پر نگاہیں متوجہ ہو گئیں اور پھر دوسرے سال یزید کے افعال و اعمال کے تفصیلی حالات معلوم ہونے کے بعد انھوں نے اعلانِ مخالفت کر دیا جس کے نتیجہ میں واقعۂ حرّہ ظہور پذیر ہوا جسکی اجمالی تفصیل اپنے محل پر بعد کو آئے گی مگر خود قتلِ حسینؑ کا جرم ان کو اتنا اہم معلوم نہ ہوا کہ وہ اسکی بناء پر یزید کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

پھر اس کے بعد واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں سادات بنی فاطمہ پر بنی امیہ کے آخری دم تک اور پھر بنی عباس کے دورِ حکومت میں کیسے کیسے ہولناک مظالم ہوتے رہے مگر اہلِ مدینہ نے کبھی ان کی کوئی امداد نہیں کی۔ حضرت امام زین العابدینؑ سے لے کر امام علی نقیؑ تک تمام وہ مقدّس ہستیاں جو اپنے وقت میں خاندانِ رسولؐ کی چشم و چراغ اور تعلیماتِ اسلام کی محافظ تھیں اپنے اپنے ابتدائی دورِ حیات میں اسی مدینہ میں مقیم تھیں۔ پھر یہیں کسی کو زہر دیا گیا۔ کسی کو مقید کر کے جلا وطن کیا گیا۔ کسی کو بجبر مدینہ سے بلایا گیا مگر کیا کبھی مدینہ نے ان کی حفاظت کی کوشش تو درکنار اس پر اُف بھی کی؟ کبھی نہیں۔

کیا ان ماقبل اور بعد کے واقعات کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد پھر یہ تصور صحیح ہوگا کہ امام حسینؑ مدینہ میں قیام فرماتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں جان لڑا دیتے؟ ہرگز نہیں۔

عام طور سے اہلِ حجاز کے متعلق دانشمندانِ عرب کی رائے یہی تھی کہ وہ مشکلات میں ثابت قدم بہت کم رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ جب معاویہ نے ابن الکواء سے مختلف عرب ممالک

کے متعلق رائے دریافت کی اور اس میں اہلِ حجاز کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا "فتنہ انگیزی میں سب سے آگے مگر اس کے نتائج کے برداشت کرنے میں بہت کمزور اور مہمات کے سر کرنے میں ناکارہ"[1]

اس صورت میں حالات اور بعد کے واقعات بتلاتے ہیں کہ اگر امام حسینؑ عاقبت اندیشی کرکے مدینۂ رسولؐ کو خالی نہ کر دیتے تو مروان جس نے ولید کو قتل حسینؑ کا مشورہ دیا تھا اور ولید کے اس مشورہ پر عمل نہ کرنے سے سخت برہم ہوا تھا وہی ولید کے ملائم طرزِ عمل کی اطلاع یزید کو دیتا اور اس وقت یزید کا عتاب نامہ ولید کے پاس آتا تو یا تو خود ولید ہی کو پھر عمر سعد کی طرح باوجود اپنے ضمیر کی مخالفت کے مال و جاہِ دنیا کی طمع اور سطوتِ حکومت کے خوف سے حسینؑ کے خلاف اقدام کرنا پڑتا یا کوفہ کے نعمان بن بشیر کی طرح اسکو معزول کرکے مروان بن الحکم یا اسی کے مثل کسی دوسرے سفاک اور سخت ترین دشمنِ اہلِ بیت کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا جاتا اور فرزندِ رسولؐ کے خون سے مدینۂ رسولؐ کی زمین کو گلرنگ بنا دیا جاتا۔

یہ خطرہ بالکل یقینی تھا اور اس نے فعلی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس خط سے جو ولید نے یزید کے نام لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "خلیفۃ المسلمین یزید کی خدمت میں ولید بن عتبہ کی جانب سے گزارش ہے کہ حسینؑ بن علیؑ آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ آپ کی بیعت پر تیار ہیں۔ اب آپ کی جو رائے ہو۔" اس کے جواب میں یزید نے لکھا کہ "اس میرے خط کی تعمیل جلد کرنا کہ تمام ان ممتاز افراد کی جنھوں نے میری بیعت کر لی ہے اور جنھوں نے بیعت نہیں کی ہے مکمل فہرست جلد بھیجو۔ لیکن اس جواب کے ساتھ حسینؑ بن علیؑ کا سر موجود ہو۔" اس حکم کی گرمی کے مقابلہ میں ولید کہاں ٹھہر سکتا تھا؟ وہ تو اتفاق سے اس خط کے آنے سے پہلے ہی حضرت حسینؑ مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے اس لیے ولید تعمیل حکم سے مجبور رہا۔ مگر اس کے بعد بھی ولید معتوب ہونے سے نہیں بچا اور ماہ رمضان میں اسے معزول کرکے عمر بن سعید ہی کو جو ابھی تک حاکمِ مکہ تھا مدینہ کا بھی حاکم مقرر کر دیا گیا۔[2]

---

[1] کتاب البلدان، ص ۱۲۵ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۱ و ۱۲۶

پھر اگر حضرت امام حسینؑ مدینہ میں شہید ہوتے تو کیا آپ کی شہادت اسی نمایاں حیثیت کے ساتھ ہوتی جس طرح کہ بلا جا کر ہوئی ؟ سیاستِ حکومت کا یہ تقاضا ہرگز نہ ہوتا بلکہ اسے طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے۔ یا تو امام حسنؑ کی شہادت کی طرح کوئی "جعدہ بنت اشعث" فراہم کی جاتی یا حضرت علیؑ کی طرح کوئی "ابن ملجم" کی طرح کا خارجی جس کے بعد بھی حکومتِ دمشق کا دامن اس الزام سے بری ہی ثابت کیا جاتا۔ اس صورت میں حسینؑ واقعی قتل ہوتے یعنی وہ دنیا سے جاتے بھی اور سلطنت دمشق کے چہرہ پر اسلام و انسانیت کی نقاب پھر بھی پڑی رہتی۔

حضرت امام حسینؑ اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ تدبر کا اقتضاء تھا کہ مدینہ میں قیام اسی وقت کیا جاتا جب مدینہ میں قیام ممکن ہو اور جب بیعت نہیں کرنا تھی تو اپنے اصول، اپنے مقصد اور اپنی قربانی کو اسی افق پر لے جا کر پیش کرنا چاہیے تھا جس پر آپ کربلا کے میدان میں انھیں لے جا سکے۔ بے شک یہ سفر کوئی معمولی سفر نہ تھا۔ وہ کربلا کی منزل کا پہلا مرحلہ یا آخرتؐ کے سفر کا پہلا قدم تھا اس لیے یہ رات حضرت امام حسینؑ نے پوری جاگ کر بسر کی اور اسے اپنے نانا (حضرت رسولِ خدام) ماں (حضرت فاطمہ زہراؑ) اور بھائی (حسن مجتبیٰؑ) کے مقدس مزارات سے رخصت ہونے میں صرف کیا۔

رات ختم نہ ہوئی تھی کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ مدینہ کی صبح آج بے رونق تھی۔ اس لیے کہ حقیقی آفتاب اس کا آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور رسولؐ کی قبر بے چراغ تھی۔ اس لیے کہ رسولؐ کا نور دیدہ آج صحرائے غربت میں گامزن تھا۔

۲۸ھ ماہ رجب کی اٹھائیس تاریخ اتوار کی رات تھی جب امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہوئے[1]۔ اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی[2] فخرج منها خائفا یترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین[3] اس آیت میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے اس وقت کا جب وہ فرعون کے ظلم و تشدد سے بیزار ہو کر مصر سے باہر نکلے ہیں۔ روانگی کے بعد امام حسینؑ شاہراہِ عام سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حالانکہ ابن زبیر اس کے پہلے شاہراہِ عام

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۹ و ۲۱۵ - ارشاد ص ۲۰۷ [2] طبری ج ۶ ص ۲۱۹ [3] قرآن مجید سورہ قصص آیت ۲۱

کو چھوڑ کر غیر معروف راستوں سے مکّہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ یہی مشورہ آپ کو بھی دیا گیا مگر آپ اپنی مدینہ سے روانگی کو فرار کی حیثیت دینے پر تیار نہیں تھے۔ آپ نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نہیں، میں تو اسی راستے سے جاؤں گا۔ پھر خدا کو جو منظور ہو[1]

آپ نے اپنے دادا ابوطالب کی تمام اولاد کو اپنے ساتھ لیا جن میں آپ کی دو بہنیں حضرت زینب اور ام کلثوم بھی تھیں۔ اس کے علاوہ سب بھائی بھتیجے اور متعلقین آپ کے ساتھ تھے۔ سوا محمد بن الحنفیہ کے[2] جو کسی مجبوری یا مصلحت سے مدینہ میں چھوڑ دیے گئے اور ام ہانی بنت ابوطالب پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ جا سکی تھیں۔ بس ان کے علاوہ اولادِ ابوطالب میں سے کوئی بھی حسینؑ سے جدا نہیں ہوا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حسینؑ کے ساتھ بنی ہاشم میں سے سوا اولادِ ابوطالب کے کسی اور سلسلہ کا ایک شخص بھی میدانِ کربلا میں نظر نہیں آتا۔

اس طرزِ عمل سے بھی کہ آپ نے صرف اپنے گھر والوں کو ساتھ لیا صاف نمایاں تھا کہ آپ جنگ کے ارادہ سے روانہ نہیں ہو رہے ہیں۔ مدینہ سے باہر نکلنے کے بعد امام حسینؑ نے مکہ معظمہ کی طرف رخ کیا۔ اس لیے کہ مکہ میں عرب کے قدیم روایات اور نیز اسلام کے مخصوص تعلیمات کی بنا پر کسی جانور تک کا قتل بلکہ گھاس تک کا بھی اکھاڑنا جائز نہیں[3] امام حسینؑ نے یہاں پہنچ کر اپنے کو ظاہری طور سے ایک محفوظ آغوش کی پناہ میں ڈال دیا اور یہاں رہ کر آپ خاموشی کی زندگی گزارنے لگے۔ نہ امورِ سلطنت سے غرض اور نہ مہماتِ ملکی سے کوئی تعلق۔ آپ نے مکہ پہنچ کر بھی نہ کہیں خطوط و رسائل روانہ کیے اور نہ مختلف اطراف و جوانب کے لوگوں کو اپنی نصرت کی طرف دعوت دی۔ یہ بھی آپ کے مقصد کے تعیّن کے لیے آپ کے کردار کا ایک اہم جزء ہے۔

آپ کا مکّہ میں ورود شب جمعہ ۳ شعبان سنہ ۶۰ھ کو ہوا[4] اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی[5] ولما توجہ تلقاء مدین قال عسیٰ ربی ان یھدینی سواء السبیل[6] یہ بھی حضرت موسیٰ کے واقعہ سے متعلق ہے جب انھوں نے مدین میں پناہ لی تھی۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۶ [2] الاخبار الطوال ص ۲۲۳، طبری ج ۶ ص ۱۹ [3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۰ صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۳۸ و ۴۳۹ [4] طبری ج ۶ ص ۲۱۵، ارشاد ص ۲۰۸ [5] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ [6] قرآن مجید سورۂ قصص آیۃ ۲۲

آپ نے مکہ میں پہنچ کر شعبِ علیؑ میں قیام کیا۔ عبداللہ بن زبیر آپ سے دو ایک دن پہلے پہنچ چکے تھے۔ ان کے مکہ میں اچانک پہنچنے کے ساتھ لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے اور انھیں ایک مرکزیت سی حاصل ہو گئی تھی لیکن حضرت امام حسینؑ کے مکہ میں پہنچنے کے ساتھ لوگوں نے عبداللہ بن زبیر کو چھوڑ دیا اور اب وہ حضرت امام حسینؑ کے گرد و پیش رہنے لگے۔ اس بات سے عبداللہ بن زبیر کو یک گونہ ناگواری پیدا ہوئی اور انھیں اندازہ ہو گیا کہ حسینؑ کی موجودگی میں ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہو سکتا۔ مصلحتِ وقت کی بنا پر وہ بھی صبح و شام دونوں وقت امام حسینؑ کے پاس آنے جانے لگے [1]

جب معاویہ کی وفات ہوئی ہے تو مدینہ میں ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کی حکومت تھی اور مکہ میں یحییٰ بن حکیم بن صفوان بن امیہ اور کوفہ میں نعمان بن بشیر انصاری اور بصرہ میں عبیداللہ بن زیاد گورنر تھا [2]

معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ دمشق کو یحییٰ بن حکیم پر اطمینان نہ تھا چنانچہ حضرت امام حسینؑ کے مکہ میں پہنچنے کے بعد یحییٰ بن حکیم کو معزول کیا گیا اور عمرو بن سعید بن عاص بن امیہ کو گورنر مقرر کیا گیا [3] پھر جب ولید کے طرزِ عمل کی اطلاع اور شاید مروان کی طرف سے رپورٹ یزید کو پہنچی تو ولید کی بجائے بھی اسی عمرو بن سعید کو مقرر کیا گیا مگر یہ بعد کی بات ہے۔ بعد میں یہ بھی ظاہر ہو گا کہ کوفہ کے گورنر کی پالیسی بھی حکومتِ دمشق کو ناگوار ثابت ہوئی اور وہاں بھی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امام حسینؑ کے معاملہ میں یزید کا طرزِ عمل اتنا غیر منصفانہ اور جارحانہ تھا کہ اسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آدمی نہ ملتے تھے۔ اور خود اس کے گورنر اس کے احکام کی تعمیل اس کی خواہش کے مطابق نہ کر سکتے تھے۔ صورتِ حال سے ظاہر ہے کہ عمالِ حکومت میں سے جو بھی حسینؑ کے ساتھ ذرا مراعات برتنے کا رجحان ظاہر کرتا تھا وہ فوراً ہٹا دیا جاتا تھا۔ تلاش تھی ایسے لوگوں کی جو اہلِ بیتِ رسولؐ کے ساتھ کسی مراعات کی جگہ اپنے دل میں نہ رکھتے ہوں۔

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۰ [2] [3] الاخبار الطوال ص ۲۳۱

اس کے بعد بھی کیا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جو کچھ بھی تشدد ہوا اس کی ذمہ داری یزید پر نہیں بلکہ عمالِ حکومت پر تھی ؟

اس وقت امام حسینؑ کا مکہ معظمہ میں قیام ایک پناہ گزین کی حیثیت سے تھا اور یہی مشورہ تھا جو آپ کو مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے بھائی محمد حنفیہ نے دیا تھا جسے آپ نے پسند کیا تھا۔ مکہ میں حالات کے ناسازگار ہونے کی صورت میں کیا ہوگا ؟ اس کے متعلق محمد بن حنفیہ کی رائے یہ تھی کہ اگر وہاں حالات آپ کے موافق نہ ہوں تو آپ نکل جائیے گا، ریگستانی صحراؤں میں اور پہاڑوں کے دامنوں میں، اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہیے گا، یہاں تک کہ لوگوں کے حالات کا آخری نتیجہ سامنے آئے اور اس وقت کوئی قطعی رائے قائم کیجیے [1]

آپ کا قیام مکہ میں ظاہری طور پر مستقل حیثیت رکھتا تھا اور کوئی خاص مقصد آپ کے پیش نظر نہیں تھا۔ سوا ایک پُرامن زندگی کے جسے "جیو اور جینے دو" ہی کے لفظوں میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں آپ نے نہ تو اپنی موافقت میں کوئی عسکری طاقت فراہم کی، اور نہ جمہور کو یزید کے خلاف مشتعل کیا۔ تقریر اور تحریر کسی حیثیت سے بھی ایسی کوئی کوشش ثابت نہیں کی جا سکتی۔

---

[1] ارشاد ص ۲۰۷-۲۰۸، طبری ج ۶ ص ۱۶۱

اٹھارواں باب

دعوت اہل کوفہ اور سفارت مسلم بن عقیل

کوفہ کی داغ بیل فرات اور حیرہ کے بیچ میں اسوقت ہوئی جب ۱۴ھ سے ۱۶ھ تک قادسیہ اور دوسرے محاذوں پر ایرانیوں کے مقابلہ میں فتوحات کے بعد[۱] مسلمانوں کی فوج نے عراق میں سکونت اختیار کی اور مدائن کی آب وہوا ان کو راس نہ آئی اور سعد بن ابی وقاص کی ہدایت کے ماتحت یہ جگہ تلاش کی گئی اور یہاں مسجد اور مسلمانوں کے قیام کے لیے مکانات کی بنیاد ڈالی گئی[۲]

۱۷ھ میں سعد بن ابی وقاص اپنی فوج کے ساتھ مدائن سے منتقل ہوئے اور اس جگہ آکر مقیم ہوئے۔ کوفہ، عربی زبان میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سنگریزے اور ریگ مخلوط ہوں۔ چونکہ یہ جگہ اسی قسم کی تھی اس لیے اس کا نام کوفہ ہوا[۳]

دوسری طرف سمندر کے کنارے اس زمین پر جو "ارض الہند" کہلاتی تھی ایک دوسرے شہر کی بناء قائم کی گئی جس کا نام بصرہ ہوا اور اس طرح عراق کے ان دونوں شہروں کوفہ اور بصرہ کی آبادی بالکل ایک ساتھ شروع ہوئی[۴]

ابتداءً سلیٹوں کے مکان بنائے گئے اور چھپر ڈالے گئے۔ پھر اسی سال دونوں جگہ آتش زدگی واقع ہوئی۔ جس میں یہ مکانات جل گئے تو اینٹوں کے مکانات کی تعمیر ہوئی[۵]

کوفہ کی آبادی اسی وقت سے کہ جب وہ آباد کیا گیا ایک لاکھ فوجیوں کی تھی[۶]

---

۱ طبری ج ۴ ص ۱۴۸ — ۲ طبری ج ۴ ص ۱۴۲

۳ طبری ج ۴ ص ۱۸۹ — ۴ طبری ج ۴ ص ۱۴۹

۵ طبری ج ۴ ص ۱۹۱ — ۶ طبری ج ۴ ص ۲۶۲

جب جناب امیرؑ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے اور طلحہ و زبیر نے عائشہ کو ساتھ لے کر آپ کے خلاف فوج کشی کی تو انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز عراق کو قرار دیا اس لیے حضرت امیرؑ کو انکے تدارک کے لیے عراق آنا پڑا اور جنگِ جمل واقع ہوئی۔ اس مقابلہ میں بصرہ والوں نے طلحہ اور زبیر کا ساتھ دیا تھا اور کوفہ کے لوگ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد حضرت علیؑ نے اسی کو اپنا پایۂ تخت رکھا۔

بارہ رجب ۳۶ھ کو پہلا وہ دن تھا جب آپ کوفہ میں تشریف لائے۔ لوگوں نے کہا کہ قصر میں قیام فرمائیے جہاں اب تک حاکم قیام کیا کرتے تھے۔ آپ نے اسے ناپسند کیا اور مقام رحبہ کے ایک مکان میں سکونت اختیار فرمائی[1]

اس کے بعد زیادہ تر اہلِ کوفہ ہی تھے جنھوں نے آپ کے ساتھ صفین اور نہروان میں بھی مخالفین کا مقابلہ کیا۔ اسی لیے وہ "شیعۂ علیؑ" کہلائے۔ حالانکہ مذہبی طور پر ان میں سے اکثر اس معنی میں شیعہ نہ تھے کہ وہ حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کو خلیفۂ بلافصل جانتے ہوں اور آپ کے قبل دوسرے خلفاء کو تسلیم نہ کرتے ہوں۔ مگر "شیعۂ بنی امیہ" کے مقابلہ میں وہ اپنے کو "شیعۂ علیؑ" کہنا فخر سمجھتے تھے۔

یہ وہ وقت تھا کہ کوفہ ایسے شیعانِ اہل بیتؑ سے چھلک رہا تھا لیکن ادھر معاویہ کا ممالکِ اسلامیہ پر تسلط ہوا اور کوفہ پر زیاد بن ابیہ کی حکومت ہوئی ادھر اہلِ کوفہ پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور عراق کی زمین ان کے لیے تنگ ہو گئی۔ جو لوگ محبِ علیؑ سمجھے جا سکتے تھے ان کا ہر نفس آئندہ آنے والے خطرات کی پیشین گوئی کرتا اور ہر دقیقہ و ثانیہ اپنے آخری ہونے کا پیغام دیتا تھا۔

یہ صورتِ حال دو ایک ماہ، دو ایک سال نہیں بلکہ بیس سال تک قائم رہی۔ اس صورت میں ناممکن تھا کہ کوفہ کے اندر شیعۂ علیؑ کے لیے کوئی نمایاں حیثیت حاصل رہتی بلکہ مارے جانے، سولی پانے اور جلا وطن ہونے کے بعد جو بچے کھچے تھوڑے سے اشخاص موجود تھے وہ گوشوں

---

[1] الاخبار الطوال، ص ۱۴۴

کے اندر اور پردوں کے پیچھے زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور دوستیٔ اہل بیتؑ کا نام بھی زبان پر لانا ان کے استحقاق قتل کی دستاویز خیال کیا جاتا تھا اور اس شکنجہ کے اندر شیعیت ایک مخصوص قلیل التعداد جماعت میں مخفی حیثیت سے مقید تھی اور وہ جماعت عراق و حجاز وغیرہ کے مختلف شہروں میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ رؤسائے عشائر اور شیوخ قبائل ذمہ دار و با اعتبار اشخاص سب حکومت وقت کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ رہ گئی عام خلقت جس پر انقلابات کا دار و مدار ہوتا ہے وہ بلا استثنا، ہر ملک میں "ہر کسے سکہ زند خطبہ بنامش خوانند" کے مطابق ہوا کے رخ پر اڑنے والی اور زمانہ کے غیر معمولی حوادث سے تیزی کے ساتھ رنگ بدلنے والی ہوا کرتی ہے۔ ان میں ایک ایسا اچانک واقعہ جس میں جوش پیدا کرنے کی صلاحیت ہو وہ انقلاب پیدا کر سکتا ہے جو برسوں کی دعوت و تبلیغ پیدا نہیں کرتی اس کے نمونے حکومتوں کے تغیر و تبدل اور سلاطین کے عزل و نصب کی صورت میں ہمیشہ نظر سے گزرتے رہتے ہیں اور وہ اکثر اسی قسم کی ناگہانی صورتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

بے شک بیس سال تک صورت حال ایک طرح رہنے کا سبب یہ تھا کہ اس مدت میں کوئی تازہ حادثہ رونما نہیں ہوا جو رجحانات طبعی سے ٹکرا کر ان کو سیلاب کی طرح کسی خاص طرف متوجہ کر سکے۔

سنہ ۶۰ھ کے رجب کا مہینہ تھا جب معاویہ نے انتقال کیا اور ان کا نامزد کردہ جانشین انکا بیٹا یزید ہوا۔ ایسے ہی مواقع وہ ہوتے ہیں جو پرسکون فضا میں موج اور مطمئن سطح میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں۔ فطرتاً ہر شخص سابق فرمانروا کے بعد اپنے جدید دائی سلطنت اور قسمت کے مالک کی سابقہ زندگی اور اس کے اخلاق و عادات اور ذاتی خصوصیات کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے اور بیک وقت مختلف حلقوں میں یہی چرچے شروع ہو جاتے ہیں۔

یزید کے اخلاق و عادات، اسکی مے نوشی اور شہوت رانی، اس کی طفلانہ جوانی اور

لہو ولعب میں سرگرمی، احکام شرعیہ سے آزادی اور نفسانی خواہشوں کی پرستاری ایسی نہ تھی جو مخفی حیثیت رکھتی ہو۔

جاننے والوں کو یاد آگیا اور انجام کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا اور نہ جاننے والوں کو پوچھ گچھ میں معلوم ہوگیا کہ ہمارا ہونے والا خلیفہ و مالک سلطنت ان صفات و عادات کا شخص ہے

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بلاتخصیص فرقہ و مذہب ایک عام بے چینی، اضطراب اور نفرت و بیزاری خلق خدا میں پھیل گئی اور اسی کے ساتھ آنکھیں گردش کرنے لگیں کہ کون ہے جو اس سخت وقت پر کام آئے اور وقت کی ذمہ داریوں کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر ملت اسلامیہ کو اس بدکردار خلیفہ سے چھٹکارا دلائے۔

اسی کے ساتھ یہ خبریں بھی مشتہر ہوئیں کہ حسینؓ بن علیؓ نے یزید کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور وہ اسی لیے مدینہ سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ آگئے ہیں اور یہ طے کرلیا ہے کہ جو کچھ بھی ہو یزید کی بیعت نہ کریں گے۔ اس وقت دوستان علیؓ کی اس قلیل جماعت کو جو بیس برس کی طویل مدت تک طرح طرح کے صبر آزما مصائب برداشت کرتے کرتے عاجز آچکی تھی اور ہر آن حضرت احدیت کی جانب سے کشائش کی منتظر تھی اپنی مایوسیوں کی مدت سے چھائی ہوئی تاریک گھٹا میں امید کی شعاعیں نظر آنے لگیں اور ان کے ضمیر نے آواز دی کہ اس موقع سے بہتر کوئی موقع نہ ملے گا اور اس وقت کا سکوت خودکشی کا مرادف ہوگا۔

یہ سوچ کر وہ سب سلیمان بن صرد صحابیٔ رسولؐ کے گھر میں مجتمع ہوئے۔ سن رسیدہ اور تجربہ کار سلیمان نے جو پیغمبر خداؐ کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور حضرت علیؓ بن ابی طالبؑ کے ساتھ معرکے جھیلے ہوئے تھے مجمع کو ان الفاظ سے مخاطب کیا:۔

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ معاویہ کا انتقال ہوا اور امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے اور وہ مکہ معظمہ چلے گئے ہیں۔ آپ لوگ اُن کے اور

ان کے پدر بزرگوار کے شیعہ ہیں۔ اگر آپ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ ان کی نصرت و مدد میں اور ان کے دشمنوں سے جنگ میں کوتاہی نہ ہوگی تو بسم اللہ، ان کو خط لکھیے اور اگر سستی و کمزوری کا اندیشہ ہو تو برائے خدا ایک شخص کو فریب دے کر اس کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے۔" [1]

الفاظ سے ظاہر ہے کہ سلیمان ایک مقرر کی طرح گرجتے برستے الفاظ سے وقتی جوش کو ابھار کر اپنے مقصد کو حاصل کرنا نہیں چاہ رہے ہیں بلکہ وہ خود مجمع سے اس کے موجودہ جوش و ولولہ کی آخری تھاہ اور موقع اقدام پر اس کی انتہائی کارفرمائی کا جائزہ لوانا اور اسی کے ساتھ ان کو موقع کی نزاکت اور آئندہ کے خطرات کا اندازہ کرا دینا چاہتے ہیں مگر یہ امر فطری ہے کہ جذبات کی طغیانی میں انسان کو اپنی طاقت کا اندازہ مشکل سے ہوتا ہے اور وہ اکثر عواقب کی فکر اور سخت مواقع پر اپنے ثبات و استقلال کی تشخیص میں غلطی کر جاتا ہے۔ مجمع کے اندر ان کے بڑھتے ہوئے جوش میں سلیمان کے الفاظ نے وہ کام کیا جو پانی کا چھینٹا بھڑکتے ہوئے آگ کے شعلوں میں۔ ایک مرتبہ سب بول اٹھے، نہیں، نہیں، ہم یقیناً ان کے دشمنوں سے جنگ کرینگے اور اپنے کو حضرتؑ کے قدموں پر نثار کر دینگے۔ [2]

یہ جمعیت کتنی تھی؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی میدان یا عالی شان قصر کے وسیع صحن میں نہیں بلکہ عربی ساخت کے مختصر مکانات میں سے جن کے نمونے آج تک عربستان میں نظر آتے ہیں ایک مکان یعنی سلیمان بن صرد کے گھر میں مجتمع ہو گئی تھی۔ پھر ان میں بھی یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سب سچے اور راسخ العقیدہ حضرت علیؑ کو وصیٔ رسولؐ اور امام برحق سمجھنے والے شیعہ ہی تھے۔

مذکورۂ بالا سوال و جواب کے الفاظ میں بے شک سچائی کا جوہر نظر آ رہا ہے اور وہ یقیناً بولنے والوں کے باطنی ضمائر کی مخلصانہ ترجمانی کر رہے ہیں لیکن ان میں سے ہر شخص آنیوالے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۷۔ ارشاد ص ۲۰۸ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۷

ناگہانی انقلابات کا کہاں تک مقابلہ کر سکے گا؟ اس کا فیصلہ مستقبل ہی کے ہاتھ ہے۔

سلیمان بن صرد کی حجت تمام ہو چکی تھی چنانچہ خط امام حسینؑ کے نام بایں عنوان لکھا گیا:۔

"یہ خط ہے حسینؑ بن علیؑ کی طرف سلیمان بن صرد، مسیب بن نجبہ، رفاعہ بن شداد، حبیب بن مظاہر اور دیگر دوستوں کی طرف سے مومنین و مسلمین اہل کوفہ میں سے" اس کے بعد معاویہ کے انتقال اور یزید کی ولیعہدی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ پھر لکھا تھا کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں ہے۔ لہٰذا آپ تشریف لائیے۔ شاید آپ کی وجہ سے ہم حق کی نصرت پر یکدل ہو سکیں۔ اور دمشق کا گورنر نعمان بن بشیر دار الامارہ میں موجود ہے مگر ہم اس کے ساتھ نماز جمعہ میں شریک نہیں ہوتے۔ نہ عیدگاہ جاتے ہیں۔ اگر ہم کو خبر معلوم ہو جائے گی کہ آپ تشریف لا رہے ہیں تو ہم اس کو یہاں سے نکال کر شام جانے پر مجبور کر دیں گے۔ والسلام

اس خط کو عبداللہ بن سبیع ہمدانی اور عبداللہ بن وال کے ہاتھ روانہ کیا گیا اور یہ سب سے پہلا خط تھا جو امام حسینؑ کو مکہ معظمہ میں دسویں ماہ رمضان کو ملا۔ جمعیت منتشر ہوئی اور اب ان میں سے ہر ایک نے اپنے حلقۂ اثر میں اس تحریک کو پھیلانا شروع کیا اور دو ہی دن کے عرصہ میں ۵۳ عرضداشتیں تیار ہو گئیں جو ایک دو تین چار آدمیوں کے دستخط سے تھیں اور یہ سب خطوط قیس بن مسہر صیداوی اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحبی اور عمارہ بن عبید سلولی کے ہاتھ روانہ کیے گئے[۲] اسی اضطراب اور روحانی تلاطم کے سبب سے جو یزید کی خلافت کے باعث عام طور پر پیدا ہوا تھا اور جس میں کسی مذہب و مسلک کا افتراق نہ تھا۔ ان حضرات کی مذکورۂ بالا تجویز کا ہر طرف سے خیر مقدم کیا گیا اور وہ لوگ جو شیعیت کا جذبہ نہ رکھتے تھے وہ بھی خاص حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کسی عقیدت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ یزید ایسے شرابخوار و فاسق سے آپ یقیناً بہتر ہیں۔ اس تجویز کے گرمجوشی سے مؤید نظر آنے لگے جس کو دیکھ کر ان افراد کو جو حقیقتاً اس تجویز کے محرک تھے یہ یقین پیدا ہو گیا

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۱۹۷۔ ارشاد ص ۲۰۹ [۲] طبری ج ۶ ص ۱۹۷

کہ رائے عامہ ہمارے ساتھ ہے لیکن یہ فریب نظر تھا۔ عام خلقت اس تحریک سے ہمدردی میں ویسی ہی تھی جیسے آندھی کے رخ پر اڑتے ہوئے پرند۔ اس غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہوا کہ یا تو پہلے خط کے یہ الفاظ کہ "شاید خدا آپ کے ذریعہ سے ہماری شیرازہ بندی کرے" بیم و رجا کا اظہار کر رہے تھے۔ یا اب دو ہی روز کے بعد جو خط لکھا گیا اس میں پُر زور الفاظ صرف کیے جانے لگے کہ "تشریف لائیے جلد، اس لیے کہ لوگ آپ کے منتظر ہیں اور آپ کے سوا کسی کی امامت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں لہٰذا جلدی کیجیے، جلدی، والسلام"۔ اس خط کو ہانی بن ہانی سبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی کے ذریعہ روانہ کیا گیا۔[1]

رائے عامہ کی قوت اور ہوا کے موجودہ رُخ کا اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ سرداران قبائل جو یزید کے خاص آدمی تھے اور جنھیں اس تحریک کے محرکین نے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا انھوں نے بھی سیاست کا تقاضا یہی سمجھا کہ اس آواز میں آواز ملا دیں چنانچہ ان اجتماعی کارروائیوں سے علیحدہ اور اس خط کے بعد جو اپنے مضمون کے اعتبار سے بالکل آخری کہا جا سکتا ہے۔ ایک خط کوفہ سے اور لکھا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"کھیتیاں لہلہا رہی ہیں، میوے درختوں میں رسیدہ ہیں اور نالاب لبریز۔ پس جب آپ چاہیں تشریف لائیں۔ ایک ایسے لشکر کی جانب جو آپ کی امداد کے لیے بالکل آراستہ موجود ہے۔ والسلام"۔

اس پر مندرجہ ذیل سات آدمیوں کے دستخط تھے۔ شبث بن ربعی، حجار بن ابجر، یزید بن حارث، یزید بن رویم، عزرہ بن قیس، عمرو بن الحجاج زبیدی، محمد بن عمیر تمیمی۔[2]

یہ خط لب و لہجہ کے اعتبار سے گزشتہ خطوط سے بالکل مختلف تھا۔ ان میں اپنی دوستی و اخلاص کے اظہارات تھے اور ہدایت کی خواہش تھی۔ یہاں مادی طاقت کی پیشکش اور منافع دنیا کی نمائش تھی جو ایک طرف لکھنے والوں کی مادی ذہنیت کی ترجمان اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۷ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۷۔ ارشاد ص ۲۱۰

دوسری طرف مکتوب الیہ کے مذاقِ طبیعت سے اجنبیت اور ناشناسی کی دلیل ہے۔ چنانچہ اس آخری خط کے لکھنے والے تقریباً سب کے سب واقعۂ کربلا میں حضرت امام حسینؑ سے لڑنے کے لیے موجود تھے۔ ممکن ہے کہ اس خط کے لکھنے میں کوئی خاص سازش مضمر ہو اور اگر ایسا نہیں تو اس سے اس موقع کی رائے عامہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو بھی یہ ضرورت پڑ گئی تھی کہ ہم بھی اس تحریک میں شامل ہو کر آئندہ کے لیے اپنے مستقبل کو محفوظ بنالیں۔ دینوری کا بیان ہے کہ یہ سب قاصد اور ان کے ساتھ کے خطوط تابڑ توڑ دو دن کے اندر امام حسینؑ کو پہنچے اور اس کے بعد چند دن میں تو خطوط کی تعداد اتنی ہوگئی کہ ان سے دو خرجیاں بھر گئیں۔[1]

گزشتہ تقریر سلیمان بن صرد کی اور اس کے بعد کے واقعات ان سب کے مطالعہ سے حسب ذیل نتائج صاف طور پر برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ امام حسینؑ کی بیعتِ یزید سے کنارہ کشی اور مدینہ سے روانگی کسی خارجی تحریک اور اہلِ کوفہ کے ساتھ کسی متقدمہ گفت و شنید کا نتیجہ نہ تھی۔

۲۔ حضرت کو مدینہ سے روانگی کے موقع پر ظاہری اسباب کی بنا پر یہ خیال بھی نہ تھا کہ آپ کوفہ تشریف لے جائیں گے۔

۳۔ آپ نے مکہ پہنچنے کے بعد بھی خود اپنی جانب سے کسی قسم کی تحریک اہلِ کوفہ سے نہیں کی اور نہ وہاں اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لیے کوئی خط بھیجا۔

مگر اب جبکہ کوفہ سے خود یہ آوازیں بلند ہیں کہ آپ ہمارے یہاں آئیے۔ ہم آپ کی نصرت و مدد کے لیے تیار ہیں۔ ہم آپ کو امام جانتے ہیں اور آپ سے ہدایت کے طالب ہیں۔ یہ دو یک آوازیں نہیں بلکہ کوفہ بھر یہی چلا رہا ہے۔ چاہے وہ دوست ہوں یا دشمن۔

یہاں تک کہ دو خرجیاں خطوط سے بھر گئیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اب موقع کی حالت کا تقاضا کیا ہے؟ حضرت امام حسینؑ کو ان خطوط کے بعد کیا کرنا چاہیے؟

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۱

صورتِ حال یہ ہے کہ آپ یزید سے بیعت جیسا کہ اب تک نہیں کی آئندہ بھی کرنا نہیں چاہتے مدینہ میں قیام یزید کے اس تہدیدی حکم کی بنا، پر کہ آپ سے بیعت لی جائے یا قتل کر دیے جائیں، ناممکن ہو چکا ہے۔ مکہ معظمہ میں قیام وقتی حیثیت سے امن کا ذریعہ سہی لیکن تا کے؟ جبکہ یزید کے اخلاق و عادات اور احکام مذہبی کے مقابلہ میں خود سری سے یہ توقع بعید تھی کہ وہ مکہ معظمہ کے مذہبی احترام کا لحاظ کرے گا بلکہ یہ خطرہ بہت قریب تھا کہ مکہ میں آپ کا قیام اس کا باعث ہوگا کہ وہیں مکہ میں آپ کے خلاف فوج کشی ہو اور مکہ میں نہ تو کوئی فوجی طاقت ایسی ہے جو آپ کی حفاظت کر سکے اور نہ آپ مکہ میں قیام کر کے حرمِ خدا کے اندر خونریزی ہونے کے خود باعث بننا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ باوجودیکہ رسولؐ کے نواسے کی مہاجرت مدینہ سے مشہور ہو چکی ہے مگر طائف ہو یا یمن، بصرہ ہو یا یمامہ کہیں سے کوئی آواز ایسی بلند نہیں ہوتی کہ ہم آپ کی مدد کے لیے حاضر ہیں اور آپ کی حفاظت کے لیے آمادہ۔

ایسے سخت اور نازک موقع پر عرب کے آبادترین خطۂ ملک (عراق) اور اس کے بھی اہم مرکز (کوفہ) سے یہ تحریک ہوتی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائیں، ہم آپ کی حفاظت و حمایت کے لیے ہر طرح تیار ہیں اور صرف معمولی سی تحریک نہیں بلکہ پچیس عرضداشتیں اور دو خورجین بھر کے خطوط اور سات قاصد یکے بعد دیگرے روانہ کیے جاتے ہیں اور لکھنے والوں میں بہت سے ایسے اشخاص بھی ہیں جن کی محبت پر آپ کو بھروسا ہے۔ جیسے حبیب بن مظاہر، سلیمان بن صرد، رفاعہ بن شداد وغیرہ۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کو کیا کرنا چاہیے تھا۔ کیا آپ کے لیے مناسب تھا کہ اس دعوت کو مسترد کر دیتے؟

حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ کے قیام کی صورت میں بھی حضرت کا شہید ہونا یقینی تھا یعنی جیسے عبداللہ بن زبیر پر اسی مکہ میں فوج کشی ہوئی اور وہیں قتل کیے گئے، اسی طرح آپ پر بھی فوج کشی ہوتی اور یہیں محصور ہو کر آپ کو شہید ہونا پڑتا۔ اس صورت میں جبکہ اہلِ کوفہ کی جانب

سے اتنے اصرار و تاکید کے ساتھ آپ کو دعوت دی جا رہی تھی اور آپ کی نصرت کا وعدہ کیا جا رہا تھا، آپ اس دعوت کو ٹھکرا کر مکّہ میں قیام کرتے اور شہید کیے جاتے تو یہی لوگ جو آپ پر اب اعتراض کرتے ہیں کہ آپ کوفہ کیوں گئے؟ یہی کہنے اٹھ کھڑے ہوتے کہ یہ کون سی عقل مندی تھی کہ ایک اتنے بڑے خطہ کی دعوت اور وعدۂ نصرت کو رد کر دیا جہاں کے لوگ آپ کے والد بزرگوار کی بھی نصرت کر چکے تھے اور خود آپ کی بھی محبت کا دم بھرتے تھے۔

اس وقت بچان و دل آپ کی حمایت کا وعدہ کر رہے تھے اور سینکڑوں عرضداشتیں بھیج کر آپ سے قیادت و ہدایت کے طالب تھے۔ ایسے نادر موقع کو ہاتھ سے دیکر مکّہ میں قیام رکھا جہاں کی زمین بے آب و گیاہ، جہاں کے رہنے والے پست حوصلہ و بے امنگ اور جہاں کی فضا بے مہر و وفا، یہاں تک کہ خود بھی قتل ہوئے اور مکہ معظمہ کی حرمت کو بھی برباد کرایا۔ ان صورتوں میں ظاہر ہے کہ عقل و تدبر کا اقتضاء یہی تھا کہ ان بلانے والوں کی آواز پر لبّیک کہی جائے۔ ان کی نصرت کے وعدوں کو آزمایا جائے اور اگر وہ سچے نہ بھی ثابت ہوں تب بھی ان پر اتمام حجت کیا جائے۔

بے شک تھے ایسے لوگ جو آپ کو عراق جانے سے منع کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ عراق والوں کے وعدہ کا کوئی اعتبار نہیں مگر وہ اس پہلو کو نظر انداز کیے ہوئے تھے کہ مکہ معظمہ میں آپ کا قیام آپ کو قتل سے بچا نہ سکتا تھا بلکہ حقیقتاً اگر موازنہ کیا جاتا تو موجودہ حالات کے لحاظ سے مکہ میں قیام کی صورت میں آپ کا قتل کیا جانا یقینی اور کوفہ کی روانگی کی صورت میں مشکوک تھا اس لیے کہ ظاہری اسباب و علل کے ماتحت اہلِ کوفہ کے مواعید کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت نہیں تھا بلکہ یہ خیال صرف ان کی ذاتی افتادِ طبع کے متعلق ایک غیر متیقّن حکم بلکہ بدگمانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس صورت میں اگر آپ مکہ میں شہید ہو جاتے تو دنیا کے اندر آپ کی شہادت سے کوئی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا لیکن اب جبکہ اہلِ کوفہ کی ان تمام خواہشوں پر لبیک کہتے ہوئے نوعِ انسانی کے اتنے افراد کی درخواستوں کو منظور کرتے ہوئے روانہ ہو رہے ہیں تو اب اگر آپ شہید بھی ہو گئے تو ایک بڑے انسانی فرض کو ادا کرتے ہوئے اور اخلاق و مروّت کی

ایک اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے اور کوفہ کے لوگوں پر حجت بھی تمام فرماتے ہوئے اور حفاظتِ خود اختیاری کے اصول پر بحدِ امکان عمل کرتے ہوئے اور پھر اپنے کو مکہ سے علیحدہ کر کے مکہ کے احترام کو بھی پورے طور سے محفوظ کرتے ہوئے۔

اسی لیے امام نے ان لوگوں کے جواب میں جو آپ کو عراق جانے سے منع کرتے تھے جیسے عبداللہ بن عباس وغیرہ کبھی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے عراق کے لوگوں پر اطمینان ہے اور اگر میں وہاں جاؤں گا تو ضرور وہ میری نصرت کریں گے، ہرگز نہیں، بلکہ آپ نے زیادہ تر اہلِ عراق کے متعلق ان کی بے اطمینانی اور عدم اعتماد کے بارے میں اپنی رائے کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے ارادہ پر مبہم و مجمل طور پر قائم رہنے کا اظہار فرمایا جیسا کہ ابن عباس سے گفتگو کے موقع پر[1] اور کبھی صاف کہہ دیا کہ میں یہاں رہوں گا تو بھی قتل ہوں گا اور خانہ کعبہ کا احترام میرے سبب سے زائل ہوگا جیسا کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن زبیر سے فرمایا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں ایک شخص مینڈھے کی طرح ذبح ہوگا جس سے یہاں کی حرمت زائل ہوگی۔ میں وہ مینڈھا بننا نہیں چاہتا۔[2]

دوسرے موقع پر جب ابن زبیر نے آپ سے چپکے چپکے کان میں کچھ کہا تو ابن زبیر کے جانے کے بعد اپنے کچھ مخصوصین سے فرمایا۔ جانتے ہو ابن زبیر نے کیا کہا؟ ابن زبیر نے کہا کہ آپ مکہ میں قیام فرمائیے اور باہر نہ جائیے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم میں ایک بالشت بھر مکہ کے حدود سے باہر قتل کیا جاؤں، مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ ایک بالشت بھر مکہ کے حدود کے اندر مارا جاؤں۔ اور قسم خدا کی اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں جا کر رہوں تب بھی یہ لوگ مجھ کو وہاں سے باہر لے آئیں گے، یہاں تک کہ جیسا چاہتے ہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔ خدا کی قسم مجھ پر یہ لوگ تعدی کریں گے جیسے یہود نے روزِ شنبہ کے بارے میں ظلم و تعدی سے کام لیا۔[3]

ان حالات میں ظاہری اسباب کی بنا پر آپ کے لیے کوفہ کی طرف تشریف لے جانا ناگزیر

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۳ [2] طبری ج ۶ ص ۲۱۷ [3] طبری ج ۶ ص ۲۱۷

تھا اور آپ کے لیے اہلِ کوفہ کی درخواست کو مسترد کرنا مناسب نہ تھا۔ پھر بھی آپ نے بحسب ظاہر اسباب احتیاطی تدبیر یہ اختیار فرمائی کہ اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے اپنا نمائندہ بنا کر حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے کوفہ جانے پر مامور فرمایا[1] اور اس کے لیے آپ نے ایک خط اہلِ کوفہ کے نام لکھ کر ہانی بن ہانی اور سعید بن عبداللہ کے سپرد کیا جو اہلِ کوفہ کے آخری قاصد تھے اور انھیں حکم دیا کہ وہ جناب مسلم کے آگے روانہ ہوں۔

اس خط کا مطلب یہ تھا کہ ہانی اور سعید تمھارے خطوط لے کر پہنچے اور یہ دونوں شخص تمھارے سب سے آخری قاصد ہیں جو میرے پاس آئے ہیں۔ جو کچھ تم نے لکھا ہے میں نے غور سے پڑھا اور سمجھا۔ تم میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ ہمارے سر پر کوئی امام نہیں۔ آپ آئیے۔ شاید خدا ہم کو آپ کی بدولت حق پر مجتمع کر دے۔ اچھا تو میں تمھاری جانب اپنے بھائی، چچا کے بیٹے اور مخصوص معتمد کو روانہ کرتا ہوں اور انھیں حکم دیتا ہوں کہ وہ مجھکو تمھارے حالات کے متعلق اطلاع دیں۔ اگر انھوں نے اطلاع دی کہ تمھاری جماعت اور اہلِ حل وعقد اس امر پر جسے تم نے اپنے خطوط میں ظاہر کیا ہے متفق ہیں تو میں عنقریب تمھاری طرف آتا ہوں اور واضح رہے کہ امام کے معنی نہیں سوا اس کے جو کتابِ الٰہی پر عامل عدالت کا پابند، حق کا متبع اور اپنی ذات کو خدا کی مرضی پر وقف کیے ہوئے ہو۔ والسلام[2]

اس خط کی عبارت سے ظاہر ہے کہ مسلم بن عقیل کو جنگ پر مامور نہیں کیا گیا تھا اور نہ وہ کوفہ کی تسخیر کی غرض سے بھیجے گئے تھے بلکہ وہ صرف ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ کہ کوفہ کی رائے عامہ اور وہاں کے لوگوں کے حالات وخیالات کا حضرت امام حسینؑ کے متعلق اندازہ کر کے آپ کو اس کی اطلاع دیں۔ جناب مسلم، قیس بن مسہر صیداوی اور عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحبی، اہلِ کوفہ کے نامہ بروں کے ساتھ[3] حکمِ امام کی تعمیل میں مکہ سے روانہ

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۲ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۴۔ الاخبار الطوال ص ۲۲۲ [3] طبری ج ۶ ص ۱۹۷ - ۱۹۸ و ف ۲۱۰-۲۱۱
[4] طبری ج ۶ ص ۲۹۸ ۔

ہوئے اور پہلے مدینۂ رسولؐ گئے۔ وہاں مسجدِ پیغمبرؐ میں نماز پڑھی۔ پھر عزیز و اقارب سے رخصت ہوئے اور قبیلۂ قیس میں سے دو عربوں کو جو راستے سے واقف تھے اپنے ساتھ لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں راستے کے ماہر ہوتے ہوئے جب آپ کو لے کر چلے تو ایک دم راستا بھول گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ ریگستان میں پڑ گئے۔ پیاس کا غلبہ ہوا اور اسی عالم میں ایک ایسے مقام پر پہنچ کر جہاں سے دور مسافروں کے چلنے کی سڑک نظر آ رہی تھی وہ دونوں بالکل بے حال ہو گئے۔ انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے سڑک کا پتہ دیا اور پھر ان میں سے ایک[1] یا دونوں[2] گر کر ہلاک ہو گئے۔ جناب مسلم اور ان کے ساتھیوں کی حالت بھی بہت تباہ ہو چکی تھی۔ مگر یہ ان کی غیر معمولی قوتِ برداشت تھی کہ انھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے کو شاہراہ تک پہنچا دیا اور بطن خبت (وادی) کے ایک چشمہ پر جس کا نام مضیق تھا قیام کر کے وہاں سے امام حسینؑ کی خدمت میں خط بھیجا جس میں آغازِ سفر کے اس حادثہ پر اپنے غیر معمولی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ میرا دل کوفہ کے سفر کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہے مگر دوبارہ امام کے تاکیدی حکم نے مجبور کر دیا اور وہ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔[3] کوفہ پہنچ کر حکم امام کے مطابق جناب مسلم نے امن پسندی سے کام لیا۔ حاکم دارالامارہ میں موجود تھا مگر مسلم نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا جسے شورش انگیزی منظور ہوتو اس کا پہلا کام یہ ہوتا کہ دارالامارہ پر قبضہ کرے مگر مسلم نے اپنے عمل سے ظاہر کر دیا کہ ہمیں تمھاری سلطنت سے مطلب نہیں، تمھاری حکومت سے کوئی غرض نہیں۔ ہمیں تو صرف طالبانِ ہدایت کی تلاش اور ان کی مذہبی و اخلاقی اصلاح مدِ نظر ہے۔

مسلم کے ورودِ کوفہ کے متعلق حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلیمان بن صرد خزاعی اس وقت کوفہ میں موجود نہ تھے ورنہ مسلم ان ہی کے مکان پر قیام کرتے اس لیے کہ وہ اس

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۴ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۸ الاخبار الطوال ص ۲۳۲

[3] الاخبار الطوال ص ۲۳۲ - طبری ج ۶ ص ۱۹۸

تحریک کے روح رواں اور اس جماعت میں سب سے زیادہ صاحب وجاہت اور ذی اثر تھے۔ مجبوراً مسلم نے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے گھر میں قیام کیا[1]

کوفہ میں یہ خبر تیزی کے ساتھ پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق آپ کے پاس ملاقات کے لیے پہنچنے لگے۔ جب کافی مجمع ہو گیا تو مسلم نے امام حسینؑ کا خط جو اس جماعت کے نام تھا پڑھ کر سنایا جس کو سنکر حاضرین میں کافی جوش کے آثار نمودار ہوئے۔ عابس بن ابی شبیب شاکری نے کھڑے ہو کر حمد و ثنائے الٰہی کے بعد اپنے ذاتی خیال کو ظاہر کرتے ہوئے کہا "مجھ کو عام لوگوں کے متعلق کسی اظہار رائے کا حق نہیں ہے اور نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اور میں ان کی طرف سے وکالت کر کے آپ کو دھوکے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا مگر میں وہ ظاہر کرتا ہوں جسے میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا ہے۔ خدا کی قسم میں جس وقت بھی آپ دعوت دیں گے لبیک کہتا ہوا حاضر ہوں گا اور آپ کے ہمراہ دشمنوں سے جنگ کروں گا اور اس وقت تک شمشیر زنی کروں گا کہ اس زندگی کو ختم کر کے اپنے خدا سے ملاقات کروں اور میرا مقصد اس سے سوا رضائے پروردگار کے کچھ نہ ہوگا۔"

یہ تقریر ختم ہونا تھی کہ حبیب بن مظاہر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔ "مرحبا، جزاک اللہ کتنی مختصر لفظوں میں تم نے حقیقت حال کو واضح کیا ہے۔" پھر مسلم کی طرف خطاب کر کے کہا۔ خدا کی قسم میرا بھی ذاتی حیثیت سے یہی خیال ہے جس کو عابس بن ابی شبیب نے اپنے لفظوں میں ظاہر کیا۔ اسی سے ملتی جلتی لفظوں میں سعید بن عبداللہ حنفی نے تائید کی جس کے بعد مجمع متفرق ہوا[2] خط کے مضمون کی بناء پر اس کارروائی کا مقصد ظاہر ہے۔ یعنی یہ

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۲ طبری ج ۶ ص ۱۹۹ و ج ۷ ص ۵۸۔ ارشاد ص ۲۱۱۔ اس گھر کے نشانات غالباً چوتھی صدی ہجری تک باقی تھے چنانچہ ابوحنیفہ دینوری نے لکھا ہے کہ اب یہ گھر "دار مسیّب" کے نام سے مشہور ہے۔ (الاخبار الطوال ص ۲۳۲) طبری نے لکھا ہے "دار مسلم بن مسیّب" کے نام سے مشہور ہے (طبری ج ۶ ص ۱۹۹) دوسری جگہ "دار مسلم بن مسیّب" درج ہے (طبری ج ۷، ص ۵۷)

[2] طبری ج ۶ ص ۱۹۹

عہد و پیمان اس غرض سے نہ تھا کہ مسلم کوئی جارحانہ اقدام کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کے متعلق یہ لوگ نصرت اور مدد کا وعدہ کر رہے تھے اور نہ موجودہ صورت حال کی بنا پر یہ خیال کسی دماغ میں جگہ پا سکتا تھا کہ چند ہی روز میں تن تنہا مسلم کے مقابلہ میں فوج کشی ہوگی اور اس کے لیے اس جماعت کو تیار رہنا چاہیے۔ بلکہ یہ عہد و پیمان صرف امام حسینؑ کی تشریف آوری کی پیش نہاد اور اس موقع کے لیے ان لوگوں کے عزائم و نیات کے اندازہ کے طور پر تھا۔

مسلم بن عقیل کے ورود کی خبر کوفہ میں عام طور پر مشہور ہو ہی چکی تھی اور اس فضا کے لحاظ سے جو امام حسینؑ کو دعوت دینے کی تحریک کے سلسلہ میں ابتدا ہی سے کوفہ میں پیدا ہو گئی تھی اور جس کے اسباب و ضاحت کے ساتھ درج کیے جا چکے ہیں۔ ہر شخص نے اس خبر کا مسرت کے ساتھ استقبال کیا۔

یزید کی خلافت سے بسبب اس کی سیاہ کاریوں کے بیزاری ایک طرف، حضرت حسینؑ بن علیؑ کی ہر دلعزیزی نہ صرف خاندانی وجاہت کے باعث بلکہ اپنے اخلاق و کمالات کے لحاظ سے دوسری جانب، وہ لوگ کہ جو مسلم بن عقیل کی تحریک کے مبلغ و داعی تھے ان کی ذاتی وجاہت اور تعلقات تیسری طرف اور "کل جدید لذیذ" کے طبعی قانون کے مطابق ہر تازہ تحریک میں جو لذت ہوتی ہے وہ چوتھی جانب ان تمام اسباب کی بنا پر حضرت مسلم کے ہاتھ پر ایک ہفتہ کے اندر بارہ[1] یا اٹھارہ ہزار[2] کوفیوں نے بیعت کی لیکن کیا یہ سب دوستانِ علیؑ تھے؟ کیا کوفہ میں زیاد و آلِ زیاد کی بیس سال حکومت کے بعد جس میں کھنچی ہوئی تلواریں اور جلادوں کے ہاتھ برابر اپنی سفاکی دکھاتے رہے ہوں اور دست و پا، سر و زبان کے قطع و برید کا سلسلہ برابر جاری رہا ہو، کوفہ میں اتنی تعداد میں علیؑ کے دوست موجود ہو سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ سچے شیعہ تو کوفہ میں پہلے ہی کم تھے۔ اور جو تھے بھی وہ معاویہ کے قتل و غارت کے بعد تقریباً نیست و نابود ہو چکے تھے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۴ [2] طبری ج ۶ ص ۲۱۱

اس کے بعد تھوڑے سے چھپے چھپائے افراد باقی ہو سکتے ہیں۔ ورنہ جتنے تھے وہ وہی افراد تھے جو حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کر کے محض ساتھ ہونے کی وجہ سے لغوی معنی کے اعتبار سے شیعہ کہے جاتے تھے اور وہ بھی اب زیادہ تعداد میں باقی نہیں تھے۔ اس صورت میں یہ ماننا ناگزیر ہے کہ مذکورہ بالا سطحی اور عارضی اسباب سے جو رائے عامہ ہموار ہوئی ہو اس میں کوئی وزن نہیں ہو سکتا۔ بے شک جب اس تحریک کے ابتدائی محرکین کو رائے عامہ کی نوعیت سمجھنے میں غلطی ہوئی حالانکہ وہ یہیں کے رہے سہے پروردہ اور تجربہ یافتہ تھے تو جناب مسلم کو جو کہ یہاں پردیسی کی حیثیت رکھتے تھے، دھوکا ہونا قابلِ تعجب نہیں ہے۔

مسلم کی تحریک کو چلانے والے ان کی صدا پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اور سب سے پہلے جلسہ میں جانبازی کا اقرار کرنے والے اور رائے عامہ کو ہموار کر کے مسلم کی نصرت و حمایت پر آمادہ کرنے والے ان میں سے اکثر بے شک سچے، خالص اور مخلص ہمدرد اور دوست تھے اور ان کا کام یہی تھا کہ وہ شہر کی فضا کو مسلم کے موافق بنا دیں جس میں ان کو بظاہر خاطر خواہ کامیابی ہوئی لیکن آئندہ کے انقلابات کوئی دوسری صورت پیدا نہ کریں گے۔ اسکی ذمہ داری کسی پر عائد نہیں ہو سکتی۔ بے شک ان قلیل التعداد خالص دوستوں نے اپنے اقرار اور عہدِ جانبازی پر بہترین طریقہ سے عمل کیا اور جو کہا تھا اسے کر دکھایا، جس کے مشاہدہ کے لیے مستقبل کا انتظار کرنا چاہیے۔

جناب مسلم بن عقیل کو حالات خوشگوار اور مطابق قول و قرار نظر آئے۔ اس لیے امام حسینؓ کو خط لکھ دیا کہ جلد تشریف لائیے۔ حالات سازگار ہیں اور اہل کوفہ اپنے قول و قرار پر قائم ہیں[1]۔ مقامی حکومت کا طرزِ عمل ان کی نسبت روادارانہ تھا۔ کوفہ کے حاکم نعمان بن بشیر نے منبر پر جا کر ایک تقریر کی جس کا مضمون یہ تھا کہ اے بندگانِ خدا فتنہ و فساد

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱ - الاخبار الطوال ص ۲۴۳

اور افتراق سے پرہیز کرو۔ اس سے خواہ مخواہ جانیں جائیں گی، خون بہیں گے اور مالی تباہیاں ہونگی جہاں تک میرا تعلق ہے میں جب تک کوئی جارحانہ اقدام میرے خلاف نہ ہو اس وقت تک کوئی اقدام نہیں کروں گا۔[1] کوفہ میں یہ خبر گرم تھی کہ اب بہت جلد ہی حسینؑ بن علیؑ تشریف لانے والے ہیں اور اس وجہ سے ہر طرف ایک خاص چہل پہل نظر آتی تھی اور حلقہ حلقہ جماعت در جماعت لوگ بیٹھ کر اس پر اظہارِ خیالات کرتے تھے اور بے چینی کے ساتھ دیدہ براہ تھے مگر کوفہ کے اندر ایک ایسی جماعت موجود تھی جو ان تمام منصوبوں کو خاک سیاہ بنا دینے پر تلی ہوئی تھی اور یا موی حکومت کے خیر خواہ وہ لوگ تھے جنھیں اندیشہ ہوا ہوگا کہ حسینؑ بن علیؑ کے اقتدار کے بعد انھیں اموالِ خلق پر بے جا تصرفات کا موقع باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص بنی امیہ کے حلیف عبداللہ بن مسلم حضرمی نے تو نعمان بن بشیر کی مذکورہ بالا روادارانہ تقریر کے بعد ہی کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ یہ آپ کا طریقِ کار صحیح نہیں ہے اور آپ کمزوری دکھا رہے ہیں جس پر نعمان نے کہا کہ "میں اللہ کی اطاعت کے لیے کمزور ثابت ہوں یہ بہتر ہے اس سے کہ معصیت الٰہی کر کے زور آور ثابت ہوں۔"[2] یہ جواب نعمان کے ضمیر کی صاف ترجمانی کر رہا تھا جس کے بعد فسادی اشخاص کو کچھ کہنے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے یہاں سے جا کر فوراً عبداللہ بن مسلم[3] نے یزید کے نام خط لکھا کہ مسلم بن عقیل کوفہ آئے ہیں اور ان کے طرفداروں نے ان کے ہاتھ پر حسینؑ کی بیعت کر لی ہے۔ اگر آپ کو کوفہ اپنے ہاتھ میں رکھنا ہے تو یہاں کوئی مضبوط آدمی بھیجیے جو آپ کے فرمان کے مطابق عمل کر سکے۔ اس لیے کہ نعمان بن بشیر کمزور شخص ہیں یا وہ جان بوجھ کر کمزوری دکھا رہے ہیں۔"

عمارہ بن عقبہ اور عمرو بن سعد نے بھی ایسے ہی مضمون کے خطوط روانہ کیے[4] ان خطوط کے پہنچنے پر یزید نے سرجون بن منصور رومی سے مشورہ لیا۔ یہ شخص عیسائی تھا جو معاویہ کے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۹ [2] طبری ج ۶ ص ۱۹۹

[3] دینوری نے اس خط لکھنے کی نسبت مسلم بن سعید حضرمی اور عمارہ بن عقبہ کی طرف دی ہے اور کہا ہے کہ یہ دونوں یزید بن معاویہ کے جاسوس تھے (الاخبار الطوال ص ۲۳۳) [4] طبری ج ۶ ص ۱۹۹۔ ارشاد ص ۲۱۱۔ ۲۱۲

زمانہ سے محکمۂ خراج میں کاتب تھا[1] سرجون نے عبیداللہ بن زیاد کا نام[2] لیا۔ یزید اس وقت تک ابن زیاد سے خفا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اسی کی وجہ سے زیاد نے میری ولیعہدی سے اختلاف کیا تھا اور یہ کہ شاید معاویہ کے بعد بجائے میرے یہ خود خلافت کا امیدوار تھا اس لیے اس کا اب تک یہ ارادہ تھا کہ وہ بصرہ کی حکومت سے بھی ابن زیاد کو معزول کر دے گا[3] چنانچہ ابن زیاد کا نام سنتے ہی یزید نے انکار کیا اور کہا، نہیں وہ ٹھیک نہیں ہے کسی اور کا نام لو۔ سرجون نے کہا۔ یہ بتائیے کہ اگر معاویہ اس وقت زندہ ہوتے اور وہ اس وقت آپ کو یہی رائے دیتے تو آپ قبول کرتے؟ یزید نے کہا، بے شک ان کے کہنے کو ضرور قبول کرتا۔ یہ سنکر سرجون نے ایک تحریر نکالی اور کہا کہ یہ معاویہ کا فرمان ہے جس میں ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا ہے۔ وہ اسے بھیجنے نہ پائے کہ انتقال ہو گیا۔ اب آپ بصرہ اور کوفہ دونوں جگہ کی حکومت عبیداللہ بن زیاد کے

---

[1] الوزراء والکتاب ص۱۵۔ چونکہ اس زمانہ میں کوفہ و بصرہ اور دمشق دونوں مرکزوں میں مالیات کے متعلق دو دفتر تھے، ایک رعایا کی مردم شماری کا اور ان کے وظائف و انعامات کا، یہاں کام عربی میں ہوتا تھا اور دوسرا آمدنی و خرچ کے حسابات کا۔ یہ کام کوفہ و بصرہ میں اب تک فارسی زبان میں ہوتا تھا اور شام میں یہ رومی زبان میں لکھا جاتا تھا اس لیے عراق میں یہ دفتر مجوسیوں اور شام میں عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ اس دفتر کا مہتمم اعلیٰ دمشق میں سرجون تھا جو معاویہ کے وقت سے عبدالملک بن مروان کے عہد تک برابر اس شعبہ کا ذمہ دار رہا اور اس غرّے میں کہ یہ کام بغیر ہمارے ہو ہی نہیں سکتا ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ خلیفہ تک کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اسی وجہ سے عبدالملک کے زمانہ میں عراق اور دمشق کے ان دونوں دفتروں کو بھی عربی میں منتقل کیا گیا چنانچہ ۷۸ھ میں حجاج بن یوسف نے عراق کے دفتروں سے مجوسیوں کو نکال کر ان کو عربی کی طرف منتقل کیا اور تقریباً اسی زمانہ میں عبدالملک کے حکم سے دمشق کے دفتر کی زبان عربی بنائی گئی اور سرجون کو عہدہ سے برطرف کر دیا گیا (الوزراء والکتاب ص۲۳، ۲۴)

[2] سب سے پہلے زیاد کے مرنے کے بعد ۵۳ھ میں عبیداللہ بن زیاد کو معاویہ نے خراسان کا حاکم قرار دیا۔ اسوقت اس کی عمر ۲۵ برس کی تھی (طبری ج ۶ ص۶۶) پھر ۵۵ھ میں اسے بصرہ کا حاکم قرار دیا (ص۱۶۸)

[3] طبری ج ۶ ص۱۹۴

لیے قرار دے دیجیے۔

یزید نے معاویہ کی اس تحریر کے مطابق ابن زیاد کے نام خط لکھا کہ مجھے میرے شیعوں نے کوفہ سے خطوط لکھے ہیں کہ وہاں پسرِ عقیل نے آکر لشکر جمع کرنا شروع کر دیا ہے تاکہ مسلمانوں میں تفرقہ اور فساد پیدا ہو۔ تم اس خط کے پہنچنے کے ساتھ ہی ادھر روانہ ہو اور مسلم کو قبضہ میں لا کر قید کرو، قتل کرو یا نکال دو۔ والسلام" [1]

قدیم مورخ جہشیاری نے اس خط کا مضمون حسب ذیل لکھا ہے جس کے پس منظر میں یزید کی ابن زیاد سے ناراضگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں تہدیدی انداز زیادہ نمایاں ہے۔

"معلوم ہونا چاہیے کہ جس کی ایک وقت تعریفیں ہوتی ہیں وہی دوسرے وقت سب و شتم سے یاد کیا جاتا ہے اور جسے سب و شتم سے کیا جاتا ہے وہی ایک دم محلِ تعریف بن جاتا ہے۔ اس وقت ایک بڑا منصب تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے جس سے بڑھ کر تمہارے لیے کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا اور اتفاق سے حسینؑ کی مہم تمہارے ہی دور اور تمہارے ہی قلمرو مملکت کے نصیب میں آئی ہے اور تمام عمالِ حکومت میں تم ہی وہ ہو جو اس محلِ آزمائش میں پڑے ہو۔ اب یا تو تمہاری شرافت پایۂ ثبوت تک پہنچ جائے گی اور یا جیسے کبھی تھے ویسے ہی غلام کے غلام قرار پاجاؤ گے۔ والسلام" [2]

اس کے آخری فقرہ میں تلمیح وہی زیاد کے مجہول النسب ہونے اور پھر معاویہ کی نظرِ عنایت سے فرزندِ ابوسفیان قرار دیے جانے کی طرف ہے۔ اس خط کے مضمون سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ صرف مسلم ہی کے بارے میں ابنِ زیاد کو سرگرمی کی تحریک نہیں کر رہا ہے بلکہ سخت و درشت اور غیرت انگیز الفاظ میں خود حضرت امام حسینؑ کے معاملہ میں ابن زیاد کو مضبوط اقدامات کی تحریک کر رہا ہے۔ جس میں ذرا بھی کوتاہی اس کے سامنے اس کے تمام مستقبل کے تاریک بننے کی دھمکیوں کا مرکز بنا دی گئی ہے۔

---

[1] ارشاد ص ۲۱۲ - طبری ج ۶ ص ۲۰۰ [2] الوزراء والکتاب ص ۱۹

بہرحال اس خط کو کوفہ کی حکومت کے پروانہ کے ساتھ مسلم بن عمرو باہلی[1] کے ہاتھ ابن زیاد کے پاس روانہ کیا جس کو دیکھتے ہی اس نے بصرہ میں اپنے بھائی عثمان بن زیاد کو قائم مقام بنا کر خود کوفہ جانے کی تیاری کر دی اور مسجد جامع میں ایک تہدید آمیز تقریر کرنے کے بعد حبس میں اعلان کیا تھا کہ اگر تم میں سے کسی نے ذرا بھی مخالفت کی تو میں اسی کو نہیں بلکہ اس کے ورثا کو بھی قتل کرا دوں گا اور آس پاس کے آدمیوں اور خطا کار کے ساتھ بے خطا کو بھی سزا دینے میں کمی نہ کرونگا۔[2] دوسرے دن روانہ ہو گیا۔[3] وہ کوئی اور نہیں زیاد بن ابیہ کا بیٹا اور معاویہ کا ان کے ادعا کے مطابق بھتیجا تھا اور یہ پورا خاندان ہی وہ تھا جس پر حیلہ و فریب کا خاتمہ تھا۔ چنانچہ سب سے پہلی بات ابن زیاد نے یہ کی کہ اس نے اپنی نقل و حرکت کو بالکل صیغۂ راز میں رکھا تاکہ اس کا ورود کوفہ میں اچانک حیثیت سے ہو اور پھر جب کوفہ نزدیک رہ گیا تو اس نے اپنی وضع میں تغیر پیدا کر کے ایک سیاہ عمامہ سر پر باندھا اور چہرہ پر اسی طریقہ سے جو عرب قوم کے بہادروں کا جنگ وغیرہ کے موقعوں پر دستور تھا ایک ڈھاٹا باندھ لیا جس کی بنا پر شناخت ناممکن ہو گئی۔ ایک مرتبہ شہر پناہ کوفہ کے اندر یہ نقشہ نظر آیا کہ آگے آگے عربی گھوڑے پر سوار ایک رئیس قوم بڑے وقار و تمکنت کے ساتھ سیاہ عمامہ سر پر باندھے جو اشراف عرب کا امتیازی نشان تھا اور اس کے پیچھے ایک شاندار قافلہ زین و لجام، ساز و سامان سے آراستہ آ رہا ہے۔ اس حشم و خدم کو دیکھ کر ان توقعات کی بنا پر جو پہلے سے قائم تھے وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا۔ یعنی ہر شخص یہی سمجھا کہ حضرت حسینؑ بن علیؑ تشریف لائے ہیں اور اس قائم شدہ اثر کی بنا پر یا متوقع جدید انقلاب سے نفع دنیوی حاصل کرنے کی تمنا میں جس جماعت کی طرف سے عبیداللہ کا گزر ہوتا وہ بہ نظر تعظیم کھڑے ہو کر آداب بجا لاتی اور خوش آمدید کے معنی میں یہ الفاظ زبان پر جاری کرتی۔ مرحبا بک یا ابن رسول اللہ قد مت خیر مقدم۔ ابن زیاد

---

[1] قتیبہ بن مسلم کی شخصیت تاریخ میں مشہور ہے۔ یہ مسلم بن عمرو اسی کا باپ تھا (الاخبار الطوال ص ۳۳)

[2] الاخبار الطوال ص ۲۳۴ [3] طبری ج ۶ ص ۲۰۱ - ارشاد ص ۲۱۲ - ۲۱۳۔

کسی کو کچھ جواب نہ دیتا بلکہ آوازوں کو سنتا، چہروں کو بغور دیکھتا، شکل وشمائل کو پہچانتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ مجمع زیادہ ہوگیا اور لوگ اشتیاق سے گھروں سے نکل آئے اور ہر شخص فرزندِ رسولؐ سمجھ کر آگے بڑھنے لگا اور نوبت یہ پہنچی کہ راہ چلنے میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی۔ اس وقت مسلم بن عمرو باہلی نے جو ابن زیاد کے ساتھ تھا۔ پکار کر کہا۔ "راستہ چھوڑ دو۔ یہ امیر عبیداللہ بن زیاد ہیں"[1]

نہ معلوم ان الفاظ میں کونسا اثر تھا کہ بڑھتے ہوئے قدم اور اٹھتے ہوئے ہاتھ اور مسرت آمیز ترانے سب موقوف ہوگئے۔ ایک سناٹا تھا جو چھا گیا اور سارا مجمع تتر بتر ہوگیا۔ یہاں تک کہ جب ابن زیاد دار الامارہ میں پہنچا تو دس آدمیوں سے زیادہ اس کے ساتھ نہ تھے۔[2]

اس موقع پر اہلِ کوفہ کے فطری رجحانات پر غور کرنے کے بعد ان کے باطنی اضطراب کا اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں۔ اس لیے کہ حالات کا غیر متوقع صورت سے ظہور پذیر ہونا بجائے خود سنسنی پیدا کر دیتا ہے چہ جائیکہ صورتِ حال یہ ہو کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے خلاف خود جاسوسی کے کام کو انجام دیا یعنی اپنے باطنی خیالات اور حسینؓ بن علیؓ کے ساتھ خلوص وعقیدت کی خود ابن زیاد کے سامنے بوقت ورود ترجمانی کر دی اور ابن زیاد نے ایک ایک چہرہ اور آواز کو پہچان لیا اور پھر ابن زیاد وہی تھا جس کی اور جس کے باپ کی تلوار کے نیچے بیس برس تک اس تمام خلقت کی گردنیں اس طرح خم رہی ہیں کہ جس کو چاہا گرفتار کیا، سولی پر لٹکایا، جلاد کے ہاتھ سے سر کو قلم کرا دیا اور ایسے ہیبت ناک مناظر ان ہی ہاتھوں سے آنکھوں کے سامنے آچکے ہیں جن کو سوچ کر اب تک رونگٹے کھڑے ہوجاتے اور دل ہل جاتے ہوں گے۔ اور اب وہی صورتیں اپنے اور اپنی اولاد اور اعزہ واقارب کے لیے پیش نظر ہیں۔ کیا یہ وجوہ ایسے نہ تھے جن کی بناء پر دل ودماغ معطل، طاقتیں مضمحل اور ہمتیں پست ہوجاتیں اور ان پر عظیم خوف وہراس کا غلبہ ہوجاتا خصوصاً جبکہ زیادہ تر تعداد عوام کی تھی جو واقعات وحالات کو سمجھے بغیر ہر نئی آواز پر لبیک کہنے کے شوق میں شریک ہوگئے تھے۔

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۴۔ طبری ج ۶ ص ۲۰۱ [2] طبری ج ۶ ص ۲۰۱

ابن زیاد نے مسجد جامع میں ایک تہدیدی تقریر کے ساتھ اپنی حکومت کا اعلان کرنے کے بعد قصر میں جا کر قیام کیا اور نعمان بن بشیر نے فوراً قصر کا تخلیہ کر کے کوفہ سے اپنے وطن شام کی طرف روانگی اختیار کی۔[1] ابن زیاد نے اس کے بعد تمام محلات کوفہ کے ذمہ دار اشخاص کو جن سے عرافت[2] کا منصب تعلق رکھتا تھا بلا کر یہ فرمان جاری کیا کہ جلد سے جلد ہر محلہ کی مردم شماری اور جو لوگ نو وارد ہیں ان کی فہرست اور جن لوگوں سے حکومت شام کو خطرہ ہے ان کے نام ادارۂ حکومت محلیہ میں پیش کر دیے جائیں اور اگر وہ کسی وجہ سے ان فہرستوں کے تفصیل وار ترتیب دینے سے معذور ہوں تو ضمانت داخل کریں کہ ان کے محلہ میں کوئی متنفس بھی حاکم شام کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوگا اور اس کے خلاف ظاہر ہوا تو اس مختار محلہ کو فوراً اس کے گھر کے دروازہ پر سولی دی جائے گی اور اس کے خاندان سے ہمیشہ کے لیے اس منصب کو علیحدہ کر لیا جائیگا۔[3]

یہ مضبوط تدبیر ایسی نہ تھی جس کی کامیابی مشتبہ ہو۔ کوفہ کا چپہ چپہ جو اسیس و مخبرین کی کثرت سے غیر محفوظ نظر آنے لگا۔ اب ہر شخص خاص اپنے محلہ میں ایک گھر سے دوسرے گھر پر جاتے ڈرتا تھا اور اس طرح دس پانچ آدمیوں کا بھی ایک جگہ جمع ہو کر کسی امر پر گفتگو کرنا اور کوئی قرارداد استوار کرنا ناممکن ہو گیا۔

یہ پہلا موقع وہ ہو سکتا تھا کہ جب مسلم بن عقیل کو جان کا اندیشہ اور مقصد کی پامالی کا احساس ہو جاتا۔ اب آپ کا صرف ایک فرض رہ گیا تھا کہ آپ حفاظت خود اختیاری کے فریضہ کے ماتحت جہاں تک ممکن ہو اپنے تحفظ کے لیے احتیاطی تدابیر عمل میں لائیں۔ اس کے لیے آپ کو مختار بن ابی عبیدہ کا مکان جس میں آپ اب تک مقیم تھے غیر محفوظ معلوم ہوا۔ اس لیے

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۴ [2] ملک عرب میں یہ طریقہ اب تک رائج ہے کہ بڑے شہروں میں ہر محلہ میں ایک مختار محلہ ہوتا ہے جو اس محلہ کی مردم شماری وارد و صادر، زائیدہ و مردہ، شادی شدہ وغیرہ شادی شدہ وغیرہ امور کی تشریح کا مقامی حکومت کی طرف سے ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی منصب کو اس زمانہ میں عرافت کہتے تھے۔ [3] طبری ج ۶ ص ۲۰۱۔ ارشاد ص ۲۱۴۔

کہ آپ کا قیام وہاں مشتہر ہو چکا تھا اور پھر اگر کوئی وقت آتا تو وہاں آپ کی حمایت کرنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ مختار بن ابی عبیدہ شریف قوم سہی لیکن صرف ایک زمیندار کی حیثیت رکھتے تھے وہ کسی بڑے قبیلہ کے سردار نہ تھے اس کے علاوہ اس خاص موقع پر وہ کوفہ میں موجود بھی نہ تھے۔[1]

لہٰذا مسلم نے اپنے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہ دیکھی کہ آپ تاریکی شب میں ہانی بن عروہ کے گھر میں منتقل ہو جائیں۔[2] یہ قبیلۂ مراد و مذحج کے سردار تھے اور جب نکلتے تھے تو بارہ ہزار آہن پوش سوار ان کے ہمرکاب ہوتے تھے۔

مسلم نے ہانی کے گھر میں پناہ لے کر ظاہری اسباب کی بنا پر اپنے کو بارہ ہزار شمشیر زن بہادروں کے حلقہ میں پہنچا دیا جو بظاہر آپ کی حفاظت کا فرض بہترین طریقہ پر ادا کر سکتے تھے۔ ہانی نے مسلم کو مخفی طور پر اپنے یہاں رکھا اور سوا مخصوص افراد کے جو محل اعتماد تھے کسی کو اس راز کی اطلاع نہ دی۔ اب ان قلیل التعداد دوستان اہل بیتؑ کو جو اس تحریک کے داعی تھے فضا کی ناسازگاری کا پورا پورا احساس ہو گیا تھا مگر وہ مستقل مزاجی کے ساتھ صورت حال کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے اور اب لازمی طور پر نقطۂ نظر میں تبدیلی ہو گئی۔ اس کے پہلے امام حسینؑ کے خط کے مطابق مسلم کی حیثیت صرف ایک پُرامن نمائندہ کی تھی جس کا مقصد فقط کوفہ کے لوگوں سے امام حسینؑ کے لیے عہد وفاداری کا استوار کرنا تھا۔ چنانچہ اس کے پہلے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ کوئی اسلحہ کی فراہمی کی کوشش ہو رہی ہو یا جنگ کی تیاری ہو مگر اب نوعیت یہ ہے کہ یہ یقینی ہے کہ عنقریب مسلم کے خلاف حکومت کی طرف سے جارحانہ اقدام ہوگا اور اب اس جماعت کو جو مسلم کے بلانے کی ذمہ دار ہے اس کے مقابلہ کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اب یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس ہدایت نامہ کے حدود سے آگے جو مسلم کو امام حسینؑ کی جانب سے دیا گیا تھا۔ یہ اب ایک ہنگامی صورت حال ہے جس کے لیے مسلم اور جماعت کوفہ کو بہرحال مناسب

---

[1] طبری ج ۷، ص ۵۸ [2] الاخبار الطوال ص ۲۳۵ طبری ج ص ۱۹۵ و ص ۲۰۰۔ ارشاد ص ۲۱۳

طرزِ عمل اختیار کرنا لازم ہے چنانچہ مسلم بن عوسجہ اسدی نے حضرت مسلم کی طرف سے اب لوگوں سے حفاظت و نصرت کا وعدہ لینا شروع کیا اور ابو ثمامہ صائدی فراہمی سرمایہ اور جمع آوری اسلحہ کے ذمہ دار ہوئے۔[1]

ابن زیاد کو جناب مسلم کی جائے قیام کا پتہ لگانے کی بڑی فکر تھی۔ اس نے مسلم کی سراغرسانی کے لیے اپنے شامی غلام معقل کو تین ہزار درہم دے کر مقرر کیا کہ وہ خفیہ طریقہ پر کسی نہ کسی طرح مسلم کا پتہ چلائے۔ معقل اس فکر میں مسجدِ جامع میں آیا۔ اتفاق سے اس وقت مسلم بن عوسجہ ایک رکن مسجد کے پاس نماز میں مصروف تھے۔ وہ دیر تک انکو دیکھتا رہا اور اس نے اپنے دل میں کہا (جسے خود اس نے بعد میں بیان کیا) کہ یہ شیعہ لوگ نمازیں بکثرت پڑھتے ہیں اس لیے ہوں نہ ہوں یہ انہیں میں سے ہوں گے لہٰذا وہ انتظار میں بیٹھا رہا۔[2] جب مسلم نماز سے فارغ ہوئے تو وہ ان کے پاس آکر بیٹھا اور کہا کہ "میں شام کا رہنے والا ذوالکلاع کا غلام خدا کے فضل سے اہل بیتِ رسولؐ کا دوست ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس خاندان میں سے کوئی بزرگ آجکل کوفہ میں آئے ہوئے ہیں اور لوگوں سے رسولِ خدا کے نواسے کی بیعت لے رہے ہیں اور یہ تین ہزار درہم میرے پاس ہیں۔ تو کیا آپ مجھے ان کا پتہ بتا سکتے ہیں کہ یہ رقم میں ان کی خدمت میں حاضر کردوں جسے وہ اپنی مہم میں صرف کریں۔"

مسلم نے کہا کہ آخر مسجد میں دوسرے لوگ بھی ہیں تم میرے ہی پاس اس کے دریافت کرنے کو کیوں آئے ہو؟ اس نے کہا کہ سبب یہ ہے کہ میں نے آپ میں نیکوکاری اور پرہیزگاری کے آثار دیکھے تو یقین ہوا کہ آپ ضرور دوستانِ اہلبیتِ رسولؐ میں سے ہیں۔ جناب مسلم اس کے فریب میں آگئے اور کہا تم نے خوب پہچانا۔ میں تمہارے ہی بھائیوں میں سے ایک ہوں۔ میرا نام مسلم بن عوسجہ ہے۔ مجھے تمہاری ملاقات سے بہت خوشی ہوئی اور اس

---

[1] طبری ج ۵ ص ۲۰۴۔ ارشاد ص ۲۱۵ [2] الاخبار الطوال ص ۲۳۶

بات سے اور زیادہ مسرت حاصل ہوئی کہ تم اپنی خواہش میں کامیاب ہوئے اور تمہارے ذریعہ سے اہل بیتِ رسولؐ کو کچھ تقویت پہنچے گی۔ بے شک اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ظالم ابن زیاد کو بھی اس کی اطلاع نہ ہو جائے لہٰذا تم مجھ سے عہد کرو کہ کسی سے اس کا اظہار نہ کرو گے۔

چنانچہ کافی اطمینان اور عہد و پیمان اور راز داری کے وعدوں کے ساتھ مسلم بن عوسجہ نے اقرار کیا کہ میں کل تمہیں جناب مسلم بن عقیل کی خدمت میں لے چلوں گا۔ معقل دوسرے دن جناب مسلم بن عوسجہ کے مکان پر آیا اور وہ اسے حضرت مسلم بن عقیل کے پاس لے گئے۔ اس نے آپ کی بیعت کی اور تین ہزار درہم جو لایا تھا آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ اس کے بعد معقل کی یہ صورت تھی کہ وہ دن بھر جناب مسلم کے پاس رہتا اور تمام حالات معلوم کرتا تھا اور رات کو ہر بات کی اطلاع ابن زیاد کو پہنچا دیتا تھا۔[1]

ہانی کے ابن زیاد سے بہت قدیم تعلقات تھے مگر صرف اس اندیشہ پر کہ کہیں ابن زیاد کو مسلم کے میرے یہاں قیام کی کچھ بھنک نہ مل گئی ہو وہ آجکل ابن زیاد کی ملاقات کو جانے سے پرہیز کرتے تھے اور بیماری کے عذر کے ساتھ خانہ نشین ہو گئے تھے۔ ابن زیاد کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح ہانی کو بلانا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے ہانی بن عروہ کے پاس ملاقات کا پیغام بھیجا[2]۔ ہانی کو اس وقت کسی دقتی خطرہ کا احساس نہیں ہوا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ابن زیاد کے دعوتی پیغام پر انہوں نے اپنے بارہ ہزار جوانوں میں سے کسی ایک کو بھی واقعہ سے اطلاع دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ خود تن تنہا ابن زیاد کے پاس چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو پہلے ہی سے ابن زیاد کا رنگ بدلا ہوا پایا۔ پہلے تو صورت دیکھتے ہی اس نے عرب کی ایک مثل زبان پر جاری کی کہ "رأتك بحائن رجلاہ" جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہانی اپنے پیروں سے موت کی طرف آرہے ہیں۔ پھر اس نے شریح قاضی کی طرف رُخ کر کے یہ شعر پڑھا ؎

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۷ [2] الاخبار الطوال ص ۲۳۸ - طبری ج ۶ ص ۲۰۴

اریدحیوتہ ویریدقتلی عذیرک من خلیلک من مراد

"یعنی میں تو اس کی زندگی چاہتا ہوں اور وہ میری جان لینے کا درپے ہے۔ خدا ہی سمجھے اس قبیلہ مراد والے تمہارے دوست سے۔"

اس سے ہانی سمجھ گئے کہ بظاہر راز افشا ہو چکا ہے مگر انہوں نے کہا۔ "کیوں امیر کیا معاملہ ہے؟" اس نے بڑے غصے سے کہا کہ "ارے کتنے غضب کی بات ہے کہ تم نے اپنے گھر کو خلیفۂ وقت اور تمام مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا اڈہ بنایا ہے۔ تم نے مسلم بن عقیل کو بلا کر اپنے گھر میں رکھا ہے۔ ان کے لیے اسلحہ جمع کر رہے ہو۔ اپنے گرد و پیش کے گھروں میں ان کی مدد کیلئے آدمی جمع کر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ باتیں سب مجھ سے چھپی رہیں گی۔"

ہانی نے پہلے ان باتوں کی صحت سے انکار کیا مگر جب اس نے معقل کو بلا کر سامنے کھڑا کر دیا۔ اور ہانی کو معلوم ہوا کہ یہ شخص جاسوس ہے تو اب ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور تھوڑی دیر کے لیے وہ مدہوش سے ہو گئے پھر انہوں نے اپنے ہوش و حواس کو جمع کر کے کہا۔ اب مجھ سے اصل حقیقت سنیئے۔ باور کیجئے۔ بخدا ایک لفظ بھی غلط نہ کہوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے مسلم کو نہ خود بلایا اور نہ مجھے ان کی تحریک کے متعلق کوئی علم تھا مگر وہ خود میرے پاس آ گئے اور میرے مکان پر قیام کے خواہش مند ہوئے۔ اب مجھے شرم دامنگیر ہوئی اور انکار نہ بن پڑا۔ اس طرح میں نے انہیں مہمان کر لیا اور پناہ دے دی۔ تاہم میں آپ سے یہ عہد کرتا ہوں میں آپ کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہیں کروں گا اور ابھی آ کر اپنے کو آپ کے حوالہ کر دوں گا۔ مگر اتنی اجازت دے دیجئے کہ میں جا کر مسلم سے کہہ دوں کہ میرے گھر سے نکل کر جہاں چاہیں چلے جائیں تاکہ ان کے پناہ دینے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔ پھر مجھے ان سے کوئی مطلب نہ رہے گا۔

ابن زیاد نے کہا "نہیں جب تک انہیں خود میرے پاس حاضر نہ کرو تم نہیں جا سکتے۔" ہانی نے کہا یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے مہمان کو بلا کر آپ کے سپرد کر دوں کہ آپ قتل کر دیں[1]۔"

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۸، طبری ج ۲ ص ۲۰۵۔ ارشاد ص ۲۱۶

بات اتنی بڑھی کہ ابن زیاد نے کہا "تم کو انہیں لانا ہوگا" نہیں تو میں تمہارا سر قلم کرا دوں گا ہانی نے کہا "ایسا ہوا تو آپ کے مکان کے گرد بجلیاں کوندتی ہونگی" ان کا خیال تھا کہ انکا قبیلہ ان کی مدد کرے گا۔ یہ سننا تھا کہ ابن زیاد کو زیادہ غصہ آیا اور کہا "اچھا! تم بجلیوں سے مجھے ڈراتے ہو۔ لاؤ۔ اسے میرے قریب لاؤ" سپاہی دوڑ پڑے۔ ہانی کو ظالم ابن زیاد کے قریب لائے۔ نتیجہ یہ تھا کہ بوڑھے لیکن بات کے پکے ہانی کا سرد چہرہ چھڑی کی ضرب سے خون میں رنگین ہوگیا۔ ہانی بالکل نہتے تھے۔ انہوں نے ایک سپاہی کی تلوار پر جو اُن کے پاس کھڑا تھا ہاتھ ڈالا کہ اس سے چھین لیں۔ ابن زیاد نے کہا۔ "اچھا، اب تو تم خارجی قرار پا گئے۔ تمہارا خون ہمارے لیے حلال ہے" جلاد بے دردی سے انہیں کھینچ کر لے گئے اور قید خانے میں ڈال دیا۔[1]

بنی زبیدہ کا سردار عمرو بن الحجاج، ہانی بن عروہ کا برادر نسبتی تھا۔[2]

اسے اطلاع ہوئی کہ ہانی قتل کر ڈالے گئے تو وہ مذحج کے بہت سے زرہ پوش سوار لے کر دارالامارہ پر چڑھ دوڑا اور تلواروں کی جھنکار، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نے ہانی کے دل میں رہائی کے توقعات پیدا کر دیے لیکن افسوس کہ شریح قاضی کی فہمائش اور اس کے کہنے سے کہ ہانی قتل نہیں ہوئے ہیں بلکہ بعض مصالح سے ایک محدود زمانہ تک نظر بند کر دیے گئے ہیں۔ وہ سب مطمئن ہو کر واپس گئے۔[3]

حضرت مسلم کے لیے یہ موقع بہت سخت تھا۔ ان کا پناہ دینے والا۔ وفادار اور مستقل مزاج بہادر ہانی بن عروہ ان کی وجہ سے زدوکوب کی توہین آمیز تکلیف برداشت کر کے دشمن کے قید خانہ میں تھا اور مسلم کے گرد گھر میں خاندان مراد کی عورتیں نالہ و شیون کر رہی تھیں[4]۔ کیا اب بھی مسلم بن عقیل چھپے بیٹھے رہتے یا اس وجہ سے کہ یہاں ان کا قیام معلوم ہو گیا ہے کسی دوسرے قابل اعتماد شخص کے یہاں جا کر مخفی ہو جاتے؟ ہرگز نہیں

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۰۶ - ارشاد ص ۲۱۷ [2] طبری ج ۶ ص ۲۰۵

[3] طبری ج ۶ ص ۱۹۵-۲۰۶-۲۰۷ - ارشاد ص ۲۱۷ - ۲۱۸ [4] طبری ج ۶ ص ۲۰۵ - ارشاد ص ۲۱۸

غیرت بنی ہاشم کا یہ تقاضا نہ تھا۔ انہوں نے یہ طے کرلیا کہ ہانی نہیں تو پھر میں بھی نہیں۔ طبری نے صاف طور پر تصریح کی ہے کہ مسلم کا جنگ کے لیے نکلنا اپنے ساتھیوں کی اطلاع کے بغیر تھا اور کوئی قرار داد اس دن کے متعلق نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ اس وقت کھڑے ہو گئے جب کہ ان کو معلوم ہوا کہ ہانی بن عروہ مرادی زدوکوب کے بعد قید کیے گئے ہیں[1]۔

دینوری کا بیان ہے کہ جناب ہانی قتل کر دیے گئے اور ان کی شہادت کا حال سن کر جناب مسلم باہر نکلے[2]۔ ابن زیاد نے مسجد میں آکر پھر ایک تہدیدی تقریر کی۔ ابھی وہ منبر سے اترا نہ تھا کہ لوگ دوڑتے ہوئے "باب التمارین" سے مسجد میں داخل ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ ابن عقیل آگئے۔ ابن زیاد گھبرا کر منبر سے اترا اور تیزی کے ساتھ قصر کے اندر جاکر دروازے قصر کے بند کر لیے[3]۔

واقعہ کی ناگہانی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اب یہ توقع تو کی ہی نہیں جاسکتی تھی کہ وہ ۱۸ ہزار بیعت کرنے والے سب مسلم کے گرد جمع ہو جائیں گے اور جنگ میں ان کے ساتھ شرکت کریں گے اور پھر جب کہ کوفہ کے محلے بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں تھے بلکہ کافی فاصلہ رکھتے تھے۔ ہاں یہ محلہ کہ جس میں مسلم کا قیام تھا۔ کافی وسعت رکھتا تھا اور اسی کے اطراف میں مسلم کے گرداگرد چار ہزار آدمی موجود تھے اور مسلم کی طرف سے جونہی "یامنصور امت" کا نعرہ بلند کیا گیا جو ان کا شعار یعنی امتیازی نعرہ جنگ تھا تو شرماشرمی وہ چار ہزار آدمی جمع ہو گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس محدود وقت میں جبکہ جنگ کے پہلے سے کچھ آثار نہ تھے وہ شاہی منظم فوج سے کہاں تک مقابلہ کے لیے تیاری کر سکے ہوں گے خصوصاً جبکہ ان چار ہزار میں بھی اکثر ایسے ہی عوام تھے جو نتائج پر غور کیے بغیر وقتی اقدامات پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جن کا حقیقی شیعۂ آل رسولؐ ہونا ہرگز ثابت نہیں۔

بہرحال جناب مسلم نے اس مختصر لشکر کو ترتیب دیا اور پیشقدمی شروع کی مگر جناب مسلم

---

[1] طبری ج ۷، ص ۵۸ [2] الاخبار الطوال ص ۲۳۹ [3] طبری ج ۴ ص ۲۰۷ - ارشاد

دارالامارہ تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ لوگ واپس جانا شروع ہوگئے اور پہنچتے پہنچتے صرف تین سو رہ گئے۔[1] لیکن ابن زیاد اس خیال سے کہ مسلم کے ساتھ کوئی بڑی جمعیت ہے قصر کے اندر قلعہ بند ہوگیا اور مسلم نے بنی مُراد کی ایک جماعت کو لیے ہوئے قصر کا محاصرہ کرلیا۔ رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی آتے گئے یہاں تک کہ مسلم کے پاس کافی جمعیت ہوگئی اور ظہر سے شام تک برابر لڑائی ہوتی رہی۔[2]

موجودہ جمعیت کو جو مسلم کے ساتھ محاصرہ میں شریک تھی مختلف قبائل کے مخلوط مجمع پر مشتمل سمجھنا چاہیئے اور قبائل کے روح رواں شیوخ و اشراف قبائل ہوتے ہیں جو حکومت کے ہوا خواہ اور پابند فرمان تھے اور ابن زیاد نے بروقت پیش بندی یہ کی تھی کہ آج صبح سے شیوخ و اشراف کو بلا کر اپنے پاس زیر حراست رکھ لیا تاکہ ان سے حسب موقع کام نکالا جا سکے۔ باوجودیکہ ابن زیاد کے پاس محل میں اس وقت کوئی فوج نہیں تھی بلکہ قصر حکومت میں صرف تیس پولیس کے سپاہی تھے اور بیس آدمی اس کے مخصوصین اور روسائے قبائل میں سے[3] یا زیادہ سے زیادہ دو سو آدمی موجود تھے[4] اس لیے وہ کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ایک طرف اس نے یہ کوشش کی کہ قصر کا دروازہ کھلنے نہ پائے[5]۔ دوسرے کچھ آدمی ادھر ادھر بھیج کر باہر سے سپاہی اکٹھا کر کے یہ انتظام کیا کہ شہر کی ناکہ بندی کی جائے یعنی چوراہوں اور عام راستوں پر پہرے بیٹھ جائیں کہ کوئی شخص مسلم کی مدد کو نہ آسکے اور صورت واقعہ کی بناء پر یہ امر لازمی تھا کہ مسلم کی مدد کو آنے والے مجتمع حیثیت سے کسی لشکر کے ساتھ نہ آتے بلکہ اکا دُکا جس کو خبر ہوتی جاتی وہ تنہا یا اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مسلم کی شرکت کے لیے آتا اور وہ فوراً گرفتار ہو جاتا تھا چنانچہ عبدالاعلیٰ بن یزید کلبی اپنے گھرانے کے کچھ نوجوانوں کو ساتھ لیے آرہے تھے جن کو کثیر بن شہاب نے گرفتار کر لیا اور محلہ بنی عمارہ کی طرف سے عمارہ بن صلخب ازدی نے ہتھیار جسم پر آراستہ کر کے چاہا تھا کہ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۰۷ [2] طبری ج ۶ ص ۲۰۷ - ارشاد ص ۲۱۸ [3] طبری ج ۶ ص ۲۰۷ - ارشاد ص ۲۱۹
[4] الاخبار الطوال ص ۲۳۹ [5] طبری ج ۶ ص ۲۰۸

مسلم کے پاس آئیں لیکن محمد بن اشعث نے گرفتار کر لیا[1]۔ یہ دونوں جانباز مسلم وہانی کی شہادت کے بعد پسر زیاد کے حکم سے قتل کر ڈالے گئے[2]۔ اس طرح مسلم سے مختلف اطراف و جوانب کی مدد قطع ہو گئی۔ چنانچہ حبیب بن مظاہر، مسلم بن عوسجہ اور ابو ثمامہ صائدی ایسے خاص لوگ آج جناب مسلم کے پاس پہنچنے سے قاصر رہ گئے۔ اس کے علاوہ اشراف قبائل کو مجمع کے منتشر کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ لوگ دار الامارہ کے بالاخانہ پر چڑھ گئے اور انھوں نے اپنے قبیلہ والوں کو پکار پکار کر ہمدردانہ انداز میں قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ عنقریب مرکزی حکومت شام کی جانب سے بہت بڑی فوجیں آنے والی ہیں اور اس صورت میں تمہارے جان و مال و اولاد سب تلف ہو جائیں گے دمشق سے فوجیں آنے کی خبر ہر طرف پھیلا دی گئی جس کے بعد یہ عالم ہوا کہ عورتیں اپنے گھروں سے نکل نکل کر اپنے باپ بھائی کے پاس آتیں اور کہتی تھیں کہ چلو واپس چلو۔ دوسرے لوگ کافی ہیں باپ یا بھائی اپنے بیٹے یا بھائی کے پاس آتا اور کہتا تھا کہ ارے کل دمشق سے لشکر آ جائے گا تو پھر تم کیا کرو گے۔ چلو لڑائی سے ہاتھ اٹھاؤ اور مجبور کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام ہوتے ہوتے صرف تیس آدمی حضرت مسلم کے پاس رہ گئے۔ آپ نے مسجد میں جا کر نماز مغرب پڑھی۔ نماز کے ختم ہونے کے بعد جب آپ باہر نکلے تو رفتہ رفتہ وہ بقیہ تیس بھی چلے گئے[3]۔ اب مسلم تنہا بازاروں میں پھرنے لگے اور کوئی اتنا تک نہ تھا کہ آپ کو راستہ بتا دے۔ آپ تاریکیٔ شب میں یونہی چلے جا رہے تھے یہاں تک کہ قبیلۂ کندہ میں پہنچ گئے[4]۔ اس قبیلہ کی عورت طوعہ جو پہلے محمد ابن اشعث کی کنیز تھی اور اس کے آزاد کرنے کے بعد اسید حضرمی کے نکاح میں آئی جس سے ایک لڑکا بلال پیدا ہوا۔ یہ کہیں گیا ہوا تھا اور طوعہ گھر کے دروازہ پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جناب مسلم نے اسے دیکھ کر بعد سلام پانی پینے کو مانگا۔ عورت خدا ترس تھی وہ گئی اور پانی لائی۔ جناب مسلم بیٹھ گئے اور پانی پیا۔ وہ برتن رکھنے گھر میں گئی۔ آئی تو دیکھا کہ یہ پھر بھی بیٹھے ہیں۔ اس نے کہا۔ "آپ پانی تو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۰۰ [2] طبری ج ۶ ص ۲۱۳ [3] الاخبار الطوال ص ۲۴۰ [4] الاخبار الطوال ص ۲۴۱

پی چکے۔ اب اپنے گھر جائیے۔ مسلم خاموش رہے۔ اس نے جب دوبارہ اور سہ بارہ کہا تو مسلم نے جواب دیا کہ "اے کنیزِ خدا۔ میرا اس شہر میں کوئی گھر نہیں ہے۔ کیا تم مجھے پناہ دے کر ثواب حاصل کر سکتی ہو۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد میں کبھی اس کا معاوضہ تمہارے ساتھ کر سکوں"۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا: "آپ ہیں کون اور واقعہ کیا ہے؟" فرمایا "میں مسلم بن عقیل ہوں۔ یہاں لوگوں نے میرے ساتھ غداری کی۔ مجھ سے نصرت کے وعدے کیے اور اب میرا ساتھ چھوڑ دیا۔" اس نے کہا۔ "اچھا۔ آپ مسلم ہیں؟" کہا "ہاں میں وہی ہوں"۔ یہ سننا تھا کہ وہ آپ کو اپنے گھر میں لے گئی اور مکان کے ایک مخصوص کمرے میں آپ کیلئے فرش بچھا دیا اور کھانا حاضر کیا مگر آپ نے کھانا نوش نہیں کیا۔ تھوڑی دیر میں اس کا لڑکا آیا اور اس نے ماں کو ایک کمرے میں بار بار آتے جاتے دیکھ کر سبب دریافت کیا اور اخفا کی کوشش محسوس کر کے زیادہ کد کرنے لگا یہاں تک کہ طوعہ کو واقعہ کا اظہار کرنا پڑا اس تاکید کے ساتھ کہ اس کا کسی سے اظہار نہ کرنا۔ وہ سن کر خاموش ہو گیا اور رات گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔[1]

ادھر ابن زیاد نے جب دیکھا کہ خطرہ بظاہر بالکل نہیں رہا تو اپنے آدمیوں کو حکم دیا، کہ سائبانوں میں دیکھیں، کہیں ابن عقیل ساتھ والے سائبانوں میں چھپے نہ ہوں۔ پورے طور پر اطمینان کر لینے کے بعد ابن زیاد نے عمرو بن نافع کو حکم دیا کہ شہر میں اعلان کر دے کہ آج عشاء کی نماز کے لیے ہر شخص کو مسجد میں آنا ضروری ہے۔ کوئی شخص نماز کے وقت اپنے گھر میں نہ رہے ورنہ اس کے جان و مال کی ذمہ داری امیر کے سر نہ ہوگی۔ تھوڑی دیر میں مسجد کے اندر لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ اقامت کہی گئی اور پسر زیاد نے اپنے دائیں بائیں محافظ کھڑے کر دیے۔ اس کے بعد نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد منبر پر جا کر تقریر کی کہ ابن عقیل نے جو مخالفت کا ہنگامہ اٹھا رکھا ہے، تم نے دیکھا۔ جس کے گھر میں ابن عقیل کو پائیں گے اس کے جان و مال کی ذمہ داری ہم پر نہیں اور جو انہیں ہمارے پاس لائے گا اس کو ان کی دیت (خون بہا) دی جائیگی۔[2]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۰۹ - ۲۱۰

بعد حصین بن تمیم کو حکم دیا کہ تمام شہر کی خانہ تلاشی کرے اور ابن عقیل کا پتہ لگائے۔ اور لوگوں کو عمرو بن حریث کی ذمہ داری پر چھوڑ کر خواب گاہ میں داخل ہو گیا[1]

طوعہ کا لڑکا بلال صبح ہوتے ہی محمد بن اشعث کے نوعمر لڑکے عبدالرحمٰن کے پاس گیا اور اسے مسلم کے اپنے گھر میں ہونے کی اطلاع دی اور وہ فوراً اپنے باپ کے پاس جو ابن زیاد کے دربار میں جا چکا تھا، پہنچا اور اس کے ذریعہ سے ابن زیاد کو مطلع کیا[2] ابن زیاد نے محمد بن اشعث کی سرکردگی میں مسلم کی گرفتاری کے لیے فوج روانہ کر دی۔ حضرت مسلم نے جو گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی سمجھ گئے کہ فوج میری گرفتاری کے لیے آئی ہے۔ تلوار لے کر حجرے سے باہر نکلے۔ اتنی دیر میں فوجی گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ آپ نے حملہ کیا اور ایسا سخت کہ دشمنوں کو گھر سے باہر نکال دیا۔ وہ دوبارہ ہجوم کر کے اندر گھسے اور آپ نے دوبارہ انھیں باہر کر دیا۔ بیشک اس حملے میں بکر بن حمران احمری کی تلوار سے ان کے اوپر کا لب قطع ہو گیا اور نیچے کے لب پر بھی زخم آگیا اور دو دانت شکستہ ہو گئے پھر بھی دشمنوں کو یہ یقین ہو گیا کہ مسلم پر یوں فتح پانا مشکل ہے لہٰذا وہ مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور پتھر مارنے لگے۔ اس کے علاوہ سینٹھوں کے مٹھے آگ سے جلا کر اوپر سے پھینکنے لگے۔ جناب مسلم نے یہ بزدلانہ طریقۂ جنگ دیکھا تو آپ تلوار کھینچے ہوئے مکان سے باہر کوچہ میں آگئے۔ محمد بن اشعث نے پکار کر کہا کہ آپ کے لیے امان ہے۔ خواہ مخواہ تلوار نہ چلائیے آپ نے جنگ جاری رکھی اور رجز پڑھنے لگے۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ "میں نے قسم کھائی ہے، نہ قتل ہوں گا مگر آزادی کی حالت میں، اگرچہ موت ناگوار چیز ہے مگر بہرحال وہ ایک نہ ایک دن تو ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں مجھ سے جھوٹ نہ بولا جائے اور دھوکا نہ دیا جائے۔ محمد بن اشعث نے کہا کہ "نہیں آپ سے جھوٹ نہیں کہا جائے گا اور نہ دھوکا دیا جائے گا۔ اطمینان رکھیے۔" مسلم جنگ کر کے تھک چکے

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۱ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۱ [3] طبری ج ۶ ص ۲۱۰ - ارشاد ص ۲۷۲

تھے اور زخموں سے چُور تھے۔ انھوں نے پوچھا "کیا واقعی مجھے امان ہے؟" اس نے کہا "ہاں آپ امان میں ہیں" جتنے محمد بن اشعث کے ساتھی تھے ان سب نے بھی امان کا وعدہ کیا، سوا ایک عمرو بن عبید اللہ بن عباس سلمی کے جس نے کہا، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا اور یہ کہہ کر وہ الگ ہٹ گیا۔ مسلم نے کہا۔ دیکھو تم نے مجھے امان دی ہے۔ اس لیے میں تلوار اپنی نیام میں رکھتا ہوں اور اگر تم امان نہ دیتے تو میں کبھی اپنے کو تمھارے حوالے نہ کرتا۔ اتنی دیر میں ایک مرکب لایا گیا جس پر مسلم کو سوار کیا اور سپاہیوں نے گرد حلقہ کر کے آپ کی تلوار کمر سے نکال لی۔ یہ ہونا تھا کہ مسلم کا دل ٹوٹ گیا اور کہا۔ یہ پہلی غداری ہے۔ محمد بن اشعث نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تمھیں کوئی خطرہ پیش نہ آئے گا" مسلم نے کہا "اچھا، تو بس ایک امید ہی ہے، اور امان کا وعدہ تمھارا کیا ہوا؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" یہ کہہ کر رونے لگے۔ عمرو بن عبید اللہ بن عباس سلمی جس نے پہلے ہی وعدۂ امان سے انکار کیا تھا کہنے لگا۔

"جو ایسی مہم کے لیے کھڑا ہوا ہو جس کے لیے تم کھڑے ہوئے تھے اسے خطرہ دیکھ کر رونا تو نہیں چاہیے" مسلم نے کہا۔ "واللہ میں اپنے لیے نہیں روتا۔ میں تو حسینؑ اور انکے ساتھیوں کے لیے روتا ہوں جو میرے خط کو دیکھ کر کوفہ کی طرف روانہ ہو چکے ہوں گے" پھر آپ محمد بن اشعث کی طرف متوجہ ہوئے۔ کہا "اے اللہ کے بندے! مجھے یقین ہے کہ تم مجھے امان دلوانے سے قاصر رہو گے۔ اب تم اتنا کرنا کہ ایک قاصد حسینؑ کے پاس بھیج دینا جو میری طرف سے ان سے جا کر کہہ دے کہ میں تو دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوں اور یقین ہے کہ شام ہونے کے پہلے تک قتل ہو چکوں گا۔ مگر آپ ادھر آنے کا قصد نہ کیجیے اور اہل کوفہ کے فریب میں نہ آیئے۔ ان کے تمام وعدے بالکل غلط اور قول و قرار جھوٹے ہیں۔" ابن اشعث نے وعدہ کیا کہ "میں ضرور قاصد روانہ کر دوں گا" اس کے بعد محمد بن اشعث جناب مسلم کو لے کر دار الامارہ کے دروازہ پر پہنچا اور پہلے خود اجازت لے

کر ابن زیاد کے پاس گیا۔ اس سے تمام جنگ کی کیفیت اور پھر وعدۂ امان پر مسلم کو ساتھ لانے کا مذکرہ کیا۔ ابن زیاد نے کہا۔ "امان دینے والے تم کون تھے؟ ہم نے تمہیں کیا اس لیے بھیجا تھا کہ تم انھیں امان دو؟ ہم نے تو اس لیے بھیجا تھا کہ انھیں ہمارے پاس لے آؤ۔" ابن اشعث میں اب کہاں جرأت تھی کہ وہ اس کے بعد کچھ کہتا، خاموش ہو رہا۔[1] اس وقت دارالامارہ کے دروازہ پر بہت سے لوگ اجازت حضوری کے انتظار میں موجود تھے جن میں عمارہ بن عقبہ، عمرو بن حریث، مسلم بن عمرو باہلی اور کثیر بن شہاب مخصوص لوگ تھے اور ایک صراحی ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی دروازے کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ جناب مسلم بہت پیاسے تھے۔ انھوں نے کہا۔ "تھوڑا سا پانی مجھے پلا دو۔" مسلم بن عمرو نے بڑے سخت الفاظ میں پانی پلانے سے انکار کیا۔ مگر عمرو بن حریث نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ مسلم کو پانی پلا دے۔ اس نے گلاس پانی سے بھر کر مسلم کے سامنے پیش کیا مگر جناب مسلم نے جب پانی پینا چاہا تو منہ سے خون بہنے لگا اور پانی کو رنگین کر دیا۔ دو مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ تیسری دفعہ دو دانت ٹوٹ کر گلاس میں گر پڑے۔ جناب مسلم نے مایوس ہو کر گلاس ہاتھ سے دے دیا اور کہا "معلوم ہوتا ہے پانی میری قسمت سے اٹھ چکا ہے" اتنی دیر میں ابن زیاد کا آدمی آیا اور مسلم کو اندر جانے کے لیے کہا۔ جب آپ ابن زیاد کے پاس پہنچے تو امیر کہہ کر اسے سلام نہیں کیا۔ ابن زیاد نے کہا "مسلم اب تم بچ نہیں سکتے۔ ابھی قتل کیے جاؤ گے۔" جناب مسلم نے کہا "میں اس کے لیے تو تیار ہی ہوں مگر مجھے اتنا موقع دیا جائے کہ میں کسی اپنے شناسا سے جو یہاں ہو کچھ وصیت کر لوں"۔ اس نے کہا۔ "اچھا جس سے چاہو وصیت کر دو" مسلم نے گرد و پیش نظر ڈالی تو عمر بن سعد کو پہچانا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم قریش کے خاندان سے ہو۔ مجھے اس وقت تم سے کچھ راز کی باتیں کہنا ہیں، ذرا انھیں سن لو۔" حکومت وقت کا خوشامدی سننے کے لیے تیار نہ ہوا جس پر خود ابن زیاد نے کہا۔ "آخر سن لینے میں تمہارا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱

کیا حرج ہے؟" اس پر عمرو سعد اٹھا اور مسلم کے ساتھ تھوڑی دور آگے بڑھ کر ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں ابن زیاد کی نظر دونوں پر پڑ رہی ہو۔ جناب مسلم نے کہا "مجھے ایک بات یہ کہنا ہے کہ میں جب سے کوفہ میں آیا ہوں سات سو درہم کا مقروض ہو گیا ہوں۔ تم میرے بعد میری تلوار اور زرہ فروخت کر کے یہ قرضہ ادا کر دینا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے قتل ہونے کے بعد میری لاش ابن زیاد سے مانگ لینا اور اسے دفن کر دینا۔ تیسرے یہ کہ امام حسینؑ کے پاس کسی کو بھیج کر اس کے ذریعہ سے میرے واقعہ کی اطلاع کرا دینا تاکہ وہ واپس چلے جائیں اور اہل کوفہ کے فریب میں مبتلا نہ ہوں۔"

مسلم نے بطور راز یہ باتیں کہی تھیں مگر بدعہد عمر سعد نے ابن زیاد کے پاس آ کر کہا۔ آپ جانتے ہیں مسلم نے مجھ سے کیا کہا؟ یہ یہ باتیں انھوں نے مجھ سے کی ہیں۔ یہ ایسا شرمناک رویہ تھا جسے ابن زیاد نے بھی برا جانا اور عرب کی یہ مثل زبان پر جاری کی کہ لا یخون الامین ولکن قد یؤتمن الخائن "امانتدار آدمی کبھی خیانت نہیں کرتا مگر کبھی کبھی غلطی سے خائن کو امانتدار بنا دیا جاتا ہے[1]۔" اس کے بعد اس نے ہر وصیت کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا۔ کہا "تمہارے مال سے ہمیں مطلب نہیں۔ وہ فروخت ہو کر تمہارا قرضہ ادا کر دیا جائے، اور حسینؑ کے بارے میں یہ ہے کہ اگر وہ ہماری طرف نہ آئے تو ہمیں ان سے کوئی مطلب نہیں ہے مگر لاش، اس کے بارے میں ہم کوئی وعدہ کرنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ تم نے ہماری مخالفت کی اور رعایا میں انتشار پیدا کیا لہٰذا ہم تمہاری لاش کے متعلق کسی احترام کے ذمہ دار نہیں ہیں[2]۔"

اس وصیت اور اس کے جواب کے بعد جو گفتگو جناب مسلم اور ابن زیاد میں ہوئی ہے وہ خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ مسلم پر جو بغاوت کا الزام عائد کیا جاتا ہے اس کے بارے میں مسلم کیا جواب دیتے ہیں اور اپنے کوفہ آنے کی نوعیت کیا بتلاتے ہیں۔

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۱-۲۴۲ [2] طبری ج ۶ ص ۲۱۲

ابن زیاد نے کہا۔ ابن عقیل! تم یہاں آئے تھے لوگوں میں تفرقہ ڈالنے اور آپس میں فساد کرانے کہ ایک جماعت دوسری جماعت پر حملے کرے اور خانہ جنگی ہو۔" مسلم نے جواب دیا اور وہ جواب جس نے آخر تک حسینی مقاومت کی نوعیت کو ظاہر کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں میں اس لیے نہیں آیا تھا بلکہ اس ملک والوں نے یہ ظاہر کیا کہ تمھارے باپ نے ان کے نیک آدمیوں کو قتل کیا اور ان کے خون بہائے اور ان میں (اسلام کی سادگی کو مٹا کر) وہ افعال و اعمال رائج کیے جو کسریٰ و قیصر کی سنت میں داخل تھے تو ہم آئے۔ اس لیے کہ ان کے اخلاق و عادات کی اصلاح کریں اور ان کو عدالت و انصاف اور تعلیماتِ قرآن پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیں۔[1]

واقعتہً چونکہ مسلم کا کوئی طرزِ عمل ان کے اس بیان کے خلاف ظاہر بھی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا یہ صفائی بغاوت کے الزام سے ان کے بری ہونے کے لیے کافی تھی مگر استبداد کے سامنے دلیل و برہان کام نہیں دیا کرتا۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ انھیں قصر کے بالاخانہ پر لے جایا جائے وہاں ان کی گردن قلم کی جائے اور پھر سر کے ساتھ ہی جسم کو نیچے گرا دیا جائے اور اس کے لیے وہی بکر بن حمران احمری[2] جس کی تلوار سے جناب مسلم کے لب و دہن پر زخم آیا تھا نامزد کیا گیا۔ جناب مسلم انتہائی صبر و سکون سے تکبیر، استغفار اور صلوٰت کے اوراد کے ساتھ دارالامارہ کے کوٹھے پر تشریف لے گئے اور ان کے سر کو جدا کر کے جسم کو قصر سے نیچے پھینک دیا گیا۔[3] روز سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ سنہ ۶۰ھ جناب مسلم نے جنگ شروع کی[4] اور روز چہار شنبہ ۹ ذی الحجہ کو شہادت پائی۔[5]

اس کے بعد سے شہر میں خوف و دہشت کی عملداری اور رعب و ہیبت کا پورا دور دورہ تھا۔ لوگ گھروں سے نکلنا خطرناک سمجھتے تھے اس لیے ہر طرف سناٹا تھا اور ایک کو ایک کی خبر نہ تھی۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۲ - ارشاد ص ۲۲۵ [2] دینوری نے اس کا نام احمر بن بکیر لکھا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۴۲)
[3] طبری ج ۶ ص ۲۱۳ - ارشاد ص ۲۲۶ - [4] طبری ج ۶ ص ۲۱۵ [5] ارشاد - دینوری نے شہادت جناب مسلم کی تاریخ سہ شنبہ ۳ ذی الحجہ سنہ ۶۰ ہجری درج کی ہے (الاخبار الطوال ص ۲۴۲) یہ درست نہیں معلوم ہوتی۔

انتہا یہ تھی کہ وہی ہانی بن عروہ جن کے ہمراہ رکاب ۱۲ ہزار مسلح سوار ہوتے تھے اور جن کے قتل کر دیے جانے کی غلط خبر پر دار الامارۃ کھنچی ہوئی تلواروں کے حلقہ میں آگیا تھا رسیوں میں جکڑ کر بازار میں لائے جا رہے تھے اور وہاں آواز دے رہے تھے کہ "کہاں ہیں میرے قبیلہ بنی مذحج کے بہادر! ہائے افسوس کہ اس وقت بنی مذحج مجھے نظر نہیں آتے" لیکن افسوس کوئی متنفس بھی ان کی طرف رخ کرتا نظر نہ آتا تھا۔

یہاں تک کہ ابن زیاد کے ترکی غلام نے اپنی تلوار سے ان کے سر و تن میں جدائی کر دی[1]

ابن زیاد نے مسلم و ہانی کے سرہائے بریدہ ہانی بن ابی حیہ ہمدانی اور زبیر بن ارواح تمیمی کے ہاتھ واقعہ کی مختصر روداد کے ساتھ روانہ کیے اور ان دونوں نے تفصیلات جا کر زبانی بھی بیان کیے۔ یزید نے جواباً اس کارنامہ پر بڑی شاباشی دی اور لکھا کہ تم نے وہی کیا جس کی ہمیں تم سے امید تھی۔ اب خود حسینؑ بن علیؑ کے بارے میں تمہاری کارگزاری دیکھنا ہے[2]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۳ - ۲۱۴ - ارشاد ص ۲۲۶ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۲

انیسواں باب

مکّہ سے کربلا تک

سفرِ امام حسینؑ ، منازلِ سفر اور کربلا میں ورود

کوفہ میں انقلاب، مسلم و ہانی کی شہادت، یہ سب کچھ ہو گیا مگر ظاہر ہے کہ اس سب کی اطلاع بر وقت مکّہ میں کیونکر پہنچ سکتی تھی۔ حضرت امام حسینؑ کو مسلم کا خط پہنچ چکا تھا کہ یہاں تشریف لائیے۔ سب آپ کی اطاعت کے لیے تیار ہیں۔ یہ خط جناب مسلم نے عابس بن ابی شبیب شاکری کے ہاتھ اپنی شہادت سے ستائیس دن پہلے ۱۲ ذیقعد کو لکھا تھا[1]۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد آپ کے لیے کوفہ کا سفر اختیار کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ پھر بھی عام حالات میں اتنی جلدی کی ضرورت نہیں تھی کہ آپ حج کے دو ایک دن باقی رہنے کے باوجود حج کو ترک فرمادیں۔ اور مکہ سے نکل کھڑے ہوں۔ یہ غیر متوقع صورت یقینی طور پر نہایت اہم ہنگامی اسباب کا پتہ دیتی ہے۔

آپ کی افتادِ طبیعت اور ذوقِ عبادت کا لازمی تقاضا بھی یہ تھا کہ آپ اس سال کے حج کو جو آپ کی زندگی میں آخری تھا مکمل فرما کر روانگی کا ارادہ کرتے لیکن ایک دم ہوا یہ کہ حج کی تکمیل میں دو دن باقی تھے کہ آپ نے حج کو عمرہ سے بدل کر مکہ معظمہ سے روانگی اختیار فرمالی۔

اس کے اسباب عام طور پر لوگوں کے سامنے کچھ نہ تھے کیونکہ حرم الٰہی کے اندر کوئی فوج و لشکر نہ تھا جسے سب دیکھتے مگر حاجیوں کے لباس میں فوج کے سپاہی آئے ہوئے تھے اور انھیں یہ ہدایت تھی کہ حسینؑ جس حال میں بھی ہوں ان کو گرفتار کر لو۔ یہ راز اس وقت کھلا جب آپ مکّہ سے باہر

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۱ [2] ارشاد ص ۲۳۰

آ چکے تھے اور فرزدق شاعر نے آپ سے راستے میں ملاقات کی اور پوچھا کہ فرزندِ رسولؐ اتنی جلدی کس لیے کہ حج بھی نہ ہو سکا؟ امامؑ نے جواب دیا کہ "اگر میں اتنی جلدی نہ کرتا تو وہیں گرفتار کر لیا گیا ہوتا۔[1]" بس یہ چیز وہ تھی جس نے امام حسینؑ کو عراق کی طرف اس قدر تعجیل کے ساتھ روانگی پر مجبور کر دیا۔

نتیجہ آخر امامؑ کے پیشِ نظر تھا یعنی شہادت جس پر آپ کی وہ تقریر گواہ ہے جو آپ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت فرمائی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ "موت فرزندِ آدم کے گلے کا ہار ہے اور مجھے اپنے اسلاف کی ملاقات کا اشتیاق ہے۔ اتنا ہی جتنا یعقوبؑ کو یوسفؑ سے ملنے کا اشتیاق تھا اور میرے لیے بہت اچھی ہے وہ جگہ جہاں میں کشتہ ہو کر گروں گا۔ گویا میری آنکھوں میں پھر رہا ہے وہ سماں کہ میرے جوڑ بند کو صحرائی درندے[2] جدا کر رہے ہیں، کوئی چارہ کار نہیں اس دن سے جو خطِ تقدیر میں گزر چکا۔ خدا کی مرضی میں ہم اہل بیت کی مرضی ہے۔ ہم اس کے امتحان پر صبر کرتے ہیں اور صابروں کے اجر کو حاصل کرتے ہیں۔ رسولؐ سے ان کے جسم کے ٹکڑے الگ نہیں ہو سکتے۔ جو شخص ہمارے ساتھ اپنی جان کی قربانی پر آمادہ اور خدا سے ملاقات پر تیار ہو وہ ہمارے ساتھ سفر کرے۔ میں کل صبح کو انشاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔ یہ تھی وہ تقریر جو آپ نے گرد و پیش کے لوگوں کے سامنے کی تھی۔ اس رات کو جس کی صبح ہوتے ہوتے آپ مکہ سے روانہ ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ یہ ہے کہ اثنائے سفر میں آپ ہر منزل پر جناب یحییٰ اور ان کی شہادت کو یاد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ دنیا کی بے قدری کے لیے اللہ کے نزدیک یہ کافی ہے کہ اس دنیا میں یحییٰ بن زکریا کا سر قلم ہو کر بنی اسرائیل کے زناکار کے سامنے بطور تحفہ بھیجا گیا۔[3]

یہ بھی حقیقت میں اپنے مستقبل کی طرف ایک اشارہ ہی تھا جو آپ بار بار فرما رہے تھے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۱۸ [2] یعنی دشمنانِ انسانیت [3] ارشاد ص ۲۶۸

پھر بھی آپ کے لیے اپنے عمل کو امکانی تحفظات کے حدود سے آگے بڑھنے دینا روا نہیں تھا۔ آپ کے لیے مکّہ سے فوراً علیحدگی اختیار کرنا ان خطرات کی بنا پر جو اس وقت یہاں پیدا ہو گئے تھے لازمی قرار پا چکا تھا۔ اس کے بعد آپ کہاں جاتے؛ عقلاً اسی جگہ کہ جہاں کے لوگ انتہائی اصرار کے ساتھ آپ کو بلا رہے تھے۔

اس صورت میں کسی شخص کا یہ پہلو آپ کے سامنے لانا کہ اس میں جان کا خطرہ ہے تحصیل حاصل اور فضول تھا۔

جان کا خطرہ تو تھا ہی مگر اس خطرہ کے ہوتے ہوئے کسی ایسی طرف جانا قرینِ مصلحت ہو سکتا تھا جہاں کا جانا "ناخواندہ مہمان" کی حیثیت رکھتا ہو یا ایسی جگہ جہاں کے لوگ الحاح و زاری کے ساتھ دعوت دے رہے تھے۔

خطرہ کے معنیٰ کیا ہو سکتے تھے؛ یہی کہ جان جائے گی، مگر جان جانا تو ناگزیر تھی، پھر یہ جان ایک انسانی اور مذہبی فرض کی ادائیگی کے سلسلہ میں کیوں نہ جائے جس کا نام ہے وعدہ وفائی۔ طالبانِ ہدایت پر اتمامِ حجت اور خلقِ خدا کی فریاد رسی۔ اسی لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ حضرت امام حسینؑ نے ان لوگوں کے خیال کی کبھی رد نہیں کی جو اہلِ کوفہ پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے تھے اور یہ نہیں کہا کہ مجھے ان سے امید ہے کہ وہ اب کی اپنی بات پر قائم رہیں گے مگر اسی کے ساتھ آپ نے ہمیشہ اپنی روانگی کو ان کی طرف ضروری بتلایا جیسا کہ فرزدق سے گفتگو میں جس کا تذکرہ ابھی آئیگا آپ نے فرمایا۔ خانۂ کعبہ میں گرفتاری کا جو خطرہ تھا۔ اس کا ایک حد تک یقینی قرینہ سامنے آگیا۔ اس وقت جب آپ کی مکّہ سے روانگی کے موقع پر حاکمِ مکہ عمرو بن سعید بن العاص کی طرف سے ایک فوجی دستہ نے یحییٰ بن سعید کی قیادت میں بیرونِ شہر آکر آپ سے مزاحمت کی اور آپ کو واپس لے جانا چاہا حضرت نے واپس جانے سے انکار کیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین میں تھوڑی دیر آویزش بھی ہوئی مگر امام حسینؑ کے ساتھ والے پوری بہادری کے ساتھ مقابل جماعت کی مزاحمت کو

ہونے کے لیے تیار تھے اس لیے ان لوگوں کو ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا اور قافلہ روانہ ہوگیا۔[1] دینوری نے لکھا ہے کہ خود عمرو بن سعید نے اس اندیشہ سے کہ صورت حال کچھ نازک نہ ہو جائے اپنے پولیس آفیسر کو واپس آنے کی ہدایت بھیج دی۔[2] یہ سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ ۶۰ھ کا واقعہ ہے اور اسی روز کوفہ میں ابن زیاد کی فوج سے جناب مسلم بن عقیل کا مقابلہ ہو رہا تھا اور دوسرے دن جبکہ وہ شہید ہوئے حضرت امام حسینؑ مکہ سے نکل کر وادیٔ غربت میں راستہ طے فرما رہے تھے۔[3]

آپ کے قیام مکہ کے دوران میں علاوہ آپ کے خاص خاص عزیزوں کے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے کچھ مخصوص افراد اہل حجاز میں سے اور کچھ اہل بصرہ میں سے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے تھے۔ اب یہ سب آپ کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔[4]

مکہ سے کربلا تک کے سفر میں حضرت امام حسینؑ نے جن منزلوں میں قیام کیا تھا انکی تفصیل کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ جہاں تک تاریخی واقعات کی مدد سے ثابت ہوتا ہے ان کی ترتیب واقعات کے ساتھ ساتھ حسب ذیل ہے :-

۱۔ صفاح : یہ مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد پہلی وہ جگہ ہے جس کا نام ملتا ہے۔ یہاں قیام نہیں ہوا بلکہ رہ گزر ہی میں فرزدق بن غالب شاعر سے ملاقات ہوئی۔[5] اور فرزدق نے کوفہ کی حالت بیان کی کہ لوگوں کے دل آپ کی طرف مگر تلواریں ان کی بنی امیہ کے ساتھ ہوں گی۔ آپ نے فرمایا "تم سچ کہتے ہو لیکن ہر بات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھاتا ہے۔ اللہ کی تقدیر اگر ہماری دلی خواہشوں کے مطابق ہو تو ہم اس کا شکر کریں گے اور ادائے شکر کے لیے اسی سے مدد کے طالب ہوں گے اور اگر قضائے الٰہی ہمارے مطلب میں سدِ راہ ہوئی تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اس کی نیت میں سچائی اور اس کے ضمیر میں پارسائی ہو۔[6]

---

[1] طبری ۶ ص ۲۱۷-۲۱۸ - ارشاد ص ۲۲۹ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۴ [3] ارشاد ص ۲۲۸ دینوری کا بیان ہے کہ جس دن جناب مسلم کی شہادت ہوئی اسی دن امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہوئے (الاخبار الطوال ص ۲۴۳)

[4] ارشاد ص ۲۲۸ [5] الاخبار الطوال ص ۲۴۵ [6] طبری ج ۶ ص ۲۱۸، ارشاد ص ۲۲۸

اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ مقصد نیک ہو اور نیت بخیر، اس کے بعد "ہر چہ بادا باد"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کسی کے وعدوں پر اعتماد کر کے منزل عمل میں گامزن نہیں ہوئے تھے بلکہ محض اللہ کے بھروسے پر اس کے عائد کردہ فرض کی تکمیل کے لیے امتحان گاہ عمل میں آ گئے تھے۔

۲۔ تنعیم: اس جگہ یمن کا ایک قافلہ آتا نظر آیا جس سے حضرت نے کچھ اونٹ اپنے اسباب اور ساتھیوں کی سواری کے لیے کرایہ پر لیے اور ان کے مالکوں سے فرمایا کہ تم میں سے جو عراق تک جانا چاہے اسے ہم پورا کرایہ دیں گے اور پھر کچھ انعام بھی عطا کریں گے اور جو راستے سے واپس جانا چاہے گا اسے ہم اتنی دور کا کرایہ دے کر واپس کر دیں گے۔ چنانچہ کچھ لوگ ان میں سے حضرت کے ساتھ عراق تک جانے کے لیے تیار ہوئے۔[1]

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ سے آپ کی روانگی اچانک بغیر کسی تیاری کے ہوئی تھی اس لیے آپ اپنے ساتھیوں کے لیے مکہ معظمہ سے باربرداری اور سواری کا سامان بھی پورا مہیا نہیں فرما سکے تھے۔

اسی منزل پر عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید بن العاص نے امام سے آ کر ملاقات کی۔ واقعہ یہ تھا کہ جب امام حسینؑ مکہ معظمہ سے روانہ ہو رہے تھے اس وقت عبداللہ بن جعفر مدینہ میں تھے۔ ظاہری حالات کی بنا پر امام کا مدینہ سے آنا اس خطرہ کے ماتحت ہوا تھا کہ وہاں کے حاکم کو یزید کا یہ فرمان پہنچ چکا تھا کہ اگر حسینؑ بیعت نہ کریں تو ان کا سر روانہ کیا جائے اور اب مکہ سے روانگی اس اندیشہ کی وجہ سے ہو رہی تھی کہ وہاں کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیج دیے گئے تھے تاکہ جس طرح ممکن ہو حسینؑ کو قتل کر ڈالیں یا گرفتار کر کے شام کی سمت بھیج دیں۔ اس موقع پر عبداللہ بن جعفر نے عونؑ و محمدؑ اپنے دونوں فرزندوں کے ہاتھ امام کے نام یہ خط بھیجا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ میرا خط دیکھتے ہی یہاں واپس آ جائیے کیونکہ اس طرف جدھر آپ کا قصد ہے مجھے آپ کی ہلاکت اور آپ کے اہلبیتؑ کے تباہ ہونے کا اندیشہ

---

[1] ارشاد ص ۲۴۹

روکنے پر تیار تھے اس لیے ان لوگوں کو ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا اور قافلہ روانہ ہو گیا۔[1] دینوری نے لکھا ہے کہ خود عمرو بن سعید نے اس اندیشہ سے کہ صورتِ حال کچھ نازک نہ ہو جائے اپنے پولیس آفیسر کو واپس آنے کی ہدایت بھیج دی۔[2] یہ سہ شنبہ ۸ ذی الحجہ ۶۰ھ کا واقعہ ہے اور اسی روز کوفہ میں ابن زیاد کی فوج سے جناب مسلم بن عقیل کا مقابلہ ہو رہا تھا اور دوسرے دن جبکہ وہ شہید ہوئے حضرت امام حسینؑ مکہ سے نکل کر وادیٔ غربت میں راستہ طے فرما رہے تھے۔[3]

آپ کے قیامِ مکہ کے دوران میں علاوہ آپ کے خاص خاص عزیزوں کے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے کچھ مخصوص افراد اہلِ حجاز میں سے اور کچھ اہلِ بصرہ میں سے آپ کی خدمت میں پہنچ گئے تھے۔ اب یہ سب آپ کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔[4]

مکہ سے کربلا تک کے سفر میں حضرت امام حسینؑ نے جن منزلوں میں قیام کیا تھا انکی تفصیل کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ جہاں تک تاریخی واقعات کی مدد سے ثابت ہوتا ہے ان کی ترتیب واقعات کے ساتھ ساتھ حسب ذیل ہے :-

۱۔ صفاح : یہ مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد پہلی وہ جگہ ہے جس کا نام ملتا ہے۔ یہاں قیام نہیں ہوا بلکہ رہ گزر ہی میں فرزدق بن غالب شاعر سے ملاقات ہوئی۔[5] اور فرزدق نے کوفہ کی حالت بیان کی کہ لوگوں کے دل آپ کی طرف مگر تلواریں ان کی بنی امیہ کے ساتھ ہوں گی۔ آپ نے فرمایا "تم سچ کہتے ہو لیکن ہر بات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہر دن وہ ایک نیا کرشمہ قدرت کا دکھاتا ہے۔ اللہ کی تقدیر اگر ہماری دلی خواہشوں کے مطابق ہو تو ہم اس کا شکر کریں گے اور ادائے شکر کے لیے اسی سے مدد کے طالب ہوں گے اور اگر قضائے الٰہی ہمارے مطلب میں سدِ راہ ہوئی تو انسان کے لیے یہی کیا کم ہے کہ اس کی نیت میں سچائی اور اس کے ضمیر میں پارسائی ہو۔[6]

---

[1] طبری ۶ ص ۲۱۶ - ۲۱۸ - ارشاد ص ۲۲۹ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۴ [3] ارشاد ص ۲۲۸ دینوری کا بیان ہے کہ جس دن جناب مسلم کی شہادت ہوئی اسی دن امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہوئے (الاخبار الطوال ص ۲۴۳)

[4] ارشاد ص ۲۲۸ [5] الاخبار الطوال ص ۲۴۵ [6] طبری ج ۶ ص ۲۱۸، ارشاد ص ۲۲۸

اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ مقصد نیک ہو اور نیت بخیر، اس کے بعد "ہر چہ بادا باد"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کسی کے وعدوں پر اعتماد کر کے منزل عمل میں گامزن نہیں ہوئے تھے بلکہ محض اللہ کے بھروسے پر اس کے عائد کردہ فرض کی تکمیل کے لیے امتحان گاہ عمل میں آ گئے تھے۔

۲۔ تنعیم: اس جگہ یمن کا ایک قافلہ آتا نظر آیا جس سے حضرت نے کچھ اونٹ اپنے اسباب اور ساتھیوں کی سواری کے لیے کرایہ پر لیے اور ان کے مالکوں سے فرمایا کہ تم میں سے جو عراق تک جانا چاہے اسے ہم پورا کرایہ دیں گے اور کچھ انعام بھی عطا کریں گے اور جو راستے سے واپس جانا چاہے گا اسے ہم اتنی دور کا کرایہ دے کر واپس کر دیں گے۔ چنانچہ کچھ لوگ ان میں سے حضرت کے ساتھ عراق تک جانے کے لیے تیار ہوئے۔[1]

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ سے آپ کی روانگی اچانک بغیر کسی تیاری کے ہوئی تھی اس لیے آپ اپنے ساتھیوں کے لیے مکہ معظمہ سے باربرداری اور سواری کا سامان بھی پورا مہیا نہیں فرما سکے تھے۔

اسی منزل پر عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید بن العاص نے امام سے آ کر ملاقات کی۔ واقعہ یہ تھا کہ جب امام حسینؑ مکہ معظمہ سے روانہ ہو رہے تھے اس وقت عبداللہ بن جعفر مدینہ میں تھے۔ ظاہری حالات کی بنا پر امام کا مدینہ سے آنا اس خطرہ کے ماتحت ہوا تھا کہ وہاں کے حاکم کو یزید کا یہ فرمان پہنچ چکا تھا کہ اگر حسینؑ بیعت نہ کریں تو ان کا سر روانہ کیا جائے اور اب مکہ سے روانگی اس اندیشہ کی وجہ سے ہو رہی تھی کہ وہاں کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیج دیے گئے تھے تاکہ جس طرح ممکن ہو حسینؑ کو قتل کر ڈالیں یا گرفتار کر کے شام کی سمت بھیج دیں۔ اس موقع پر عبداللہ بن جعفر نے عونؑ و محمدؑ اپنے دونوں فرزندوں کے ہاتھ امام کے نام یہ خط بھیجا کہ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ میرا خط دیکھتے ہی یہاں واپس آ جائیے کیونکہ اس طرف جدھر آپ کا قصد ہے مجھے آپ کی ہلاکت اور آپ کے اہلبیتؑ کے تباہ ہونے کا اندیشہ

---

[1] ارشاد ص ۲۴۹

ہے اور اگر آپ دنیا سے اٹھ گئے، تو زمین کی روشنی رخصت ہو گئی کیونکہ آپ طالبانِ ہدایت کے لیے نشانِ راہ اور مومنین کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ سفر میں جلدی نہ کیجیے۔ میں خود اس خط کے پیچھے آ رہا ہوں۔ عون و محمد یہ خط لے کر امام کے قافلہ سے راستے میں جا کر ملحق ہوئے۔ اس کے بعد عبداللہ بن جعفر، حاکم مدینہ عمرو بن سعید بن العاص کے پاس گئے اور اس سے گفتگو کر کے ایک امان کا پروانہ امام حسینؑ کے لیے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے[1] عبداللہ کی خواہش کے مطابق عمرو بن سعید نے اس پر مُہر کی اور اپنے بھائی یحییٰ بن سعید کو عبداللہ کے ساتھ کیا۔ عبداللہ، یحییٰ کے ساتھ اس تحریر کو لیے ہوئے مدینہ سے روانہ ہوئے اور راستے میں امام سے ملحق ہو کر تحریر آپ کے سامنے پیش کی۔ آپ خوب جانتے تھے کہ مرکزی حکومت کی پالیسی کے خلاف ایک مقامی حاکم کے امان نامہ کی کیا وقعت ہے۔ آپ نے عبداللہ بن جعفر کی رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ مجھے اب یہاں قیام کرنا مناسب نہیں ہے اور عمرو بن سعید کے نام اس تحریر کا جواب لکھ کر ان کے سپرد کیا[2] عبداللہ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اس سفر میں ساتھ نہ جا سکتے تھے۔ انھوں نے عون و محمد کو حضرت کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی اور خود مدینہ واپس ہو گئے[3]

۳۔ **ذاتِ عراق**: شیخ مفیدؒ نے عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید کی واپسی کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت امام حسینؑ تیزی کے ساتھ عراق کی سمت راہ قطع کرتے رہے یہاں تک کہ ذاتِ عراق میں پہنچ کر قیام فرمایا[4]

۴۔ **بطن الرمہ اور حاجر**: "بطن الرمہ" ایک وادی کا نام تھا جس کے ایک مقام کا نام "حاجر" ہے۔ اس منزل سے آپ نے قیس بن مسہر کو جو اہلِ کوفہ کے فرستادہ آپ

---

[1] عمرو بن سعید مکہ اور مدینہ کا مشترکہ حاکم تھا۔ بظاہر جس وقت امام روانہ ہوئے اس وقت عمرو بن سعید اور اس کا بھائی یحییٰ بن سعید دونوں مکہ میں موجود تھے اور یحییٰ کی قیادت میں ایک دستہ نے آ کر امام کا راستہ روکا۔ اس کے بعد امام عراق کے راستے پر روانہ ہوئے اور یہ دونوں مدینہ چلے گئے۔ وہاں عبداللہ بن جعفر نے عمرو بن سعید سے ملاقات کر کے یہ خط حاصل کیا اور یحییٰ بن سعید کے ساتھ امام سے منزلِ تنعیم پر آ کر ملاقات کی [2] طبری ج ۶ ص ۲۱۹۔ ارشاد ص ۲۲۳

[3] ارشاد ص ۲۲۹ [4] ارشاد ص ۲۲۹۔

کے ساتھ ساتھ تھے۔ اہلِ کوفہ کے نام خط دے کر روانہ فرمایا[1]۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:۔

"یہ خط ہے حسینؑ بن علیؑ کا برادرانِ ایمانی و اسلامی کے نام۔ بعد سلام اور حمدِ الٰہی کے معلوم ہو کہ مسلم بن عقیل کے خط سے مجھے تمھارے حالات کی درستی اور میری نصرت پر تم لوگوں کی ہم آہنگی کا علم ہوا جس پر میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ ہمارے معاملہ کو بہترین صورت پر انجام تک پہنچائے اور تم کو اس کے متعلق بہترین اجر عطا فرمائے۔ میں مکہ معظمہ سے روز شنبہ ۸ ذی الحجہ کو روانہ ہو گیا ہوں۔ جب میرا خط تمھیں پہنچے تو انتظامات مکمل اور تیزی سے اپنا نظام درست کر لینا کیونکہ چند ہی روز میں میں تمھارے یہاں پہنچنے والا ہوں۔ انشاء اللہ۔ والسلام[2]"

بعض کا قول ہے کہ اس خط کو عبداللہ بن لقیطر کے ہاتھ بھیجا تھا[3]۔ اس خط کے مضمون اور نوعیت سے صاف ظاہر ہے کہ مکہ سے نکلنے کے بعد یہ سب سے پہلی منزل ایسی منزل تھی جہاں اطمینان کی سانس لی جا سکتی تھی ورنہ اس خط کو پہلے ہی روانہ کر دیا جاتا۔

قیس اس خط کو لے کر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے مگر جب قادسیہ پہنچے تو حصین کی فوج نے گرفتار کر لیا اور انھیں ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ ابن زیاد نے کہا کہ اگر جان بچانا چاہتے ہو تو منبر پر جا کر حسینؑ بن علیؑ کے خلاف تقریر کرو اور ان کی مذمت بیان کرو۔ قیس یہ سنکر منبر پر چلے گئے۔ مجمع ہمہ تن گوش تھا کہ دیکھیں حسینؑ کا قاصد حسینؑ کے خلاف کیا کہتا ہے مگر انھوں نے مقصدِ امام کی اشاعت کا یہ ایک ممکن موقع پیدا کیا تھا۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد مجمع کو مخاطب کیا اور کہا:۔

"ایھا الناس! اس وقت خلقِ خدا میں بہترین شخص حسینؑ بن علیؑ ہیں جو رسولؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؑ کے فرزند ہیں۔ میں انھی کا بھیجا ہوا تمھارے پاس آیا ہوں۔ تمھارا فرض ہے کہ ان کی نصرت کے لیے قدم آگے بڑھاؤ اور ان کی آواز پر لبیک کہو۔"

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۵ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۷، طبری ج ۵ ص ۳۵۳۔ ارشاد ص ۲۳۰ [3] ارشاد ص ۲۳۰

ابن زیاد غضب ناک ہوا اور اس نے حکم دیا کہ انھیں قصر کے اوپر سے زمین پر گرا دو۔ بے رحموں نے انھیں نیچے گرا دیا جس سے ان کے اعضاء چکنا چور ہو گئے۔[1]

جب آپ اس منزل سے آگے بڑھے تو ایک چشمہ پر عبداللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی جو عراق سے واپس ہو رہے تھے۔ انھوں نے بھی آپ سے مکہ چھوڑنے کا سبب دریافت کیا اور اہلِ کوفہ کی دعوت کا حال سنکر دوسرے تمام مشورہ دینے والوں کی طرح آپ کے کوفہ جانے سے اختلاف کیا۔[2]

۵۔ زرود: اس منزل سے قریب جو چشمہ تھا اس پر زہیر بن القین کا خیمہ نصب تھا۔ یہ حج کر کے مکہ سے واپس ہوئے تھے اور کوفہ جا رہے تھے۔[3] شروع میں ان کو خاندانِ رسولؐ سے کوئی عقیدت نہ تھی بلکہ عام طور پر وہ اہلِ شام کے ہم عقیدہ سمجھے جاتے تھے جس کو اس زمانہ میں "عثمانی" مسلک کہا جاتا تھا۔ مگر امام حسینؑ کی نباضِ فطرت و بصیرت انکی باطنی استعداد کو دیکھ رہی تھی۔ آپ نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ خاندانِ رسولؐ سے جو وحشت عام طور سے اس گروہ میں پیدا کر دی گئی تھی اس کی بنا پر انھوں نے ملنے سے انکار کر دینا چاہا مگر ان کی بیوی نے جو ان کے ساتھ تھیں کہا کہ واہ کیا غضب کی بات ہے کہ رسولؐ کا فرزند تمھارے پاس پیغامِ ملاقات بھیجے اور تم مسترد کر دو۔ اس بات سے متاثر ہو کر یہ امام حسینؑ کے پاس گئے اور کچھ اس طرح صفائی سے ان کے سامنے امام حسینؑ نے اپنے معاملہ کو پیش کیا کہ وہ ہمہ تن آپ کے موافق ہو گئے اور بڑے خوش خوش اپنی قیامگاہ پر پہنچ کر انھوں نے حکم دیا کہ ہمارا خیمہ یہاں سے اکھاڑ کر اصحابِ حسینؑ کے خیموں کے پاس لگا دیا جائے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور ان سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ میکے چلی جائیں پھر ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "میں نے امام حسینؑ کے ساتھ مرنے کا مضبوط ارادہ کر لیا ہے جو شخص تم میں سے ہمارے ساتھ شہید ہونا چاہے وہ میرے ساتھ رہے اور جو نہ چاہے

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۵۔ ارشاد ص ۲۳۰ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۶ طبری ج ۶ ص ۲۲۴ [3] الاخبار الطوال ص ۲۴۶ طبری ج ۶ ص ۲۲۴۔

وہ یہیں سے علیحدہ ہو جائے۔" چنانچہ ساتھ والے سب علیحدہ ہو گئے۔[1]

صورتِ حال سے صاف ظاہر ہے کہ امام کی گفتگو زہیر سے کچھ خوش آئند توقعات یا امید افزا تصورات پر مبنی نہ تھی بلکہ صفائی کے ساتھ اس انجام کار کا انکشاف کر دیا گیا تھا جس پر ابھی تک عام نگاہوں میں توقعات کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر منزلِ عمل میں گامزن ہو رہے تھے۔

پھر بھی چونکہ عوام بالکل ظاہر بین ہوتے ہیں لہٰذا ان کے توقعات امام کی نسبت بہت خوش آئند تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ فرزندِ رسولؐ اپنے باپ بھائی کے پایۂ تخت اور عراق ایسے مردم خیز صوبہ کے صدر مرکز کوفہ کی طرف خود وہیں کے باشندوں کے اصرار و طلب پر جا رہے ہیں وہاں پہنچ کر تخت و تاج، فوج و لشکر اور حشم و خدم سب کچھ مہیا ہوگا۔ حضرت شاہِ عراق تسلیم کیے جائیں گے اور آپکی ذات میں امامت و سلطنت دوش بدوش جمع ہو گی۔ ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر دنیا کے لالچی لوگ بھی جوق در جوق آپ کے ساتھ شامل ہو رہے تھے اور راستے میں آپ کا وہ مختصر قافلہ جو مکہ سے نکلتے وقت خاص خاص لوگوں پر مشتمل تھا اب ایک مختصر لشکر کی صورت اختیار کر چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیشک کوئی بادشاہ ہے جو اپنے مرکزِ سلطنت کی طرف جا رہا ہے لیکن زرود سب سے پہلا وہ مقام تھا جہاں سے روانہ ہونے پر پریشانی کا آغاز ہوا جبکہ عبداللہ بن سلیم اور مذری بن مشمعل دونوں اسدی شخصوں نے جو مکہ معظمہ سے فراغتِ حج کے بعد بہت تیزی سے روانہ ہو کر زرود میں حضرت سے ملحق ہو گئے تھے۔ ایک شخص کو کوفہ کی طرف سے آتے دیکھا۔ امام اس کو دیکھتے ہی ٹھہر گئے تھے کہ کچھ حالات کوفہ کے معلوم کریں لیکن اس نے حسینی قافلہ کو دیکھ کر رخ دوسری جانب کر دیا لہٰذا امام آگے بڑھ گئے۔ ان دونوں اسدی شخصوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس سے کچھ کوفہ کے حالات دریافت کرنا چاہئیں۔ چنانچہ یہ دونوں قافلہ سے جدا ہو کر انتہائی تیز رفتاری

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۴ - ارشاد ص ۲۳۱ - ۲۳۲ - الاخبار الطوال ص ۲۴۶

سے اس جانے والے تک پہنچ گئے اور صاحب سلامت کے بعد اس کا قوم و قبیلہ اور نام و نسب دریافت کیا۔ معلوم ہوا بکیر بن مشعبہ اسدی ہے تو انھوں نے بھی اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ ہم بھی قبیلۂ بنی اسد میں سے ہیں۔ ذرا تم سے اپنے شہر کی حالت دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ "ہاں سنو میں کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل کیے گئے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کی لاش کے پاؤں میں رسی باندھ کر بازار میں گھسیٹا جا رہا ہے۔"[1] بڑی وحشت ناک خبر تھی۔ دونوں آدمیوں نے سن لیا اور موقع شناسی سے کام لے کر اس وقت اسے دل میں رکھ لیا۔ یہاں تک کہ وقت اس کے اظہار کی اجازت دے۔

۶۔ ثعلبیہ : اس منزل پر دوسرے دن شام کے وقت جب امام حسینؑ نے قیام کیا تو دو دلوں اسدی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تسلیم بجا لائے۔ حضرت نے سلام کا جواب دیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہمیں ایک اطلاع دینا ہے۔ حضور فرمائیں تو سب کے سامنے عرض کریں اور اگر ارشاد ہو تو علیحدہ تخلیہ میں کہیں؟ حضرت نے ایک نظر حاضر الوقت اشخاص پر ڈالی اور فرمایا "ان لوگوں سے کسی رازداری کی ضرورت نہیں ہے"۔ انھوں نے کہا کہ "آپ نے اس سوار کو دیکھا تھا جو کل شام کے وقت آ رہا تھا؟" فرمایا "ہاں! اور میں نے اس سے کچھ حالات بھی دریافت کرنا چاہے تھے۔" انھوں نے کہا کہ "ہم نے حضور کی منشا کے مطابق اس سے حالات دریافت کیے اور وہ ہمارے ہی قبیلہ کا آدمی ہے اور بہت سمجھ دار، سچا اور دانش مند شخص ہے۔ اس نے ہم سے بیان کیا کہ وہ کوفہ سے باہر نہیں آیا تھا کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ دونوں شہید کر دیے گئے اور ان کی لاشیں بازاروں میں پھرائی گئیں۔"

بلاشبہ یہ خبر امام حسینؑ کے لیے بہت اندوہناک تھی۔ ایک طرف مسلم کی جدائی کا صدمہ جو آپ کے چچازاد بھائی اور معتمد خاص تھے۔ دوسری طرف اپنے مستقبل کے متعلق

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۵۔ ارشاد ص ۲۳۲

ظاہری تمام امیدوں کا ختم ہو جانا، لیکن ایک رئیس قوم اور سردار کی حیثیت سخت موقع پر بہت ذمہ دارانہ ہوتی ہے اس لیے کہ تمام لوگوں کی نظریں اسی پر ہوتی ہیں۔ اگر کہیں اس کو اضطراب ہوا تو پھر تمام رفقاء اور ساتھیوں پر مایوسی کا چھا جانا اور اضطراب کا پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ اسی لیے اس موقع پر جب یہ اچانک خبر امام حسینؑ کو پہنچی تو آپ نے صرف اتنا کیا کہ چند بار کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ رَحْمَۃُ اللّٰہِ عَلَیْھِمَا اور بس خاموش ہو گئے۔[1] دینوری نے نے کلمۂ استرجاع کے بعد ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ عند اللہ نحتسب انفسنا (یعنی) "ہم اللہ کے یہاں حساب کرتے ہیں اپنی جانوں کا"[2] مطلب اس کا یہ ہوا کہ اسی کی راہ میں ہم اپنی جانوں کو نثار کرتے ہیں اور وہی معاوضہ دینے والا ہے۔

اسدی جو ایک رات تک اس وحشت ناک خبر کو اپنے دل میں رکھ کر اس سے پورا پورا اثر لے چکے تھے اور نتائج کو ہر طرح سوچ کر دل ہی دل میں رائے قائم کر چکے تھے ان سے اپنے دل کی بات چھپائی نہ گئی اور وہ بیساختہ بول اٹھے کہ "خدا کا واسطہ اپنی اور اپنے گھر بھر کی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیے۔ یہیں سے واپس ہو جائیے کیونکہ کوفہ میں آپ کا نہ کوئی مددگار ہے نہ دوست بلکہ ہمیں خوف ہے کہ پورا کوفہ آپ کے خلاف ہی ہوگا۔" ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ہنگامی اضطراب اور تاثر کے جذبہ سے جو ہمدردی کا مشورہ دیا جائے اس کا جواب زیادہ سنجیدہ دلائل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ حضرت امام حسینؑ خود پہلے ہی سے انجام پر مطلع تھے اور آپ کا سفر جن نتائج کو پیش نظر رکھ کر تھا ان میں اس خبر کے آنے سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن دوسرے افراد کے لیے وقتی جذبات کے مقابل میں عقلی دلائل کے پیش کرنے کا محل نہیں ہوا کرتا۔ اس لیے حضرت نے اس ہنگامی جذبہ کے ماتحت مشورہ کا جواب بالکل متضاد ایک فطری جذبہ کے احساس سے دینا چاہا۔ اور اس کے لیے ایک نظر اولادِ عقیل پر ڈالی اور فرمایا "تمھاری کیا رائے ہے؟ مسلم تو شہید ہو گئے۔" تمام عقیلی جوان کھڑے ہو گئے اور کہا "خدا کی قسم ہم تو واپس نہ ہونگے جب تک مسلم کے خون کا بدلہ نہ لے لیں یا وہی موت کا ساغر ہم بھی نہ چکھ لیں جو

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۶

مسلم نے چکھا۔" حضرت متوجہ ہوئے دونوں اسدیوں کی طرف اور فرمایا" جب یہ نہ ہوئے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے"۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ آپ کی اور مسلم کی برابری نہیں۔ آپ کوفہ میں پہنچ جائیں تو کوفہ کے لوگ آپ کی مدد کے لیے دوڑ پڑیں گے"۔ حضرت نے اس خیال کی کوئی تائید نہیں کی اور خاموشی اختیار فرمائی[۱]

رات یہیں گزاری گئی۔ سحر کے وقت آئندہ کی منزلوں کے لیے کافی پانی ساتھ لینے کے بعد آگے روانہ ہوئے یہاں تک کہ زبالہ پہنچے[۲]

۷۔ **زبالہ**: اس منزل پر آیاس بن عثل طائی جو شعراء میں سے تھا محمد بن الاشعث کا بھیجا ہوا خط لے کر امام کے پاس پہنچا۔ چونکہ جناب مسلم نے دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہونے اور اپنی شہادت کا یقین ہو چکنے کے بعد یہ وصیت کی تھی کہ میرے بعد حضرت امام حسینؑ کو اطلاع دے دی جائے کہ کوفہ کی یہ حالت ہے اور آپ کے مددگار اب کوفہ میں موجود نہیں ہیں اس لیے آپ اب یہاں آنے کا ارادہ نہ کیجیے چنانچہ یہ خط بھیجا گیا اور منزل زبالہ پر امام کے پاس پہنچا[۳]

اس قاصد نے یہ بھی اطلاع دی کہ قیس بن مسہر قتل کر دیے گئے[۴]

قرائن بتلاتے ہیں کہ وہ افراد جن کی موجودگی میں جناب مسلم کی خبر شہادت بیان کی گئی تھی واقعی نہایت مخصوص رازدار ہستیاں تھیں۔ اسی لیے اس مجمع کے روبرو مسلم کی خبر شہادت ظاہر ہونے کے بعد پھر بھی عام اہل قافلہ سے وہ راز ہی کی حیثیت سے مخفی رہی مگر حضرت نے اب ان واقعات کو اہل قافلہ سے مخفی رکھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ راستے کے بہت سے عرب آپ کے ساتھ اس غلط خیال کے ماتحت ہو گئے ہیں کہ آپ ایک ایسے ملک کی طرف جا رہے ہیں جہاں لوگ آپ کی سلطنت تسلیم کر چکے

---

۱ الاخبار الطوال ص ۲۴۶۔ طبری ج ۶ ص ۲۲۵۔ ارشاد ص ۲۲۳ ۲ طبری ج ۶ ص ۲۳۵۔ ارشاد ص ۲۲۳
۳ طبری ج ۶ ص ۲۱۱ ۴ طبری ج ۶ ص ۲۰۳ ۵ الاخبار الطوال ص ۲۴۷

ہیں لہٰذا آپ کو یہ منظور نہ ہوا کہ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور حقیقت حال سے تاریکی میں رہنے کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیں۔ آپ کو یقین تھا کہ جب آپ صورت حال کا اظہار کر دیں گے تو بس وہی جان نثار آپ کے ساتھ رہ جائیں گے جو حقیقتاً آپ کے مقصد کے ساتھ ہمدردی رکھتے اور آپ کی نصرت میں جان تک سے ہاتھ دھونا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے حسب ذیل بیان کے ذریعے سے تمام اہل قافلہ کو صورت حال سے مطلع فرمایا:۔

"ہمیں یہ دردناک خبر معلوم ہوئی ہے کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ قتل کر ڈالے گئے اور ہماری اطاعت کے دعویداروں نے ہماری نصرت سے ہاتھ اٹھا لیا اس لیے جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے۔ ہماری طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ والسلام۔"

نتیجہ وہی ہوا جو معلوم تھا کہ اس اعلان کے ساتھ ہی لوگ متفرق ہونا شروع ہوئے اور تقریباً سب دائیں بائیں روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ زیادہ تر وہی لوگ جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے باقی رہ گئے۔[1]

۸۔ **بطن عقیق**[2]: اس منزل پر قبیلہ عکرمہ کا ایک شخص[3] عمرو بن لوذان[4] ملا اور اس نے بتایا کہ ابن زیاد کی طرف سے قادسیہ اور عذیب کے درمیان ناکہ بندی ہو گئی ہے اور اس نے کہا کہ برائے خدا واپس جائیے۔ آپ کے سامنے سوا تلواروں اور نیزوں کے کوئی چیز آنے والی نہیں ہے اور خطوط لکھنے والوں پر بھروسا نہ کیجیے۔ وہی لوگ سب سے پہلے آپ سے لڑنے کے لیے آئیں گے۔ امام حسینؑ نے اس کی خیر خواہی پر اسے دعائے خیر دی اور آگے روانہ ہوئے۔[5]

بظاہر یہ سننے کے بعد کہ قادسیہ کے ناکے پر فوجوں کا پہرہ ہے اور وہاں پہنچنا اپنے

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۷۔ طبری ج ۶ ص ۲۴۶۔ ارشاد ص ۲۳۳ [2] شیخ مفید نے اس منزل کا نام بطن عقبہ لکھا ہے (ارشاد ص ۲۳۳) [3] الاخبار الطوال ص ۲۴۷ [4] ارشاد ص ۲۳۳۔ [5] الاخبار الطوال ص ۲۴۷۔ ارشاد ص ۲۳۳، ۲۳۴

کو یقینی طور پر دشمن کے ہاتھ میں گرفتار کرا دینا ہے آپ نے سمتِ سفر میں ذرا تبدیلی فرمائی اور اسی لیے قادسیہ کہ جس کا ہر کوفہ جانے والے کے محلِ گزر میں واقع ہونا ضروری تھا اور جہاں قیس بن مسہر گرفتار کیے گئے تھے آپ کے منازلِ سفر میں واقع نہیں ہوا اور آپ کا اس فوج سے تصادم نہیں ہوا جو حصین کی سرکردگی میں قادسیہ کے حدود میں مقیم تھی۔

۹۔ سراۃ: بطنِ عقیق سے روانہ ہو کر امام نے یہاں رات بسر کی۔[1]

۱۰۔ شراف: طبری اور شیخ مفید کی تصریح کے مطابق ثعلبیہ و زبالہ کے بعد اس منزل پر امام نے حکم دیا کہ پانی بھر لو اور مشکیں اور چھاگلیں پُر کر لو۔[2] اس منزل سے آگے بڑھے اور اب غالباً محرم ۶۱ھ کا چاند فلک پر نمودار ہو چکا ہے۔

پہلی تاریخ دوپہر کو امام حسینؑ کا قافلہ منزلِ شراف کے حدود سے آگے بڑھا تھا۔ قادسیہ سے تین میل کے فاصلہ پر[3] کہ آپ کے اصحاب میں کسی نے کہا۔ "اللہ اکبر"۔ امام نے فرمایا بے شک اللہ سب سے بڑا ہے مگر اس وقت تکبیر کہنے کی وجہ؟ اس نے کہا، مجھے خرمے کے درخت دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی آبادی نزدیک ہے۔ اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اس جگہ تو کبھی ہم نے درخت خرما دیکھے نہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ پھر تم ہی دیکھو کیا دکھائی دیتا ہے؟ انھوں نے کہا، ہم کو تو گھوڑوں کی گردنیں[4] یا کنوتیاں[5] نظر آتی ہیں۔ حضرت نے فرمایا، میں بھی یہی دیکھتا ہوں۔

۱۱۔ ذو حسم: مخالف فوج کو ادھر متوجہ پا کر امام حسینؑ نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ یہاں کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جسے ہم اپنی پشت پر قرار دے کر دشمن سے سامنے کی جانب سے مقابلہ کریں۔ مطلب یہ تھا کہ چاروں طرف سے گھرنے کا امکان باقی نہ رہے۔ لوگوں نے کہا یہ ذو حسم[6] پہاڑ موجود ہے جو آپ کے بائیں پہلو کی طرف ہے۔ آپ اس کی طرف متوجہ

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۷ [2] طبری ج ۶ ص ۲۲۷ ارشاد ص ۲۳۳۔ ۲۳۴ [3] طبری ج ۶ ص ۲۲۰

[4] طبری ج ۶ ص ۲۲۷ [5] ارشاد ص ۲۳۴ [6] دینوری نے ذو جشم لکھا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۴۷)

ہو جیسے۔ اگر ہم دشمن کے پہلے اس حد تک پہنچ گئے تو مقصد حاصل ہو جائے گا۔ حضرت نے اس رائے کو پسند فرمایا اور بائیں طرف کا رُخ کیا۔ آنے والی سپاہ نے جو یہ دیکھا تو اس نے بھی اسی طرف کا رُخ کر دیا۔ مگر امام وہاں پہلے پہنچ گئے تھے۔ اصحاب کو حکم دیا کہ خیمہ نصب کر دیے جائیں فوراً تعمیل کی گئی۔ اتنی دیر میں وہ فوج بھی قریب پہنچ گئی۔ معلوم ہوا کہ حُر بن یزید ریاحی ایک ہزار کی فوج کے ساتھ سدِّ راہ ہونے کے لیے آیا ہے[1] چونکہ امام کوفہ کے عام راستے پر نہیں جا رہے تھے جو قادسیہ سے ہو کر گزرتا تھا اس لیے حصین کی فوج سے تصادم نہ ہوا جو قادسیہ میں پڑی ہوئی تھی مگر جاسوسوں نے حصین کو آپ کے اس طرح بچ کر آگے بڑھ جانے کی اطلاع دے دی تھی اس لیے حصین نے حُر کو اس ایک ہزار فوج کے ساتھ آپ کا راستہ روکنے کے لیے آگے روانہ کیا[2] دوپہر کا وقت اور گرمی کا موسم[3] اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ناکہ بندی پر معین فوج کے حلقہ سے بہت دور دور جا رہے تھے اس لیے حُر کو آپ تک پہنچنے کے لیے غیر معمولی تگ و دو کرنا پڑی اور ریگستان میں بغیر پانی ساتھ لیے ہوئے بہت تیز چلنا پڑا اس لیے یہاں پہنچتے پہنچتے فوج کے سوار اور گھوڑے سب ہی کی پیاس کے مارے حالت تباہ تھی۔

امام اپنے اصحاب سمیت عمامے سروں پر رکھے، تلواریں حمائل کیے کھڑے تھے کہ دشمن کے ہانپتے ہوئے گھوڑے اور سوار سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ آثار پیاس کی شدت کے گواہ تھے اور صورت سوال۔ حسینؑ ایک حساس دل رکھتے تھے جس میں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپ کے لیے دشمن کی موجودہ حالت ناقابلِ برداشت تھی۔ آپ نے اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ ان کو پانی پلاؤ اور تمام فوج کو پوری طرح سیراب کر دو۔ حکم

---

[1] الاخبار الطوال ص۲۴۷۔ طبری ج ۶ ص۲۲۷ [2] طبری ج ۶ ص۲۲۷۔۲۲۸ [3] الاخبار الطوال ص۲۴۷

کی دیر تھی اطاعتِ امام پر کمربستہ جوان کھڑے ہو گئے، اور سب کو سیراب کیا۔[1] حالت یہ تھی کہ پیالے، لگنیں، طشت پانی سے بھرتے تھے اور گھوڑوں کے پاس لے جاتے تھے۔ جب ہر گھوڑا تین، چار، پانچ دفعہ پی کر منہ ہٹا لیتا تھا تب دوسرے گھوڑے کے پاس لے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ راکب و مرکب سب سیراب ہو گئے۔ علی بن طعان محاربی حُر کا ایک ساتھی تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میری حالت پیاس سے بہت تباہ تھی اور سب سے آخر میں میں پہنچا۔ جب امام حسینؑ نے میری اور میرے گھوڑے کی پیاس کو دیکھا، فرمایا "رادیہ (یعنی شتر آبکش کو) بٹھالو"۔ میری زبان میں "رادیہ" مشک کو کہتے تھے اس لیے میں اس کے معنی نہ سمجھا۔ حضرت نے فرمایا "جمل (یعنی اونٹ) کو بٹھالو"۔ میں نے اونٹ کو بٹھایا۔ حضرت نے فرمایا، اب پانی پیو۔ مگر میں اتنا بدحواس تھا کہ جتنا پینے کی کوشش کرتا پانی زمین پر بہتا اور مجھ تک نہ پہنچتا۔ امام نے کہا مشک کے دہانے کو اپنی طرف موڑ لو۔ پھر بھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ تب حضرت خود اٹھے اور مشک کے دہانے کو ٹھیک کر کے مجھے دیا۔ میں نے خود بھی پانی پیا اور اپنے گھوڑے کو سیراب کیا۔[2]

امام حسینؑ کی اس بلند ظرفی کا جو اثر مخالف سردار یعنی حُر کے دل پر قائم ہوا اس کے ظاہر ہونے کا ابھی وقت نہ آیا تھا لیکن کم از کم وہ ششدر رہ گیا ہو گا کہ اس احسان کے بعد اب اس بزرگ فطرت انسان سے کس طرح گفتگو کروں امام نے بھی اپنے فطری استقلال و اطمینان کی وجہ سے اس وقت کچھ نہ پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو اور کیا مطلب ہے؟ فوج حُر کے سپاہی اپنے گھوڑوں کے سایہ میں باگیں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے بیٹھ گئے۔[3] یہاں تک کہ ظہر کی نماز کا وقت آیا اور امام حسینؑ نے حجاج بن مسروق جعفی کو اذان کا حکم دیا اور انھوں نے اذان کہی۔ جب نماز جماعت کی صفیں تیار ہو گئیں تو امام اپنے نماز کے لباس میں خیمہ سے برآمد ہوئے اور اقامت کا حکم دیا۔ اس کے بعد آپ نے حُر سے فرمایا کہ تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو گے یا اپنے ساتھیوں کو الگ نماز پڑھانا چاہتے ہو؟ حُر نے کہا نہیں، آپ نماز پڑھائیے اور ہم سب آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۷، طبری ج ۶ ص ۲۲۷ [2] طبری ج ۶ ص ۲۲۶۔ ارشاد ص ۲۳۴ [3] الاخبار الطوال ص ۲۴۷

ایسا ہی ہوا اور دونوں جماعتوں نے امامؑ کے پیچھے نماز ادا کی[1]

نماز کے بعد حضرت نے اس جماعت کی طرف رخ کیا اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد حُرؑ اور اس کی فوج کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد کیا۔ "اے گروہِ مردم! میں خدا کی بارگاہ میں اور تمہارے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا ہوں۔ میں تمہاری طرف اس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ تمہارے خطوط میرے پاس نہیں گئے کہ آپ ہماری طرف آئیے۔ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ شاید خدا آپ کے ذریعہ سے ہمیں ہدایت پر مجتمع کر دے اب اگر تم اپنی بات پر قائم ہو تو میں آ ہی گیا ہوں۔ اپنے ارادہ پر قائم رہوں اور اگر تم میرے آنے سے ناراض ہو تو میں واپس چلا جاؤں وہیں جہاں سے آیا ہوں۔" اس تقریر کے بعد خاموشی چھائی اور کوئی جواب نہیں ملا[2] آخر حضرت اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور آپ کے اصحاب آپ کے خیمہ میں مجتمع ہو گئے۔ حُرؑ اس خیمہ میں جو اس کے لیے لگایا گیا تھا داخل ہوا اور اس کے کچھ ساتھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ دوسرے لوگ متفرق طور پر اسی میدان میں اسی شان سے کہ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ہاتھوں میں لے لیں ان ہی کے سایہ میں دوپہر کا وقت گزرنے تک بیٹھے رہے[3] عصر کا وقت ہوا تو امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ روانگی کی تیاری کرو۔ پھر آپ نے باہر آ کر عصر کی نماز کا اعلان کیا اور اسی صورت سے حضرت کی اقتدا میں دونوں گروہوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد آپ نے پھر مجمع کی طرف رخ کیا اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا۔ "اگر تقویٰ اختیار کرو اور حقدار کا حق پہچانو تو خدا کی رضامندی حاصل کرو گے۔ حقیقتاً ہم اہل بیتؑ امتِ اسلامیہ کی فرمانروائی کے ان لوگوں سے زیادہ مستحق ہیں۔ جو آج اس منصب کے غلط دعویدار ہیں اور مسلمانوں پر ستم ڈھاتے ہیں لیکن اگر تم ہم کو ناپسند کرتے ہو اور ہمارے حق کا اقرار نہیں رکھتے ہو اور اس رائے کے خلاف ہو جو تمہارے خطوط اور قاصدوں کے بیانات سے ظاہر ہو رہی تھی تو میں واپس چلا جاؤں گا۔"[4] اب حُرؑ کی مُہرِ خاموشی ٹوٹی اور اس نے کہا۔ "ہمیں تو بخدا خبر بھی نہیں کہ یہ خطوط کیسے ہیں؟ جن کا

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۷۔ طبری ۶ ص ۲۲۸۔ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۸۔ طبری ج ۶ ص ۲۲۸ [3] طبری ج ۶ ص ۲۲۸
[4] طبری ج ۶ ص ۲۲۸۔ ارشاد ص ۲۳۵ - ۲۳۶

آپ حوالہ دے رہے ہیں۔

امام نے عقبہ بن سمعان سے فرمایا لاؤ وہ تھیلے جن میں ان لوگوں کے خطوط بھرے ہوئے ہیں۔ عقبہ نے دو تھیلے خطوط سے بھرے ہوئے لاکر سامنے رکھے اور ان میں سے خطوط نکال کر پھیلا دیے۔ حُر نے کہا کہ ہم تو ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے آپ کو خطوط لکھے ہیں۔ ہم تو مامور کیے گئے ہیں۔ اس پر کہ جہاں بھی آپ مل جائیں پھر ہم آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ یہاں تک کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس پہنچا دیں۔ یہ سننا تھا کہ امام نے زور سے کہا کہ "موت تمھارے لیے اس سے قریب تر ثابت ہوگی۔" [1]

اور اس کے بعد آپ نے کوفہ جانے کا ارادہ کلیتہً ترک کر دیا یعنی اس کے پہلے راستہ بدلنے کے بعد بھی آپ کا رُخ کوفہ ہی کی طرف تھا۔ لیکن اب کوفہ جانے کے خیال ہی کو ذہن سے نکال دیا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے اصحاب کے سامنے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں حمد و ثنائے باری کے بعد فرمایا۔ "صورتِ حال جو پیش آئی ہے وہ تم دیکھ رہے ہو یقیناً دنیا کا رنگ بدل گیا ہے اور اس کی نیکی رخصت ہو چکی ہے اور اس میں کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ سوا ایسے تھوڑے حصّہ کے جو پانی کے بہنے کے بعد کسی ظرف میں بچ رہتا ہے اور ایک پست زندگی کے جو مثل زہریلی گھاس کے ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی نہیں اختیار کی جاتی۔ اس صورت میں مومن یقیناً خدا کی ملاقات کا آرزومند ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تو موت کی صورت میں شہادت کی سی نعمت ہے اور زندہ رہنا ان ظالموں کے درمیان وبالِ جان ہے۔" اس خطبہ کا مقصد صرف اصحاب کو انجام کار کی طرف ایک مرتبہ پھر متوجہ کرنا اور اس طرح ان کو اپنے عزائم کی پختگی کا دوبارہ جائزہ لینے کی دعوت دینا ہی قرار دیا جا سکتا تھا اور اس لیے ضرورت تھی کہ اس تقریر کو سنکر اصحاب کی جانب سے خلوصِ نیّت اور پختگیٔ عزم کا قرار واقعی اظہار کر دیا جاتا چنانچہ امام کی تقریر ختم ہوتے ہی زہیر بن قین کھڑے ہو گئے اور اس احساس کی بنا پر

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۸، طبری ج ۶ ص ۲۲۸۔ ارشاد ص ۲۴۶

کہ میں اس جماعت میں تازہ شریک ہوا ہوں اس لیے مجھے ایسے مواقع پر سبقت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ دوسرے اصحاب سے ان الفاظ میں تقریر کی اجازت چاہی کہ آپ لوگ پہلے تقریر کریں گے یا میں کچھ کہوں؟ سب نے کہا کہ نہیں تم تقریر کرو۔ زہیر نے حمد و ثنائے الٰہی کے بعد کہا:۔

"اللہ آپ کو مقصد تک پہنچائے اے فرزند رسولؐ! ہم نے آپ کے ارشاد کو سنا خدا دنیا اگر ہمارے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی مگر جدا ہونا اس سے محض آپ کی نصرت اور ہمدردی کی بنا پر ہوتا تو بھی ہم آپ کا ساتھ دینے کو دنیا میں ہمیشہ قیام پر ترجیح دیتے"

یہ سنکر امام نے زہیر کو دعائے خیر دی اور ان کے خلوص کی تعریف کی[1] اس کے بعد نافع بن ہلال جملی کھڑے ہوئے اور انھوں نے حسب ذیل پُرزور تقریر کی:۔

"فرزند رسول! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جد بزرگوار کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہوا کہ لوگوں کو اپنی محبت گھول کر پلا دیں اور لوگ حضرت کی اس طرح اطاعت کرنے لگیں جس طرح کہ حضرت چاہتے تھے اور حضرت کے ساتھ والوں میں بہت سے منافق تھے جو حضرت سے نصرت کا وعدہ کرتے تھے مگر دماغ میں غداری کا خیال مضمر رکھتے تھے وہ باتیں تو ایسی بناتے تھے جو شہد سے زیادہ شیریں ہوتیں مگر کردار سے مخالفت کرتے ایسی جو انتہائی تلخ ثابت ہوتی یہاں تک کہ رسول اللہؐ کا انتقال ہو گیا اس کے بعد آپ کے والد بزرگوار حضرت علیؑ کو بھی اسی صورت سے دوچار ہونا پڑا۔ کچھ لوگ ان کی نصرت پر متفق ہوئے اور انھوں نے ان کا ساتھ دیتے ہوئے ناکثین و قاسطین و مارقین (جمل صفین اور نہروان والوں) سے جنگ کی اور کچھ لوگوں نے مخالفت کی۔ یہاں تک کہ حضرت کی وفات ہو گئی اور آج ہمارے سامنے آپ کے لیے وہی صورت درپیش ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے عہد کو توڑے گا اور نیت کو خراب کریگا وہ خود اپنا برا کرے گا اور خدا آپ کو اس سے لاپرواہ کر دے گا۔ بسم اللہ چلیے ہم

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۹

کو لے کر خیر و سلامتی کے ساتھ چاہے مشرق کی طرف اور چاہے مغرب کی جانب ، ہم بخدا خدا کے مقرر فیصلہ سے خوفزدہ نہیں ہیں اور نہ اپنے رب کی ملاقات (موت) سے کراہت رکھتے ہیں۔ ہم اپنی نیتوں اور اعتقادوں پر قائم ہیں۔ موالات رکھتے ہیں۔ اس شخص سے جو آپ کے ساتھ موالات رکھے اور دشمن ہیں اس کے جو آپ سے دشمنی کرے۔"

پھر بریر بن خضیر ہمدانی نے تقریر کی :۔

خدا کی قسم اے فرزند رسولؐ! یہ خدا کا ہم پر احسان ہے کہ اس نے ہم کو موقع دیا اس بات کا کہ ہم آپ کے سامنے جنگ کریں اور آپ کی نصرت کے سلسلہ میں ہمارے اعضاء و جوارح قطع کیے جائیں یہاں تک کہ آپ کے جد بزرگوار روز قیامت ہمارے شفاعت خواہ ہوں کیونکہ وہ جماعت کبھی نجات نہیں پاسکتی جس نے اپنے نبی کے نواسے کو تہ تیغ کیا ہو اور وائے ہو ان کے لیے وہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے اور ان کا کیا حال ہوگا۔ اس دن جب وہ آتش جہنم میں نالہ و فریاد کرتے ہوں گے۔"[1]

اس گفتگو کے بعد امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اپنی سواریوں پر سوار ہو جاؤ اور سب لوگ یہاں تک کہ خواتین بھی اپنی عماریوں میں سوار ہو گئیں۔ آپ نے حکم دیا کہ چلو جس راستے سے آئے ہیں اسی راستے پر واپس چلو۔ جب اصحاب نے ارادہ پلٹنے کا کیا حُر کی سپاہ سامنے آکر سدِ راہ ہوئی۔ اس پر امام نے دریافت کیا کہ "تمہارا مطلب کیا ہے؟" حُر نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جاؤں"۔ حضرت نے فرمایا۔ "خدا کی قسم یہ نہیں ہوگا"۔ حُر نے کہا "پھر میں بخدا آپ کو چھوڑوں گا بھی نہیں۔" یونہی تین مرتبہ ردّ و بدل ہوئی۔

آخر میں حُر نے کہا کہ "میں آپ سے جنگ کرنے پر مامور نہیں ہوا ہوں۔ مجھے تو بس یہ حکم ہوا ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ رہوں یہاں تک کہ آپ کو کوفہ پہنچیں۔ اب اس صورت میں کہ آپ کوفہ جانے سے ہی انکار کرتے ہیں تو ایک ایسا راستہ اختیار کیجیے جو نہ کوفہ کی طرف جاتا ہو اور نہ مدینہ کی طرف

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۹

بس میرے اور آپ کے درمیان انصاف کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اس وقت تک کہ جب تک مجھے حاکم کی رائے معلوم ہو۔" حضرت کو حُر کی یہ بات معقول معلوم ہوئی، اور آپ قادسیہ و عذیب کے راستے سے بائیں سمت کی طرف متوجہ ہو گئے، اور حُر بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلا۔ تاریخ میں صراحت ہے کہ یہاں سے اور عذیب تک ۳۸ میل کا فاصلہ تھا۔[1]

راستے میں امام حسینؑ اور حُر کے درمیان جو گفتگو ہوتی جاتی تھی وہ بھی بڑی معنی خیز تھی۔ حُر نے کہا "میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے اوپر رحم کریں اس لیے کہ اگر آپ نے جنگ کی تو یقیناً آپ قتل کر دیے جائیں گے اور تباہ ہوں گے۔" حضرت نے جواب دیا "کیا تم مجھے موت سے ڈراتے ہو؟ کیا تم اس سے زیادہ کچھ کر سکتے ہو کہ مجھے قتل کر ڈالو؟" اس کے بعد حضرت نے قبیلۂ اوس کے ایک شاعر کا وہ شعر پڑھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "میں اپنے ارادہ پر قائم رہوں گا اور موت سے دوچار ہونے میں جوانمرد کے لیے کوئی عار و ننگ نہیں ہے جبکہ اس کی نیت میں سچائی ہو اور وہ راہِ حق میں جہاد کر رہا ہو۔"

حُر اس انتہائی عزم و استقلال کا اظہار سن کر حسینی قافلہ سے کچھ دور ساتھ ساتھ ہو کر راستہ طے کرنے لگا۔[2]

۱۰ ربیعہ: اس مقام پر امام حسینؑ نے فوجِ حُر اور اپنے اصحاب کے سامنے ایک تقریر فرمائی جس میں اسلام کے تعلیمات کے حوالہ سے اپنے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ "ایہا الناس پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی بادشاہ کو دیکھے کہ وہ ظلم و جور کرتا ہے، محرماتِ الٰہیہ کو حلال بنائے ہوئے ہے خدائی عہد و پیمان کو توڑ دیتا ہے، سنتِ رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے اور بندگانِ خدا میں معصیت کا طرز اختیار کیے ہوئے ہے اور یہ شخص ان باتوں کو گوارا کرے اور اصلاح کی کوشش نہ کرے، اپنے قول اور اپنے عمل سے تو وہ مستحق ہوگا اس کا کہ اللہ اس کو بھی اسی بادشاہ کے درجہ میں محسوب کرے۔"

اس کے بعد موجودہ صورتِ حال پر تبصرہ کی حیثیت سے فرمایا:-

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۸-۲۴۹ - طبری ج ۶ ص ۲۲۸-۲۲۹ - ارشاد ص ۲۳۶ [2] طبری ج ۶ ص ۲۲۹ - ارشاد ص ۲۳۶-۲۳۷

"تمھیں معلوم ہوگا کہ ان بنی امیہ نے اطاعتِ شیطان کو اپنا راستہ بنا لیا اور اللہ کی اطاعت سے روگردانی کی ہے۔ مسلمانوں کے اموال کو اپنا لیا ہے اور حرامِ خدا کو حلال اور حلالِ خدا کو حرام قرار دے لیا ہے۔ اس صورت میں مجھ سے زیادہ کس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کی کوشش کرے۔" [1]

۱۲۔ **عذیب الہجانات**[2]: اس منزل پر امام حسینؑ اور حُر کے لشکر نے ایک تیر کی مسافت کا فاصلہ درمیان میں چھوڑ کر الگ الگ قیام کیا۔[3] اسی اثنا میں کوفہ کے پانچ آدمی اپنے مرکبوں پر سوار وارد ہوئے جن کے ساتھ ایک کوتل گھوڑا تھا۔ ان کے راستہ بتانے والے طرماح بن عدی ساتھ تھے۔ یہ پانچ آدمی عمر بن خالد اسدی صیداوی، ان کے غلام سعد، مجمع بن عبداللہ عائذی، ان کے فرزند عائذ بن مجمع اور جنادہ بن حارث سلمانی تھے۔ حُر نے جو امام کی نقل و حرکت کا نگران تھا بڑھ کر کہا کہ "یہ کوفہ کے لوگ ہیں اور آپ کے ساتھ آنے والوں میں سے نہیں ہیں لہٰذا میں انھیں قید کر دوں گا یا کوفہ واپس کر دوں گا۔" امام نے فرمایا۔ "اب جب یہ میرے پاس پہنچ گئے ہیں تو ان کی حفاظت میرے ذمہ ہے اور اب وہ میرے انصار و اعوان کی جماعت میں داخل ہو گئے ہیں۔" حُر خاموش ہو گیا۔

حضرت نے ان سے اہلِ کوفہ کی کیفیت دریافت کی۔ مجمع بن عبداللہ عائذی نے کہا کہ بڑے آدمیوں کو رشوتیں دی گئی ہیں اور مال و دولت سے پُر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے وہ سب آپ کے خلاف متفق ہیں۔ رہ گئے دوسرے لوگ، ان کے دل آپ کی طرف مگر تلواریں ان کی آپ کے خلاف ہی بلند ہوں گی۔ انھوں نے قیس بن مسہر کی شہادت کے حالات بھی بیان کیے جس پر امام کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور آپ نے قرآن کی آیت پڑھی۔ فمنھم من قضیٰ نحبہ و منھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ اس راستے پر چلے گئے اور ہمیں بھی اسی راستے پر جانا ہے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۹ [2] یہ نام اس مقام کا اس لیے ہوا کہ نعمان بن منذر بادشاہِ حیرہ کی ہجائن یعنی اونٹنیاں اس مقام پر چرا کرتی تھیں (طبری ج ۶ ص ۲۳۰)

طرماح نے امام سے ابن زیاد کی افواج کی کثرت بیان کی اور کہا "کوفہ سے باہر نکلنے کے پہلے میں نے پشتِ کوفہ پر اتنا عظیم لشکر دیکھا ہے جتنا آج تک تو میری نظروں سے نہیں گزرا تھا اور میں نے دریافت کیا تو بتلایا گیا کہ یہ سب اس لیے اکٹھے ہیں کہ ان کا جائزہ لیا جائے گا اور پھر یہ حضرت امام حسینؑ سے مقابلہ کے لیے روانہ ہوں گے۔"

یہ بیان کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ "اس جماعت سے مقابلہ آپ کے لیے ممکن نہیں لہٰذا آپ میرے ساتھ کوہِ اجا پر چلیے جہاں شاہانِ غسان و حمیر اور نعمان بن منذر لیسے زبردست بادشاہ تک ہم پر قابو نہیں پا سکے، وہاں میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ قبیلۂ طے کے بیس ہزار سپاہی آپ کی مدد کے لیے تیار ہوں گے۔"

امام نے طرماح کی مخلصانہ پیشکش پر انھیں دعائے خیر دی لیکن ان کے مشورہ پر عمل کرنے سے معذوری ظاہر فرمائی۔[1]

۱۳۔ قصرِ بنی مقاتل: عذیب الہجانات سے امام حسینؑ کوفہ کے راستے کو چھوڑ کر داہنے ہاتھ کی سمت روانہ ہوئے یہاں تک کہ قصرِ بنی مقاتل پہنچے۔ یہاں پہنچکر آپ نے اور ساتھی ساتھ حُر نے بھی قیام کیا۔[2]

اسی منزل پر کوفہ کے بہادروں اور شاہسواروں میں سے ایک شخص عبیداللہ بن حُر جعفی قیام پذیر تھا۔ حضرت نے اتمامِ حجت کے لیے اسے نصرت کی دعوت دی۔ مگر اس کی قسمت میں یہ سعادت نہ تھی اور اس کی قوتِ ارادی ابھی اس پختگی تک پہنچی ہوئی نہ تھی، اس نے حیلہ حوالہ کر کے اس موقع کو ہاتھ سے دے دیا[3] جس پر اُسے عمر بھر افسوس رہا اور بعد میں خونِ امام کے انتقام لینے میں شریک ہوا۔

یہاں سے روانگی کے قبل رات کے آخری حصہ میں حضرت نے اپنے قافلہ کے جوانوں کو پانی بھر کر ساتھ لینے کا حکم دیا جس کی تعمیل ہوئی۔ پھر سب آگے روانہ ہوئے۔[4]

ابھی تھوڑا راستا طے ہوا تھا کہ امام پر کچھ غنودگی سی طاری ہوئی۔ آنکھ کھلی تو آپ فرما رہے تھے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ - ۲۳۰ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۹ [3] طبری ج ۶ ص ۲۳۱، الاخبار الطوال ص ۲۴۹
[4] طبری ج ۶ ص ۲۳۱ -

"انا للہ وانا الیہ راجعون والحمد للہ رب العالمین" دو تین مرتبہ آپ نے یہی کلمات زبان مبارک پر جاری فرمائے۔

اس وقت آپ کے فرزند علی اکبر گھوڑا بڑھا کر آپ کے قریب آئے اور اس وقت ان کلمات کے زبان پر جاری کرنے کا سبب دریافت کیا۔ حضرت نے فرمایا۔ "ابھی میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے ایک سوار کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ "یہ لوگ تو راستے پر جا رہے ہیں اور موت ان کی طرف آ رہی ہے"۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح ہماری موت کی اطلاع دی گئی ہے۔" علی اکبر نے عرض کیا کہ "بابا خدا آپ کو رنج کی صورت نہ دکھلائے، کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟" امام نے فرمایا "کیوں نہیں، یقیناً قسم اس خدا کی جس کی جانب تمام خلق کی بازگشت ہے، ہم حق پر ہیں۔" علی اکبر نے کہا "جب ہم حق پر ہیں تو پھر ہمیں موت کی کیا پروا ہے"۔ امام نے فرمایا۔ "بیٹا تمھیں خدا جزائے خیر دے بہترین جزا جو کسی بیٹے کو اس کے باپ کی طرف سے مل سکتی ہو[1]۔" یہ عزتِ نفس، اطمینانِ قلب اور ثباتِ ضمیر کا عجب مرقع تھا۔

۱۳۔ نینوا: قافلہ راستہ قطع کر رہا ہے۔ امام آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور حُر کی طرف سے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ نینوا کی زمین تک پہنچنا ہوا۔ یہاں ایک سوار مسیح کوفہ کی طرف سے آتا دکھائی دیا، اور سب ٹھہر کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ پہنچا تو اس نے حُر اور اس کے اصحاب کو تو سلام کیا لیکن حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کو سلام کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ یہ ابن زیاد کا قاصد تھا جو حُر کے نام خط لایا تھا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ تم کو لازم ہے کہ جہاں پر تم کو یہ خط پہنچے وہیں پر حسینؑ کو آگے بڑھنے سے روک دو اور انھیں ایسی جگہ قیام کرنے پر مجبور کرو جہاں آب و گیاہ موجود نہ ہو اور نہ کوئی قلعہ یا جائے پناہ ہو اور میں نے اپنے فرستادہ کو حکم دے دیا ہے کہ وہ تمھارے ساتھ ساتھ رہے اور تمھاری کارگزاری کی مجھے اطلاع دے[2]۔ اور تم سے جدا نہ ہو جب تک کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے۔ والسلام[3]۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ارشاد ص ۲۳۷، ۲۳۸۔ [2] الاخبار الطوال ص ۲۴۹۔ ۲۵۰۔
[3] طبری ج ۶ ص ۲۳۲۔ ارشاد ص ۲۳۸۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام کے ساتھ حُر کے روادارانہ برتاؤ کی اطلاع ابن زیاد کو ہوگئی۔ اس کا امام کے پیچھے اپنی فوج سمیت نماز پڑھنا اور پھر کوفہ لے جانے کے مطالبہ سے دست بردار ہو کر یہ صورت تجویز کرنا کہ مدینہ اور کوفہ کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ اختیار کیا جائے۔ یہ باتیں وہ ہو سکتی ہیں جن سے حُر کی وفاداری ابن زیاد کی نگاہ میں مشکوک بن جائے اور شاید اسی بناء پر اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے حکم کی تعمیل میں حُر کی نگرانی اپنے قاصد سے کرائے۔ حُر جو کچھ بھی ابھی تک دنیا کا بندہ تھا اس لیے ہزار ناچاری و مجبوری اور ناخواستگی طبع کے ساتھ سہی مگر اس نے امام اور آپ کے اصحاب کے روبرو آکر یہ اعلان کیا کہ یہ امیر ابن زیاد کا خط ہے۔ اس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ جہاں بھی مجھے یہ خط پہنچے وہیں پر میں آپ کو اترنے پر مجبور کروں اور یہ ابن زیاد کا قاصد ہے جسے حکم ہے کہ وہ مجھ سے بغیر اس حکم کی تعمیل کرائے ہوئے الگ ہی نہ ہو۔ اس طرح حُر نے واقعہ، صورت حال کو صفائی کے ساتھ پیش کر دیا۔ اس کے بعد امام نے نہ چاہا کہ اس کے ضمیر کی طاقت کا زیادہ امتحان لیا جائے۔ آپ نے اتنا کہا کہ اچھا ہم کو ذرا آگے بڑھ کر اس قریہ میں قیام کرنے دو جس کا نام غاضریہ ہے یا اس دوسرے قریہ میں جس کا نام شفیہ ہے[1] مگر حُر نے کہا کہ مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ مجھے تو حکم ہے کہ میں آپ کو ایسے خشک صحرا میں اتاروں جہاں آب و گیاہ نہ ہو اور یہ شخص مجھ پر نگران مقرر کیا گیا ہے کہ یہ میرے طرز عمل کی جا کر اطلاع دے۔ اس جواب پر اصحاب امام میں جوش پیدا ہو گیا اور زہیر بن قین نے کہا کہ "فرزند رسولؐ! ان سے جنگ کر لینا ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت ان لوگوں سے جنگ کرنے کے جو ان کے بعد آئیں گے کیونکہ اس کے بعد اتنی فوجیں آئیں گی کہ ان کے مقابلہ کی ہم میں طاقت نہ ہوگی"۔ مگر امام نے فرمایا کہ نہیں "میں جنگ میں ابتدا کرنا نہیں چاہتا"[2]

آخر امام حسینؑ نے حُر سے فرمایا کہ اچھا کچھ تو چلنے دو۔ اور حُر خاموش ہو گیا۔

کربلا : امام ذرا بائیں طرف مڑ کر تھوڑا سا چلے تھے کہ سپاہ حُر سامنے آکر سدِ راہ ہو گئی اور کہا

---

[1] دینوری نے سقیہ لکھا ہے (الاخبار الطوال ص۲۵۰) [2] الاخبار الطوال ص۲۵۰۔ طبری ج ۶ ص۲۳۲۔ ارشاد ص۲۳۸۔ ۲۳۹

کربلا میں اتر پڑیے۔ فرات یہاں سے دور نہیں ہے۔ امام نے نام پوچھا، معلوم ہوا کربلا۔ فرمایا "اچھا کرب و بلا کی یہی منزل ہے" یہ کہہ کر گھوڑے سے اتر پڑے[1]۔ یہ دوسری محرم ۶۱ھ پنجشنبہ کا دن تھا[2]۔

اب جبکہ امام کا سفر منزلِ آخر تک پہنچ گیا تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل تبصرہ کر دیا جائے تاکہ اسکی اہمیت اور ضرورت کچھ اور واضح ہو جائے۔

یہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ امام کا مقصد یزید سے اس طرح کی جنگ کرنا نہ تھا جیسی دنیا میں ہوا کرتی ہے۔ آپ کو نہ سلطنت کا حاصل کرنا مقصود تھا۔ نہ براہِ راست یزید کی سلطنت کا ختم کرنا بلکہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیں اور ان میں ایک ایسا انقلاب ذہنی پیدا کر دیں کہ وہ یزیدی کردار کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے لگیں اور اس کے ظاہری دعوائے اسلام سے دھوکا نہ کھائیں۔ اس کے لیے آپ نے مدینہ سے روانگی اختیار کی۔ جہاں تک مدینہ سے نکلنے کا تعلق ہے پورے طور سے اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اگر آپ مدینہ میں قیام کر کے اور وہاں رہ کر یزید کے مقابلہ میں جنگ کرتے یا قربانی پیش کرتے تو اس سے وہ نوعیت پیدا ہی نہ ہوتی جو آپ کو مدِ نظر تھی۔ یا زہر کام کرتا اور یا تلوار، مگر تلوار کیسی، جس کی ذمہ داری کسی صورت سے سلطنت شام پر عائد نہ ہو سکتی بلکہ کوئی خارجی نکلتا ابن ملجم کا سا جس نے علیؑ کو شہید کیا تھا یا کوئی تیر آتا آدمی نہیں ملک جنوں کی طرف سے جیسا کہ اسلامی تاریخ میں سعد بن عبادہ کا شام میں خاتمہ ہوا تھا۔ یہی ہوتی ہیں عام حکومتوں کی شعبدہ کاریاں جن کا نام دنیا نے "سیاست" رکھا ہے۔ حضرت امام اس طرح کی سیاست کے گُروں کو خوب سمجھتے تھے چاہے خود اخلاقی و اسلامی پابندیوں کی وجہ سے اختیار نہ کریں۔ انھوں نے مدینہ اس لیے چھوڑا کہ انکا واقعۂ شہادت کوئی اچانک اور بے سان گمان کا حادثہ نہ سمجھا جائے۔ جا کر قیام کیا کہاں؟ مکہ معظمہ میں جو قلب جزیرۃ العرب تھا اور جہاں حج کے لیے بہر حال ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر مسلمان جمع ہوتے تھے۔ علاوہ ذلیفۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے۔ خود عرب کے قدیم روایات

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۲۔ ارشاد ص ۲۳۹۔ [2] دینوری نے چہارشنبہ یکم محرم لکھا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۵۱)

اور سابقہ عملدرآمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا عرب کے اس خطّہ کو تمام مختلف الخیال قبائل عرب کا محل اجتماع ہونا ضروری تھا۔ وہ مشہور کانفرنسیں جو شعر و سخن اور خرید و فروخت کے لیے قائم ہوتی تھیں جن کو "اسواق العرب" کہا جاتا تھا۔ ذیقعد سے لیکر محرم تک مکّہ و طائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔ امام حسینؑ کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے تھے اور حضرت کو آپ کے پورے مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے تھے لیکن رسولؐ کے نواسے، سلطانِ حجاز و عراق کے فرزند، ملکِ عرب کے سب سے بڑے سخی جس کے در سے کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کے بزرگ خاندان اور اسلام کے سب سے بڑے عالم، یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہیں تھا۔ حسینؑ نے یہی خاص زمانہ کہ جو تمام قبائلِ عرب کے اجتماع کا تھا مکہ میں اپنے قیام کے لیے تجویز کیا۔ امام حسینؑ کا یہاں خاموشی کے ساتھ قیام بھی تمام اطراف ملک میں آپ کی بیعتِ یزید سے کنارہ کشی کے اعلان کے لیے کافی تھا اور یہی سب سے بڑی وہ وجہ تھی جس کی بنا پر آپ کی زندگی سیاستِ وقت کے لیے یہاں بھی ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی چنانچہ یزید کی طرف سے حاجیوں کے بھیس میں آدمی بھیجے گئے تاکہ وہ آپ کو گرفتار کرلیں یا قتل کر دیں۔

امام حسینؑ جیسا کہ آپ نے مکہ سے روانگی کے وقت فرما دیا تھا، یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ مکّہ کے اندر شہید کیے جائیں جس کی بنا پر خانۂ کعبہ کی حرمت زائل ہو۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد و پیش حج کے زمانہ میں ہر قسم کے لوگ ہر طرف سے آئے ہوئے ہوتے ہیں اور امام حسینؑ کے لیے یہ غیر ممکن تھا کہ آپ عرفات، منیٰ، مشعر، مقام ہر جگہ اپنے ساتھ محافظ رکھتے۔ ایسی صورت میں بہت آسان تھا کہ حجرِ اسود کے استلام کے وقت، عرفات میں وقوف کی حالت میں، مشعر کی طرف واپسی کے دوران میں، منیٰ میں قربانی کے موقع پر، مقامِ ابراہیمؑ میں نماز پڑھنے کی حالت میں کسی وقت آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جاتا اور قاتل موجودہ ہنگامہ و اژدہام کے اندر گم ہو جاتے۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا تھا کہ حسینؑ کا قاتل حقیقتاً یزید یا اس کا کوئی فرستادہ ہے۔

اس شدید خطرہ کی بنا پر امام حسینؑ نے مکہ کو چھوڑا اس طرح کہ حج کو بھی مکمل نہ کیا جس کا سبب

وہی ہنگامی صورت حال تھی جو پیدا ہوگئی تھی مگر جیسا کہ علامہ سید سبتہ الدین شہرستانی نے "نہضۃ الحسین" میں لکھا ہے اس طرح دفعۃً ایسے موقع پر امام کی روانگی نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک بجلی کی سی لہر دوڑا دی۔ اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی مکمل اسی وقت قلمبند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ حسینؑ بن علیؑ کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟ آخر تمام اہل وعیال واقربا کے ساتھ اپنے نانا کی قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟

"یزید کے خوف سے۔"

"کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟"

"حسینؑ سے بیعت کا طالب ہے۔"

لاحول ولاقوۃ۔ بھلا ایسا کیونکر ہوسکتا ہے؟ فرزند رسولؐ ساحق آشنا یزید ایسے شرابخوار اور زناکار کی بیعت کرے! اچھا پھر مکہ معظمہ میں کیوں قیام نہ کیا؟ کس لیے حج کو بھی مکمل نہ کیا؟

"جان کا خطرہ تھا۔ شاید مکہ میں حسینؑ کو قتل کرنے کے لیے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے۔" توبہ! توبہ! اس سے بڑھ کر سفاکی اور ظلم کیا ہوگا؟ اے فرزند رسولؐ کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا۔ کم وبیش اس قسم کے تذکرے ہوں گے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف وجوانب میں اکثر باخبر حلقوں میں بڑی قوت کے ساتھ ہو رہے ہوں گے۔ اس زمانہ میں جب مراسلت ومخابرت کے طریقے محدود تھے اور تار، ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب، اس سے بہتر کوئی صورت واقعات کی اشاعت کے لیے نہیں ہوسکتی تھی اس لیے کہ بعد اختتام حج جو شخص بھی اپنے شہر میں واپس آتا اس کو تازہ واقعات کے ضمن میں حسینؑ کی نقل وحرکت اور اس کے اسباب وعلل کا بیان کرنا ضروری تھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام کی موافقت میں کسی لشکر کے جمع ہونے کا امکان پیدا ہوگیا تھا بلکہ یہ کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت ہوجانے کی وجہ سے آپ کی شہادت نامعلوم اسباب وعلل کا نتیجہ قرار نہیں دی جاسکتی اور حکومت شام کو اس کے متعلق اپنے سیاسی مفاد کے لحاظ سے

مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع نہیں مل سکا اور امام حسینؓ کی مظلومیت و حقانیت پر پردہ نہ ڈالا جا سکا لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو سلطنت یزید کی طرف سے امام کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے اور آئین و شعائر اسلام کے تحفظ کا وہ بلند مقام جو امام کے پیش نظر تھا اتنے کامیاب طریقہ پر حاصل نہ ہوتا۔ مگر یہ امام کے انتہائی مدبرانہ طریقۂ کار کا نتیجہ تھا کہ ادھر امام شہید ہوئے اور ادھر تمام دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ آپ ناحق قتل کیے گئے۔ شام کا حاکم اور اس کے وزراء اور ہوا خواہ کسی تہمت کے تراشنے کا موقع نہ پا سکے۔ اس لیے کہ امام حسینؓ نے اپنی نقل و حرکت کے اسباب کو اپنی شہادت کے پہلے ہی عالم اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور اپنی حقانیت کے سامنے دنیا کا سر خم کرا لیا۔

نتیجہ کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ حسینؓ کا قافلہ جو مکہ سے نکل کر جا رہا تھا ایک خاموش مبلغ تھا۔ اس لیے کہ حج کی وجہ سے عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آ رہے تھے اور ادھر امام حسینؓ اپنے اہل و اقرباء، انصار و اصحاب کی جماعت کے ساتھ خیمہ و خرگاہ تمام اسباب ساتھ لیے ایک قافلہ کی صورت میں مکہ سے جا رہے تھے۔ عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستے میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ اور کیوں؟ پھر کہاں امام حسینؓ اور آپ کے اصحاب و انصار کا شاندار قافلہ، حج کو صرف دو دن باقی رہتے ہوئے مکہ معظمہ کی طرف سے آ رہا ہو جبکہ دنیا مکہ معظمہ کی طرف حج کے لیے جا رہی ہو۔ یہ وجوہ یقیناً جاذب نظر اور باعث توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ناگزیر تھا کہ یہ کون جماعت ہے؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ اور حسینؓ کا نام معلوم ہونے پر اسی قسم کا مکالمہ جیسا اوپر درج ہو چکا ہے، ان کے درمیان لازمی طور پر شروع ہو جاتا ہوگا۔ چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں کہ فرزدق کی ملاقات امام سے یونہی ہوئی اور عبداللہ بن مطیع اور عمر بن عبدالرحمٰن مخزومی کی بھی کہ وہ مکہ کی طرف جا رہے تھے اور امام مکہ کی طرف سے آ رہے تھے اس سے ظاہر ہے کہ حسینؓ بن علیؓ اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانۂ خدا کو بمجبوری چھوڑ کر

دشت غربت میں راہ پیما تھا دور دور کے لوگوں کو حالات کی تحقیق اور حقیقت کے سمجھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔
مکہ سے نکلنے کے بعد آپ نے کوفہ کا رُخ کیا۔ اس لیے کہ اہلِ کوفہ کے انتہائی اصرار کو عدم اعتماد کی بنا پر مسترد کر دینا اخلاقی و مذہبی حیثیت سے کسی طرح آپ کے نزدیک مناسب نہ تھا خصوصاً جبکہ آپ کے معتمد سفیر (مسلم بن عقیل) نے وہاں کے حالات کو قول و قرار کے موافق پاکر آپ کو اس کی اطلاع بھی دے دی تھی جس کے بعد امام کے لیے ان کے مطالبۂ ہدایت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اتمامِ حجت کرنا ایک فریضہ تھا مگر اس ضمن میں اس انقلاب کے لیے جو حضرت کی شہادت سے پیدا ہونے والا تھا کچھ مزید اسباب کا اضافہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؑ وطن سے بے بسی اور بیکسی کے ساتھ نکلے تھے۔ مکہ میں بھی کوئی قابلِ اطمینان حالت نہ تھی مگر مکہ سے آپ کا سفر اختیار کرنا اہلِ کوفہ کے مہمان کی حیثیت سے تھا اور عرب کی غیرت و حمیت کا تقاضا مہمان کے بارے میں مضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ عین موقع پر اہلِ کوفہ کثرت کے ساتھ امام حسینؑ کی نصرت کے لیے نہیں پہنچ سکے یا نہیں پہنچے مگر انسانی اور عربی فطرت کے لازمی نتیجہ کے طور پر یہ یقینی تھا کہ بعد کو اہلِ کوفہ کے دل میں ایک عجیب بیقرار احساس پیدا ہوگا اس کا کہ ہم نے بلایا تھا اور مدد نہ کی اور یہی احساس آگے بڑھ کر اور پرورش پاکر ایک عظیم سیلاب کی صورت میں اُمڈے گا جو اس سلطنت کے بیڑے کو ہمیشہ کے لیے ڈبو کر چھوڑے گا جس کا نتیجہ ہوگا امام کی فتح اور دشمن کی شکست۔ بنی امیہ کی عداوت اور ان کے وسیع ذرائع حکومت کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ امام حسینؑ تو ملک عرب میں جہاں جاتے آخر میں شہید ہوتے لیکن ظاہری حیثیت سے یہ نتیجہ مرتب نہ ہوتا جو کوفہ کی طرف آنے کی صورت میں ہوا۔ وہ لوگ جو مسلم کی شہادت کے بعد آپ کو واپسی کا مشورہ دے رہے تھے یقیناً نیک نیت اور اپنے نقطۂ خیال کے لحاظ سے حق بجانب بھی ہوں گے مگر انھیں حسینی اقدام کی نوعیت کا اندازہ نہ تھا۔ عراق کا سفر اختیار کرنا اگر کچھ خوشگوار توقعات پر مبنی ہوتا تو بیشک اب اس ارادہ کو بدل جانا چاہیے تھا اس لیے کہ وہ توقعات اب مایوسی سے بدل گئے تھے لیکن جبکہ امام کے سامنے کوئی امیدوں کا

بسر باغ نہیں تھا بلکہ اس حد سے بڑھے ہوئے اصرار کی پذیرائی اور غیر معمولی طلب و دعوت کی قبولیت تھی جس سے اتمام حجت کا مقصد پورا ہوتا تھا تو اس ارادہ کو اتنے پر کہ آپ کو مسلم کی خبر شہادت مل گئی متزلزل نہ ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ استقلال و ثبات قدم، کوہ آسا عزم اور پختگیٔ ارادہ، وعدہ کی پابندی اور اصول کے تحفظ کا تقاضا یہ تھا کہ آپ عملاً اس کا ثبوت پیش کر دیتے کہ آپ اپنے وعدہ پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ آگے بڑھنے میں خونریزی اور نقص امن عام کے باعث ہونے کا اندیشہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ ابھی مسلم کی شہادت کے تفصیلی حالات بھی تو عام طور پر لوگوں کو معلوم نہ تھے اور ظاہری اسباب کی بنا پر یہ ممکن تھا کہ وہ بڑی خونریز لڑائی کے بعد شہید ہوئے ہوں جس میں اہل کوفہ نے پورے طور پر داد شجاعت دی ہو لیکن سرکاری فوج کے مقابلہ میں سربرنہ ہوئے ہوں اور ممکن ہے ان کے دل میں یہ ارمان ہوتا یا بعد میں کہنے کا موقع ملتا کہ اگر امام حسینؑ آجاتے تو ہمیں تازہ قوت حاصل ہو جاتی اور حالات کا ورق بالکل پلٹ جاتا اس صورت میں آپ کا یہیں سے واپس ہو جانا جبکہ کوفہ کے بہت سے لوگ گویا آپ ہی کی خاطر سے ایک بڑی مصیبت اور کشمکش میں مبتلا ہو چکے، بڑی کمزوری اور کم ہمتی کا نمونہ سمجھا جا سکتا تھا۔ آپ نے ارادہ میں تبدیلی کی بس اس وقت جب حرؑ کا لشکر آپ سے دوچار ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ وہ آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جانے پر مامور ہے۔ اب امام نے اپنا ارادہ بدل دیا اس لیے کہ اب آپ کا آگے بڑھنا دو ہی صورتوں سے ہو سکتا تھا۔ ایک تو یہ کہ آپ جنگ آزمایانہ صورت سے فوجوں کو درہم برہم اور راستے کو صاف کرتے ہوئے کوفہ پر حملہ آور ہوتے اور ابن زیاد کو کوفہ سے نکال کر وہاں اپنی عملداری قائم کرتے، دوسرے یہ کہ آپ صبر و خاموشی کے ساتھ جس طرح اب تک آرہے تھے اسی طرح کوفہ کی طرف اپنی رفتار کو جاری رکھتے۔

دوسری صورت موجودہ حالات میں غیر ممکن تھی کیونکہ اب تک آپ کا آگے بڑھنا خود مختارانہ حیثیت سے اور خود اپنے ارادہ سے تھا مگر حرؑ کی فوج کے اس قصد سے آنے کے بعد کہ وہ آپ کو کوفہ، ابن زیاد کے پاس لے جائے آپ کا خاموشی کے ساتھ آگے بڑھنا اس فوج کے ہاتھ میں اسیر

ہونے اور ابن زیاد کا قیدی بن جانے کا مرادف ہوتا کیونکہ ابھی یہ حُر کی سپاہ ہے اور آگے بڑھ کر حصین کا فوجی مرکز ہے اور وہاں سے پھر افواج کے محاصرہ میں ابن زیاد کے پاس لے جایا جانا ہے جس کے بعد آپ کا معاملہ ابن زیاد کے ہاتھ میں ہے۔

اسی لیے آپ نے حُر کے اس اظہار کا کہ ہم آپ کو ابن زیاد کے پاس لے جانے کے لیے آئے ہیں انتہائی ترش جواب دیا کہ موت تمہارے لیے اس سے قریب تر ثابت ہو گی۔

بیشک پہلی صورت باقی تھی اور وہ یہ کہ آپ کوفہ پر حملہ آور ہوتے اور غنیم کی فوج کو پسپا کر کے وہاں اپنا قبضہ جماتے مگر ایک تو ظاہری اسباب کی بنا پر آپ کے ساتھ موجودہ فوجی طاقت ایسی نہیں تھی کہ وہ یزید کی منظم افواج کا مقابلہ کر سکتی اور بغیر ایسی طاقت کے موجود ہوئے ایک جگہ گھیر لیے جانے کے بعد دفاعی حیثیت سے بہتر نفوس کو ساتھ لے کر تیس ہزار کا مقابلہ کر لینا تو عین شجاعت و ہمت اور قابلِ ستائش طریقۂ کار ہے مگر اس قلیل تعداد کے ساتھ غنیم پر جارحانہ طرز پر حملہ آور ہونا سوائے تہوّر اور ناعاقبت اندیشی کے اور کچھ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ دوسرے یہ آپ کے اس مسلک کے خلاف ہے جو آپ نے اختیار کر رکھا تھا کہ آپ کی اس مقاومت میں عوامی محاذرہ کے لحاظ سے بغاوت اور شورش انگیزی کی صورت پیدا نہ ہونے پائے۔ اسی لیے آپ نے اپنی گفتگو میں جو حُر کے ساتھ ہوئی تھی اپنے اس نقطۂ نظر کو واضح کر دیا تھا کہ میں بلایا ہوا آیا ہوں اگر میرا آنا ناپسند ہے تو میں واپس جاتا ہوں۔

چنانچہ فوجِ حُر کی اس مزاحمت کے بعد آپ نے کوفہ کا خیال ترک کر دیا اور حُر کی معقول تجویز کے مطابق ایک دوسرا راستہ اختیار فرمایا جس نے آگے بڑھ کر آپ کو میدانِ کربلا میں پہنچا دیا۔

اور یہی آپ کا اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا نہ کرنے کا اصول اس کا بھی باعث ہوا کہ جب کربلا کی سرزمین پر پہنچ کر فوجِ حُر نے سختی کے ساتھ آگے بڑھنے سے روکا تو آپ نے وہیں پر خیمے نصب کرا لیے کیونکہ اب بغیر جنگ کیے ہوئے آگے بڑھنا ممکن نہ تھا پھر آگے بڑھنے کی صورت میں اگر کوئی اہم مرکز آپ کے پیشِ نظر ہوتا جہاں جا کر آپ اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں تو ان

لوگوں سے اپنے مقصد میں سدِّ راہ ہونے کی بناء پر جنگ بھی کر لی جاتی لیکن جب آپ کے پیشِ نظر ایسا کوئی خاص مرکز نہیں تھا تو صرف اس بات پر جنگ کرنا کہ ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے بلکہ کچھ آگے جا کر ٹھہریں گے ایک لاحاصل سی بات ہوتی۔

چنانچہ فوجِ مخالف کے مطالبہ پر آپ نے کربلا کی سرزمین پر فرات کے کنارے سے ہٹ کر خیمے نصب کر لیے۔ جس زمین کو اب کربلا کہا جاتا ہے یہ حقیقتاً مجموعہ ہے چند زمینوں اور قریوں کا جو اس زمانہ میں بالکل پاس پاس واقع تھے۔ اس کی مثال زمینداریوں اور جاگیروں اور مواضعات کی حیثیت سے ہر ملک میں موجود ہے اور خصوصیت سے عرب میں ایسا پایا جاتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے قطعاتِ ارض کے مستقل نام ہوتے تھے جنھیں اگر ایک کی خصوصیت کے لحاظ سے دیکھا جاتا تو وہ کئی مقام متصور ہوتے تھے اور اگر ان کے باہمی قرب پر نظر کی جاتی تو وہ سب ایک قرار پاتے تھے اور اس طرح ایک جگہ کا واقعہ دوسری جگہ کی طرف منسوب کیا جا سکتا تھا۔

جیسا کہ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی نے "نہضۃ الحسین" میں لکھا ہے، واقعۂ کربلا کے محلِ وقوع کے ماتحت جو بہت سے نام گوش زد ہوتے ہیں کربلا، نینوا، غاضریہ، شطِ فرات انھیں ایک ہی جگہ کے متعدد نام نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ وہ متعدد جگہیں تھیں جو باہمی قرب کی وجہ سے ایک ہی سمجھی جا سکتی تھیں اور اس لیے محلِ وقوع واقعہ کے اعتبار سے ہر ایک کا نام تعارف کے موقع پر ذکر کیا جانا صحیح قرار پاتا تھا۔

"نِینَوا"[1] یہ ایک قریہ تھا جسے موجودہ زمانہ کے سدۂ ہندیہ کے قریب سمجھنا چاہیے۔ اس کے پہلو میں "غاضریہ" تھا۔ یہ قبیلۂ بنی اسد کی ایک شاخ بنی غاضرہ کی طرف نسبت رکھتا تھا اور ان ہی کا محلِ سکونت تھا۔ یہ غالباً وہ زمین ہے جو اب حسینیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی جگہ ایک قریہ شفیہ تھا اور یہیں پر ایک قطعۂ زمین "کربلّا"[2] پایا جاتا تھا وہ اب موجودہ شہر کربلا کے مشرقی حصہ میں جنوب کی طرف واقع ہے۔ اس کے متصل "عقر بابل" نام کا قریہ تھا جو غاضریات کے شمال

---

[1] نون کے کسرہ کے ساتھ [2] تشدید لام کے ساتھ

مغرب میں واقع تھا۔ وہاں اب کھنڈر ہیں جن میں بہت اہم آثارِ قدیمہ کے انکشاف کی امید کی جاتی ہے اور یہ بالکل دریائے فرات کے کنارے پر تھا، اور اپنے قدرتی محلِ وقوع یعنی ٹیلوں میں گھرے ہونے کی وجہ سے ایک قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مقابل غاضریات کے دوسری جانب نواویس کا مقام تھا جو مسلمانوں کے فتوحات کے قبل ایک عمومی قبرستان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے وسط میں زمین "حیر" تھی جو اب حائر کے نام سے معروف ہے اور جہاں حضرت امام حسینؑ کی قبر مبارک ہے۔ حیر ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتا تھا جو تین طرف سے متصل اور پہلو بہ پہلو ٹیلوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان ٹیلوں کا سلسلہ شمال مشرق کی طرف سے جدھر حرم حسینی کا "باب السدر" اور "منارۂ عبد" ہے شروع ہو کر غرب کی جانب "بابِ زینبیہ" کے حدود تک پہنچتا تھا اور وہاں سے پیچیدہ ہو کر جنوب کی طرف درِ قبلہ کے مقام تک آ کر ختم ہوتا تھا۔ ان متصل ٹیلوں کے اجتماع سے ایک نصف دائرہ کی شکل بنتی تھی جو "ن" کی صورت سمجھی جا سکتی ہے۔ اس دائرہ میں داخل ہونے کا راستہ مشرقی جہت میں اس جانب سے تھا کہ جدھر روضۂ حضرت عباسؑ میں جانے کا راستہ ہے۔ تحقیقاتی انکشاف سے اب تک یہ بات پائی جاتی ہے کہ ان مکانات کے آثار جو قبرِ امام حسینؑ کے گرد ہیں، شمالی اور مغربی جانب زمین کی قدیمی بلندی کے قرینے موجود ہیں اور مشرقی جانب سوا نرم مٹی کے جو پستی کی طرف مائل ہے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کی قدیمی صورت ایسی ہی تھی کہ شرق کی جانب سے ہموار اور شمال اور مغرب کی جانب ہلالی شکل کے طور پر بلند تھی۔ یہی ہلالی دائرہ وہ تھا جس میں امام حسینؑ کو گھیر کر شہید کیا گیا تھا۔ فرات کی اصلی نہر جسے ہماری زبان کے اعتبار سے دریائے فرات کہا جاتا ہے اس کا براہِ راست کوئی تعلق کربلا کی زمین سے نہ تھا۔ اس کا خط سیر حلہ، مسیّب وغیرہ مقامات سے ہوتا ہوا کوفہ کے بیرونی حصوں کی جانب جاتا تھا۔ کربلا اور اس کے درمیان بڑا فاصلہ تھا لیکن اس نہر یا دریائے فرات کی ایک چھوٹی شاخ مقام رضوانیہ کے پاس سے نکل کر جدا ہوتی تھی جو کربلا کے شمال مشرق کی جانب کے ریگستانوں اور نشیبوں سے ہوتی ہوئی اس مقام سے ہو کر گزرتی تھی جہاں علمدارِ حسینؑ ابوالفضل العباس کی قبر ہے۔

اور اس کے بعد موجودہ مقام ہندیہ کی طرف سے ہوتی ہوئی اس مقام کے شمال مغربی جانب جس کا نام "قریہ ذی الکفل" ہے اصل دریائے فرات سے مل جاتی تھی۔ یہ چھوٹی نہر "علقمہ" کے نام سے موسوم تھی اور اسے اپنی اصل کے اعتبار سے فرات بھی کہہ دیا جاتا تھا۔ "طف" کے معنی ہیں "نہر کا کنارہ"۔ خصوصیت سے دریائے فرات کے اس کنارے کو جو جنوبی پہلو میں بصرہ سے نہبت تک تھا طف کہا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے "فراتِ صغیر" یعنی نہرِ علقمہ کے اس کنارہ کو جس میں کربلا واقع تھا طف کہا جانے لگا اور اسی وجہ سے کربلا کے واقعہ کو "واقعۃ الطف" کہا جاتا ہے اور کربلا کو شطِ فرات کے نام سے بھی اسی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔

بیسواں باب !

یزیدی حکومت کی سرگرمی اور کربلا میں فوجوں کی آمد

مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد کوفہ میں سخت گیری انتہا کو پہنچ گئی۔ ابن زیاد کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلم کی بیعت کرنے والے جو اُن کی امداد سے قاصر رہے وہ اب اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے کوئی انقلاب پیدا کریں لہٰذا اس نے تلاش کر کے جن جن اشخاص کو حضرت امام حسینؑ کا ہمدرد سمجھا جا سکتا تھا یا ان پر ایسا شبہ بھی ہو سکتا تھا انھیں قتل یا قید کرنا شروع کر دیا۔

میثم تمار اور رشید ہجری اسی دوران میں شہید کیے گئے۔

مختار بن ابو عبیدہ جو مسلم کے جہاد کے زمانہ میں کوفہ کے اندر موجود نہ تھے اور اسی دن اطلاع پا کر آئے لیکن ایسے وقت پہنچے کہ مسلم شہید ہو چکے تھے اور عمرو بن حریث نے رایتِ امان بلند کیا تھا کہ جو شخص اس کے نیچے چلا آئے گا اس کا جان و مال محفوظ رہے گا۔ چنانچہ مختار موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس جھنڈے کے نیچے چلے گئے مگر انھیں اس پر بھی امان نہ مل سکی اور وہ پا بزنجیر کر کے قید خانہ بھیج دیے گئے۔ اسی طرح عبداللہ بن حارث بن نوفل اور دیگر اشخاص۔

ادھر یزید کو دمشق میں جناب مسلم کے قتل کی خبر کے ساتھ ہی حضرت امام حسینؑ کی مکہ سے روانگی کی اطلاع پہنچی تو اس نے ابن زیاد کو خط لکھا:-

"مجھے خبر ملی ہے کہ حسینؑ بن علیؑ عراق کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں لہٰذا تم کو لازم ہے کہ ہوشیاری کے ساتھ جاسوس مقرر کرو۔ مورچے مضبوط کرو اور کسی شخص پر وہم و گمان بھی ہو تو اس کا تدارک کرو اور فوراً گرفتار کر لو۔"

اب کیا تھا؛ جیلخانے قیدیوں سے چھلکنے لگے جس کا اظہار خود ابن زیاد نے اس کے بعد ان الفاظ میں

کیا کہ "کوئی ایسا شخص نہیں جس پر گمان ہو سکتا تھا کہ وہ حکومت کی مخالفت کرے گا مگر یہ کہ وہ قید خانہ کے اندر ہے۔"

شہر کے اندرونی حالات پر اس طرح قابو پانے کے بعد اس نے باہر کی طرف توجہ کی اس لیے کہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں بصرہ و مدائن اور دیگر اطراف کے لوگ امام حسینؑ کی مدد کے لیے نہ آجائیں۔ اس کے لیے حدود کی ناکہ بندی ہوئی اور قادسیہ میں جو حجاز و عراق و شام کے خطوط سیر کا محل اجتماع تھا چار ہزار سواروں کے ساتھ حصین بن تمیم کو جو اب تک کوتوالِ شہر کی حیثیت رکھتا تھا مقرر کیا گیا اور واقصہ سے لے کر قطقطانہ، لعلع اور خفان اور اطراف و جوانب میں جو شام و بصرہ کے راستے تھے سب میں لشکر پھیلا دیا گیا۔ یہاں تک کہ نہ کوئی شخص آسکتا تھا اور نہ جا سکتا تھا[1] چنانچہ قیس بن مسہر صیداوی جو امام حسینؑ کا فرستادہ خط اہلِ کوفہ کے نام لے جا رہے تھے اسی قادسیہ میں پہنچ کر حصین کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور جب امام نے بطن عقیق کے بعد یہ سنکر کہ آگے فوج سدِ راہ ہے سمتِ سفر میں تبدیلی فرمائی تو حُر ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ اسی فوج میں سے بھیجا گیا جو قادسیہ میں حصین کی سرکردگی میں موجود تھی۔ جب حُر نے ابن زیاد کے خط کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت امام حسینؑ کو کربلا میں اترنے پر مجبور کر دیا تو اس نے ابن زیاد کو اس کی اطلاع دی۔ یہ وقت وہ تھا کہ ملک عجم میں بغاوت ہو گئی تھی اور "دُستبیٰ"[2] کے مقام پر قبیلۂ دیلم نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے مشہور فاتح عراق سعد بن ابی وقاص کے بیٹے عمر بن سعد کو چار ہزار فوج کا سردار بنایا گیا تھا اور اس کے لیے رَے اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۲ و ۲۲۳۔ الاخبار الطوال ص ۲۴۳۔ [2] دُستبیٰ کا نام تاریخ میں ہمدان اور رَے کی فتح کے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ نعیم بن مقرن نے ان مقامات کو ۲۲ھ یا ۲۳ھ میں فتح کیا۔ دستبیٰ چند اہلِ کوفہ میں تقسیم کر دیا گیا جن کے نام یہ ہیں۔ عصمہ بن عبداللہ ضبی، مہلہل بن زید طائی، سماک بن عبد عبسی، سماک بن مخرمہ اسدی اور سماک بن خرشۃ انصاری۔ یہ لوگ مسلمانوں میں سب سے پہلے دستبیٰ کی چھاؤنیوں کے والی ہوئے اور انھوں نے دیلم سے جنگ کی۔ ایک قول یہ ہے کہ رَے کو قرظہ بن کعب نے فتح کیا (طبری ج ۴ ص ۲۵۱) دستبیٰ ہمدان کا جز و تھا اور وہاں کی چھاؤنیاں ہمدان تک پھیلی ہوئی تھیں (طبری ج ۴ ص ۲۵۲) نعیم نے فتح کرنے کے بعد رَے کا قدیم شہر برباد کر دیا اور اس سے ہٹ کر نئے شہر کی بنیاد قائم ہوئی (ص ۲۵۳)

سرحد دستبیٰ و دیلم کی حکومت کا پروانہ لکھ دیا گیا تھا چنانچہ یہ فوج ایران جانے کے لیے باہر نکل بھی چکی تھی[1] اور عمر بن سعد اس فوج کو ساتھ لیے کوفہ کے باہر مقام "حمام اعین" پر خیمہ زن تھا اور عنقریب آگے بڑھنے والا تھا[2] اب امام حسینؑ کی مہم جو درپیش ہوئی تو ابن زیاد نے عمر بن سعد کو حکم دیا کہ پہلے اس مہم کو سر کرے اور پھر ایران کی طرف روانہ ہو[3]

عمر سعد صحابی تو نہیں مگر عام مسلمانوں کی اصطلاح کے مطابق تابعی ضرور تھا۔ عین خلیفۂ دوم عمر بن خطاب کے انتقال کے دن اسکی پیدائش ہوئی تھی[4] اور اس کے سن تمیز تک پہنچنے تک بہت سے صحابۂ رسولؐ موجود تھے۔ یقینی ان کی زبانی اس نے وہ احادیث بھی سنے ہوں گے جو پیغمبر اسلامؐ نے حسنؑ و حسینؑ کے بارے میں فرمائے تھے۔ نیز امام حسینؑ کے ساتھ رسولؐ کی انتہائی محبت کے واقعات بھی اس کے گوش زد ہوئے ہوں گے۔ پھر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے زمانہ خلافت میں جب کہ امام حسینؑ بھی کوفہ میں موجود تھے عمر بن سعد کا کچھ ایسا کم سنی اور بے شعوری کا دور نہ تھا۔ اسے یقینی قریب سے حضرت امام حسینؑ کے محاسن ذات اور بلند اوصاف و اخلاق کے مشاہدہ کا موقع ملا ہوگا اور جب سے آپ مدینہ تشریف لے گئے تھے تو اب تک بیس برس کی مدت میں آنے جانے والوں کی زبان سے اس نے امام کے زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت اور خوش اخلاقی و سخاوت کے کتنے ہی واقعات ضرور سنے ہوں گے۔

شاید انہی امور کا نتیجہ تھا کہ وہ حضرت امام حسینؑ سے جنگ کو پسند نہ کرتا تھا اور اسے ایک گناہ خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے معاف کر دیجیے تو بہتر ہے۔ ابن زیاد نے جواب دیا کہ اچھا تو ہمارا پروانۂ حکومت رے کا واپس کر دو۔ یہ معاملہ سخت تھا۔ عمر سعد کو رے کی حکومت دل سے عزیز تھی۔ جاہ طلبی اور حق شناسی کے جذبوں میں کشمکش ہوئی۔ یہاں تک کہ اسے یکسوئی حاصل کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت مانگنا پڑی۔ مہلت ملی اور عمر سعد نے اپنے مخصوص احباب و اعزہ سے مشورہ کیا۔ سب نے مخالفت کی اور اس مہم کے لیے جانے سے منع کیا۔

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۱ [2] طبری ج ۶ ص ۲۳۲ [3] طبری ج ۶ ص ۲۳۳ [4] تقریب التہذیب ص ۱۹۰

حمزہ بن مغیرہ بن شعبہ نے جو اس کا بھانجا تھا حسب ذیل تقریر کی: "آپ حسینؑ سے جنگ کرنے کو نہ جائیے اور گنہگار ہونے کے ساتھ ساتھ رشتۂ قرابت کو قطع کرنے کے مرتکب نہ ہوجیے۔ خدا کی قسم اگر تمام دنیا کا مال و دولت اور عالم بھر کی سلطنت آپ کے قبضہ میں ہو اور پھر وہ نکل جائے تو بہتر ہے اس سے کہ آپ حسینؑ کے خون کا بار اپنی گردن پر لیں۔"[1]

یہ وہ پہلو تھا جسے اس کے سچے مشیر کار پیش کر رہے تھے لیکن دوسری طرف اس کا جاہ طلبی کا جذبہ رہ رہ کر رَے کی حکومت کا خیال دلا رہا تھا۔ وہ ایک دماغی کشمکش میں مبتلا تھا جسے شب کے تاریک پردہ میں اس کے یہ اشعار ظاہر کر رہے تھے ؎

اترک ملک الری والری رغبتہ	ام ارجع مذموما بقتل حسینؑ
وفی قتلہ النار التی لیس دونہا	حجاب وملک الری قرۃ عینی

(یعنی) کیا میں رَے کی حکومت چھوڑ دوں درآنحالیکہ وہ مجھے دل سے پسند ہے یا میں حسینؑ کو قتل کر کے طوق مذمت میں گرفتار ہوں؛ ان کو قتل کرنے میں دوزخ کی آگ ہے جس کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور رَے کا ملک میری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک ہے۔"[2]

بعض مؤرخین اس کے ساتھ مزید اشعار اور نقل کرتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ حسینؑ کے قتل کا جو کچھ جرم ہے اس کا نتیجہ مرنے کے بعد نمایاں ہوگا جو معلوم نہیں صحیح بھی ہے یا نہیں، پھر رَے کی نقد حکومت کو چھوڑ کر آخرت کے راحت و آرام کی امید باندھنا کس سمجھدار آدمی کا کام ہوسکتا ہے؟

غالباً ان اشعار کی روایت صحیح ہے۔ اس لیے کہ نتیجۃً عمر بن سعد کے عمل سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ نتیجہ یہی تھا کہ دنیا کی وقتی دلفریبی غالب آئی اور اس نے فرزند رسولؐ سے جنگ کرنے پر کمر باندھ لی مگر ایک آخری بار ضمیر کی چٹکیوں نے اسے پھر آمادہ کیا کہ وہ ابن زیاد سے کمزور الفاظ میں سہی معذرت کرلے۔ چنانچہ اس نے آکر کہا کہ آپ مجھ کو دستبیٰ اور دیلم کے حدود کی طرف جانے پر مامور کر چکے ہیں۔ لوگوں کو اس کا علم بھی ہوگیا ہے اور میری فوج والوں نے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۳۳ [2] کتاب البلدان ص ۲۷۱

بھی وہیں جانے کی تیاری کی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھ کو ادھر ہی روانہ کیجیے اور حسینؓ ابن علیؓ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے کسی اور کو اشراف اہل کوفہ میں سے جو کسی طرح شخصیت و شہرت اور فن سپہگری و مہارت جنگ میں مجھ سے کم نہیں روانہ کر دیجیے۔ چنانچہ اس نے چند آدمیوں کے سردار ان اہل کوفہ میں سے نام بھی لے دیے مگر ابن زیاد برہم ہو گیا اور اس نے کہا کہ تمھیں سردارانِ کوفہ کے نام مجھے گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اگر کسی کو بھیجنا ہوگا تو تم سے مشورہ لے کر نہیں بھیجوں گا۔ تم تو اپنے متعلق کہو کہ تمھیں جانا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں جانا ہے تو ہمارا پروانہ حکومت رَے کا واپس کرو۔ عمر سعد نے سمجھ لیا کہ بغیر قربانی کے اس جرم سے چھٹکارا ملنا ممکن نہیں اور قربانی کے لیے اس کا نفس تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر اس نے اقرار کر لیا کہ اچھا میں ہی جاؤں گا۔ چنانچہ وہی چار ہزار کی فوج جو ملک ایران جانے پر کمربستہ تھی کربلا کی طرف روانہ ہو گئی اور عمر سعد اس فوج کے ساتھ امام حسینؓ کے ورود کربلا کے دوسرے ہی دن[1] یعنی تیسری محرم کو یہاں پہنچ گیا۔

کربلا میں حُر کے ساتھ ایکہزار کی فوج پہلے ہی سے موجود تھی۔ اب عمر سعد کی فوج ملا کر پانچہزار ہوئی۔ حضرت امام حسینؓ اور ان کی مختصر جماعت کے لیے ظاہری حیثیت میں اتنا لشکر بہت تھا مگر امام حسینؓ کی خاندانی شجاعت اور ان کی سچائی کی طاقت کا ابن زیاد کے دل پر اتنا رعب تھا کہ وہ فوج کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو بھی کم سمجھتا رہا۔ چنانچہ حصین بن تمیم کو تو اس شہر کوفہ کی سرداری میں قادسیہ کے نام پر جو باقی تین ہزار فوج تھی وہ پوری کی پوری کربلا کی طرف منتقل کر دی گئی اس کے بعد کوفہ میں عام بھرتی کا اعلان کر دیا گیا اور ابن زیاد خود کوفہ سے باہر نکل کر تخیلہ میں جو کربلا کے راستہ پر تھا آ کر خیمہ زن ہو گیا تاکہ اپنے سامنے افواج کا معائنہ کر کے پے در پے کربلا کی جانب روانہ کرے اور بڑے بڑے سردارانِ کوفہ حجار بن ابجر، شبث بن ربعی، شمر بن الجحاج وغیرہ کو مامور کیا گیا کہ وہ اپنی اپنی جماعت کے ساتھ کربلا روانہ ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوتا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا کوئی عذر بھی سنا نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۱ - طبری ج ۶ ص ۲۳۳

شبث نے بیماری کا عذر کیا تھا لیکن ابن زیاد نے کہا، تم بیمار بن رہے ہو، اگر تم ہماری اطاعت میں ہو تو ہمارے دشمن سے جنگ کے لیے روانہ ہو۔ مجبوراً شبث بھی روانہ ہوا۔ بعض اشخاص ایسے تھے کہ ابن زیاد کو اپنی صورت دکھا کر پھر کوفہ واپس چلے جاتے تھے۔ جب ابن زیاد کو اس کا علم ہوا تو اس نے سوید بن عبدالرحمٰن منقری کو کچھ سواروں کے ساتھ کوفہ روانہ کیا کہ جو شخص کوفہ میں نظر آئے اور وہ ابھی تک حسینؑ سے جنگ کرنے کو نہیں روانہ ہوا اسے گرفتار کر کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ سوید نے کوفہ کے قبیلوں میں گردش کی۔ اتفاق سے ایک شخص شام کا رہنے والا اپنے کسی متروکہ کے جھگڑے میں کوفہ آیا تھا۔ سوید نے اسے پکڑ کر ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ اس کی گردن مار دی گئی۔ اس واقعہ سے تمام لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی اور سب امام حسینؑ سے جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔[1] اس کے بعد تاریخ کے لحاظ سے مردم شماری کی ضرورت نہیں اور نہ علماء کے اقوال دیکھنے کی حاجت کہ بیس ہزار تھے جسے ابن طاؤس نے ترجیح دی ہے یا تیس ہزار جسکو علامہ مجلسی نے مانا ہے، یا پینتیس ہزار جیسا کہ ابن شہر آشوب نے لکھا ہے، یا ایک لاکھ تک مطابق بعض اہل مقاتل کی تحریر کے بلکہ گزشتہ انتظامات ہی سے ظاہر ہے کہ کوفہ کی تمام قابل جنگ آبادی کربلا میں انڈیل دی گئی تھی۔ جس کے بعد کربلا کی زمین فوجوں کی کثرت سے موجیں مارنے لگی تھی۔

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۲

اکیسواں باب

انصار امام حسینؑ، ان کی قلّتِ تعداد اور اسکے اسباب

سابقہ ابواب میں ان واقعات وحالات کا تذکرہ ہوچکا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کوفہ کی اس جماعت میں سے جو حضرت امام حسینؑ کی ہمدرد تھی اور جنھیں آپ کی نصرت کا فریضہ محسوس ہو سکتا تھا ایک کثیر تعداد پابزنجیر کرلی گئی تھی۔ نیز حدود کی ناکہ بندی[1] نے اطراف وجوانب کے رہے سہے اشخاص کے لیے حضرت تک پہنچنا دشوار سے دشوار تر بنا دیا تھا اور کوفہ سے اگر کوئی آنے کا قصد کرتا تو نخیلہ میں جہاں ابن زیاد نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا گرفتار کرلیا جاتا اور کسی دوسری طرف سے آنا چاہتا تو قادسیہ وخفان وقطقطانہ، تعلع وغیرہ کی کسی نہ کسی منزل پر وہ مقیّد ہوجاتا۔

اس کے علاوہ کربلا میں آپ کا ورود اچانک طور پر تھا اس لیے اطراف وجوانب میں اس کی اطلاع تک ممکن نہ تھی جبکہ بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ اس وقت تک بھی کہ جب امام حسینؑ شہید ہو چکے ہیں اور اسیروں کو کوفہ لے جایا گیا ہے بہت سے اشخاص ان واقعات سے بے خبر تھے ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ آپ کے پاس کوئی بڑی جمعیت نصرت کے لیے پہنچ جاتی۔ خصوصاً جبکہ آپ نے پہلے ہی سے اپنے ساتھ تعداد کے بڑھانے کی کوئی کوشش بھی نہ فرمائی تھی۔ پھر بھی مذکورۂ بالا تمام مشکلات کے باوجود شیعانِ کوفہ کی وفاداری اور اولوالعزمی کا ایک بڑا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ وہ افراد جو امام حسینؑ کے کوفہ کی طرف تشریف لانے کی تحریک کے ذمہ دار تھے، جنھوں نے حضرت مسلم بن عقیل سے ان کے ورود کے موقع پر پہلے جلسہ میں وفاداری کا اقرار اور جانبازی کا عہد کیا تھا وہ کسی نہ کسی طرح حسینؑ بن علی تک پہنچ گئے اور اپنی جانیں آپ کے قدموں پر نثار

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۲

کریں اور جو لوگ اس جماعت میں سے حسینؑ کی نصرت کے لیے نہ پہنچے یا نہ پہنچ سکے ان میں سے بھی کسی متنفس کی امام حسینؑ کے خلاف معرکۂ کربلا میں موجودگی ہرگز پائی نہیں جاتی۔ بلکہ کچھ کمزور عزم و ایمان رکھنے والے اشخاص جو بظاہر ضعیف العمر بھی تھے اس لیے ابن زیاد کی فوج میں جانے سے بھی مستثنیٰ ہو سکے تھے اس وقت جب کربلا میں جہاد ہو رہا تھا، بیرونِ کوفہ ٹیلے پر کھڑے ہوئے آنسو بہا رہے تھے اور دعائیں مانگ رہے تھے کہ خداوندا اپنی نصرت نازل فرما اہل بیتِ رسولؐ اور ان کے انصار پر جنھیں اس طرح دیکھ کر راوی کو غصہ آیا اور کہا اے کم بختو تمھارے جذبات یہ ہیں تو آخر خود جا کر نصرت کیوں نہیں کرتے؟[1]

مگر یہ توقع ہر شخص سے کرنا کہ وہ عزم و ہمت میں مسلم بن عوسجہ اور حبیب بن مظاہر ہی ثابت ہو ایک دور از کار بات ہے۔ بہرحال ان کمزور نفوس والے افراد کے بالمقابل ان پُرجگر اور باوفا افراد کی تعداد جنھوں نے امام حسینؑ کا اس نازک موقف میں ساتھ دیا اور وہ کوفہ ہی کے باشندہ تھے بجائے خود قلیل ہونے کے باوجود تاریخ عالم کے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے ہرگز کم نہیں ہے۔

یہی وہ پہلو ہے جسے اہلِ کوفہ کی حمایت میں پیش کیا گیا۔ اس وقت جب ابوالعباس سفاح کے سامنے ابوبکر ہذلی بصری اور ابن عیاش میں بصرہ اور کوفہ کی باہمی فضیلت کے بارے میں مناظرہ ہوا اور ابن عیاش نے شجاعت کے تذکرہ میں کچھ شہسواران کوفہ کے نام لیے اور ابوبکر ہذلی نے دکھتی ہوئی رگ کو دباتے ہوئے کہا کہ کوفہ والوں کی بہادری کا کیا کہنا کہ ان میں جتنے بھی تھے وہ یا امام حسینؑ اور ان کے اقربا و انصار کے قاتل تھے یا عدم تعاون کرنے والے یا ان کا مال و اسباب لوٹنے والے یا ان کی لاشوں کو پامال کرنے والے۔" یہ سنکر ابن عباش نے کہا کہ جو فخر کا پہلو ہے وہ تم نے چھوڑ دیا اور طعنہ دینے پر اُتر آئے۔ تم نے امام حسینؑ کے والد بزرگوار حضرت علیؑ بن ابی طالب کو قتل کیا (ابن ملجم بصرہ کا رہنے والا تھا) رہ گئے اہلِ کوفہ۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۲۲

ان میں سے حضرت امام حسینؑ کے ساتھ روزِ شہادت چالیس آدمی تھے جب کہ آپ کے سپاہیوں کی مجموعی تعداد تقریباً ستر تھی اور کوفہ کے یہ جتنے آدمی تھے ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ واپس نہیں گیا بلکہ سب نے امام پر اپنی جان نثار کی اور ہر ایک نے قتل ہونے سے پہلے کچھ نہ کچھ اپنے دشمنوں کو قتل بھی کیا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ فوج عمر سعد میں کوفہ کے عوام تھے اور اطراف و جوانب کے قبائل جن کا مسلک صرف اطاعتِ شیوخ تھا اور کچھ نہیں۔ ان میں سے اکثر کا نصب العین قتل امام حسینؑ میں صرف حکمِ حاکم کی تعمیل اور اپنی فوجی ذمہ داری کا پورا کرنا اور جائزہ و انعام کی ہوس تھی اور کچھ ایسے بھی تھے جو حضرت امام حسینؑ سے جنگ کرنے پر خوشی سے رضامند نہ تھے مگر ان میں اتنی قوتِ ارادی نہ تھی کہ وہ حکومت کے خلاف اپنے اختیار سے کام لیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں بہت سے ایسے جوان اور نوعمر بھی ہوں جو حسینؑ کی شخصیت سے آگاہ ہی نہ ہوں اور وہ صرف سمجھتے ہوں کہ ہم کو حاکم کی طرف سے ایک باغی سے مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف حضرت امام حسینؑ کے ساتھ کوفہ کے جتنے آدمی تھے وہ وہاں کی خلقت کے دل و دماغ تھے۔ وہ وہ تھے جو دنیا کے تمام محرکات کے مقابل میں اپنے شعور اور ارادہ کے مالک ثابت ہوئے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ ان میں سے بہت سوں سے کوفہ کے عوام واقف بھی تھے اور ان کی شخصیت سے متاثر ہوتے تھے اور ان کے لیے یہ عجیب معمہ بن گیا تھا کہ ایسے عابد و زاہد اور پرہیزگار لوگ آج کس طرح میدانِ جنگ میں آگئے ہیں؟ ان شخصیتوں کا فوجِ مخالف کے افراد پر اتنا زبردست اثر پڑ رہا تھا کہ ان کے دلوں کی طاقت نے جواب دے دیا تھا۔ واقعۂ کربلا کی جنگ میں بارہا تاریخ کے اوراق پر نظر آتا ہے کہ فوجِ مخالف نے حسینی مجاہدین کے سامنے سے فرار کیا۔ حقیقتاً یہ فرار مادی قوت کی کمی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان میں سب سے زیادہ ضمیر کی کمزوری کا دخل تھا۔

---

[1] کتاب البلدان ص ۱۷۲

درحقیقت یہ ایک مارے باندھے کا سودا تھا جو کیا جا رہا تھا جس کے لیے آخر وقت تک فوج کی اکثریت سپر انداختہ ثابت ہو رہی تھی اور کچھ افسران فوج کی زبردستیاں اور جائزہ و انعام وغیرہ کے ترغیبات اور عتاب حکومت کے تازیانے ہی تھے جو ان کے جذبات صداقت کی کمزوری کے باعث ان کے رُکتے ہوئے قدموں کو بار بار آگے بڑھاتے تھے۔ اس کے برخلاف حسینی سپاہیوں کا ضبط و نظام ایک بے مثال نمونہ ہے۔ یہاں نہ بڑھنے کے موقع پر قدم پیچھے ہٹنے کا امکان تھا' نہ بے موقع قدم آگے بڑھنے کا سوال۔ ان کا کوئی اقدام جوش کے ماتحت نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ برابر اپنے سالار کے اشارہ کے منتظر رہتے تھے اور جس وقت تک امام اتمام حجت کی منزلوں کو ختم کر کے جنگ کے اقدام کو حق بجانب نہ سمجھ لیں۔ اس وقت تک ایک سپاہی بھی ایسا نہ تھا جو حسینی نظام کے خلاف خود رائی یا خود سری سے کام لے۔ یہ بات صرف اس لیے تھی کہ یہ جتنے افراد تھے سب عارف حق امام کے تربیت یافتہ اور صاحب اخلاق تھے۔

بائیسواں باب
صُلح کی باتیں

عمر سعد چاہتا تو تھا ہی کہ کسی طرح اس جرمِ عظیم سے جس میں وہ حرصِ دنیا کی بدولت اپنے ہاتھوں گرفتار ہونے جا رہا ہے چھٹکارا حاصل کرے چنانچہ اس نے کربلا آ کر ایک کوشش معاملات کے سلجھانے کی شروع کی۔ اس طرح کہ عزرہ بن قیس احمسی کو بلا کر یہ چاہا کہ وہ امام حسینؑ کے پاس جا کر آپ کے مقصدِ تشریف آوری کو معلوم کرے مگر عزرہ، یہ ان سات آدمیوں میں سے تھا جنھوں نے وقتی سیاست سے متاثر ہو کر جماعتِ شیعہ کے خطوط جانے کے بعد اپنی جانب سے امام حسینؑ کو ایک دعوتی خط لکھ دیا تھا۔ اس لیے اس کو آپ کے پاس جانے اور اس قسم کی گفتگو کرنے سے حجاب دامن گیر ہوا اور اس نے انکار کر دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ دوسرے ایسے اشخاص کو بھی جو خطوط لکھ چکے تھے جانے میں اسی صورت سے توقف ہوا اور آخر کثیر بن عبداللہ شعبی ایک دُرشت خو اور سخت آدمی یہ کہتا ہوا سامنے آیا کہ میں جانے کے لیے تیار ہوں بلکہ مجھے حسینؑ کے قتل کرنے کے لیے کہا جائے تو اس میں بھی عذر نہیں ہے۔ عمر سعد نے کہا نہیں، یہ مطلب نہیں ہے۔ تم بس جا کر اتنا دریافت کر لو کہ آپ اس ملک میں کس لیے آئے ہیں؛ کثیر خیمہ گاہِ حسینی کی طرف روانہ ہوا۔ بہادر ابو ثمامہ صائدی نے جو شاید اس وقت خیمۂ امام حسینؑ پر پہرا دے رہے تھے اسے دور سے دیکھ لیا اور امامؑ سے عرض کیا کہ آپ کی طرف بدترین خلق اور انتہائی سفاک و خونریز شخص آ رہا ہے۔ اس کے بعد وہ خود آگے بڑھ گئے اور انھوں نے کثیر کو روک کر ہتھیار کھول کر رکھ دینے کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ میں پیغام لے کر آیا ہوں۔ اگر مجھے موقع دو تو میں پیغام پہنچا دوں، نہیں تو واپس جاؤں۔ ابو ثمامہ نے کہا، اچھا میں تمھاری تلوار کے

قبضہ پر ہاتھ رکھے رہوں گا اور اس طرح تم کو امام کی خدمت میں لے جاؤں گا۔ کثیر نے اسے بھی منظور نہ کیا اور کہا، میری تلوار کو تو تم ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ ابو ثمامہ نے کہا کہ اچھا پھر اپنا پیغام تم مجھ سے کہہ دو۔ میں اس کا جواب امام سے لا دوں گا۔ اس طرح گفتگو بڑھتے بڑھتے بالآخر سخت کلامی کی نوبت آگئی اور کثیر نے واپس جا کر عمر سعد کو اپنی سرگزشت سے مطلع کر دیا۔

اب اس نے قرہ بن قیس حنظلی کو بلایا اور اس سے کہا تم جا کر حسینؑ سے دریافت کرو کہ وہ اس سرزمین پر کس لیے آئے ہیں[1]؟ چنانچہ قرہ بن قیس روانہ ہوا۔ امام نے جو اسے آتے دیکھا تو دریافت فرمایا کہ تم لوگ اسے پہچانتے ہو؟ حبیب بن مظاہر نے کہا، جی ہاں۔ یہ قبیلۂ حنظلہ کا ایک شخص ہے۔ بنی تمیم میں سے اور ننھیال کی طرف سے ہمارا عزیز ہوتا ہے میں ایک عرصہ سے اس کو جانتا ہوں اور میرے خیال میں یہ سنجیدہ و فرزانہ شخص تھا۔ مجھے یہ خیال نہ تھا کہ یہ اس موقع پر جنگ کے لیے ہمارے مقابل میں آئے گا۔ اتنی دیر میں وہ آگیا اور امام کی خدمت میں تسلیم بجا لاتے ہوئے اس نے عمر سعد کا پیغام پہنچایا۔ وہی کہ آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا "مجھ کو تمھارے شہر کے لوگوں نے لکھا تھا کہ میں آؤں لیکن اب جبکہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا۔" جواب اتمام حجت کے مقصد کا حامل اور صلح پسندی کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل صاف تھا۔ قاصد واپس جانے لگا، حبیب ابن مظاہر کو موقع تبلیغ کا مل گیا۔ کہنے لگے "اے قرہ بن قیس ظالم جماعت کی طرف کہاں واپس جاتے ہو، آؤ اور اس مظلوم کی مدد کرو جس کے بزرگوں کی بدولت تمھاری اور ہماری ہدایت ہوئی ہے۔" قرہ نے کہا۔ میں جو پیغام لایا تھا اس کا جواب پہنچا دوں پھر غور کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے جا کر عمر سعد سے جواب امام حسینؑ کا بیان کیا۔ اس جواب سے اسے توقع پیدا ہوئی کہ اب صلح ہو جائے گی لہٰذا اس نے عبیداللہ بن زیاد

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۳۔ دینوری نے قرہ بن سفیان حنظلی درج کیا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۵۱)

کے نام خط لکھا کہ "میں نے یہاں پہنچکر حسینؑ کے پاس اپنا نمائندہ بھیجا اور اس کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ وہ ادھر کیوں آئے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں اور کیا مطالبہ رکھتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اس ملک کے لوگوں نے مجھ کو لکھا تھا اور میرے پاس ان کے قاصد گئے تھے اور مجھے ادھر آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن اب جبکہ وہ میرا آنا ناپسند کرتے ہیں اور ان کے خیالات میں تبدیلی ہوگئی ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں ادھر ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

خط پہنچا۔ ابن زیاد نے پڑھا اور غرور و تکبر، فرعونیت اور ظلم و سفاکی کے جذبہ کے ماتحت اس نے یہ شعر پڑھ کر اپنی تاریک ذہنیت کا ثبوت دیا ؎

الآن اذ علقت مخالبنا بہ

یرجو النجاۃ ولات حین مناص

(یعنی) "اب جبکہ ہمارے چنگل ان تک پہنچ گئے ہیں تو وہ نجات کے طالب ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اب وہ ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے۔"

اس نے عمر سعد کو لکھا۔ "خط پہنچا اور حال معلوم ہوا۔ تم حسینؑ کے سامنے یہ سوال پیش کرو کہ وہ اور ان کے تمام اصحاب یزید بن معاویہ کی بیعت کر لیں۔ جب وہ ایسا کر چکیں گے تو پھر ہم رائے قائم کریں گے۔"[1]

اس خط سے عمر سعد کی امیدوں کی دنیا میں ایک دفعہ پھر تاریکی چھا گئی۔ اس خط کے عنوان میں ابن زیاد کی مفسد اور فتنہ پسند ذہنیت کا پورا پورا ثبوت موجود تھا۔ اول بیعت یزید کا امام حسینؑ سے مطالبہ ہی ایسا تھا جس کا اثر قبول کرنا آپ کے لیے ناممکن تھا۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ بفرضِ محال بیعت کر لینے کی صورت میں بھی حکومت کی طرف سے کسی خوشگوار نتیجہ کا وعدہ نہ تھا بلکہ یہ کہا جا رہا تھا کہ ہم پھر رائے قائم کریں گے۔ اس کے یہی معنیٰ ہو سکتے تھے کہ اس کے بعد بھی حکومت امام حسینؑ کے گزشتہ انکارِ بیعت کی بناء پر آپ کے لیے کچھ سزا

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۲

تجویز کرنے کا حق رکھے گی۔

خط کا انداز بتا رہا ہے کہ ابن زیاد حضرت امام حسینؑ کے اتمام حجت پر مبنی جواب کی صحیح نوعیت کو نہیں سمجھا اور اس نے خیال کیا کہ فوج کی کثرت کو دیکھ کر آپ ڈر گئے ہیں اور اس لیے کہ میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاؤں گا۔ مگر عمر سعد، حسینؑ اور ان کے اصحاب کے تیوروں کو قریب سے دیکھ رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ آپ کا جواب صرف امن پسندی اور سلامت روی کا نتیجہ ہے کسی ہیبت اور خوف پر مبنی نہیں ہے۔ اس لیے اس نے ابن زیاد کے اس خط کو بالکل نامعقول سمجھتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ امیر ابن زیاد امن و سکون کے خواہاں نہیں ہیں"۔[1]

پھر بھی اس نے یہ کیا کہ ابن زیاد کا خط امام حسینؑ کے پاس بھیج دیا۔ امام حسینؑ نے وہی کہا جو عمر سعد سمجھ چکا تھا۔ یعنی "یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ موت ہی تو ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہوں"۔[2] عمر سعد نے یہ جواب امام حسینؑ کا ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۴، ارشاد ص ۲۳۹۔۲۴۰۔ الاخبار الطوال ص ۲۵۱ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۲

تئیسواں باب

بندشِ آب اور غلبۂ تشنگی

حقیقتِ امر یہ ہے کہ امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب و اقربا عہ یہاں تک کہ اطفال خورد سال پر پانی بند کرنے کا انتظام دوسری محرم ہی کو ہو گیا تھا۔ اس خط کے ذریعہ سے جو ابن زیاد نے حُر بن یزید ریاحی کے پاس بھیجا تھا اور جس میں صاف صاف لکھا تھا کہ حسینؑ کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ اور انھیں ایک ایسی جگہ قیام پر مجبور کرو جہاں پانی موجود نہ ہو۔ اس حکم کے نفاذ میں اتنا اہتمام تھا کہ قاصد کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ حُر سے اس وقت تک جدا نہ ہو جب تک اس حکم کی تعمیل نہ ہو جائے۔ چنانچہ حُر نے امام کے سامنے اپنی مجبوری کا اظہار کر کے حضرت کو کربلا میں ایسے ہی بے آب مقام پر قیام کے لیے مجبور کیا[1] اس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ پہلے ہو چکا ہے۔

اس کے بعد اب صورت حال یہ تھی کہ امام حسینؑ آپ کے اصحاب و اعزہ مخدراتِ عصمت اور اطفال ان سب کے خیمے نہر سے دور جلتی ہوئی ریت پر تھے۔ صحرائے عرب کا سورج دن بھر اپنی پوری قوت سے ان خیام پر چمکتا تھا جس کے اندر رہنے والے یقیناً تمازتِ آفتاب شدت کے ساتھ محسوس کر سکتے تھے۔ نہر فرات فاصلہ پر رواں تھی اور وہاں دشمن فوج کا قیام تھا۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ابن زیاد کے خط کے جس جزو پر ہر دیکھنے والے کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے اور جسے حُر نے بھی خاص اہمیت دی "بے آب مقام" اس کے مقصد کی طرف خود ابن زیاد کی فوج کے سپاہیوں کی نظر نہ گئی ہو گی جبکہ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ والے افراد فریقِ مخالف کے ساتھ جس سخت گیری کا حکم نہیں بھی دیتے، چھوٹے درجہ کے عمّال اور سپاہی

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۴۹-۲۵۰، طبری ج ۶ ص ۲۳۲، ارشاد ص ۲۱۳، کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۲۶، ابوالفدا ج ۱ ص ۱۹۰

بربنائے تعصب اور نیز اپنے بڑوں کو ان کے مخالف کے ساتھ سختی کرکے خوش کرنے کے لیے اس کے لیے بھی تیار ہوجاتے ہیں۔ چہ جائیکہ حاکم کی طرف سے شدت کے ساتھ سختی کرنے کا حکم اور پھر صاف صاف پانی سے دور رکھنے کا فرمان بھی ہوگیا ہو۔ اس کے بعد یہ کسی طرح سمجھا ہی نہیں جاسکتا کہ اب حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے لیے پانی باطمینان وسکون اور بالکل بآسانی بغیر کسی رکاوٹ کے حاصل ہوجاتا ہوگا۔

ہاں ممکن ہے حُر اپنی ذات سے سختی نہ کرتا ہو۔ چونکہ وہ پہلے ہی امام کی حقانیت سے کچھ متاثر ضرور تھا مگر جب ابھی وہ "بازمانہ لبساز" پر عامل تھا اور حکومت وقت کی مخالفت پر کھل کر آمادہ نہ تھا تو دوسرے سپاہیوں کو وہ صاف صاف سختی و درشتی سے باز بھی نہ رکھ سکتا تھا پھر یہ تو دو ایک دن کی بات تھی کہ حُر سالارِ فوج تھا۔ اس کے بعد عمر سعد آگیا اور مزید فوجیں کربلا میں جمع ہوگئیں جس کے بعد حُر کی کوئی اہم حیثیت باقی نہیں رہی تھی اور نہ اس کی آواز کوئی آواز سمجھی جاسکتی تھی اس لیے یقیناً ان دنوں میں بھی اصحاب امام کے لیے پانی تک پہنچنا اور پانی بھر کرلانا ہر مرتبہ ایک خطرہ اور کشمکش کا مقابلہ کرنا تھا جسے اسی وقت اختیار کیا جاتا ہوگا جب بچوں کی پیاس بہت بڑھ جائے یا پوری جماعت پر پیاس کا شدید غلبہ ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بعض وقت جنگ بھی ہوگئی ہے اور جنگ کرکے پانی حاصل کیا گیا ہے[1]

ساتویں محرم کو وہ مخاص تاریخ تھی جب ابن زیاد کا دوسرا خط عمر سعد کے پاس پہنچا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ:-

"حسینؑ اور ان کے اصحاب پر پانی بند کردو، اس طرح کہ انھیں ایک قطرہ بھی پانی ملنے نہ پائے جیسا عثمان بن عفان کے ساتھ سلوک کیا گیا تھا۔"[2]

عمر سعد نے اس خط کو دیکھتے ہی عمرو بن حجاج زبیدی کو پانچسو سواروں کی فوج کے ساتھ گھاٹ پر مقرر کردیا اور یہ تاکید کردی کہ ایک قطرہ خیام حسینی کی طرف جانے نہ پائے۔

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ ص۱۸۷ [2] الاخبار الطوال ص۲۵۲، طبری ج ۶ ص۲۳۴۔ ارشاد

تاریخ میں تصریح ہے کہ یہ امام حسینؑ کی شہادت سے تین روز قبل کا واقعہ ہے[۱]
پانی کی اس بندش کے بعد جماعت حسینی کے تمام افراد اور بالخصوص صغیر اطفال پر پیاس کا شدید غلبہ ہو گیا[۲]

پھر دشمن کی یہ تنگ ظرفی تھی کہ اس ظلم و تشدد کے ساتھ زخم زبان بھی لگائے جا رہے تھے۔ جیسے یہ فقرہ کہ :۔ "حسینؑ! دیکھتے ہو یہ پانی نیلا نیلا آسمانی رنگت کا کس طرح بہہ رہا ہے مگر تم مرتے دم تک اس میں سے ایک قطرہ بھی نہیں پا سکتے"[۳]

اور یہ کہ "اے حسینؑ! یہ پانی موجود ہے جس میں کتے تک منہ ڈالتے ہیں اور عراق کے سور، گدھے اور بھیڑیے تک اس میں سے پیتے ہیں۔ مگر تم اس میں سے بخدا ایک قطرہ چکھ بھی نہیں سکتے"[۴]

بعید نہیں ہے کہ فوج یزیدی کا خیال یہ ہو کہ جماعت حسینی سے کسی جنگ کی ضرورت ہی نہ پڑے گی پیاس کی شدت ہی ان کے ختم کرنے کے لیے کافی ہو گی۔ چنانچہ ایک موقع پر جب حضرت نے اتمام حجت کے لیے خطبہ پڑھا اور پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق کا اظہار کر کے ان نام نہاد مسلمانوں میں احساس فرض پیدا کرنے کی کوشش فرمائی تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ "ہم یہ سب جانتے ہیں مگر اس کے باوجود تم کو چھوڑیں گے نہیں۔ یہاں تک کہ پیاس کی شدت کی وجہ سے ہی تم دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔"[۵]

حالانکہ حسینی اصحاب نے اپنی شجاعت سے یہ ثبوت دے دیا کہ ہم اب بھی جب چاہیں تمھیں گھاٹ سے ہٹا کر پانی حاصل کر لیں چنانچہ حضرت ابوالفضل العباس کے ساتویں کے بعد بھی جہاد کر کے پانی لانے کا تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے[۶]

غالباً یہ آٹھویں شب کا واقعہ ہے اس کے بعد آٹھویں، نویں اور دسویں تین دن کی مسلسل پیاس پھر بھی مسلم طور پر قائم رہتی ہے۔

---

[۱] الاخبار الطوال ص۲۵۲۔ طبری ج ۶ ص۲۳۴۔ ارشاد، کامل ابن اثیر ج ۴ ص۷۶۔ تذکرہ خواص الامہ سبط ابن جوزی ص۱۴۷
[۲] لہوف سید ابن طاؤس [۳] طبری ج ۴ ص۲۳۴، ابن اثیر ج ۴ ص۷۶۔ ارشاد۔ تذکرہ سبط ابن جوزی ص۱۴۲
[۴] تذکرہ ص۱۴۱ [۵] لہوف ابن طاؤس [۶] الاخبار الطوال ص۲۵۲، طبری ج ۶ ص۲۲۴

یہ اقربا و انصارِ حسینی کی یادگار وفاداری ہے کہ بغیر امام کے ان میں سے ایک نے بھی باوجود نہر تک پہنچ جانے کے لب تر نہیں کیے اور صاف کہہ دیا کہ یہ ناممکن ہے کہ ہم پانی پئیں اور حضرت امام حسینؑ پیاسے رہیں[1] اور یہ امام کی بلند نظری تھی کہ پانی کے حاصل کرنے پر اپنی طاقت صرف نہیں کی بلکہ تین دن تک صرف اتمامِ حجت کے طور پر ان کے ضمیر کے بیدار کرنے کی کوشش "سوالِ آب" کی صورت میں کرتے رہے اور اصحاب کو بھی اسی کی اجازت عطا فرمائی چنانچہ جب شدتِ عطش کا عالم دیکھتے ہوئے بریر ہمدانی نے اجازت چاہی کہ میں ابن سعد کے پاس جا کر پانی کے باب میں گفتگو کروں ممکن ہے کہ اس پر کچھ اثر ہو۔ حضرت نے فرمایا، تمھیں اختیار ہے۔ بریر، عمر سعد کے پاس گئے اور کہا "تم کیسے مسلمان ہو کہ آلِ رسولؐ کے قتل پر تیار ہو کر آئے ہو۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ آبِ فرات ہے جس میں سے عراق کے کتے اور سؤر تک پانی پیتے ہیں مگر یہ حسینؑ ہیں اور ان کے اہلِ حرم اور اعزا و اقارب کہ پیاس سے ہلاک ہو رہے ہیں اور انھیں فرات کے پانی تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔"

عمر سعد نے جواب میں گویا اقرارِ جرم کرتے ہوئے یہ عذر پیش کیا کہ "کیا کروں، رَے کی حکومت مجھ سے جاتی رہے گی اگر ابن زیاد کے خلاف کروں اور رَے کی حکومت کا ترک کرنا میرے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے[2]۔"

صبح عاشور جب حُر بن یزید لشکرِ شام سے جدا ہو کر جماعتِ حسینی کی طرف گئے تو انھیں سب سے زیادہ فوجِ یزیدی کے جس ظلم و تعدی کا احساس ہوا وہ پانی کا بند کرنا تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا اس لیے کہ امام حسینؑ نے اس کے پہلے حُر اور اس کی جماعت کو انتہائی تشنگی کے عالم میں سیراب کیا تھا۔ پھر یہ کہ اسی نے ابن زیاد کے حکم سے خیامِ حسینی کو نہر کے کنارے برپا نہ ہونے دیا اس لیے ایک طرح بندشِ آب کا وہ اپنے کو ذمہ دار سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے امام حسینؑ سے عفو قصور کرانے کے بعد فوجِ مخالف کے سامنے جو تقریر کی اس میں انتہائی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۴ [2] کشف الغمہ ص ۱۸۹

پُر اثر انداز میں جماعتِ حسینیؑ بالخصوص خواتین و اطفال کی عطش کا بیان اور بندشِ آب پہ اعتراض کیا ہے۔

۲۹ اس کا تفصیلی تذکرہ آیندہ آئے گا۔

جب اس تمام اتمامِ حجت اور موعظہ و نصیحت کا اس ستمگار اور قسی القلب فوج پر کوئی اثر نہ ہوا تو امام حسینؑ اور آپ کے ساتھ کے ہر بچہ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ راہِ حق پر اُن کے قیام اور ثبات و استقلال میں کسی تشدد اور ایذا رسانی سے ذرہ بھر کمی نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے شدتِ تشنگی کی تکلیف کو برداشت کیا اور تین دن کی پیاس کے عالم میں فریضۂ جہاد کو پورے طور سے ادا کرنے کے ساتھ شہادت کا خیر مقدم کیا۔

چوبیسواں باب

صلح کی آخری کوشش اور اس کا انجام

حسینؑ اپنے دامن پر یہ دھبہ لینا نہیں چاہتے تھے کہ آپ مسلمانوں کے درمیان خونریزی کو پسند کرتے ہیں۔ اس لیے آپ نے اتمام حجت کے لیے دوبارہ خود اپنی جانب سے صلح کی گفتگو کا آغاز فرمایا۔ اس طرح کہ عمرو بن قرظہ بن کعب انصاری کو عمر بن سعد کے پاس بھیجا کہ آج شب کو مجھ سے دونوں طرف کے لشکروں کے درمیان مل لینا۔ چنانچہ عمر سعد کوئی بیس سوار اپنے ساتھ لے کر نکلا اور امام بھی اتنے ہی ساتھیوں کے ساتھ تشریف لے گئے مگر جب قریب پہنچے تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو ہٹا دیا جس کے بعد ابن سعد نے بھی اپنے ساتھیوں سے علیحدگی اختیار کی۔ یہ مکالمہ بڑی رات گئے تک جاری رہا جس کے بعد امام اپنے خیام کی طرف واپس ہوئے اور ابن سعد اپنے لشکر گاہ کی طرف چلا گیا۔[1]

یہ تمام گفتگو صیغۂ راز میں تھی۔ مختصر طور پر اتنا معلوم ہو سکا کہ امام حسینؑ اس پر آمادہ تھے کہ عراق میں قیام کے خیال کو ترک کر دیں گے اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو عرب کا ملک بھی چھوڑ دیں گے اور کسی دور و دراز مقام پر چلے جائیں گے۔[2]

حقیقت کے لحاظ سے اس صورت میں بھی امام حسینؑ کی فتح تھی یعنی آپ کا ملک ترک کرنا بھی اس مقصد کا ایک اعلان تھا جس کی خاطر آپ کو جان دینا پڑی پھر بھی آپ کا رویہ اتنا نرم اور سلجھا ہوا تھا کہ یزیدی فوج کے افسر عمر سعد نے صاف اعتراف کر لیا کہ آپ صلح کے راستے پر گامزن ہیں اور اس نے بہت خوش ہو کر ابن زیاد کو خط لکھا اور حضرت

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۵ [2] طبری ج ۶ ص ۲۳۵

امام حسینؓ کی اس شرط مصالحت سے اطلاع دی۔ ان الفاظ کے ساتھ کہ "الحمد للہ فتنہ کی آگ فرو ہو گئی اور مسلمانوں کا شیرازہ مجتمع رہنے کی صورت پیدا ہو گئی اور امت اسلامی کا معاملہ روبہ اصلاح ہو گیا۔ آخر میں اس نے اپنی رائے بھی لکھی کہ میرے نزدیک اب مخاصمت کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اب اس معاملہ کو ختم ہونا چاہیے۔"[1]

کہا جاتا ہے کہ ابن زیاد نے بھی اس رائے کو منظور کرنا چاہا اور کہا کہ عمر سعد کا یہ خط بہت خیر خواہانہ ہے مگر شمر[2] بگڑ گیا اور کہنے لگا۔ "بھلا ایسا موقع جس کے ہاتھ آئے وہ اسے چھوڑ دے۔ حسینؓ آپ کے پاس پہلو میں آ گئے ہیں۔ اگر آج وہ چلے گئے اور انھوں نے آپ کی اطاعت اختیار نہ کی تو پھر یاد رکھیے کہ قوت و عزت ان ہی کا حق ہو گا اور کمزوری و عاجزی آپ کا حصہ۔ میری رائے میں ان کی یہ خواہش کبھی منظور نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ بڑی ذلت کی بات اور کمزوری کی نشانی ہے۔ بیشک انھیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دینا اور آپ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ پھر اگر آپ انھیں ان کے جرم کی سزا میں قتل کرنا چاہیں تو آپ کو حق اس کا ہے اور اگر معاف کر دیں تو اس کا بھی اختیار ہے۔ رہ گیا عمر سعد اس کا کیا ذکر، میں نے تو سنا ہے کہ پوری پوری راتیں وہ حسینؓ کے ساتھ باتوں میں گزار دیتا ہے۔"[3]

یہ خوشامد آمیز، غیرت انگیز، مفسدہ پرداز اور فتنہ پرور تقریر وہ تھی جس سے ایک طرف تو تفوق طلبی اور ظفر انجامی کے جذبہ میں حرکت پیدا ہوئی۔ دوسری طرف انانیت، غرور اور خود بینی کی رگ میں جنبش ہوئی اور تیسری طرف ابن سعد کی طرف سے بدگمانی ہو گئی اور وہ خلوص اور خیر خواہی کا قرینہ جو اس کی تحریر میں پایا جاتا تھا نیست و نابود ہو گیا۔ شمر بڑا خیر خواہ دوست اور سچا مشیر کار شمار کیا جانے لگا اور عمر سعد پر غصہ آنے لگا کہ وہ لڑنے گیا تھا اور رات رات بھر بیٹھ کر دشمن سے باتیں کرتا ہے حسینؓ سے مل گیا ہے اور ہم کو خواہ مخواہ دھوکا دیتا ہے۔ پھر ایسے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۵-۲۳۶۔ ارشاد ص ۲۴۱ [2] شمر کا اصلی نام تھا شرجبیل بن عمرو بن معاویہ۔ وہ بنی عامر بن صعصعہ میں آل وحید کلابی میں سے تھا (الاخبار الطوال ص ۲۵۴) [3] طبری ج ۶ ص ۲۳۶

مشتبہ شخص کا سردارِ لشکر باقی رکھنا کیسا؟ یقیناً شمر کو بھیجا جائے تاکہ ابن سعد کے طرزِ عمل کا تدارک اور حسینؑ کے ساتھ ہر قسم کی مصالحانہ گفتگو کا سدِّ باب کر سکے۔ چنانچہ ابن زیاد نے اسی دماغی الجھن کے عالم میں عمر سعد کے نام خط لکھا: "میں نے تم کو حسینؑ کی جانب اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ تم ان کے ساتھ مراعات کرو یا ان کے ساتھ معاملات کو طول دو یا ان کو زندگی کی امیدیں دلاؤ یا میرے پاس ان کی سفارش کرنے بیٹھو، دیکھو اگر حسینؑ اور ان کے اصحاب میرے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں اور اپنے کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیں تو ان کو خاموشی کے ساتھ میرے پاس بھیج دو اور اگر وہ انکار کریں تو ان پر حملہ کرو[1] انھیں قتل کر دو اور ان کے اعضاء و جوارح کو قطع کرو کیونکہ وہ اسی کے مستحق ہیں۔" اتنا ہی نہیں بلکہ اسلام کے نام کو بدنام، انسانیت کی پیشانی کو عرقِ انفعال سے تر اور تاریخ کو ہمیشہ کے لیے انگشت بدنداں کرنے والے یہ الفاظ تھے جو کسی اور کی نسبت نہیں رسولِ اسلامؐ کے سب سے پیارے راستباز نواسے حسینؑ کی نسبت لکھے جا رہے تھے کہ اگر حسینؑ قتل ہو جائیں تو اُن کے سینہ اور پُشت کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کرانا کیونکہ وہ سلطنت کے باغی، مخالف اور حریف ہیں۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ اس سے موت کے بعد ان کو کوئی نقصان پہنچے گا۔ لیکن یہ زبان سے کہہ چکا ہوں کہ اگر حسینؑ کو قتل کیا تو ان کے ساتھ یہ سلوک کروں گا۔ اگر تم نے ان احکام کا اجرا کیا تو خیر تمھیں معاوضہ ملیگا جو ایک وفادار فرماں بردار کو ملنا چاہیے اور اگر تمھیں یہ منظور نہ ہو تو لشکر کی سرداری سے علیحدہ ہو جاؤ۔ اور اس منصب کو شمر کے سپرد کر دو۔ جسے ہم نے پورے طور سے مناسب ہدایتیں کر دی ہیں" اس نے یہ خط شمر کے سپرد کیا اور زبانی بھی اس سے کہہ دیا کہ اگر عمر سعد اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو وہ معزول تصور ہوگا اور تم اس کی جگہ سردارِ لشکر قرار پاؤ گے۔ تم حسینؑ سے جنگ کرنا اور عمر سعد کو بھی قتل کر کے اس کا سر میرے پاس بھیج دینا[2]

یہ تعجیلی اور تنبیہی حکم نامہ شمر کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیجا گیا۔ اب جنگ کا التوا غیر ممکن سا ہو گیا۔ خود عمر سعد کو اس کا خوب اندازہ تھا کہ حسینؑ یزید کی بیعت یا ابن زیاد کی غیر مشروط اطاعت

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۳ [2] طبری ج ۶ ص ۲۳۶، ارشاد ص ۲۴۱، ۲۴۲

پر ہرگز آمادہ نہ ہوں گے اس لیے جونہی اسے ابن زیاد کا خط شمر کے ہاتھ پہنچا اور اس نے کھول کر اسے پڑھا فوراً شمر سے کہنے لگا "کم بخت یہ تو نے کیا کیا؟ خدا تجھ سے سمجھے، خدا تجھے غارت کرے اور اس پیغام کو غارت کرے جو تو میرے پاس لایا ہے۔ بخدا میں سمجھتا ہوں کہ تو نے ہی ابن زیاد کو میرے مشورہ پر عمل کرنے سے روک دیا اور اس بات کو بگاڑ دیا جس کے بن جانے کی امید تھی۔ خدا کی قسم حسینؑ کبھی اپنے کو ابن زیاد کے رحم و کرم پر چھوڑنا پسند نہ کریں گے۔ یقیناً حسینؑ اپنے باپ کا دل اپنے سینے میں رکھتے ہیں[1]۔" شمر نے کہا "ان باتوں کو جانے دو۔ یہ بتاؤ کہ اب کیا کرو گے؟ اپنے امیر کے حکم پر عمل یا سرداری کو میرے سپرد کرو گے؟"

کمزور دل اور دنیا پر جان دینے والا عمر سعد اپنی تمام قلبی کیفیتوں اور ضمیر کی ہدایتوں کو اُس وقت بھول جاتا تھا جب دنیا کے وقتی اعزاز اور جاہ و ثروت کے اس کے ہاتھ سے جانے کا سوال پیش ہوتا تھا اور اس طرح وہ دنیا کے عشق میں اپنی تمام وجدانی کیفیتوں کے پامال کر دینے پر اس حد تک تیار ہو جاتا تھا کہ اس کے ذیل میں اس کو بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب بھی گوارا ہو جاتا تھا۔ خطرہ بالکل قریب اور اس کا رقیب سرداری شمر سامنے موجود تھا اور صرف ایک ہاں یا نہیں کا جواب وہ تھا کہ جس پر تمام اُس کی آئندہ زندگی کا دار و مدار تھا۔ جس میں فقط سرداری رہنے یا نہ رہنے کا سوال ہی نہ تھا بلکہ ابن زیاد کے صریحی حکم کے مطابق جان جانے کا اندیشہ بھی تھا اس کے لیے تو ویسے ہی جذبۂ حق پسندی کی ضرورت تھی جو راہِ حق کے فداکاروں میں ہوا کرتا ہے مگر عمر سعد اس جذبہ سے عاری اور ثبات و استقلال سے خالی تھا لہٰذا شمر کے اس سوال پر اسے کہہ دینا پڑا کہ نہیں میں ہی اس مہم کو سر کروں گا[2]۔ ہاں تمھیں پیادوں کا افسر بنائے دیتا ہوں[3]۔ اس کے بعد سے شمر کا وجود اس کے لیے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا۔ ابن زیاد کی بدگمانی اس کی نسبت ظاہر ہو چکی تھی لہٰذا اسے اپنی وفاداری اور خیر خواہی کا ثبوت فراہم کرنا تھا۔ اس لیے اب جنگ میں ذرا بھی تاخیر اس کے نزدیک مناسب نہ تھی۔

---

[1] ارشاد مفید ص ۲۴۲ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۳ [3] طبری ج ۶ ص ۲۳۶ - ۲۳۷

چنانچہ اس نے اسی وقت حملہ کی تیاری کا حکم جاری کر دیا اور روز پنجشنبہ نویں تاریخ کی شام ہونے نہیں پائی تھی کہ امام حسینؑ پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ بالکل بغیر اطلاع تھا۔ امام حسینؑ عصر کی نماز کے بعد خیمہ کے دروازے پر تلوار کا سہارا لیے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھے تھے اور آپ کی آنکھ لگ گئی تھی کہ ایک مرتبہ گھوڑوں کی ٹاپوں اور فوج کے غل کی آواز جناب زینبؑ کے کان میں گئی۔ آپ گھبرا کر پردے کے پاس آئیں اور امام حسینؑ کو مخاطب کیا کہ دیکھیے فوج دشمن کی آوازیں بہت نزدیک سے آ رہی ہیں۔ آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا میں نے ابھی خواب میں دیکھا رسول اللہؐ کو، حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ تم عنقریب ہمارے پاس آیا چاہتے ہو۔ ادھر اچانک دشمنوں کے حملہ سے زینبؑ کا دل پریشان تھا ہی۔ ادھر جو امام نے یہ خواب بیان کیا تو جناب زینبؑ مضطرب ہو گئیں۔ دونوں ہاتھوں سے منہ پیٹ لیا اور کہا "ارے یہ غضب!" امام نے بہن کو تسکین دی۔ فرمایا "اے بہن غضب تمہارے دشمنوں کے لیے، خاموش رہو۔ خدا مالک ہے۔" ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ابوالفضل العباس نے آ کر اطلاع دی کہ فوج اعداء نے چڑھائی کر دی ہے۔ حضرت یہ سنکر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ عباس سوار ہو جاؤ اور ان سے پوچھو کہ اس وقت حملہ کا سبب کیا ہے؟ جناب عباس بیس سواروں کے ساتھ تشریف لے گئے اور آپ نے فوج مخالف سے خطاب کرتے ہوئے دریافت کیا کہ تمہاری رائے میں کیوں تبدیلی ہوئی اور اب تم کیا چاہتے ہو؟ جواب ملا کہ "امیر ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ تم لوگوں سے امیر کی اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور نہیں تو پھر جنگ شروع کر دی جائے۔" آپ نے فرمایا کہ اچھا پھر جلدی نہ کرو۔ میں امام کے پاس جا کر تمہارا مطالبہ پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد جیسا کچھ امام فرمائیں گے اس سے تم کو مطلع کر دوں گا۔ جناب عباس گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے امام حسینؑ کی خدمت میں واپس گئے اور آپ کو واقعہ کی اطلاع دی[1] حضرت نے فرمایا اگر ممکن ہو تو آج کی شب کی ان سے مہلت حاصل کرو تاکہ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۸

آج رات بھر ہم عبادت الٰہی اور دعا و استغفار میں بسر کرلیں۔ اللہ ہی واقف ہے کہ میں اُس کی نماز و عبادت، تلاوتِ قرآن اور دعا و استغفار سے کتنی محبت رکھتا ہوں[1] ادھر اس دوران میں حبیب بن مظاہر اور زہیر بن قین فوج مخالف سے گفتگو اور حضرت امام حسینؓ پر بلا وجہ ظلم و ستم کرنے پر اُن کو قائل معقول کرتے رہے یہاں تک کہ جناب عباس واپس آئے اور امام کے ارشاد کے مطابق ان سے ایک رات کی مہلت طلب کی[2] عمر سعد گزشتہ واقعات کی بنا پر شمر کی موجودگی کو اپنے لیے انتہائی خطرناک سمجھتا تھا۔ اس لیے اب وہ امام حسینؓ کے متعلق خواہ مخواہ بھی تشدد سے کام لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ شمر کی طرف متوجہ ہوا اور کہا، تمھاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ شمر نے جواب دیا کہ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ اس لیے کہ آپ افسر ہیں اور آپ کی رائے معتبر ہے۔

عمر سعد نے سمجھ لیا کہ شمر کا یہ جواب طنزیہ انداز کا حامل ہے، اس نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ مہلت نہ دی جائے۔" مگر چونکہ دراصل اس کا ضمیر اس کے خلاف تھا اس لیے اب وہ متوجہ ہوا دوسرے سرداروں کی طرف اور ان سے دریافت کیا کہ کیوں تمھاری کیا رائے ہے۔ عمرو بن حجاج زبیدی، ہانی بن عروہ کے برادرِ نسبتی نے جو اُن کے قتل کی خبر سنکر فوج لے کے دارالامارہ پر چڑھ دوڑا تھا، کہا "سبحان اللہ! اگر یہ لوگ قبیلۂ ترک و دیلم سے بھی ہوتے اور اتنی مراعات کے طالب ہوتے تو تمھیں ان کے ساتھ یہ مراعات لازم تھی۔" قیس بن اشعث نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مہلت دینی چاہیے[3] حضرت عباس کے ضبط و صبر کا بے نظیر نمونہ تھا کہ یہ تمام گفتگوئیں آپس میں ہوتی رہیں اور آپ خاموش نتیجہ کے منتظر کھڑے رہے۔ آخر کو مہلت کا مسئلہ طے پایا اور جناب عباس واپس ہوئے۔ اس طرح کہ آپ کے ساتھ عمر سعد کی طرف کا ایک نمائندہ بھی تھا اور اس نے آکر کہا کہ ہم آپ کو کل تک کی مہلت دیتے ہیں۔ اگر کل آپ نے ہتھیار ڈال دیے تو ہم آپکو اپنے امیر عبیداللہ بن زیاد کے پاس بھیج دیں گے اور اگر آپ نے انکار کیا تو پھر جنگ یقینی ہوگی۔[4]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۷-۲۳۸ - ارشاد ص ۲۴۲ [2] طبری ج ۶ ص ۲۳۸ [3] طبری ج ۶ ص ۲۳۸ - ارشاد ص ۲۴۳

پچیسواں باب

شبِ عاشور یعنی محرّم کی دسویں رات

کوشش کے ساتھ اس رات کی مہلت اس لیے نہیں لی گئی تھی کہ جنگ کی کوئی خاص تیاری کرلی جائے، نہ یہ کہ کہیں سے کسی امداد کے آنے کی کل تک امید ہو اور نہ یہ کہ امام چاہتے تھے کہ اپنے اہل بیت اور پسماندگان کو آئندہ کے لیے کچھ وصیتیں فرمادیں اور انھیں آئندہ کے لیے تیار کردیں یا اپنے بعد ان کی حفاظت کا کوئی سامان کرنا منظور تھا۔ ان میں سے کوئی بات نہ تھی۔ بلکہ ایک تو مقصد اس مہلت کا وہی تھا جو خود آپ نے جناب عباس سے ظاہر فرمادیا تھا۔ اس وقت جب انھیں مہلت لینے کے لیے بھیجا ہے وہ یہ تھا کہ ہم آج کی رات اپنے پروردگار کی خوب عبادت کریں اور دعا و استغفار میں مصروف رہیں۔ چنانچہ آپ نے اور آپ کے اصحاب نے تمام شب اس عالم میں گزاری کہ وہ مسلسل نماز اور دعا اور دعا اور استغفار اور بارگاہِ الٰہی میں تضرّع و زاری میں مصروف تھے۔[1]

دوسری بڑی مصلحت اس ایک شب کی مہلت میں یہ مضمر تھی کہ آپ خطرہ کے یقینی ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو اپنی اپنی طبیعتوں کے تول لینے کا موقع دینا چاہتے تھے اور ایک بار اور یہ کہہ دینا چاہتے تھے کہ جو آپ کا ساتھ چھوڑ کر جانا چاہتا ہو وہ چلا جائے۔ تاکہ عین موقع پر کوئی ایک متنفس بھی ایسا باقی نہ رہنے پائے جو خطرہ کے ہنگامی ہونے کی وجہ سے بادلِ ناخواستہ آپ کا ساتھ دینے پر مجبور ہوا ہو۔ چنانچہ آپ نے شام ہوتے ہوتے اپنے ساتھیوں کو مجتمع کرکے یہ خطبہ ارشاد فرمایا:۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۰

"تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں۔ راحت و تکلیف ہر حال میں اس کا شکر ہے۔ بارالٰہا تیرا شکر ہے کہ تو نے ہم کو نبوّت کی عزت عطا کی۔ قرآن کا علم دیا۔ دینی معلومات کا خزانہ مرحمت فرمایا اور ہمیں گوش شنوا، چشم بینا اور دلِ دانا کی نعمتوں سے مالا مال کیا۔"

اس کے بعد حضرت نے فرمایا "معلوم ہونا چاہیے کہ میں دنیا میں کسی کے ساتھیوں کو اپنے ساتھیوں سے زیادہ باوفا اور ان سے بہتر نہیں جانتا اور نہ اپنے اعزا سے زیادہ نیکو کار اور ادائے حق کرنے والے اعزّا کسی کے مجھے معلوم ہیں۔ خدا تم سب کو میری طرف سے جزائے خیر دے۔ آگاہ ہو کہ دشمن کل ضرور جنگ کرے گا۔ میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ جہاں تمھارا جی چاہے چلے جاؤ۔ میں بیعت کی ذمہ داری تم سے ہٹاتا ہوں۔ رات کا پردہ پڑا چاہتا ہے اسی کو اپنا مرکب بنا کر روانہ ہو جاؤ۔ تم ہی کو میں جانے کے لیے نہیں کہتا بلکہ ہر ایک تم میں سے میرے عزیزوں میں سے بھی ایک ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لے اور اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اس لیے کہ یہ لوگ صرف میرے طالب ہیں، اگر مجھے قتل کر ڈالیں تو پھر کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔[1]"

اس تقریر کو سنکر سب سے پہلے حضرت ابوالفضل العباس کھڑے ہوئے اور کہا "کس لیے ہم ایسا کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد ہم زندہ رہیں؟ ہرگز نہیں، خدا ہم کو یہ روزِ بد نصیب نہ کرے۔" دوسرے تمام اعزا بھی حضرت عباس کے ساتھ ہم آواز ہوئے اور متفق اللہجہ ہو کر یہی الفاظ زبان پر جاری کیے جس کے بعد امام نے خاص طور سے اولادِ عقیل کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "تمھارے لیے تو مسلم کا قتل ہو چکنا بہت کافی ہے۔ تم چلے جاؤ، میں تمھیں اجازت دیتا ہوں"۔ ان سب نے متفق اللہجہ ہو کر کہا "ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ کے بعد زندہ رہنے کا کوئی مزہ نہیں۔"

اس کے بعد اصحاب میں سے مسلم بن عوسجہ کھڑے ہوئے، کہا کہ "ہم آپ کو چھوڑ دیں؛ یہ نہیں ہو سکتا

---

[1] ارشاد ص ۲۴۳-۲۴۴۔ طبری ج ۶ ص ۲۳۸

خدا کی قسم میں ان دشمنوں سے نیزہ کے ساتھ جنگ کروں گا۔ یہاں تک کہ میرا نیزہ ان کے سینوں میں ٹوٹ جائے اور تلوار چلاؤں گا جب تک کہ اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ٹھہر سکے اور میں آپ سے کسی طرح جدا نہ ہونگا۔ اگر ہتھیار نہ ہوں گے کہ جن سے جنگ کروں تو میں انھیں پتھر ماروں گا اور آپکی حمایت کروں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اس جان کو نثار کر دوں۔" اس کے بعد سعید بن عبداللہ حنفی نے کہا۔" بخدا ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ خدا کی بارگاہ میں یہ ثابت نہ کر لیں کہ ہم نے رسالتمآبؐ کے غائبانہ حق کو آپ کے بارے میں ادا کر دیا۔ بخدا اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میں قتل ہونگا پھر زندہ کیا جاؤں گا، پھر جیتے جی جلا دیا جاؤنگا، پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے گی اور ایسا ہی میرے ساتھ ستّر مرتبہ ہوگا تب بھی میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آخری مرتبہ بھی آپ کے قدموں پر موت نہ آجائے۔ چہ جائیکہ یہ تو ایک مرتبہ کا قتل ہونا ہے اور اس کے بعد وہ دائمی عزت ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔" زہیر بن قین نے کہا۔" بخدا میری تو آرزو یہ ہے کہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں اور پھر قتل کیا جاؤں۔ ایسا ہی ہزار مرتبہ ہو مگر کسی طرح آپ سے اور آپ کے خاندان کے نوجوانوں سے یہ مصیبت دفع ہو جائے۔" دیگر اصحاب نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور سب کا متفق اللہجہ مطلب یہی تھا کہ یہ غیر ممکن ہے کہ ہم آپ سے جدا ہو جائیں بلکہ اپنی جانیں آپ پر فدا کر دیں گے۔ ہاں جب ہم مر جائیں تو پھر چاہے جو ہو ہم تو اپنا فرض ادا کر چکے ہوں گے[1] امام نے دعائے خیر دی اور اپنے خیمہ میں واپس تشریف لے گئے[2]

یہ تھا مجاہد کربلا کی حقانیت کا ایک بے مثال مظاہرہ۔ آپ زور تقریر سے جوش و خروش پیدا کرنے والے بیانات اور خوش آئند و دلفریب توقعات سے اپنے ساتھ والوں کو ساتھ رکھنا نہیں چاہ رہے تھے بلکہ ان کے سامنے حقیقت حال کو واضح کر کے غلط فہمیوں کو دور کر رہے تھے۔ یہ کوشش شب عاشور ہی تک نہیں رہی بلکہ اس کا آپ کی جانب سے مظاہرہ روز عاشور بھی ہوا۔ اس طرح کہ جب بشر بن عمرو حضرمی کو جو انصار امام میں سے ایک تھے یہ خبر پہنچی کہ ان کا فرزند

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۹ [2] ارشاد ص ۲۴۴

عمر رے کی سرحد پر قید ہو گیا ہے انھوں نے کہا کہ خدا پر چھوڑتا ہوں اس کو بھی اور اپنے آپ کو بھی۔ بیشک اگر مجھے زندہ رہنا ہوتا تو یہ پسند نہ کرتا کہ وہ قید میں رہے۔" امام کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ تم میری بیعت سے آزاد ہو، جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو۔ وفادار مجاہد نے جواب دیا کہ "مجھے جیتے جی درندے کھا جائیں اگر میں آپ سے جدا ہوں، یہ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے۔" حضرت نے فرمایا۔ "اچھا اپنے فرزند محمد کو بھیجو اور یہ کپڑے اس کو دے دو کہ ان کی قیمت سے اپنے بھائی کی رہائی کا سامان کر سکے۔" آپ نے پانچ کپڑے مرحمت کیے جن کی قیمت ہزار اشرفی کے قریب تھی۔ اس کے بعد جتنے جان نثار امام کے ساتھ رہ گئے تھے وہ وہی ہو سکتے تھے جو موت کو اپنے لیے یقینی سمجھتے ہوئے دل و جان سے مقصدِ حسینؑ کی حمایت کے لیے آمادہ تھے اور ان کے کردار میں کمزوری کے شائبہ کا امکان بھی نہ تھا۔

تیسری مصلحت اس ایک رات کی مہلت میں یہ ہو سکتی تھی کہ آپ دشمن کو ایک موقع اور اپنے کردار کے جائزہ لینے کا دینا چاہتے تھے تاکہ اگر کسی میں صلاحیت راہِ راست پر آنے کی ہو تو وہ آ جائے۔ چنانچہ عمر سعد کی فوج کا ایک بڑا افسر حُر بن یزید ریاحی جو سب سے پہلے حسینؑ کو گھیر کر کربلا میں لانے کا ذمہ دار تھا اپنے ضمیر کی ہدایت کی بنا پر فوج مخالف سے علیٰحدہ ہو کر اصحابِ حسینؑ میں داخل ہو گیا اور اس نے بھی آپ کی نصرت میں اپنی جان دی۔ اسی طرح اور بھی چند سپاہی نصرتِ باطل چھوڑ کر نصرتِ حق پر آمادہ ہو گئے۔

حقیقت میں ایک داعی حق کی بڑی کامیابی یہی قرار پا سکتی ہے کہ وہ کسی ایک متنفس کو ہی سہی حقیقی معنی میں راہِ ہدایت دکھا سکے اور حضرت امام حسینؑ کی یہ ایک بڑی کامیابی اس رات کی مہلت کا نتیجہ تھی جو آپ نے دشمن سے مانگ کر حاصل کی تھی۔

گزشتہ خطبہ کے بعد تمام رات امام اور اصحابِ امام نے عبادت خالق میں بسر کی۔ اس کے ساتھ آپ نے جنگ کے ہنگام کے لیے امکانی حد تک تحفظی تدابیر بھی کیے۔ آپ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ خیموں کو بالکل ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیں اور ہر خیمہ کی

طناب کو دوسرے خیمہ کے ساتھ باندھ دیں۔[1]

اس کے علاوہ آپ نے پشت کی جانب ایک ایسے نشیب کو جو ایک نالی کی طرح سے تھا کھدوا کر خندق تیار کرادی اور اس میں لکڑیاں جمع کرادیں کہ جب ان میں آگ دی جائے تو اس طرف سے دشمن کے حملہ کا اندیشہ نہ رہے۔

یہ تیاریاں شب عاشور مکمل ہوگئیں اور صبح کو اس خندق میں آگ روشن کر دی گئی اس طرح فوج دشمن کو بالکل گھیر کر چاروں طرف سے حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔

---

[1] ارشاد مفید ۲۴۵

چھبیسواں باب

دسویں محرم ۶۱ھ

اتمامِ حجّت اور آغازِ حرب

عاشور کی رات اپنی تمام کیفیتوں سمیت ختم ہوئی۔ یقین کرنا چاہیے کہ اس شب کربلا کے میدان میں کسی کی آنکھ لگنے نہ پائی ہوگی۔ اس طرف عبادت خدا اشتیاق شہادت، بی بیوں میں بے تابی بچوں میں پریشانی اور سب سے بڑھ کر پاس کا غلبہ اور اس طرف جنگ کی تیاری، اسلحہ کی درستی تدابیر جنگ کے متعلق مشورے اور اپنے ظالمانہ ارادوں کی تکمیل کے لیے صبح کا انتظار۔

بہرحال رات ختم ہوئی اور سپیدۂ سحری نمودار ہوا۔ حضرت امام حسینؑ نے اصحاب و اقربا کے ساتھ نماز صبح بجماعت ادا کی، وہ نماز جس کے تعقیبات میں کربلا کا جہاد تھا۔

عام انسانی دل و جگر کے معیار کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے ظاہر بیں افراد خیال کر سکتے ہیں کہ اس وقت اصحاب حسینؑ پر عجیب ہراس کا عالم طاری ہوگا۔ سامنے نظر جاتی ہوگی تو ان کو دشمن کی فوج کا عظیم سمندر موجیں لیتا ہوا نظر آتا ہوگا اور اپنی ہستی اس میں حباب کی سی نظر آرہی ہوگی مگر نہیں حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ ان کے دل اطمینان سے معمور تھے۔ ان کے سینوں میں خوشی اور مسرت کی لہریں تھیں اور ان کے چہروں پر فرحت و انبساط کی سرخی تھی۔ وہ جیسے کبھی خوش نہیں تھے ویسے آج خوش نظر آرہے تھے۔ جیسی پر مذاق باتیں کبھی نہ کرتے تھے ویسی آج کر رہے تھے۔

چنانچہ عبدالرحمٰن بن عبدربہ انصاری اور بریر بن خضیر ہمدانی کا واقعہ ہے کہ بریرؓ نے عبدالرحمٰن سے کچھ مزاح کیا۔ عبدالرحمٰن نے کہا "چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے

بریر نے جواب دیا کہ "خدا کی قسم میرے قوم وقبیلہ والے اچھی طرح واقف ہیں کہ مجھے جوانی سے لیکر اس عمر تک کبھی مذاق سے دلچسپی نہیں رہی ۔ مگر میرا دل اس وقت مستقبل کے تصور سے محفوظ ہو رہا ہے ۔ خدا کی قسم ہمارے اور سعادتِ ابدی کے درمیان بس اب اتنا فاصلہ ہے کہ یہ دشمنانِ دین تلواریں لے کر ہم پر ٹوٹ پڑیں اور مجھے تو تمنا ہے کہ کسی طرح وہ وقت جلد آئے کہ ان کی تلواریں ہم پر پڑنے لگیں"۔ [1]

بے شک یہ حقانیت پر اعتماد اور اخروی کامیابی کے کامل یقین ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے ۔ یہی چیز کمزور دل میں طاقت پیدا کرتی اور مایوسیوں کی ظلمت میں امید کی شمع روشن کرتی ہے ۔

اتنی دیر میں فوج مخالف میدانِ جنگ میں آگئی، پرے جمائے گئے اور لشکر کی ترتیب ہوئی میمنہ پر عمرو بن حجاج زبیدی، میسرہ پر شمر بن ذی الجوشن، سواروں کا سردار عزرہ بن قیس احمسی اور پیادوں کا افسر شبث بن ربعی یربوعی اور علم عمر سعد نے اپنے غلام ورید کے سپرد کیا۔ [2]

امام حسینؑ بھی میدانِ جہاد میں آگئے ۔ یقیناً تاریخ ایک ایسے سپہ سالار کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے ایسی چھوٹی سی جماعت کو کم از کم بیس تیس ہزار فوج کے مقابلہ میں جنگ کے لیے کھڑا کیا ہو ۔

ایک تاریخی صراحت کے مطابق یہ بتیس سوار اور چالیس پیادوں سے زیادہ نہیں تھے [3] اور اسی لیے شہدائے کربلا کے لیے بہتر کی لفظ زبان زد خلائق ہے ۔

مگر کربلا کے حالاتِ جنگ اور مجاہدین کے ناموں کی تفصیل اور دوسرے متعلقہ واقعات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد سو سے زیادہ اور دو سو سے کم تھی [4] ممکن ہے کہ عام طور پر تاریخ میں جو تعداد درج اور عموماً زبان زدِ خلق ہے اور جو اس کتاب میں بھی بعض جگہ نظر آئیگی۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۱ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱ ارشاد ص ۲۴۶

[3] الاخبار الطوال ص ۲۵۴ طبری ج ۶ ص ۲۴۱، ارشاد ص ۲۴۶

[4] عمار دہنی کی روایت ابو جعفر سے اس کے مطابق ہے ۔ اس میں ہے کہ جماعت حسینی ۴۵ سواروں اور سو پیادوں پر مشتمل تھی (طبری ج ۶ ص ۲۲۰)

ان جانبازوں کی ہو جو فوجی انداز پر تربیت یافتہ تھے لیکن سلسلۂ جہاد میں بہت سے ایسے افراد بھی میدان میں آگئے جو فوجی حیثیت سے سپاہی نہ سمجھے جا سکتے تھے۔

میدان جنگ میں آنے کے بعد پہلے امام نے اپنے ہاتھ درگاہِ احدیت میں بلند کیے اور یہ مناجات زبان پر جاری کی۔ کیا نسبت دی جا سکتی ہے نبیٔ خدا حضرت عیسیٰؑ کی آواز کو جو بائبل (عہد جدید) کی نقل کے مطابق صلیب پر بلند ہوئی تھی۔ اس انداز سے کہ ایلی ایلی لما سبقتنی "اے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" فرزندِ رسولؐ امام حسینؑ کی اس مناجات کے ساتھ جو اس سیلابِ مصیبت کے اندر آپ کے لبوں پہ جاری ہو رہی تھی۔

خداوندا! تو میرا سہارا ہے ہر تکلیف میں اور میرا قبلۂ امید ہے ہر سختی میں اور تجھ پر مجھے ہر مہم میں جو درپیش ہو بھروسا ہے۔ کتنے ہی صدمے ایسے ہیں جن کے برداشت کرنے سے دل کمزور ثابت ہوتا ہے اور حیلہ و تدبیر کی راہیں بند نظر آتی ہیں۔ دوست ان میں ساتھ چھوڑ دیتے اور دشمن ان میں طعنہ زنی کرنے لگتے ہیں۔ میں ان کو تیرے حضور میں پیش کرتا اور تیری بارگاہ میں عرض معروض کرتا ہوں اس لیے کہ میں تجھے چھوڑ کر کسی اور سے لَو لگانا ہی نہیں جانتا تو اس تکلیف کو دور کرتا اور اس کا تدارک کرتا ہے۔ یقیناً تو ہی ہر نعمت کا مالک اور احسان کا مرکز اور ہر مطلب کے لیے آخری جائے پناہ ہے۔"[1]

اس کے بعد آپ نے اپنے چھوٹے سے لشکر کو ترتیب دیا۔ میمنہ پر زہیر بن قین، میسرہ پر حبیب بن مظاہر اور علمدار عباس بن علیؑ قرار دیے گئے۔[2]

چونکہ امام حسینؑ کی جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ دین و آئینِ شریعت کی حقانیت کو ظاہر کرتے ہوئے اپنے دشمن کی سیرت و کردار کے متعلق دنیا کے سامنے اس حقیقت کو ثابت کر دیں کہ اسے اسلام سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے اس کے لیے ضرورت تھی کہ ایک تو آپ کے کردار میں کوئی ایسا شائبہ بھی نہ آنے پائے جو آپ کے خلاف تشدد کے جواز کی دلیل بن سکے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۱۔ ارشاد ص ۲۴۶ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۱، ارشاد ص ۲۴۶۔ الاخبار الطوال ص ۲۵۳

اسی لیے آپ نے مصالحت کی گفتگوئیں کیں۔ ملک عرب کو چھوڑنے اور دربدری کی زندگی بسر کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اسبابِ اشتعال پیدا کیے جانے کے باوجود بھی اپنے ساتھیوں کو جنگ میں سبقت سے روکے رکھا اور لڑائی کی مکمل تیاری ہو چکنے کے بعد بھی اپنی طرف سے پہل نہ ہونے دی چنانچہ صبح عاشور ابھی جب خیامِ امام کے ساتھ خندق میں آگ بھڑک رہی تھی تو ادھر کا ایک سوار سر سے پیر تک لوہے میں غرق اس طرف سے گزرا اور اس خندق کی آگ کو شعلہ ور دیکھ کر ایک انتہائی اشتعال انگیز جملہ کہا۔ معلوم ہوا کہ شمر بن ذی الجوشن ہے۔ مسلم بن عوسجہ نے امام سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو اس کو تیر کا نشانہ بنالوں کیونکہ یہ بڑا فاسق و فاجر شخص ہے اور اسوقت بالکل تیر کی زد پر ہے۔ حضرت نے فرمایا "نہیں ایسا نہ کرو۔ میں جنگ میں پہل نہیں کرنا چاہتا"۔[1]

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک تیر جو اس وقت کمان سے رہا ہو جاتا نوعیتِ جنگ کو تبدیل کر دیتا۔ امامؑ نے اس کا سختی کے ساتھ لحاظ رکھا۔

دوسرے اس کی ضرورت تھی کہ آپ کے خلاف دشمنوں کے طرزِ عمل میں تاویل کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ سب سے بڑی تاویل کسی ناروا عمل کے متعلق اسکا بے خبری اور ناواقفیت پر محمول کیا جانا ہے۔ بنی امیہ نے اپنے حدودِ مملکت میں یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے بعد کوئی اولاد نہیں چھوڑی اور ہم ان کے وارثِ جائز ہیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ امام حسینؑ اپنے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات نیز اپنے بارے میں اسلامی روایات کو فوج مخالف پر اس طرح واضح کر دیں کہ ان میں سے کسی ایک فرد کے لیے بھی ناواقفیت کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہ جائے اور آپ کے خلاف جو ظلم ہو رہا ہے اس کے جرم کی اہمیت ہر ایک پر بالکل روشن ہو جائے تاکہ ان میں سے ہر ایک نہ خود اپنے نفس کو دھوکا دے سکے اور نہ دوسروں کو ان کی نسبت کسی "حسنِ ظن" یا "حمل بر صحت" کا راستہ مل سکے۔ امام حسینؑ دیکھ چکے تھے کہ ان سے پہلے ان کے والد بزرگوار حضرت علیؑ کا مقابلہ کیا گیا اور اس مقابلہ کو "خطائے اجتہادی" کا پردہ ڈال کر قابلِ معافی سمجھ

---

[1] طبری ج ۶ صہ ۲۴۲

لیا گیا۔ حسینؑ کے خلاف تلوار اٹھانے والوں کے عمل میں اگر کہیں سے اس طرح کی گنجائش ہوتی تو سادہ لوح افراد یا ہوا خواہان بنی امیہ اس سے فائدہ اٹھانے سے چوکتے تھوڑے ہی اور اس سے مقصد اور مفاد دینی کو سخت نقصان پہنچ جاتا۔ اسی نے تحفظ کے لیے امام حسینؑ نے وہ سب کچھ کیا جسے "اتمام حجت" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد دشمن کے "اصرار گناہ" یا باطل پر ضد کی حیثیت اتنی نمایاں ہو گئی کہ کسی تاویل یا حمایت کا موقع باقی نہ رہا۔

تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صبح عاشور دونوں طرف کی صف بندی ہو چکنے کے بعد کافی وقت تک آغاز جنگ نہیں ہوا۔ اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دشمن اس کا موقع ڈھونڈ رہا تھا کہ کسی صورت سے حسینی جماعت کی طرف سے کوئی ایسا اقدام ہو جو بنائے جنگ بن سکے اور امام حسینؑ کا منشاء یہ تھا کہ میری طرف سے آغاز جنگ ہونے نہ پائے بلکہ اس کے برخلاف آپ نے دشمن کو راہ راست پر لانے کی پُرامن کوشش کر کے چاہا کہ اتمام حجت فرمائیں اس لیے آپ نے ناقہ طلب فرمایا اور اس پر سوار ہوئے۔ قرآن اپنے سامنے رکھا۔[1]

پھر صفوف دشمن کے قریب آکر بلند آواز سے ارشاد فرمایا۔ "اے گروہ مردم میری بات سنو جلدی سے کام نہ لو۔ یہاں تک کہ مجھ پر جو تمھارا حق ہے اس کے ماتحت تم کو نصیحت و ہدایت کا فرض ادا کر دوں اور تمھارے سامنے یہ حقیقت حال بیان کر دوں کہ میں تمھاری جانب کیوں آیا؟ اگر تم نے میرے بیان کو صحیح سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیا اور میرے ساتھ انصاف سے کام لیا تو یہ تمھاری خوش قسمتی ہو گی اور تمھیں معلوم ہو گا کہ تمھیں میری مخالفت کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی اور اگر تم نے میرے بیان کو قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو شوق سے مجتمع کر لو اپنی طاقتوں کو اور اکٹھا کر لو جس جس کو چاہو اپنے ہم خیالوں میں سے اور کوئی کوشش اٹھا نہ رکھو، پھر پوری طاقت سے بغیر ایک دم کی بھی مہلت دیے ہوئے میرا خاتمہ کر دو۔ میرے لیے وہ پروردگار کافی ہے۔ جس نے قرآن کو نازل کیا اور وہی اپنے نیک اعمال بندوں کا مددگار رہے۔" امام حسینؑ کی آواز خیمہ میں پہنچنا تھی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۱

کہ اہلِ حرم میں گریہ و بکا کا شور بلند ہوا۔ حضرت نے عباس و علی اکبر کو بھیجا کہ انھیں خاموش کرو۔ رونے کا وقت بعد کو آئے گا۔ جب آوازِ گریہ کی موقوف ہو گئی تو حضرت نے حمدِ الٰہی ادا فرمائی اور خدا کے اوصاف ذکر فرمائے پھر جناب رسالتمآبؐ پر درود بھیجا اور آنحضرت کے اوصاف و فضائل دیر تک بیان فرماتے رہے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے حسینؑ کے پہلے اور حسینؑ کے بعد کوئی متکلم نہیں دیکھا جو فصاحت و بلاغت میں آپ سے بڑھا ہوا ہو۔ حمد و صلوٰۃ ادا کرنے کے بعد حضرت نے فرمایا۔ "ذرا میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو۔ غور کرو کہ تمھارے لیے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے؟ کیا میں تمھارے نبیؐ کا نواسا نہیں ہوں اور ان کے وصی، ان کے چچا زاد بھائی اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے کا فرزند؟ کیا حمزہ سید الشہدا میرے باپ کے چچا اور جعفر طیار خود میرے ہی چچا نہیں تھے؟ کیا یہ حدیث جو زبان زدِ خلائق ہے تمھارے گوش زد نہیں ہوئی کہ حضرت رسولِ خداؐ نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں جوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں؟ اگر تم میری بات کو سچ سمجھتے ہو اور حقیقتاً وہ سچ ہی ہے، اس لیے کہ کبھی میں نے غلط بات نہیں کہی، پھر تو کوئی بات نہیں اور اگر تم میری بات کو غلط سمجھو تو اسلامی دنیا میں ابھی ہیں ایسے اشخاص جن سے اگر تم پوچھو تو وہ بتلا دیں گے۔ پوچھ لو جابر بن عبداللہ انصاری سے، ابوسعید خدری سے، سہل بن سعد ساعدی سے، زید بن ارقم سے، انس بن مالک سے۔ وہ تمھیں بتائیں گے کہ انھوں نے رسالتمآبؐ سے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے۔ پھر کیا یہ تمھیں میری خونریزی سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے[1] اس موقع پر شمر آپ کا کلام قطع کرتے ہوئے بول اٹھا کہ "میں اللہ کی عبادت ایک حرف پر کرتا ہوں۔ اگر میری سمجھ میں آتا ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو" (قرآن میں منافقین کی نسبت آیا ہے ومن الناس من یعبد اللہ علیٰ حرف لہٰذا اس کا مقصود

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۲

تھا کہ میں مسلمان نہیں، منافق ہوں اگر کچھ سمجھتا ہوں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں)

اصحاب خاموش کھڑے ہوئے امام کی تقریر سن رہے تھے انھیں شمر کی یہ بدتمیزی اور حضرت کے خطبہ میں مداخلت سخت ناگوار ہوئی۔ حبیب بن مظاہر نے پکار کر جواب دیا۔ "بخدا میں جانتا ہوں کہ تو خدا کی عبادت ستر حرفوں پر کرتا ہے (یعنی انتہائی مکار اور عبادت کے معاملہ میں فریبی ہے) اور میں گواہی اس کی بھی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے تیری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں۔ خدا نے تیرے دل پر مہر لگا دی ہے۔" امام نے پھر سلسلۂ تقریر جاری فرمایا۔ اگر تمھیں اس حدیث کی صحت میں پھر بھی شک ہے تو کیا اس میں بھی شک ہے کہ میں تمھارے رسولؐ کا نواسا ہوں۔ خدا کی قسم مشرق و مغرب کے عالم میں کوئی بھی نبیؐ کا نواسا میرے سوا موجود نہیں ہے نہ تم میں اور نہ تمھارے سوا دوسرے اقوام میں اور میں تو خود تمھارے ہی نبیؐ کا نواسا ہوں۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر تم کس لیے آمادہ ہوئے ہو؟ کیا کسی اپنے مقتول کا قصاص لینا چاہتے ہو جسے میں نے قتل کر دیا ہو؟ یا کسی اپنے مال کا مطالبہ رکھتے ہو جسے میں نے تلف کیا ہو؟ یا کسی زخم کا بدلہ چاہتے ہو جو میرے ہاتھ سے کسی کو لگا ہو؟" ایک خاموشی سی چھائی رہی اور ان میں سے کسی سے کچھ جواب دیتے نہ بن پڑا[1]۔ دیکھیے تو کہ ایک انسان ایک طرف اور ہزاروں زبانیں دوسری طرف۔ بے شک حق میں ایسی طاقت ہونا چاہیے اور ایک انسان اپنی سچائی اور حسن عمل پر اتنا اعتماد رکھتا ہو۔ حسینؑ اس وقت جبکہ اپنا کوئی گواہ نہ تھا اور مجمع دشمن تھا مجمع سے اپنی بے جرمی کا اقرار لے رہے تھے۔ تمام لشکر کو دعوت دی جا رہی تھی کہ کوئی شخص کسی جرم کا پتہ دے دے۔ ہوتا کوئی جرم کسی کی نگاہ میں تو اس تیس ہزار کے مجمع میں کوئی زبان کھولتا۔ کیا دنیا کی کوئی مادی طاقت زبانوں کو روکنے والی تھی؟ مگر معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کی طاقت تھی جو دہنوں پر قفل اور زبانوں پر گرہ لگائے ہوئے تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک یکہ و تنہا انسان ہزاروں آدمیوں کو مخاطب کر رہا تھا اور کسی کو اسکے خلاف زبان کشائی کی جرأت نہ تھی۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳۔ ارشاد ص ۲۴۸

فوجِ مخالف کے سکوت کو ملاحظہ فرمانے کے بعد آپ نے نام بنام ان لوگوں کو پکارا جن کے اس خط پر دستخط موجود تھے اور یہ لوگ معمولی درجہ کے سپاہی بھی نہ تھے بلکہ ان میں سے ہر ایک کم از کم ہزار پانچسو آدمیوں کا سردار تھا۔ آپ نے فرمایا "اے شبث بن ربعی، اے حجار بن ابجر، اے قیس بن اشعث، اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ کھیتیاں لہلہا رہی ہیں، چشمے پانی سے چھلک رہے ہیں۔ آئیے لشکر آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں۔[1]" اب معاملہ ان اشخاص کے لیے انتہائی نازک تھا۔ چار آدمیوں کی بابت نام لے لے کر یہ انکشاف کیا جا رہا تھا کہ انھوں نے بھی آپ کو خط بھیجا تھا۔ گویا یزیدی افواج اور ان کے سالار عمر سعد کے سامنے ان لوگوں کی سازش، دورنگی اور حکومت سے ایک طرح کی بغاوت کا ثبوت مہیا کیا جا رہا تھا حالانکہ وہ کوفہ کے سربرآوردہ اشخاص تھے اور ابن زیاد کی طرف سے بڑے بڑے معزز عہدوں پر فائز تھے۔ انھوں نے تو وہ خط جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے محض سازشی انداز میں ہوا کے رخ کو دیکھ کر لکھا تھا۔ اس خیال سے کہ حسینؑ کے نام اتنی کثرت سے خطوط آ رہے ہیں اور بلایا جا رہا ہے۔ اگر کہیں حسینؑ آ گئے اور فضا ان کے موافق رہی تو ہمارے لیے بھی جگہ باقی رہنا چاہیے اس لیے انھوں نے یہ خط لکھا مگر اس وقت اتنے گواہوں کے سامنے ان کی سازش منکشف ہو رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ واقعۂ کربلا کے بعد ابن زیاد کے ہاتھ سے ان لوگوں کا فیصلہ ہو جائے اور سلطنت بنی امیہ کی جانب سے راندۂ درگاہ قرار پا جائیں اس لیے بربنائے ضرورت ان کو اس موقع پر بے غیرتی کے ساتھ بولنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں سے انکار کیا اور کہا "ہم نے اس طرح کے خطوط نہیں لکھے تھے۔" امام نے فرمایا "اللہ اکبر! اتنا کھلا ہوا حقیقت سے انکار! تم نے خط لکھا تھا اور ضرور لکھا تھا۔ اچھا اگر بفرض محال نہیں بھی لکھا تھا اور تم لوگ میرا آنا حقیقتاً نہیں بھی چاہتے تھے تو مجھے واپس

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳، ارشاد ص ۲۴۸

چلا جانے دو کسی ایسی جگہ جہاں میں امن و امان کی زندگی گزار سکوں۔"

قیس بن اشعث نے (جس کی بہن جعدہ بنت اشعث نے حکومت شام کے ساتھ سازش میں شریک ہو کر امام حسنؑ کو زہر دیا تھا اور جس کا بھائی محمد بن اشعث حضرت مسلم کے قتل کا ذمہ دار تھا) پکار کر کہا۔ "آپ یزید کی بیعت کیوں نہیں کر لیتے؟" حضرت نے فرمایا۔ "تم ایسا کیوں نہ کہو گے؟ تم محمد بن اشعث ہی کے تو بھائی ہو۔ کیا تم اتنے کو کافی نہیں سمجھتے کہ مسلم بن عقیل کے خون کی ذمہ داری تم پر ہے۔ خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں نہ دونگا۔ اور نہ غلاموں کی طرح خطرہ سے اپنی جان بچا کر بھاگوں گا۔"

فوج مخالف کے متاثر ہونے کی پہلے ہی سے امید نہ تھی۔ اپنا فرض پورا کرنا تھا وہ پورا ہو گیا۔ حضرت نے ناقہ کو بٹھا دیا۔ اتر پڑے اور عقبہ بن سمعان کو حکم دیا کہ اسے باندھ دیں[1] چونکہ اصحاب حسینؑ آپ کے مقصد سے واقفیت حاصل کر چکے تھے اس لیے وہ بھی مسلک حسینی ہی کو پیش نظر رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور افواج یزید کی اکثریت عوام اہل کوفہ کے ممتاز افراد کی تقریروں کا ان پر کافی اثر ہو سکتا تھا۔ پھر ان میں بھی حبیب بن مظاہر وغیرہ جو ہمیشہ سے شیعہ علیؑ ہونے کی حیثیت سے مشہور تھے اور حضرت کو کوفہ کی جانب دعوت دینے والوں میں سے تھے۔ ہوا خواہان بنی امیہ کے لیے ان کی تقریر ایسی مؤثر نہ ہو سکتی تھی جیسی زہیر بن قین کی جو کہ ابھی قریبی زمانہ تک "عثمانی" گروہ میں شمار ہوتے تھے اور اب مکہ اور کربلا کے راستے ہی میں امام کے پاس آ کر شریک ہوئے تھے اس لیے فوج مخالف کے سامنے سب سے زیادہ تقریریں انھوں نے کی ہیں جن کا ظاہری حیثیت سے اسوقت کوئی نتیجہ مرتب ہوا ہو یا نہیں۔ لیکن یہی نتیجہ کیا کم ہے کہ افواج مخالف پر ہر ممکن ذریعہ سے اتمام حجت ہو گیا۔ چنانچہ امام حسینؑ کے مذکورہ بالا خطبہ کے بعد زہیر بن قین گھوڑے پر سوار، سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق صف سے باہر نکلے۔ پکار کر کہا۔ "کوفہ والو! خدا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳ - ارشاد ص ۲۴۸

کے عذاب سے ڈرو۔ ایک مسلمان کی گردن پر اس کے اسلامی بھائی کا یہ حق ہے کہ وہ اسے خیر خواہانہ نصیحت کرے اور ہم آپس میں بھائی بھائی اس وقت تک ہیں اور ایک ہی ملت کے تابع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک کہ ہمارے تمھارے درمیان تلوار چلنے نہیں لگی ہے یعنی جب تک باقاعدہ جنگ شروع نہیں ہوجاتی ہم میں اور تم میں رشتۂ اخوت قائم ہے اور تم ابھی ہماری طرف سے نصیحت کے مستحق ہو۔ بے شک جب تلوار چلنے لگے گی تو یہ رشتہ خود بخود ٹوٹ جائے گا اور ہم علیحدہ علیحدہ ملتوں کے تابع قرار پاجائیں گے۔ یقیناً اللہ نے ہماری اور تمھاری آزمائش کی ہے۔ اپنے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کے ذریعہ سے تاکہ وہ دیکھے کہ ہم ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں اور تم کیا سلوک کرتے ہو۔ ہم تم سب کو دعوت دیتے ہیں کہ ان کی مدد کرو اور عبیداللہ بن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ یزید اور ابن زیاد سے تم کو ان کی حکومت کے تمام دور میں کبھی سوا برائی کے کوئی اچھا سلوک نظر نہ آئے گا۔ وہ تمھاری آنکھوں میں سلائیاں پھروائے۔ تمھارے ہاتھ پاؤں قطع کرائے تم کو سولیاں دلوائے اور تمھارے نیک اعمال حفاظِ قرآن مثلاً حجر بن عدی اور ان کے ہمراہیوں اور ہانی بن عروہ وغیرہ کے ایسے اشخاص کو قتل کرتے رہے ہیں۔"[1]

مضمون کے لحاظ سے امام حسینؑ کے خطبہ اور زہیر بن قین کی تقریر میں بہت نمایاں فرق ہے۔ اس کا انداز خاص طور پر انفرادی حیثیت سے حقیقت حال کو واضح کرنے اور اپنی شخصیت کے تعارف پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں موجودہ حکومت کے متعلق ایک سیاسی تبصرہ ہے جس میں یزید سے زیادہ ابن زیاد کی حکومت کے کردار پر تبصرہ کیا گیا۔ اس مصلحت سے کہ مخاطب کوفہ کے باشندے تھے اور ان کو براہِ راست ابن زیاد کے مظالم سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ زہیر بن قین کو اپنی تقریر کے سلسلے میں سخت مزاحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح کہ ابن زیاد کے ہوا خواہوں اور خوشامدیوں نے خود زہیر کی مذمت اور ابن زیاد کی مدح شروع کردی اور کہا ہم اس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک تمھارے سردار اور ان کے ساتھیوں کو قتل نہ کرلیں یا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳

گرفتار کرکے ان کو ابن زیاد کے پاس نہ لے جائیں۔ زہیر اس کے بعد بھی خاموش نہ ہوئے اور ان کو ہدایت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شمر نے تیر لگایا اور کہا "بس خاموش۔ خدا تیری زبان کو چپ کرے"، مگر زہیر نے تیر کی بھی کوئی پروا نہیں کی اور وہ شمر سے مصروفِ کلام ہو گئے۔ شمر کے اس کہنے پر کہ "دیکھو تھوڑی دیر میں تم اور تمھارے سردار سب قتل ہوا چاہتے ہیں"۔ زہیر نے بڑی جگر داری اور قوتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیا "تو مجھے موت سے خوف دلاتا ہے؟ خدا کی قسم ان کے ساتھ مرنا مجھے تم لوگوں کے ساتھ زندگیٔ جاوید حاصل کرنے سے زیادہ محبوب ہے"۔ اس کے بعد پھر وہ لشکرِ مخالف کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا "اے اللہ کے بندو! ایسے بندگانِ زر کے کہنے میں نہ آؤ۔ خدا کی قسم پیغمبرِ خداؐ کی شفاعت ان لوگوں کو کبھی نصیب نہیں ہو سکتی جنھوں نے پیغمبرِ خداؐ کی اولاد کا خون بہایا ہو اور ان کے مددگاروں کو قتل کیا ہو"۔ امام حسینؑ نے یہ دیکھ کر باتوں کا جواب تیر سے دیا جا رہا ہے اور اتمامِ حجت کا فرض ادا ہو چکا ہے کسی سے پکار کر کہلوایا کہ زہیر! واپس چلے آؤ، اگر مومن آلِ فرعون نے اپنی قوم کو نصیحت کر کے اپنے فرض کو ادا کر دیا تھا تو یقیناً تم بھی اپنا فرض پورا کر چکے اور نصیحت کا حق ادا کر دیا۔ مگر نصیحت و تبلیغ کا کوئی فائدہ بھی تو ہو"[1]۔ اس آواز کو سنکر زہیر واپس چلے آئے۔

ان مصلحانہ رجحانات، ان حقیقت ریز بیانات اور بصیرت افروز نصائح و اظہارات کا کوئی اثر ہو رہا تھا یا نہیں۔ یہ امر بالکل تاریکی میں تھا، جب تک کہ حُر کے باطن نے پردہ الٹ کر اپنے کو ظاہر نہیں کیا۔ ہماری کتاب کے ناظرین کے لیے یہ نام کوئی اجنبی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی حُر وہ تھا جس نے ایک ہزار فوج کی جمعیت کے ساتھ آکر کوفہ کے راستے میں امام حسینؑ کو روکا تھا جو آپ کو گھیر کر کربلا لایا تھا اور جس نے ابن زیاد کا خط آنے کے بعد اتنی سختی برتی تھی کہ خیامِ حسینی کو دریا کے کنارے برپا نہ ہونے دیا تھا۔ اس کے بعد محرم کی دوسری تاریخ سے دسویں تک اس کی کیا حالت رہی تھی اس کا بعد کی صورتِ حال اور خود حُر کے اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت سے وہ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۳۔۲۴۴

امام حسینؑ کو کربلا میں پہنچا کر ابن زیاد کو مطلع کر چکا اس وقت سے برابر خاموشی کے عالم میں مگر بے چینی کے ساتھ حالات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔

اس کے قبل اس نے راستے ہی میں اس طرح کی سلسلہ جنبانی کرنا چاہی تھی کہ کسی طرح امام حسینؑ اور یزید یا ابن زیاد کے درمیان کچھ خط و کتابت ہو اور معاملات روبہ اصلاح ہو جائیں۔ اس کے بعد میدانِ کربلا میں پہنچنے کے بعد بھی اسے یہ توقع تھی کہ بیچ میں کوئی ایسا مشترک نقطہ پیدا ہو جائے گا جہاں امام اور ان کے مخالف مجتمع ہو جائیں اور جنگ کی صورت پیش نہ آئے۔ اسے کوفہ سے متواتر فوجیں آنے سے انتشار ضرور پیدا ہوتا ہوگا مگر عمر بن سعد کا طرزِ عمل اس کے لیے امید افزا تھا جو خود صلح کی گفتگو میں کر رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ نہ ہو۔ ایسا بھی وقت آیا جب سلسلۂ گفتگو ایسے نقطہ پر پہنچا جہاں عمر سعد تک نے یہ طے کر لیا کہ اب معاملہ یکسو ہو گیا اور مقابلہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ پھر ایسی صورت میں حرؑ کو یہ سمجھنے کی کیا وجہ تھی کہ جنگ ضرور ہوگی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ امام کا طرزِ عمل روادارانہ ہے۔ آپ اپنی جانب سے معقول شرائط پیش کر رہے ہیں جن پر صلح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ توقعات تھے جو اس کے دل و دماغ پر نویں محرم کی سہ پہر تک چھائے رہے ہونگے مگر ۹ محرم کی شام کو یہ سب امیدیں منقطع ہو گئیں۔ ابن زیاد کے اس خط سے جو شمر بن ذی الجوشن کے ہاتھ عمر سعد کے پاس پہنچا جس کے بعد عمر سعد مجبور تھا کہ وہ اسی وقت حسینی جماعت پر حملہ آور ہو اور بدقت تمام حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کو صرف ایک شب کی مہلت عبادتِ خدا کے لیے دینا منظور کرے۔ یقیناً یہ وہ وقت تھا کہ جب حقیقتاً حرؑ کے سامنے امام حسینؑ سے کھل کر جنگ کرنے اور آپ کے قتلِ ناحق میں شرکت کرنے کا سوال صریحی طور پر پیدا ہو گیا اور اس کو یہ نظر آنے لگا تھا کہ میں نے اس سے پہلے حسینؑ کے خلاف جتنے بھی اقدامات کیے تھے وہ اس مظلوم مقدس ہستی کو فنا کی منزل سے قریب کرنے کے سامان تھے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اس کے بعد پھر اب کیا مجھ کو اس سے بڑے اقدامات میں شرکت کرنا چاہیے؟ کیا میں حسینؑ کے خون میں اپنے ہاتھوں کو رنگین کر سکتا ہوں؟ اس کا ضمیر سختی سے انکار کرتا تھا کہ ہرگز نہیں۔

مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ اسے اب سب کچھ یاد آتا ہوگا کہ حسینؑ وہ تھے جنھوں نے اس سخت موقع پر مجھے اور میری تمام فوج کو پانی سے سیراب کیا تھا۔ اب ان پر اور ان کے ننھے ننھے بچوں تک پر پانی بند ہے اور یہ بڑی حد تک میری ہی وجہ سے، اس لیے کہ میں نے ہی انھیں اس بے آب و گیاہ مقام پر اترنے کے لیے مجبور کیا۔ یہ سوچ کر اس کے قلب میں خود اپنی ہستی سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہوگا یا کم از کم اس کی کسی صورت سے تلافی کی صورتوں پر غور کرتے ہوئے وہ خیال کرتا ہوگا کہ اگر میں حسینؑ کے پاس جا کر اپنی اس خطا کو معاف کرنے کی درخواست کروں تو کیا اتنا بڑا مجرم دنیا میں معافی کے قابل بھی ہے؟ پھر اگر حسینؑ نے میری خطا کو معاف نہ کیا تو میں کہاں کا رہا؟ نہ دنیا کا نہ آخرت۔ پھر بھی اس کا ضمیر کہتا ہوگا کہ چل کر معافی مانگنا تو چاہیئے اپنا امکانی فرض تو بہرحال انجام دینا ضروری ہے۔ پھر میں جب اپنی جان ان کے قدموں پر ڈال دوں گا تو وہ کریم النفس ہیں ضرور معاف کر دیں گے۔ قرائن کی بنا پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ خیالات تھے جو اس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا کیے ہوئے تھے اور وہ شب عاشور ہی تھی جس کی سیاہی کے بے پناہ سمندر میں اس کے خیالات کی کشتی تھپیڑے کھا رہی تھی۔

ہُو مارتا ہُوا جنگل اور رات کا سناٹا! صفحۂ تاریخ بھی سنسان ہے، کون مورخ ہے جو اس معرکہ کی داستان قلم بند کرے جو حرؑ کے دل و دماغ میں برپا تھا۔ بے شک سچا شاعر اکثر حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ میر انیس علیہ الرحمۃ اور ان کے خاندان کے دوسرے باکمال مرثیہ گویوں نے جس طرح اس رات کو حرؑ کی حالت کی خیالی تصویر کشی کی ہے۔ وہ یقیناً ایک ایسا بیان حال ہے جس کی روایت خاموش فطرت کے واسطہ سے شاعر کے دل تک پہنچی ہے اور واقعات کے قرائن اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

بہرطور رات کسی طرح گزری اور صبح ہوئی۔ حرؑ کو پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اب کیا ہوتا ہے۔ کیا واقعی جنگ ہی ہوگی یا کوئی اور صورت رونما ہوگی۔ اس نے انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ دیکھا کہ افواج کی ترتیب ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ایک حصہ فوج کا افسر قرار دیا گیا ہے۔

اس نے امام کا بے نظیر مؤثر خطبہ سنا جس نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ مگر پھر اس نے انتظار کیا کہ اس کا اثر فوجِ مخالف پر کیا پڑتا ہے۔ اسی اثنار میں زہیر بن قین نے بڑھ کر تقریر کی اور ناصحانہ انداز میں اہلِ کوفہ کو مخاطب کیا۔ ان تمام باتوں کے بعد بھی اسے محسوس ہوا کہ افواجِ یزید کے ارادوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور وہ جنگ پر آمادہ ہیں۔ بس اس کے بعد حُر کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا اور وہ خیال جو اس کے دل میں پرورش پا رہا تھا اب رازداری کے حدود سے آگے بڑھ گیا۔ وہ عمر سعد کے پاس آیا اور کہا "کیا تم ان سے واقعی جنگ کرو گے؟"[1] اسی ایک سوال کے انداز میں وہ سب کیفیتیں مضمر تھیں جن میں حُر کئی روز سے دل ہی دل میں غلطاں و پیچاں تھا۔ اسے یہ یقین آنے کے قابل بات ہی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ فرزندِ رسولؐ سے جنگ عملی شکل بھی اختیار کرے گی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے آثار و قرائن کو جنگ کے قطعی پا رہا ہے مگر پھر بھی اس کی آرزو رکھتا ہے کہ یہ سب نمائشی ہو اور اس کو واقعیت سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ عمر بن سعد اس کے ضمیر کے اندرونی کیفیات سے بالکل بیگانہ تھا۔ اس نے حُر کے سوال کا فوجی انداز میں بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ "ہاں قسم بخدا، ایسی جنگ جس کا بہت ادنیٰ نتیجہ یہ سمجھنا چاہیے کہ سروں کی بارش ہو اور ہاتھ قلم ہو کر زمین پر گریں۔" حُر نے کہا "کیا اتنی صورتیں مصالحت کی جو حسینؑ نے پیش کیں ان میں سے کوئی تم لوگوں کے نزدیک منظوری کے قابل نہیں ہے؟"[2] اس سوال سے صاف ظاہر ہے کہ وہ صلح کی گفتگو کو پورے غور سے نتیجہ کی جستجو کے ساتھ سن رہا تھا اور یہ یقین رکھتا تھا کہ ان صورتوں میں سے کوئی ضرور مان لی جائے گی۔ عمر بن سعد نے کہا کہ "خدا کی قسم اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں ضرور منظور کر لیتا مگر کیا کروں؟ تمہارا حاکم نہیں مانتا۔"[3] عمر سعد کا یہ جواب خود کمزوری کا پہلو لیے ہوئے تھا اور اس کا عنوان حُر کی رائے اور خیال کو مزید تقویت دینے والا تھا اس لیے کہ وہ تسلیم کر رہا تھا کہ حسینؑ کا مسلک صلح جوئی کا حامل ہے اور ابن زیاد کی ہٹ دھرمی ہے کہ وہ قتال

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [3] طبری ج ۶ ص ۲۴۴

حسینؓ سے کم کسی بات پر رضامند نہیں۔ اس کے بعد حُرؑ کچھ گفتگو کرنا بیکار سمجھا اور اب یہ وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے اس فیصلہ کو جو بہت مشکل سے اسکے دل و دماغ کے انتہائی کشمکش کے نتیجہ میں طے پاسکا تھا عملی لباس پہنائے۔

حُرؑ کو یہ اندیشہ قطعی تھا کہ اگر فوج سے نکلنے کے پہلے یہ ظاہر ہوگیا کہ میری نیت کچھ اور ہے تو مجھے فوراً گرفتار کرلیا جائے گا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکوں گا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اس وقت بہت احتیاط سے کام لے رہا ہوگا۔ اس کے قبیلہ کا ایک شخص قرہ بن قیس اس وقت اس کے نزدیک تھا[1] غالباً یہ وہی شخص ہے جو عمر بن سعد کا پیغام لے کر امام کی خدمت میں گیا تھا اور حبیب بن مظاہر کے نصیحت کرنے پر اس نے کہا تھا کہ میں جو پیغام لایا ہوں جاکر اس کا جواب دے دوں تو پھر غور کروں گا کہ خود مجھے کس کا ساتھ دینا چاہیے۔ حُرؑ کو اس کا اپنے پاس رہنا ناگوار ہو رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ یہ کسی طرح میرے پاس سے ہٹ جائے مگر کچھ بنتا نہ تھا۔ آخر اس نے پوچھا کہ "قرہ! تم نے آج اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟" اس نے کہا "نہیں ابھی نہیں"۔ کہا، "پھر پلاؤ گے نہیں؟"[2] انسان کا چہرہ، اس کی بات چیت، اس کے چہرہ کا رنگ سب ہی اسکے خلاف جاسوسی کرتے ہیں۔ حُرؑ لاکھ چھپائے مگر دل کا اضطراب چھپنے کی چیز نہیں۔ قرہ کچھ نہ سمجھا ہو اتنا تو سمجھ لیا کہ یہ مجھے اپنے پاس سے ٹالنا چاہتے ہیں۔ بعد میں اس کا بیان تھا کہ اگر حُرؑ مجھ سے بتلا دیتے کہ میں امام حسینؓ کی طرف جا رہا ہوں تو میں بھی یقیناً ان کے ساتھ ہولیتا اور نکل جاتا[3] مگر یہ کہنے کی باتیں ہیں اور خواہ مخواہ کے عذر ہیں جو احساس گناہ پر وقت نکلنے کے بعد پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ایسی اخلاقی جرأت اس میں موجود ہوتی تو حُرؑ کے بے کہے چلے جانے پر بھی قرہ کے لیے راستہ نہیں بند ہوگیا تھا۔ وہ جانا چاہتا تو چلا جاتا۔ بہرحال یہ محسوس ہوتے ہوئے کہ حُرؑ کو میرا اپنے پاس رہنا ناگوار ہے اس نے اُس کے پاس سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ حُرؑ نے اپنے خیال کے مطابق اس کو ہٹا کر ایک رکاوٹ کو اپنے راستے سے دور کردیا اور آہستہ آہستہ گھوڑا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [3] طبری ج ۶ ص ۲۴۴

اپنا جماعت حسینی کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ نفسیاتی حیثیت سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت اس کا دل دھڑک رہا ہوگا۔ اس کے سینہ میں طوفان برپا ہوگا اور یقیناً وہ محسوس کر رہا ہوگا کہ اب میں کہیں اور رہوں۔ اس پر اس وقت ایک خود فراموشی اور مدہوشی کا عالم طاری ہوگا۔ اس وقت کسی کا ٹوک دینا! معاذ اللہ۔

مہاجر بن اوس اس کے قبیلہ کا ایک شخص کہنے لگا "کیوں حُر! کیا ارادہ ہے؟ کیا حملہ کرنا چاہتے ہو؟"[1] حُر اس کا کیا جواب دیتا؟ اس نے پھر بھی سکوت کرکے پردہ داری کی کوشش کی۔ کچھ جواب نہیں دیا، مگر جسم میں لرزہ سا پیدا ہوگیا۔ مہاجر نے کہا "حر تمھاری یہ کیا حالت ہے، میں نے تمھاری یہ کیفیت کبھی نہیں دیکھی۔ مجھ سے پوچھا جاتا کہ کوفہ میں سب سے زیادہ بہادر کون ہے تو میں تمھارے سوا کسی کا نام نہ لیتا۔ مگر اس وقت میں تمھاری عجیب حالت دیکھ رہا ہوں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟" یہ سنکر حُر نے مزید رازداری کی کوشش کو بے سود سمجھا۔ کہا "میرے سامنے اس وقت بہشت و دوزخ کا سوال ہے۔ میں تو بہشت پر کسی چیز کو مقدم نہ سمجھوں گا چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اور مجھے آگ میں جلا دیا جائے۔" یہ کہتے کہتے اس نے گھوڑے کو چابک لگایا اور اصحاب حسینؑ کی طرف پہنچ گیا۔[2]

اس موقع پر شاید حُر کو اندیشہ ہوا کہ اس کے اس طرح بے تحاشا گھوڑا اڑائے ہوئے آنے سے کہیں انصار امام کو پریشانی نہ پیدا ہو اور اس کی مزاحمت نہ کی جائے اس لیے اس نے انکے قریب پہنچتے ہی اپنی سپر کو پلٹ کر ہاتھ میں لے لیا۔[3] یہ طرز عمل عرب کے دستور کے مطابق تھا اس لیے کہ جب کسی کو حملہ کرنا مقصود ہو تو اس کے ایک ہاتھ میں کھنچی ہوئی تلوار اور دوسرے ہاتھ میں حفاظت کے لیے سپر ہوتی تھی لیکن اگر کوئی تلوار نیام میں رکھے اور پلٹی ہوئی سپر کو ہاتھ میں لیے آتا دکھائی دے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ امان کا طالب ہے یا کچھ پیغام لے کر آرہا ہے۔[4] حُر نے اس طرح اصحاب حسینؑ پر واضح کر دیا کہ وہ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ چنانچہ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۲ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [3] طبری ج ۶ ص ۲۲۲ [4] ابصار العین ص ۱۱۹

بلا روک ٹوک وہ سیدھا امام کے سامنے آیا اور کہنے لگا، فرزندِ رسولؐ! میری جان آپ پر فدا، میں وہی گنہگار ہوں جس نے آپ کو واپس جانے سے روکا۔ راستے میں آپ کے ساتھ ساتھ رہا اور آپ کو اس جگہ ٹھہرنے پر مجبور کیا۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں کہ مجھے یہ گمان ہرگز نہیں تھا کہ یہ لوگ آپ کے تمام شرائط کو جو آپ پیش کریں گے مسترد کر دیں گے اور نوبت یہاں تک پہنچے گی۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ کیا حرج ہے، میں کسی حد تک ان لوگوں کا ساتھ دوں اور معلوم نہ ہو کہ میں ان کی اطاعت سے باہر ہوں۔ پھر یہ لوگ ان شرائط کو تو قبول ہی کر لیں گے جو امام ان کے سامنے پیش کریں گے۔ بخدا اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ یہ لوگ ان شرائط کو آپ کے منظور نہیں کریں گے تو میں کبھی آپ کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتا۔ اچھا اب میں حاضر ہوا ہوں انتہائی شرمساری کے ساتھ توبہ کرتا ہوا اپنے گناہ سے خدا کی بارگاہ میں اس غرض سے کہ جان و دل سے آپ کا شریکِ مصیبت ہوں۔ یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر نثار ہو جاؤں۔ کیا اس طرح میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟" حضرت نے بلا توقف فرمایا۔ "ہاں ہاں! خدا تمھاری توبہ قبول کرے گا اور تمھیں بخش دے گا۔ مبارک ہو۔ واقعی تم حُرؑ (آزاد منش) ہو۔ ویسے ہی جیسا تمھاری ماں نے نام رکھا ہے۔ تم آزاد ہو انشاء اللہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔[1] گھوڑے سے تو اترو۔" حُرؑ نے کہا۔ "میرا آپ کی نصرت میں گھوڑے پر سوار رہنا نیچے اترنے سے بہتر ہے۔ چاہتا ہوں تھوڑی دیر ان سے جنگ کر لوں، پھر تو (مرکر) گھوڑے سے نیچے اترنا ہی ہے۔" امام نے یہ دیکھ کر کہ حُرؑ کو جہاد کا ولولہ ہے۔ فرمایا۔ "اچھا جو تمھاری خوشی ہو وہ کرو۔ خدا اپنی رحمت تمھارے شاملِ حال رکھے۔"[2] وہ ضبط بہت کر چکا تھا۔ امام سے خطا معاف کرا کے اس کا دل بڑھ چکا تھا۔ اب اسے حق محسوس ہوتا تھا کہ وہ افواجِ یزید کے سامنے جا کر ان کو بھی حق کے راستے پر آ جانے کی دعوت دے۔ چنانچہ وہ فوراً میدان میں آ گیا۔ پہلے تو اس نے ملائم الفاظ میں صفوفِ اہلِ کوفہ سے تخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بھائیو! آخر حسینؑ کی ان باتوں میں سے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۲، الاخبار الطوال ص ۲۵۴ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۴، ارشاد ص ۲۲۹

جن کو وہ پیش کرتے ہیں کسی ایک بات کو تم کیوں نہیں منظور کر لیتے تاکہ تمھیں ان کے مقابلہ میں جنگ کرنے سے نجات ملے۔" لشکریوں نے کہا کہ امیر عمر سعد موجود ہیں جو کچھ تمھیں کہنا ہے ان سے کہو۔ حُر نے عمر سعد سے مخاطب ہو کر پھر یہی الفاظ کہے اور ویسا ہی جواب ملا جو اس کے قبل مل چکا تھا کہ "اگر مجھ سے ممکن ہوتا تو میں ضرور ایسا کرتا۔" یہ سنکر حُر کو غصہ آ گیا، اتنے تلخ الفاظ میں جس کا اسے خود اسی فوج کے ایک نمایاں افسر ہونے کی بنا پر پورے طور سے حق حاصل تھا۔ اس نے کہا۔ "اے کوفہ والو خدا تمھیں غارت کرے۔ تم نے اس بزرگوار کو بلایا اور جب وہ آیا تو تم نے اسے دشمن کے سپرد کر دیا۔ تم نے خیال ظاہر کیا تھا کہ تم ان پر جان نثار کرو گے۔ پھر تم نے خود ان پر چڑھائی کر دی اور ان کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ تم نے ان کے نفس کی آمد و شد کو مسدود کر رکھا ہے اور گلا گھوٹنے پر آمادہ ہو اور چاروں طرف سے انھیں گھیر رکھا ہے۔ تم نے ان کو خدا کی چوڑی چکلی زمین میں جدھر وہ امن کا راستہ پائیں اُدھر جانے سے روک دیا ہے۔ اور وہ تمھارے ہاتھ میں قیدی کے مثل ہو گئے ہیں اور بے بس کر دیے گئے ہیں اور تم نے ان کو، ان کے اہلِ حرم اور بچوں کو اور ان کے اصحاب کو فرات کے اس بہتے ہوئے پانی سے روک دیا ہے جس کو یہودی مجوسی اور نصرانی تک پیتے ہیں اور عراق کے سؤر اور کتے تک اس میں لوٹتے ہیں مگر یہ لوگ ہیں کہ پیاس کی شدت نے ان کو جاں بلب کر رکھا ہے۔ حقیقتاً کیا بُرا وہ سلوک ہے جو تم نے محمد مصطفےٰؐ کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ جائز رکھا ہے۔ تم کو خدا اس شدت والی پیاس کے دن سیراب نہ کرے اگر تم آج ابھی اسی دم توبہ نہ کر لو اور اپنے طرزِ عمل سے پشیمان ہو کر باز نہ آ جاؤ۔"

حُر کی تقریر دشمن کے مفاد کے خلاف بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لیے تیراندازوں کو حکم دیا گیا اور انھوں نے کچھ تیر چلائے۔ یہ دیکھ کر حُر نے تقریر موقوف کر دی اور چونکہ جنگ باقاعدہ شروع نہ ہوئی تھی وہ واپس آ کر امام کے سامنے کھڑے ہو گئے۔[1]

جیسا کہ شبِ عاشور کی مہلت پر بحث کے سلسلہ میں کہا جا چکا ہے یہ امام حسینؑ کی ایک

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۵۔ ارشاد ص ۲۵

بہت بڑی فتح تھی جو عین موقع جنگ پر خود آپ کی آنکھوں کے سامنے اور آپ کے دشمنوں کی نگاہوں کے سامنے ظاہر ہوگئی کیونکہ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ جس قدر ہمت بڑھانے اور دلوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے مادی اسباب ہو سکتے ہیں سب فوج یزید کی طرف تھے۔ کثرتِ تعداد طاقت وقوت، یقین کامیابی، آسائش وراحت، آب وغذا کا اطمینان، پھر جائزہ وانعام اور بارگاہِ حکومت میں تقرب کے توقعات اس کے برخلاف جتنے ہمت شکن اور جی چھڑانے والے اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب اصحابِ حسینؓ میں مجتمع تھے۔ قلتِ تعداد، بے کسی و بے بسی، یقینِ بربادی اور تین دن کی بھوک پیاس اور حکومت کا عتاب جس کا نتیجہ اپنے ہی لیے نہیں بلکہ اپنے بعد اپنے پسماندگان اور اولاد کے لیے بھی ہمت شکن اور طاقت ربا ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس سب کے باوجود تاریخ یہ بتانے سے عاجز ہے کہ ان میں سے کوئی ایک معمولی سپاہی بلکہ بچہ بھی الگ ہو کر فوجِ مخالف سے جا کر ملا ہو۔ نہ حسینؓ کی زندگی میں اور نہ حسینؓ کے بعد۔ اس کے برخلاف فوجِ مخالف کا کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ ایک نمایاں افسر جنگ شروع ہونے سے قبل ہی اُدھر سے ٹوٹ کر ادھر آ گیا۔ یہ وہ غیر معمولی فتح تھی جس نے فوجِ مخالف کو دنگ کر دیا اور شاید فوج کا رنگ بے رنگ پا کر ہی سالارِ فوج نے مزید تاخیر کو خطرناک پایا۔

اب دھوپ کافی چڑھ چکی تھی اور دن کا اچھا خاصا حصہ گزر گیا تھا۔ عمر سعد نے لشکر کو آگے بڑھایا اور اپنے غلام وَرْدان کو جو علمبردارِ لشکر تھا آواز دی کہ جھنڈا اپنا میرے قریب لاؤ۔ وَرْدان رایتِ جنگ لیے اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ عمر سعد نے تیر اپنا چلہ کمان میں جوڑ کر فوجِ حسینی کی طرف رہا کیا اور لشکرِ یزید کو مخاطب کرتے ہوئے پکار کر کہا "گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے لگایا ہے"[1]

سپہ سالارِ لشکر ان الفاظ کو اپنی زبان پر جاری کرتے ہوئے تیر رہا کرے اور لشکریوں میں جوش وخروش پیدا نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔ یقیناً ہزاروں کمانیں کڑکیں، ہزاروں چلّے کھنچے اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۵۔ ارشاد ص ۲۵۰

ہزاروں تیر روانہ ہو گئے۔

نہیں سمجھا جا سکتا کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ والی قلیل جماعت اس اچانک حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی طریقہ پر تیار ہو سکتی تھی مگر انھیں تیاری کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ان کے تنے ہوئے سینے تیروں کے استقبال کے لیے موجود اور ان کے دل و جگر، شوقِ شہادت میں ناوکوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے پر آمادہ تھے۔

یزیدی لشکر والوں کو اندازہ تھا اور خوب اندازہ کہ اگر حسینی جماعت سے وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہی دست بدست مقابلہ کیا گیا تو کربلا کی جنگ صرف عاشور کے دن ختم نہیں ہو سکے گی اور وہ اس کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جنگ کا طول کھینچنا ان کے لیے انتہائی اندیشہ کا باعث ہے۔ اس لیے کہ امام کی مکہ سے روانگی کی اطلاع بصرہ میں ہو چکی ہے اور وہاں سے مدد پہنچنے کی توقع ہے۔ کوفہ کے بہت سے افراد جو ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ یقیناً موقع کے منتظر اور نصرتِ حسینؑ کے لیے بے چین ہوں گے نیز یہ بھی کہ ایران کچھ دور نہیں ہے اور وہاں کے بھی کچھ افراد کا امام حسینؑ کے ساتھ عقیدت رکھنا یقینی ہے خصوصاً جبکہ ان کے ساتھ علیؑ بن الحسینؑ بھی موجود ہیں جو ننھیالی رشتہ سے مملکتِ ایران کے شہزادے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا بہت امکان ہے کہ قومی تعصب ہی ایرانیوں کو حسینؑ کی حمایت پہ آمادہ کر دے۔ یہ بھی خیال ہو سکتا تھا کہ اجا و سلمیٰ پہاڑ بھی بہت فاصلہ پر نہیں ہیں جہاں کا قبیلۂ طے کافی اہمیت و طاقت کا مالک ہے اور طرماح بن عدی، امام حسینؑ سے یہ وعدہ بھی کر چکے ہیں کہ اگر آپ اپنے کو وہاں پہنچا دیں تو آپ کی مدد کے لیے ہزاروں جوان قبیلۂ طے کے بآسانی تیار پائے جائیں گے۔ پھر خود طرماح صحرائے کربلا کے قریب حضرت سے یہ کہہ کر رخصت ہوئے ہیں کہ میرا کچھ غلّہ ہے، اسے گھر پر رکھ آؤں تو آتا ہوں۔ ممکن ہے وہ آئیں تو اپنے ساتھ کچھ جوانانِ طے کو لیتے ہوئے آئیں۔ بہرحال اسباب کچھ بھی ہوں مگر بظاہر فوجِ یزید کو بہت جلدی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ یہ مہم جلدی سر ہو جائے مگر تیروں کی اس ابتدائی بارش سے جماعت حسینی کو کوئی خاص نقصان

نہیں پہنچا۔ بے شک وہ عملی طور پر ایک جنگ کا اقدام تھا جس کی ابتدا فوجِ دشمن کی طرف سے ہوگئی تھی اور یہ ایک آخری حجت تھی جس کے تمام ہونے کے امام منتظر تھے۔

چنانچہ بغیر کسی ہراس اور پریشانی کے امام متوجہ ہوئے اپنے اصحاب کی طرف، فرمایا "کھڑے ہو جاؤ موت کے استقبال کے لیے جو بہرحال ضروری ہے۔ خدا اپنی رحمت تمھارے شاملِ حال رکھے۔ یہ تیر نہیں بلکہ دشمن کے قاصد ہیں جو تمھاری طرف روانہ کیے گئے ہیں۔"

اصحابِ حسینؑ جو حیرت انگیز ضبط و تنظیم کے ساتھ تیروں کی اس بارش کے بعد بھی اپنی اپنی جگہ برقرار تھے اور کسی قسم کا انتشار ان میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ امام کی جانب سے ان الفاظ میں اذنِ جہاد پاتے ہی فوراً مستعد ہوگئے، اور انھوں نے تیروں کا جواب تیروں سے دیا۔ جن کے معنیٰ صرف مقابلہ کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ہزاروں تیروں کے مقابلہ میں سو دو سو تیروں کے ادھر سے بھی چلے جانے سے افواجِ مخالف کو کوئی خاص نقصان پہنچ نہیں سکتا تھا ان کی یہ تیروں کی سخت بارش ان مٹھی بھر انسانوں کو مرعوب نہیں کر سکی اور انھیں بہرحال ان سے جان توڑ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جس میں ہتھیاروں سے زیادہ دل کی طاقت کی ضرورت ہے اور ضمیر کے تزلزل سے یہی پہلو فوجِ یزیدی کا انتہائی کمزور ثابت ہو رہا تھا۔

ستائیسواں باب

انصارِ امام کے حالات اور حیرت انگیز قربانیاں

چونکہ آغازِ جنگ کے ساتھ ساتھ انصارِ حسینؑ کے مجاہدانہ خدمات کا عملی سلسلہ شروع ہوگیا تھا اس لیے اس ذکر کے ساتھ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب و انصار کے مختصر حالات زندگی اور خصوصیات شخصی کا بھی جہاں تک کہ علم ہوسکا ہے تعارف ہوتا چلے اس لیے واقعات کی تاریخی ترتیب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جن انصار کے کارنامے آنکھوں کے سامنے آئے ہیں ان کے مختصر حالات سلسلہ کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں۔ انہی حالات کے ذیل میں جنگ کے تفصیلات اور واقعات کی ترتیب کا بھی بیان ہوتا جائے گا۔ اگرچہ شہدائے کربلا کے حالات کے متعلق عربی میں "ابصار العین فی انصار الحسینؑ" اور اردو میں "شہدائے کربلا" کے تین حصے مطبوعہ امامیہ مشن لکھنؤ جامع اور مستند کتابیں موجود ہیں مگر اس غرض سے کہ زیرِ نظر کتاب اس حیثیت سے تشنہ نہ رہ جائے یہاں ان حالات کا لبِ لباب واقعاتی ترتیب کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ جو لوگ مزید تحقیق و تفصیل یا مختلف روایات پر بحث و تبصرہ کے طلبگار ہوں وہ مذکورہ کتابوں کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

۱۔ عبداللہ بن عمیر کلبی:

آغازِ جنگ کے بعد اصحابِ حسینؑ میں سے سب سے پہلے میدان کارزار میں یہی آئے تھے۔

ان کا پورا نام و نسب: ابو وہب عبداللہ بن عمیر بن عباس بن عبد قیس بن علیم بن جناب الکلبی العلیمی تھا۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور قبیلہ ہمدان کے بئر جعد نام کے کنویں کے پاس اپنے ذاتی مکان میں سکونت رکھتے تھے[1] یہ مقام کوفہ کی گنجان آبادی سے بالکل باہر اُن

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۵

باغاتِ خرما کے قریب تھا جو نخیلہ کے حدود میں واقع تھے۔ ان کے ساتھ ان کی رفیقۂ حیات رہتی تھیں جو قبیلۂ نمر بن قاسط سے تھیں اور اُم وہب بنتِ عبد کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔[1] اہلِ سیر کا قول ہے کہ وہ بڑے سورما، بہادر اور شریف تھے۔ شیخ طوسی نے کتاب الرجال میں ان کا اصحابِ حضرت علیؑ میں تذکرہ کیا ہے۔ کوفہ میں جناب مسلم بن عقیل کی شہادت ہو چکنے پر جب ابن زیاد نے قتلِ حسینؑ کی تیاری شروع کی اس زمانہ میں عبداللہ بن عمیر بیرونِ شہر اپنے مکان ہی میں مقیم اور موجودہ صورتِ حال سے بالکل بے خبر تھے۔ جب امام حسینؑ کربلا میں پہنچ گئے اور ابن زیاد نے اپنا لشکر گاہ نخیلہ میں قرار دیا تاکہ وہاں فوجوں کا معائنہ کرنے کے بعد کربلا کی جانب روانہ کرے تو اس غیر معمولی صورتِ حال کی طرف عبداللہ بن عمیر کو بھی توجہ ہوئی اور انھوں نے لوگوں سے واقعات کی نوعیت دریافت کی۔ انھیں بتایا گیا کہ یہ فوجیں دخترِ رسولؐ فاطمہ زہراؑ کے فرزند حسینؑ سے جنگ کرنے کے لیے بھیجی جا رہی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ بہادر عبداللہ کے ایمانی جذبہ میں تلاطم پیدا ہوا۔ انھوں نے خیال کیا کہ مجھے مشرکین سے جہاد کرنے کی حسرت رہی ہے۔ ان لوگوں سے جہاد کرنا جو اپنے رسولؐ کے نواسے کے ساتھ جنگ کر رہے ہوں یقیناً اللہ کے نزدیک مشرکین کے ساتھ جہاد کرنے سے کم درجہ نہیں رکھتا ہوگا۔ یہ بات دل میں ٹھان کر وہ اپنی زوجہ کے پاس گئے اور انھیں اپنے ارادہ سے مطلع کیا۔ پاک عقیدہ اور پُر حوصلہ بی بی نے آتشِ شوق کو اور ہوا دی۔ اس طرح کہ انھوں نے کہا تم بھی جاؤ اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ چنانچہ رات کے وقت دونوں روانہ ہوئے اور کربلا پہنچ کر انصارِ حسینؑ کے ساتھ ملحق ہو گئے۔

اس وقت جب فوج عمر سعد کی جانب سے تیروں کی بارش ہو چکی تھی جو پیغامِ جنگ کی حیثیت رکھتی تھی تو یسار اور سالم دونوں زیاد اور ابن زیاد کے غلام میدانِ جنگ میں آئے اور مبارز طلب ہوئے۔ فوجِ حسینی میں سے حبیب بن مظاہر اور بریر بن خضیر جوش میں بھرے ہوئے آگے بڑھے مگر امام نے ان کو روک دیا۔ بس عبداللہ بن عمیر کو تو ولولۂ جہاد تھا ہی، وہ کھڑے ہو گئے اور اجازت

جنگ چاہی۔ امام نے سر سے پیر تک ان پر نظر ڈالی۔ گندمی رنگ، لانبا قد، مضبوط کلائیاں اور بازو، کشادہ پشت اور سینہ ملاحظہ کرتے ہوئے بطور خود فرمایا "بہادر اور جنگ آزما جوان معلوم ہوتا ہے"۔ پھر فرمایا "جاؤ اگر تمھارا دل چاہتا ہے"۔ عبداللہ میدانِ جنگ میں آئے۔ فریقِ مخالف نے نام و نسب پوچھا اور انھوں نے بتایا۔ اس نے کہا ہم تم کو نہیں پہچانتے۔ ہمارے مقابلہ میں زہیر بن قین یا حبیب بن مظاہر یا بریر بن خضیر کو آنا چاہیے۔ بس یہ سنکر عبداللہ کو غصہ آیا۔ اس کا جواب سخت الفاظ میں دیتے ہوئے انھوں نے حملہ کرکے پہلے وار میں یسار کا کام تمام کر دیا۔ عبداللہ اس کی طرف متوجہ ہی تھے کہ سالم نے تلوار کا وار کیا جو سر پر آ چکا تھا۔ جب ان کو خبر ہوئی بہادر نے بائیں ہاتھ کو سپر بنا دیا جس سے اس ہاتھ کی انگلیاں قطع ہو گئیں مگر عبداللہ نے اتنی دیر میں پلٹ کر ایک ضربِ شمشیر میں اس کا بھی خاتمہ کیا۔ زخم خوردگی کے غصہ اور اپنے دونوں حریفوں پر فتح پانے کے جوش سے متاثر ہو کر عبداللہ بن عمیر رجز پڑھنے لگے جس کا مفہوم یہ تھا کہ "اگر مجھے نہ پہچانتے ہو تو پہچان لو کہ میں قبیلۂ کلب کا سپوت ہوں۔ میرے حسب و نسب کے لیے اتنا کافی ہے کہ خاندانِ علیم میں میرا گھرانا ہے۔ میں ایک سخت مزاج اور درشت خو انسان ہوں اور مصیبت کے وقت پست ہمتی سے کام لینے والا نہیں ہوں۔ اے آلِ وہب میں ذمہ داری کرتا ہوں تجھ سے کہ میں ان میں بڑھ بڑھ کر نیزے لگاؤں گا اور تلواریں ماروں گا۔ اور اس طرح کی شمشیر زنی کروں گا جو خدا پر ایمان رکھنے والے جوان ہمت انسان کے شایانِ شان ہو[2]"۔

ممکن ہے کہ یہ بہادرانِ عرب کی اس عام رسم کی بنا پر ہو کہ وہ اپنے کارناموں کا گواہ اپنی شریکِ زندگی خواتین کو بنایا کرتے تھے مگر عبداللہ کی زوجہ عام عورتوں کے مثل نہ تھیں وہ اپنے سینہ میں شیرانہ دل رکھتی تھیں اور اس دل میں ایمان کی غیر معمولی تڑپ کے ساتھ اپنے شوہر سے بے انتہا محبت تھی۔ ممکن ہے کہ جب انھوں نے اپنے شوہر سے فرمائش کی تھی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۵-۲۴۶۔ ارشاد ص ۲۵۰ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۶

کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو تو اسی وقت وہ یہ نیت رکھتی ہوں کہ میں بھی شوہر کے ساتھ میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دوں گی اور اس وقت تک شاید وہ اپنے قلبی جذبات کو انتہائی بے چینی کے باوجود روکتی رہی ہوں، اہلِ حرم اور ان کی ہمراہی خواتین کو دیکھ کر جو احکامِ اسلام کے تحت میدانِ جنگ سے کنارہ کش رہتے ہوئے خیموں میں جا گزیں تھیں۔

مگر عبداللہ بن عمیر کا میدانِ جنگ میں مذکورہ بالا اشعار پڑھنا جو ایک طرف ولولۂ جنگ کے مظہر، دوسری طرف جوشِ ایمان کا مرقع اور تیسری طرف قلبی واردات اور تعلقِ روحانی کے ترجمان تھے اور ان سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ اس حرب وضرب کے عالم میں بھی اپنی شریکۂ حیات کی یاد اپنے دل میں اور اس کی تصویر اپنی آنکھوں میں لیے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ اپنی شجاعت اور سرفروشی کی داد اس سے لینا چاہتے ہیں۔ بس یہ اسباب تھے جن کی بنا پر ان اشعار نے ام وہب کے ضبط وصبر کے لیے "برقِ خرمن" کا کام کیا اور وہ بے تحاشا ایک گرز ہاتھ میں لیکر میدانِ جنگ میں آگئیں اور پکار کر کہنے لگیں کہ "میرے ماں باپ دونوں تم پر نثار، اولادِ رسولؐ کی نصرت میں کوتاہی نہ ہونے پائے"۔[1]

دلیر و غیور عبداللہ کے لیے یہ منظر انتہائی صبر شکن ثابت ہوا۔ وہ فوراً زوجہ کے پاس آئے اور چاہا کہ انھیں خیمہ کی طرف پہنچا دیں مگر وہ باتوں میں آنے والی نہ تھیں۔ عبداللہ بن عمیر کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی جس سے دشمن کا خون ٹپک رہا تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیاں کٹ چکی تھیں جن سے خود لہو جاری تھا۔ پھر بھی انھوں نے کوشش کی کہ وہ اپنی قوت سے انھیں خیمہ کی طرف واپس کر دیں مگر جوش میں بھری بہادر خاتون نے اپنا دامن عبداللہ کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اور کہنے لگیں کہ "میں تمھیں چھوڑوں گی نہیں جب تک تمھارے ساتھ میں بھی قتل نہ ہو جاؤں"۔ امام حسینؑ نے یہ ملاحظہ فرما کر ان کو آواز دی کہ "اللہ تم دونوں کو جزائے خیر دے۔ اے مومنہ اہلِ حرم کے پاس واپس جاؤ اور ان کے ساتھ بیٹھی رہو کیونکہ عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے"۔ ایمان اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۶

اطاعتِ امام کا احساس تھا جو بے پناہ جذبۂ الفت اور جوشِ قربانی پر غالب آیا اور اہم وہب خواتین کے پاس خیمہ میں واپس چلی گئیں[1] اور اس کے بعد عبداللہ بن عمیر بھی صفِ مجاہدین میں واپس آگئے۔ اس کے بعد وہ میسرہ کے حملہ میں شریک ہوئے اور مسلم بن عوسجہ کے بعد شہادت پائی۔ جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

۲۔ حُر بن یزید ریاحی:

نام و نسب: حُر بن یزید بن ناجیہ بن قعنب بن عتاب بن ہرمی بن ریاح بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم التمیمی الیربوعی الریاحی۔ یہ خاندان عرب میں قدیمی عزت کا مالک تھا۔ عتاب جو حُر کی چوتھی پشت میں ہے نعمان بن منذر ملک حیرہ کے مخصوصین میں وہ درجہ رکھتا تھا کہ گھوڑے پر اس کے "ردیف" کی صورت سے سوار ہوتا تھا۔ عتاب کے دو فرزند تھے۔ قیس اور قعنب، باپ کے انتقال کے بعد یہ منصب قیس کو حاصل ہوا۔ بنی شیبان نے اس سے منازعت کی جس کے نتیجہ میں "یوم الطخہ" کی خونریز جنگ واقع ہوئی۔ قیس کے سلسلہ میں اخوص شاعر ایک صحابی تھے جن کا نام و نسب زید بن عمر بن قیس بن عتاب تھا۔ طبقہ کے لحاظ سے وہ حُر کے باپ یزید کے چچا زاد بھائی اور حُر کے رشتہ کے چچا ہوتے تھے۔

حُر، کوفہ کے رؤسا میں سے تھے اور ابن زیاد کی فوج میں افسر کی حیثیت رکھتے تھے اور قادسیہ کی فوج جو ناکہ بندی کے لیے تعینات تھی اس میں یہ بھی داخل تھے۔ اسکے بعد ان کا امام حسینؑ کو روکنے کے لیے بھیجا جانا، امام کا ان کی تمام فوج کو شدت سے پیاسا دیکھ کر اپنے ساتھ کا کُل پانی پلانا اور امام سے ان کی گفتگو اور آپ کے ارادۂ روانگی کے موقع پر سدِ راہ ہونا اور آپ کو گھیر کر میدانِ کربلا تک لانا اور ابن زیاد کا خط پاکر آپ کو یہاں قیام کرنے پر مجبور کرنا، اس کے بعد صبح عاشور ان کا لشکرِ یزید سے علیحدہ ہو کر اصحابِ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۶

حسینؑ میں شامل ہونا یہ تمام واقعات اس کتاب میں پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

آغازِ جنگ کے بعد جب عبداللہ بن عمیر کلبی ایک کارِ نمایاں انجام دے چکے یعنی دست بدست لڑائی میں انھوں نے تیار اور سالم کو قتل کر دیا تو اس شکست کے غصہ میں برافروختہ ہو کر عمرو بن الحجاج نے جو میمنہ لشکرِ یزید پر تھا مجموعی قوت سے حسینی جماعت پر حملہ کر دیا۔

اس سخت موقع پر حسینی مجاہدوں نے گھٹنے اپنے زمین پر ٹیک دیے اور نیزوں کی انیاں سامنے کر دیں جن سے دشمن کے گھوڑے اپنی جگہ ٹھہر گئے اور آگے نہ بڑھ سکے۔ اس کے بعد جب وہ لوگ واپس ہونے لگے تو انھوں نے ان کو تیروں کا نشانہ بنایا جس سے چند آدمی ان میں قتل اور چند زخمی ہوئے۔[1]

جنگ کی اس شدت کو دیکھ کر یقیناً ہر حرؑ کو خیال ہوا کہ کہیں کوئی ناصرِ حسینؑ مجھ سے پہلے نہ قتل ہو جائے، یہ سوچ کر انھوں نے خدمت امام میں عرض کیا "فرزندِ رسولؐ! چونکہ سب سے پہلے آپ سے لڑنے کو آیا تھا لہٰذا چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ سب سے پہلے میں ہی آپ کے قدموں پر نثار ہوں اور اس طرح دنیا سے جا کر آپ کے جدِ بزرگوار کی دست بوسی کا شرف حاصل کروں"۔ امام نے اجازت دے دی اور حرؑ میدان جنگ میں پہنچے اور کچھ اشعار رجز میں پڑھنے لگے۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں حرؑ ہوں اور مہمانوں کا پناہ دینے والا ہوں۔ میں تمھاری گردنوں پر تلواریں ماروں گا۔ اس امام کی جانب سے جو سرزمین مکہ کا سب سے بہتر رہنے والا ہے میں تم کو تہ تیغ کر دوں گا اور ذرا بھی اس کو ظلم نہیں سمجھوں گا۔ اس رجز کے بعد انھوں نے حملہ کرتے ہوئے شمشیر زنی شروع کر دی۔ اس کے پہلے جب حرؑ لشکرِ عمر سعد سے جدا ہو کر اصحابِ حسینؑ میں شامل ہوئے تھے تو یزیدی لشکر کے ایک سپاہی یزید بن سفیان تمیمی نے کہا تھا کہ "بخدا اگر میں حرؑ کو دیکھ لیتا اس وقت جب وہ لشکر سے نکل کر جا رہا تھا تو ایک نیزہ میں اُس کا کام تمام کر دیتا"۔ اب جو حرؑ تن تنہا اتنے بڑے لشکر کے مقابلہ میں جنگ کر رہے تھے آگے بڑھ بڑھ کے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۶۔ ارشاد ص ۷۵۔

تلواریں لگا رہے تھے اور عنترہ کا یہ شعر ان کی زبان پر تھا کہ ؎

ماذلت ارمیھم بثغرۃ نحرہ
ولبانہ حتی تسربل بالدم

(یعنی) "میں برابر ان پر پھینکتا رہا اپنے گھوڑے کی گردن اور اس کے سینہ کو یہاں تک کہ اس گھوڑے نے سر سے پاؤں تک خون کی چادریں اوڑھ لیں"۔[1]

اور یہ شعر حقیقتاً ان کے حسب حال تھا کیونکہ ان کا گھوڑا زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے سر اور چہرے پر تلواریں پڑ چکی تھیں اور خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت حصین بن تمیم نے جو قادسیہ کی ناکہ بندی پر مامور فوج کا افسر تھا۔ یزید بن سفیان سے کہا کہ دیکھو حُر یہی تو ہے جس کے قتل کرنے کی تم آرزو رکھتے تھے۔ اس نے کہا۔ "اچھا"۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور پکارا "حُر کیا مقابلہ منظور ہے؟" حُر نے کہا "ہاں ضرور"۔ اور یہ کہتے ہی سامنے آ گئے۔ خود حصین کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ بس یہ معلوم ہوا جیسے یزید کی جان حُر کے قبضہ میں تھی۔ چنانچہ وہ دم کے دم میں قتل ہو گیا۔[2] یہ ایسا پُر ہیبت منظر تھا کہ دشمن کا پرانبد ہو گیا اور حُر کے مقابلہ کو پھر کوئی نہ نکلا۔ آخر وہ اپنے گھوڑے کو جو بُری طرح زخمی ہو چکا تھا موڑ کر اپنے مرکز کی طرف واپس ہو گئے۔

اس کے بعد پھر وہ جنگ مغلوبہ میں شریک ہوئے اور ظہر کی نماز کا وقت آنے کے بعد شہید ہوئے۔ تفصیل اس کی بعد میں درج کی جائے گی۔

۳۔ مسلم بن عوسجہ اسدی:

اصحاب حسینؓ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

نام و نسب: ابو حجل مسلم بن عوسجہ بن سعد بن ثعلبہ بن دودان بن اسد بن خزیمہ اسدی سعدی۔ ممتاز و معزز اشرافِ عرب میں سے سردارِ قوم، عابد و متہجد گزار تھے۔ اور انھوں نے رسولؐ کی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۸۔ ارشاد ص ۲۵۱ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۸۔ ۲۴۹

زیارت کی تھی۔ شعبی ایسے محدث نے ان سے روایتِ احادیث کی ہے۔ ان تمام خصوصیات کے ساتھ وہ فارس بھی تھے اور میدانِ کارزار میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ ۲۰ھ میں جب حذیفہ بن یمان کی سرکردگی میں فوجِ اسلام نے ایران کے ترکستانی علاقہ آذربائیجان کو فتح کیا تھا تو اس میں مسلم بن عوسجہ بھی شریک تھے اور انھوں نے اس جنگ میں بہت سے مشرکین کو قتل بھی کیا تھا۔ میدانِ کربلا میں وہ سن رسیدہ اور ضعیف العمر ہو چکے تھے۔

مجاہدۂ حسینی سے متعلق ان کے خدمات کا سلسلہ عاشورِ محرم کے بہت پہلے سے شروع ہو چکا تھا چنانچہ جب ابن زیاد کے کوفہ پر مسلط ہونے کے بعد مسلم بن عقیل، ہانی کے گھر میں فروکش ہوئے اور انھوں نے بیعت کرنے والوں کی از سرِ نو تنظیم شروع کی تھی تو مسلم بن عوسجہ ان کے نمائندہ خاص کی حیثیت سے ان کی بیعت اور اہل بیتِ رسولؐ کے ساتھ وفاداری کا عہد و پیمان لیتے تھے مگر شہادت جناب مسلم بن عقیل کے بعد پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں گئے اور پھر کس طرح امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچ گئے۔

شبِ عاشور حضرت امام حسینؑ نے جو تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ تم سب مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو جاؤ اور مجھے تنہا ان سے مقابلہ کرنے دو اس کے جواب میں عزیزوں کے بعد سب سے پہلے مسلم بن عوسجہ ہی کھڑے ہوئے تھے اور تاریخ انسانی کے لیے یادگار جوش اور خلوص میں بھرے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے کہ "بھلا ہم اور آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں اور خدا کے سامنے جواب دہی کا سامان نہ کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بخدا میں اتنا لڑوں گا کہ ان کے سینوں میں اپنے نیزہ کو توڑ دونگا اور تلواریں لگاؤں گا۔ جب تک کہ اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں سنبھل سکے گا۔ مگر آپ سے کبھی جدا نہ ہوں گا۔ یہاں تک کہ اگر میرے پاس ہتھیار نہ ہوں گے جن سے جنگ کر سکوں تو انھیں پتھر ماروں گا آپ کی نصرت میں یہاں تک کہ آپ ہی کے ساتھ رہتے ہوئے دنیا سے چلا جاؤں گا۔"

صبحِ عاشور شمر نے خیامِ حسینی کی پشت پر خندق میں آگ کے شعلے بھڑکتے دیکھ کر جو گستاخی کا تخاطب کیا تھا اس کے جواب میں بھی مسلم بن عوسجہ نے غیظ میں آکر اسکو اپنے تیر کا نشانہ بنانا چاہا

تھا مگر امام کے مانع ہونے کی وجہ سے خاموش ہو گئے تھے۔

اب جنگ چھڑنے کے بعد کہاں ممکن تھا کہ معرکۂ کارزار میں وہ کسی سے پیچھے رہ جاتے۔ وہ بڈھے ضرور تھے مگر نصرتِ حسینؑ میں ان کا جوش و ولولہ جوانوں سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اصحابِ امام میں سب سے پہلے وہی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

اس وقت جب عبداللہ بن عمیر دست بدست جنگ کر چکے اور حُر بھی میدان جنگ میں داد شجاعت دے چکے تو نافع بن ہلال جملی نے آگے بڑھ کر لڑنا شروع کیا اور وہ کہتے جاتے تھے کہ "میں قبیلۂ بنی جمل سے ہوں۔ میں علیؑ کے دین پر ہوں"۔ ان کے مقابلہ پر ایک شخص آیا جس کا نام مزاحم بن حریث تھا۔ اس نے کہا کہ "میں عثمان کے دین پر ہوں"۔ نافع نے غصہ میں بھرے ہوئے جواب کے ساتھ اس پر حملہ کیا اور اس کو قتل کر دیا۔[1]

ان پیہم نقصانات سے جو افواجِ مخالف کو برابر ہو رہے تھے، سرداران لشکر یزید پریشان ہو گئے۔ عمرو بن الحجاج نے جو اس کے پہلے ہی ایک حملہ کر کے ناکام واپس جا چکا تھا۔ زور سے اپنی فوج کو للکارا اور بلند آواز سے کہا "بے وقوفو! تم جانتے بھی ہو کہ کس سے جنگ کر رہے ہو؟ یہ ملک کے خاص شہسوار اور جانوں پر کھیلے ہوئے افراد ہیں۔ تم میں سے کوئی شخص انفرادی طور پر ان سے جنگ کے لیے نہ نکلے۔ ہاں چونکہ ان کی تعداد بہت کم ہے اس لیے یہ بہت تھوڑی دیر زندہ رہ سکتے ہیں۔ اگر تم سب مل کر فقط پتھر ہی ان پر برساؤ تو بھی ان کو قتل کر سکتے ہو"۔

یہ مشورہ کہ دست بدست جنگ نہ کی جائے عمر سعد کو بھی پسند آیا اور تمام لشکر میں فرمان جاری کر دیا گیا کہ کوئی شخص مبارز طلبی کے لیے میدان میں نہ نکلے۔ پھر عمرو بن الحجاج نے آگے بڑھ کر تمام لشکر میں جوش پیدا کرانے کے خیال سے ایک تقریر کی اور کہا "اے اہل کوفہ اطاعت اور وفاداری کے پابند رہو اور اپنی جماعت سے الگ نہ ہو اور ذرا بھی شک و شبہ نہ کرو۔ ان لوگوں کے قتل کے بارے میں جو دین سے نکل گئے ہیں اور امامِ وقت (یزید) کے مخالف ہیں"۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۹۔ ارشاد ص ۲۵۱

امام حسینؑ نے یہ گمراہ کن الفاظ سن کر جواب دینا ضروری سمجھا اور ارشاد کیا کہ "او عمرو بن الحجاج تو لوگوں کو میرے خلاف آمادہ کرتا ہے! کیا ہم دین سے نکل گئے ہیں اور تم دین پر قائم ہو؟ قسم بخدا عنقریب اس وقت جبکہ تمھاری جانیں ان جسموں سے جدا ہوں گی اور تم اپنے ان اعمال پر دنیا سے جاؤ گے، معلوم ہوگا کہ کون دین سے نکلا تھا اور کون آتش جہنم میں جلنے کا مستحق تھا۔"

بہرطور عمرو بن الحجاج نے اپنی فوج کو آمادہ کر ہی لیا تھا۔ چنانچہ اس نے پورے جوش و خروش سے میمنہ کی فوج کے ساتھ فرات کی جانب سے جماعت حسینی پر حملہ کیا۔ اس جماعت کے چھوٹے سے میسرہ نے ایسی پامردی سے مقابلہ کیا کہ دشمن کو پھر واپس ہونا پڑا مگر غبار کا دامن چاک ہوا تو مسلم بن عوسجہ خاک و خون میں غلطاں نظر آئے۔ امام حسینؑ فوراً مسلم بن عوسجہ کے سرہانے پہنچے جبکہ ان میں رمق جان باقی تھی۔ آپ نے ان کے لیے دعائے خیر کرتے ہوئے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ کہ فمنھم من قضیٰ نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔ (یعنی) کچھ جانے والے گزر گئے اور کچھ وقت کے منتظر ہیں مگر کوئی اپنی بات سے ہٹا نہیں۔"

حبیب بن مظاہر جو امام کے ساتھ ساتھ تھے مسلم بن عوسجہ کے قریب گئے اور ان سے کہا کہ تمھارا ساتھ چھوٹنے کا بڑا صدمہ ہے مگر میں تمھیں جنت کی مبارکباد دیتا ہوں۔ مسلم نے کمزور آواز میں جواب دیا "تمھیں بھی ہر طرح کی خیر و برکت کی مبارکباد قبول ہو۔" حبیب نے کہا "اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ میں بھی عنقریب تمھارے پیچھے پیچھے آتا ہوں تو کہتا کہ کچھ وصیت کرو۔ اور میں اس وصیت کو پورا کروں۔" مسلم نے جواب میں حسینؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، وصیت جو کچھ بھی ہے وہ اسی ذات سے متعلق ہے۔ مطلب یہ تھا کہ تم بھی ان ہی پر اپنی جان نثار کرنا۔ حبیب نے کہا "ضرور خدا کی قسم ایسا ہی ہوگا۔"

عمرو بن حجاج کے ساتھ کی بدحواس فوج اس مختصر سی جماعت کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر بے تحاشا بھاگی تھی۔

اسے خبر بھی نہ تھی کہ کون قتل ہو گیا مگر مسلم بن عوسجہ کے ساتھ ان کے اہل و عیال موجود تھے۔

جب ان کی شہادت کی خبر خیمہ میں پہنچی تو ایک کنیز نے چیخ مار کر کہا۔

"ہائے ابن عوسجہ! ہائے میرے آقا!" اس آواز کو سنکر مخالف لشکر میں خوشیاں ہونے لگیں کہ ہم نے مسلم بن عوسجہ کو قتل کیا۔ اس پر شبث بن ربعی کو غصہ آگیا اور اس نے کہا "غضب کی بات ہے کہ مسلم بن عوسجہ کا سا شخص قتل ہو اور تم لوگ خوشیاں مناؤ۔ بخدا میں نے خدمت اسلام میں اس شخص کے کارنامے دیکھے ہیں۔ آذربائیجان کی جنگ میں میرا چشم دید واقعہ ہے کہ ابھی مسلمانوں کے لشکر کی پوری صف بندی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس بہادر نے چھ آدمی فوج مشرکین کے قتل کر دیے تھے۔ ایسا شخص تمہارے ہاتھ سے مارا جائے اور تم خوش ہو؟"[1]

ظاہر بین نگاہوں کو یہ باتیں معمولی معلوم ہوتی ہونگی مگر حقیقتاً یہ امام حسینؑ کی حقانیت کے وہ صریحی علامات تھے جو دورانِ جنگ میں برابر آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔

عبداللہ بن عمیر کی شہادت

بہرحال اس دوسرے اجتماعی حملہ کی اس کامیابی نے جو قتل مسلم کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی لشکرِ مخالف کا دل بڑھا دیا تھا اس لیے اس کے بعد شمر بن ذی الجوشن نے میسرۂ فوج کو لے کر حسینی میسرہ پر حملہ کیا اور اس طرف بھی اصحابِ حسینؑ نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ اس موقع پر عبداللہ بن عمیر نے جن کے حالات پہلے بیان ہو چکے ہیں بڑی جانفشانی سے کام لیا اور دو سپاہی دشمن کے قتل کر دیے مگر اس کے بعد وہ ہانی بن ثبیت حضرمی اور بکیر بن حیّ تیمی کے ہاتھ سے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ طبری نے تصریح کی ہے کہ وہ اصحابِ حسینؑ میں دوسرے مقتول تھے۔[2]

زوجہ عبداللہ بن عمیر جنھوں نے اپنی زندگی کی تمام کائنات کو اپنے جذبۂ ایمانی پر قربان کر دیا تھا یہ معلوم کر کے کہ ان کا عزیز شوہر ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو گیا اور وہ کربلا کی تپتی زمین

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۹ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۹

پر اپنے خون کی سرخ چادر اوڑھے موت کی نیند سو رہا ہے ایک مرتبہ پھر بے چین ہو کر اس ارادہ سے نہیں کہ وہ جنگ کریں گی یا اپنے شوہر کے خون کا بدلہ لیں گی، صرف اس لیے کہ وہ اپنے شوہر کی لاش کو دیکھ لیں میدان میں پہنچیں۔ وہ شوہر کے سرہانے بیٹھ کر ان کے چہرہ سے گرد و غبار صاف کرتی اور کہتی جاتی تھیں کہ "تمھیں جنت مبارک ہو۔ بہشت کی سیر کرنا مبارک ہو۔ مگر دشمن کا ظلم و تشدد اس حد پر تھا کہ شمر نے اپنے غلام کو جس کا نام رستم تھا آواز دی کہ اس کا بھی کام تمام کر دے۔ وہ بڑھا اور اس نے ان سمّ رسیدہ اور دل خستہ خاتون کے سر پر ایک ایسا گرز مارا کہ وہ شہید ہو گئیں[1]۔ اور اس طرح کربلا کے خونیں مرقع میں ایک قابلِ احترام خاتون کا مقدس لہو بھی شامل ہو گیا۔

۴۔ بریر بن خضیر ہمدانی:

ہمن رسیدہ تابعی، عبادت گزار اور حافظِ قرآن، حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں سے کوفہ کے باشندہ اور قبیلۂ ہمدان کے اشراف میں سے ابو اسحٰق ہمدانی سبیعی مشہور محدث و حافظ کے ماموں تھے۔ مسجد کوفہ میں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ لوگ ان کو سید القراء (حفاظِ قرآن کا سردار) کہتے تھے۔ راستے میں کہیں پر پہنچ کر حسینؑ کے ساتھ ہو گئے اور حُر کی ملاقات کے بعد جو خطبہ امامؑ نے ارشاد فرمایا تھا اس کے جواب میں زہیر بن قین اور نافع بن ہلال کی تقریروں کے بعد انھوں نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی تھی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ عبدالرحمٰن بن عبد ربہ سے ان کی اطمینانی گفتگو کا تذکرہ بھی اس کے قبل اس کتاب میں آ چکا ہے۔ حبیب بریر نے کچھ مزاح کیا اور عبدالرحمٰن نے کہا، یہ مذاق کا وقت نہیں ہے تو بریر نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میرے قوم و قبیلہ والے اس سے واقف ہیں کہ مجھے جوانی سے لے کر اس عمر تک کبھی مذاق سے دلچسپی نہیں رہی، مگر اس وقت تو اپنے مستقبل کے تصور سے میری خوشی کی انتہا نہیں کہ ادھر میدان جنگ میں تلوار چلی اور بس نتیجہ میں ہمارے لیے آخرت کی زندگی اور سعادت نصیب ہوئی۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۱

اس سے بریر کے شوقِ شہادت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی جذبۂ بے قرار کا نتیجہ تھا کہ وہ جنگ میں سبقت کرنا چاہتے تھے چنانچہ سب سے پہلے جو دو غلام زیاد و ابنِ زیاد کے لشکرِ یزید سے نکلے اور انھوں نے مبارز طلبی کی تو حبیب اور بریر کھڑے ہو گئے تھے مگر امام نے انکو روک دیا تھا۔ جماعتِ حسینی میں ان کا نمایاں حیثیت رکھنا اس سے بھی ظاہر ہے کہ جب عبداللہ بن عمیر میدان میں گئے تھے تو ان دونوں غلاموں نے کہا کہ ہم تم کو نہیں جانتے، ہمارے مقابلے کے لیے زہیر بن قین یا حبیب بن مظاہر یا بریر بن خضیر کو آنا چاہیے۔ گزشتہ جنگِ مغلوبہ کے بعد دست بدست مقابلے کے لیے یزید بن معقل لشکرِ یزید میں سے میدانِ جنگ میں آیا۔ اس سے اور بریر سے پرانی ملاقات تھی اور مذہبی نوک جھونک بھی ہوا کرتی تھی۔ اس لیے اس نے میدانِ جنگ میں بریر کو آواز دی کہ "دیکھا تم نے خدا نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا؟" بریر نے کہا "خدا۔ میرے ساتھ تو بڑا اچھا سلوک کیا، ہاں تو اپنی کہہ کہ بڑا بدنصیب ثابت ہو رہا ہے۔" یزید بن معقل نے جواب دیا۔ جھوٹ کہتے ہو، حالانکہ اس کے پہلے تمھیں جھوٹ بولنے کی کبھی عادت نہیں تھی خیر یہ بتاؤ کہ تمھیں یاد ہے، ایک دن ہم اور تم بنی لوذان کے کوچہ سے ہو کر گزر رہے تھے اور تم کہہ رہے تھے کہ عثمان گنہگار تھے اور معاویہ خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا ہے اور امام برحق بس علیؑ بن ابیطالبؑ ہیں۔ بریر نے کہا کہ میں اب بھی اپنے اسی خیال پر قائم ہوں۔ یزید نے کہا، "اچھا اس پر تیار ہو کہ میں تم سے مباہلہ کروں اور ہم تم دونوں مل کر خدا سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے پر لعنت کرے اور جو حق پر ہو اس کے ہاتھ سے باطل پرست کو قتل کرا دے، پھر میں تم سے جنگ کروں۔" یزید بن معقل نے اس کو منظور کر لیا۔ دونوں فوجوں کی آنکھیں لڑی تھیں۔ دونوں نے آمنے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور خدا سے دعا کی۔ پھر جنگ میں مشغول ہو گئے۔ بس صرف دو ضربوں کی ردّوبدل ہونے پائی۔ اس طرح کہ پہلے یزید نے تلوار لگائی جو بریر پر اچٹتی ہوئی پڑی اور کوئی صدمہ انھیں نہیں پہنچا۔ پھر بریر نے تلوار ماری جو خود کو کاٹتی ہوئی اس کے دماغ تک پہنچی اور وہ گھوڑے سے زمین پر گر پڑا۔ اس حالت سے

کہ بریر کی تلوار اس کے کاسۂ سر میں در آئی ہوئی تھی اور وہ اسے باہر کھینچ رہے تھے۔ اسی حالت میں رضی بن منقذ عبدی نے ان پر حملہ کر دیا۔ وہ بریر سے لپٹ گیا اور کشتی لڑنے لگا۔ بریر اس کو گرا کر سینہ پر سوار ہو گئے۔ کمینہ اور بزدل دشمن چیخ اٹھا اور پکارنے لگا "کہاں ہیں جنگ جو پہلوان کہاں ہیں مدافعت کرنے والے جوان"۔ دفعتاً کعب بن جابر بن عمرو ازدی بریر پر حملہ کے لیے آگے بڑھا لشکر یزید کے دوسرے سپاہیوں نے اسکو منع بھی کیا کہ یہ بریر حافظِ قرآن ہیں جو مسجد میں حفظ قرآن کرایا کرتے تھے مگر اس نے نہ مانا اور پشت کی جانب سے بریر پر نیزہ کا وار کر دیا جو سینہ سے پار ہو گیا اور بریر زمین پر گر گئے۔ پھر اس نے تلوار لگا کر بریر کا کام تمام کر دیا۔[1]

۵۔ منجح بن سہم:

جماعتِ حسینی میں آزاد افراد کے ساتھ ساتھ غلاموں کی نمائندگی بھی کافی تھی۔ ان میں سب سے پہلے سلسلۂ شہداء میں جن کا نام آتا ہے وہ منجح ہیں۔

شیخ الطائفہ نے کتاب الرجال میں ان کا اصحابِ امام حسینؑ میں شمار کیا ہے۔ زمخشری نے ربیع الابرار میں لکھا ہے کہ حسینہ حضرت امام حسینؑ کی کنیز تھی جسے آپ نے نوفل بن حارث بن عبدالمطلب سے خرید فرمایا تھا اور اس کی شادی سہم سے کر دی تھی۔ اس طرح منجح کی ولادت ہوئی اور چونکہ یہ کنیز علیؑ بن الحسینؑ (زین العابدینؑ) کے گھر میں خدمات انجام دیتی تھی اس لیے حضرت امام حسینؑ عراق کی طرف روانہ ہوئے تو وہ اپنے فرزند منجح سمیت آپ کے ہمراہ آئی۔ کربلا میں ان کی شہادت اوائل جنگ میں ہی واقع ہوئی اور وہ حسان بن بکر حنظلی کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

۶۔ عمر بن خالد:

پورا نام عمر بن خالد بن حکیم بن حزام الاسدی الصیداوی تھا۔ کوفہ کے اشراف میں سے اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۷۔

اہل بیتِ رسولؐ کے سچے محب تھے۔ شروع میں مسلم بن عقیل کی نصرت کے لیے نکلے تھے مگر جب اہلِ کوفہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو یہ بھی روپوش ہو گئے۔ یہاں تک کہ امام حسینؓ عراق کے حدود میں پہنچے اور آپ نے قیس بن مسہر صیداوی کو اپنی آمد کی اطلاع کے ساتھ کوفہ روانہ کیا۔ قیس راستے میں گرفتار ہو گئے اور ان کے قتل کا حکم ہوا مگر انھوں نے مرتے مرتے حسینؓ کی سفارت کے حق کو ادا کر دیا۔ اعلان کر کے کہ امام حسینؓ مقام حاجر تک پہنچ گئے ہیں، جس کو جانا ہو ان کے پاس چلا جائے۔ یہ خبر عمر بن خالد کو پہنچی تو وہ اپنے غلام سعد اور تین دوسرے ہمراہیوں کے ساتھ غیر معروف راستے سے ہو کر بہت تیز رفتاری کے ساتھ منزل عذیب الہجانات پر امام حسینؓ کی خدمت میں پہنچ گئے۔

جب کہ حُر بن یزید ریاحی امام کی نقل و حرکت کی نگرانی کے لیے پہنچ چکا تھا چنانچہ حر نے مداخلت کی اور کہا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ نہیں آئے تھے اس لیے یا تو میں انھیں گرفتار کرونگا یا کوفہ واپس، مگر امام نے فرمایا "اب جبکہ یہ میرے پاس پہنچ گئے اور میری امان میں آ گئے تو میں انھیں تمھارے سپرد نہیں کر سکتا۔"

روزِ عاشور جنگ چھیڑنے کے بعد یہ اور ان کے ساتھی وہ پانچ آدمی تھے جنھوں نے بیک وقت فوج دشمن پر حملہ کیا اور لشکر میں گھس کر شمشیر زنی کرنے لگے۔ لشکر یزید نے ان بہادروں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور جماعتِ حسینی سے بالکل جدا کر دیا۔ یہ دیکھ کر امام حسینؓ نے اپنے بھائی ابوالفضل العباس کو ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ آپ نے جا کر تن تنہا فوج پر حملہ کیا اور تلوار چلانا شروع کی، یہاں تک کہ لشکر کو منتشر کر دیا اور ان زخمی بہادروں کو دشمن کے حلقہ سے نکال کر اپنی جماعت کی طرف واپس لے چلے۔ ابھی راستہ پورا طے نہیں ہوا تھا کہ دشمن تعاقب کے لیے آتے نظر آئے۔ عباس نے ان بہادروں کو اپنے آگے کیا اور آپ خود بغرض حفاظت پیچھے ہو گئے تاکہ ان کو کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ مگر دشمن کے قریب پہنچتے ہی زخمی بہادروں کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ عباس کی حفاظت سے نکل کر دشمنوں پر جھپٹ پڑے اور باوجودیکہ

زخموں سے بالکل بے حال تھے لیکن جان توڑ کر شمشیر زنی کی اور آخر ایک ہی جگہ پر گر کر شہید ہو گئے[1] عباس نے مجبوراً امام کی خدمت میں واپس آکر اس واقعہ کی اطلاع دی۔ حضرت نے چند بار ان بہادروں کے لیے درگاہِ باری سے رحمت طلب کی۔

۷۔ سعد مولی عمر بن خالد:

شریف النفس اور بلند ہمت غلام تھے جنھوں نے اپنے مالک عمر بن خالد صیداوی کا آخر وقت تک ساتھ دیا۔ وہ اپنے مالک کے ساتھ اس مختصر قافلہ میں آکر اصحاب حسینؑ سے ملحق ہوئے تھے جو منزل عذیب الہجانات پر خدمتِ امام میں پہنچا اور جنگ میں بھی وہ اپنے ہمراہیوں کے جتھے میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۸۔ مجمع بن عبداللہ:

نام ونسب: مجمع بن عبداللہ بن مجمع بن مالک بن ایاس بن عبد مناۃ بن سعد العشیرۃ المذحجی العائذی۔ وہ تابعین میں سے تھے۔ رسول اللہؐ کے زمانہ میں متولد ہوئے تھے۔ ان کے باپ نے رسول اللہؐ کی صحبت کے شرف کو حاصل کیا تھا اور خود مجمع حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں داخل تھے۔ چنانچہ جنگِ صفین کے واقعات کے ذیل میں ان کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ یہ بھی ان پانچ اشخاص میں سے تھے جو منزل عذیب الہجانات پر امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور جب آپ نے ان سے کوفہ کی حالت کے متعلق دریافت فرمایا تو مجمع نے حسب ذیل الفاظ میں اہلِ کوفہ کی تصویر کشی کی تھی۔ بڑے بڑے آدمیوں کو تو بڑی رشوتیں دی گئی ہیں اور گٹھڑیاں بھر بھر کر مال و دولت عطا کیا گیا ہے تاکہ وہ موافق رہیں اور خیر خواہی کرتے رہیں۔ اس لیے وہ سب متفق ہیں، آپ کے خلاف اور عوام، ان کے دل تو آپ کی طرف

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۵

جھکتے ہیں مگر تلواریں ان کی کل آپ کے خلاف کھنچی ہوئی ہوں گی۔

روزِ عاشورا انھوں نے بھی اپنے جتھے کے ساتھ دشمن سے جنگ کی اور درجۂ شہادت حاصل کیا۔

۹۔ عائذ بن مجمع:

مجمع بن عبداللہ عائذی کے فرزند تھے۔ اپنے باپ کے ساتھ منزل عذیب الہجانات پر امام حسینؑ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا تھا اور انہی کے ساتھ اپنے جتھے میں رہتے ہوئے جنگ میں شرکت کی اور شہید ہوئے۔

۱۰۔ جنادہ بن حارث سلمانی:

سلمان قبیلۂ مراد کی ایک شاخ اور مراد قبیلۂ مذحج کا ایک شعبہ ہے۔ جنادہ بن حارث کوفہ کے باشندہ اور مشاہیر شیعہ میں سے تھے۔ عہد رسول اللہؐ کا ادراک کیا۔ پھر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ رہے اور جنگِ صفین میں جہاد کیا۔ شیخ طوسی نے کتاب الرجال میں ان کا نام اصحابِ حسینؑ میں درج کیا ہے۔

جب مسلم بن عقیل کوفہ میں امام حسینؑ کی بیعت لے رہے تھے تو جنادہ نے وفاداری کے ساتھ بیعت کی اور مسلم کے ساتھ جہاد میں شریک بھی ہوئے مگر جب فضا مسلم کے خلاف ہوگئی تو وہ بھی مثل دیگر اشخاص کے مخفی ہوگئے اور آخر اسی جتھے میں جو منزل عذیب الہجانات میں خدمت امام میں پہنچا تھا وہ بھی حاضر ہوئے اور اسی جتھے کے ساتھ رہ کر جنگ بھی کی اور درجۂ شہادت حاصل کیا۔

۱۱۔ جندب بن حجیر کندی خولانی:

کوفہ کے باشندہ اور ممتاز شیعی افراد میں سے تھے۔ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی

صحبت سے شرفیاب ہوئے اور جنگِ صفین میں کندہ اور ازد کے رسالوں کے افسر تھے۔ جب امام حسینؑ کوفہ کی سمت راہ پیما تھے تو حرؑ کی ملاقات سے پہلے ہی وہ خدمتِ امام میں پہنچ کر ہمراہی کے شرف سے بہرہ یاب ہوئے اور روزِ عاشور جنگ کے ابتدائی ہنگام میں جنگ کر کے شہید ہوئے۔

۱۲۔ یزید بن زیاد بن مہاصر ابوالشعثاء کندی بہدلی :

شیعانِ کوفہ میں سے شریف، بہادر اور جنگ آزما تھے۔ امام حسینؑ کی خدمت میں حُرؑ کی ملاقات سے پہلے حاضر ہوئے اور پھر ہمراہ ہمرکاب رہے تھے۔ جب کربلا کی سرزمین کے قریب پہنچ کر حرؑ کے پاس ابن زیاد کا قاصد یہ خط لایا تھا کہ جہاں یہ خط پہنچے وہیں حسینؑ کو اترنے پر مجبور کیا جائے تو ابوالشعثاء نے اس قاصد کو پہچانا تھا کہ وہ مالک بن نسر بدی ہے۔ چونکہ وہ بھی قبیلۂ کندہ سے تھا۔ اس لیے ابوالشعثاء نے اس کو نصیحت کرنا ضروری سمجھتے ہوئے اس سے کہا کہ یہ تو نے کیا غضب کیا اُس کام کے لیے تو آیا؟ اس نے کہا "میں نے اپنے امام کی اطاعت کے حق کو پورا کیا"۔ ابوالشعثاء نے جواب دیا کہ "تو نے خدا کی تو نافرمانی کی اور اپنے امام کی اطاعت یقیناً تو نے اس طرح اپنے نفس کی ہلاکت کا سامان کیا اور ہمیشہ کے لیے ننگ و عار اور آتش جہنم کا مستحق بنا۔ خداوند عالم نے یہ فرمایا ہے کہ کچھ امام ایسے ہیں جو آتشِ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور روزِ قیامت انکی کوئی فریاد رسی نہیں ہوگی۔ بے شک تیرا امام ایسا ہی ہے۔"

وہ بہت بڑے تیرانداز تھے۔ روزِ عاشورا اپنے گھٹنے ٹیک کر وہ امام کے سامنے بیٹھ گئے اور آٹھ تیر لگائے جن میں سے پانچ تیر ٹھیک نشانہ پر پڑے اور پانچ آدمیوں کو دشمنوں میں سے ہلاک کیا۔ جب تیر ختم ہو گئے تو وہ تلوار لے کر میدان میں آئے اور یہ رجز پڑھا :۔

"میں یزید ہوں اور میرے باپ مہاصر تھے۔ میں شیر بیشہ سے زیادہ بہادر ہوں۔
خداوندا گواہ رہنا کہ میں حسینؑ کا ناصر اور ابن سعد سے بے تعلق اختیار کرنے والا ہوں۔"

آخر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ تاریخ میں تصریح ہے کہ وہ ابتدائے جنگ کے شہداء میں سے ہیں[1]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۵

حملۂ اولیٰ

حقیقتاً تاریخ کا یہ یادگار اور حیرت انگیز واقعہ ہے کہ تیس ہزار فوج کے مقابلہ پر بہتر (۷۲) یا زیادہ سے زیادہ سو ڈیڑھ سو نفوس ہوں اور وہ بھی تین دن کے بھوکے پیاسے اور اس کے باوجود وہ فوجِ کثیر اس جماعتِ قلیل سے نقصان پر نقصان اور شکست پر شکست اٹھائے اور اس کے بنائے کچھ نہ بنے۔ صبح سے دوپہر کے قریب تک کا وقت آجائے اور حسینی جماعت کی صف مثل ایک مضبوط و محکم آہنی دیوار کے سامنے موجود رہے۔ اس کے برخلاف افواجِ یزید میں اضطراب و بدنظمی کے آثار نمایاں ہوں اور وہ کسی ایک طریقۂ جنگ پر قائم نہ رہ سکیں۔ راوی کا بیان ہے کہ اصحابِ حسینؓ نے سخت جنگ کی اور ان میں کے سواروں نے جو تعداد میں صرف بتیس تھے لشکرِ یزید پر تابڑ توڑ حملے کیے اور وہ جس صف پر حملہ کرتے تھے اس کو منتشر کر دیتے تھے[1] چنانچہ جب عزرہ بن قیس نے جو لشکرِ یزید کے سواروں کی فوج کا افسر تھا یہ دیکھا تو اس نے عمر بن سعد کے پاس عبدالرحمٰن بن حصین کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "آپ دیکھتے ہیں کہ آج صبح سے اس چھوٹی سی جماعت کے ہاتھوں میری فوج کی کیا حالت ہے؟ اب آپ پیادوں کی فوج اور تیر اندازوں کے دستوں کو بھیجیے کہ وہ مقابلہ کریں۔" لشکرِ یزید کے لیے کس درجہ شرم کا مقام تھا کہ اس کے سواروں کا افسر ہمت ہار چکا اور کھلے ہوئے الفاظ میں اقرارِ شکست کر لیا۔ اس کے بعد پیادوں کی طرف رجوع کیا گیا اور شبث بن ربعی کو جو پیادہ فوج کا افسر تھا، عمر سعد کا یہ تہدیدی پیغام پہنچا کہ تم آگے کیوں نہیں بڑھتے مگر اس نے حقارت آمیز جواب یہ دیا کہ "افسوس ہے اس مہم کو سر کرنے کے لیے سواروں کی اتنی بڑی فوج ناکافی سمجھی جائے اور میرے ایسے بڑے سردار کو زحمت دی جائے اور پھر تیر اندازوں کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہو، کیا میرے سوا کوئی اور اس مہم کو سر کرنے کے لیے نہیں ملتا؟ یہ سنکر مجبوراً

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۰۔ ارشاد ص ۲۵۲

عمر سعد نے حصین بن تمیم کو اسی فوج کے ساتھ جو قادسیہ کی سرحد میں ناکہ بندی کی غرض سے تعینات رہ چکی تھی پانچسو تیراندازوں کے اضافہ کے ساتھ مامور کیا کہ وہ آگے بڑھے اور خیمۂ حسینی کے نزدیک جاکر پاس سے ان پر تیروں کا مینہ برسائے[1]

فنِ جنگ کے واقف کار اچھی طرح جانتے ہیں کہ تیروں کی زد کے لیے ایک محدود فاصلہ درمیان میں ہونا ضروری ہے۔ مقررہ فاصلہ سے زیادہ پر تیراندازی ایک طرح سے ہوائی فائروں کی حیثیت رکھتی ہے جس سے گزند نہ پہنچنے کا قوی امکان ہوتا ہے مگر تھوڑی مسافت سے تیروں کی ہنگامہ خیز بارش ایک بے پناہ حملہ ہے۔ جس سے محفوظ رہنے کے لیے نہ قنونِ جنگ کام دے سکتے ہیں، نہ شجاعت و جرأت۔ اسی لیے یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ یہ بزدلانہ طریقۂ جنگ ہے اور شجاعانِ روزگار کے لیے ننگ۔ یہ ظاہر ہے کہ اصل لشکرگاہ دو متخاصم فریقوں کے ایک دوسرے سے کافی فاصلہ پر ہوتے ہیں یقیناً اسی صورت پر کربلا میں بھی تھے۔

دونوں لشکروں کی صف آرائی بھی اس طریقہ پر ہوتی ہے کہ درمیان میں کافی وسیع مصاف باقی رہے اور یہ مسافت بھی کچھ کم نہیں ہوتی ہے۔ پہلی مرتبہ کے تیروں کی بارش کا عنوان یہ تھا کہ عمر سعد نے اپنے لشکر ہی سے جس کی صف آرائی ہو چکی تھی تیر چلایا اور اسی کے ساتھ اس کے لشکر والوں نے بھی تیر رہا کیے لہٰذا ان تیروں سے جماعتِ حسینی کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا تھا اور نہ ہونا چاہیے تھا سوا اس کے کہ ان کے ذریعہ سے اعلانِ جنگ ہوگیا۔ اور عملی طور سے حرب و ضرب شروع ہوگئی۔ مگر اس وقت جس طریقہ سے تیراندازی مقصود تھی اس کی نوعیت بالکل مختلف تھی اس لیے کہ اس مرتبہ پورے طور سے جماعتِ حسینی کو زد پر لاکر تیر برسائے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ تیر کی زد سے ڈھال یا نیزہ و شمشیر کے ذریعہ سے تحفظ ممکن نہیں ہے۔ البتہ تیر کو خالی دے کر اس سے بچا جا سکتا ہے مگر یہ اسی وقت کارگر ہو سکتا ہے جب ادھر اُدھر تیروں کی زد سے خالی جگہ موجود ہو لیکن تصور میں اس منظر کو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۰

سامنے لایا جائے کہ صرف سَو ڈیڑھ سو نفوس پر مشتمل جماعت حسینی صف باندھے ایستادہ اور ان کے مقابلہ میں ہزاروں کی تعداد میں ایک فوج آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور تیر برسانا شروع کرتی ہے تو وہ کتنی زیادہ دور تک پھیلی ہوئی ہوگی اور جب اس کی طرف سے ایک مرتبہ مجموعی طور پر یک جہت اور ہم آہنگ ہو کر ایک نشانہ پر، ایک ہی مرکز کو سامنے رکھے ہوئے بہت دور سے نہیں بلکہ قریب سے تیر برسائے جا رہے ہیں تو کیا اس میں کوئی شک ہو سکتا ہے کہ ان تیروں نے ایک عظیم سیلاب ایک بڑے طوفان، ایک تیز آندھی یا لوہے کی ایک چادر کی طرح چپ و راست ہر طرف سے اس مختصر جماعت کو ڈھانپ لیا ہوگا اور اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا باقی نہ ہوگا جو ان تیروں کی زد میں نہ آتا ہو۔ مگر انصارِ حسینؑ نے اس بے پناہ تیروں کے سیلاب کا یوں مقابلہ کیا کہ تلواریں سونت لیں اور لوہے کی ان چادروں کو اپنے سینوں سے ریلتے ہوئے دشمن کی فوج پر جا پڑے اور اس میں در آکر شمشیر زنی کرنے لگے۔

یہی وہ عظیم الشان حملہ اور گھمسان کی جنگ ہے جو تاریخوں میں "حملۂ اولیٰ" کے نام سے مذکور ہے اور یہ ظہر سے ایک گھنٹہ قبل کا واقعہ تھا۔

اصحابِ حسینؑ نے پھر دشمن کو شکست دی اور فوج کو پسپا کیا مگر اس حملہ کا نتیجہ خود جماعت حسینی کے لیے بھی بہت دردانگیز ثابت ہوا چنانچہ جس وقت میدان صاف ہوا اور گرد و غبار دور ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ مختصر تعداد اور زیادہ مختصر ہو چکی تھی اس لیے کہ پچاس آدمی انصارِ حسینؑ میں سے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے تھے جن میں سے بعض تیروں کا نشانہ بنائے گئے تھے اور بعض جنگِ مغلوبہ میں شہید کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ جتنے گھوڑے اصحابِ حسینؑ کی سواری میں تھے وہ سب بھی ختم کر دیے گئے تھے اور چند اصحابِ حسینؑ بھی جو سوار تھے اب پیادہ ہو گئے تھے[1]

چنانچہ حُر بن یزید ریاحی بھی جن کا گھوڑا اس کے پہلے ہی زخمی ہو چکا تھا اب پیادہ ہو گئے جس کا تذکرہ ان کے دشمن ایوب بن مشرح خیوانی نے اس طرح کیا ہے کہ میں ہی وہ شخص تھا جس نے حُر کے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۰۔ ارشاد ص ۲۵۲

گھوڑے کو پے کیا۔ بس میں نے ایک تیر ایسا لگایا کہ فرس تھرّا کر زمین پر گر گیا اور حُر شیر کے مانند جست کر کے اس کی پشت سے علیحدہ ہوئے۔ تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے اور اس مضمون کا شعر پڑھ رہے تھے کہ "اگر تم نے میرا گھوڑا پے کر ڈالا تو کوئی حرج نہیں، میں ایک شریف انسان کا فرزند ہوں اور شیر سے زیادہ شجاعت کا مالک ہوں۔" دوسرے ایک مشاہد کا بیان ہے کہ ان کا سا میں نے دوسرا کوئی شمشیر زنی کرنے والا نہیں دیکھا۔[1]

اس حملہ کے ذیل میں جو پچاس انصارِ حسینؑ شہید ہوئے ان میں نہیں کہا جا سکتا کہ کون پہلے شہید ہوا اور کون بعد کو، اس لیے ان کے حالات حروفِ تہجی کی ترتیب سے درج کیے جاتے ہیں۔

۱۳۔ ادہم بن امیہ عبدی بصری:

قبیلۂ عبد قیس سے بصرہ کے باشندہ تھے۔ بصرہ میں ایک خاتون تھیں ماریہ بنت منقذ عبدیہ جو شیعۂ علیؑ اور محبِ اہلِ بیتِ نبوت تھیں اور ان کے مکان پر اکثر شیعانِ علیؑ کا اجتماع ہوتا رہتا تھا۔ جب امام حسینؑ نے مکہ معظمہ سے کوفہ کی روانگی کا قصد کیا اور ابن زیاد بصرہ سے کوفہ کی گورنری پر مامور ہوا اور بصرہ کے نئے گورنر کی جانب سے ناکہ بندی کا انتظام ہوا تاکہ کوئی شخص نصرتِ حسینؑ کے لیے بصرہ سے نہ جانے پائے تو ماریہ عبدیہ کے مکان پر یزید بن ثبیط قیسی نے نصرتِ حسینؑ کی غرض سے کوفہ کی طرف جانے کا عزم ظاہر کیا۔ چونکہ صریحی طور پر ان کا یہ مقصد خطرے سے خالی نہ تھا کچھ زیادہ اشخاص ان کے اس عزم سے ہم آہنگ نہ ہوئے پھر بھی یزید بن ثبیط کے دو فرزند اور چار دوسرے افراد وہ تھے جنھوں نے ان کے ساتھ اتحادِ عمل کیا۔ چنانچہ ان سب نے اپنی جانوں پر کھیل کر مقام ابطح پر جو کہ مکہ معظمہ ہی کے حدود میں تھا امام کی ہمراہی اختیار کی۔ ان ہی چار اشخاص میں ایک ادہم بن امیہ بھی تھے جو روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۰۔

۱۴۔ امیہ بن سعد بن زید طائی :

قبیلۂ طے کے بہادر، جنگ آزما اور شہسوار تھے۔ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں محسوب ہوتے تھے۔ آپ کے ساتھ جنگِ صفین میں شرکت بھی کی تھی اور کارنمایاں انجام دیا تھا۔ اس کے بعد ان کا کوفہ میں قیام رہا۔ جب امام حسینؑ کے کربلا میں پہنچنے کی خبر ہوئی تو گفتگوئے صلح کے دوران میں کسی عنوان سے کوفہ سے کربلا پہنچے اور امام کی ہمراہی اختیار کی، یہاں تک کہ روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۱۵۔ جابر بن حجاج تیمی :

قبیلۂ تیم اللہ بن ثعلبہ میں سے عامر بن نہشل تیمی کے آزاد کردہ غلام تھے۔ کوفہ کے باشندہ اور شہسوار تھے۔ پہلے مسلم بن عقیل کی حمایت کے لیے کمربستہ ہوئے تھے مگر حالات کے ناسازگار ثابت ہونے کے بعد مثل دوسرے بہت سے افراد کے وہ بھی اپنے قبیلہ میں روپوش ہو گئے تھے۔ جب امام کے کربلا میں وارد ہونے کی اطلاع ہوئی تو وہ عمر سعد کی فوج کے ساتھ کربلا پہنچے اور خفیہ طریقہ پر اس سے علیحدہ ہو کر انصار امام حسینؑ میں شامل ہو گئے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۱۶۔ جبلہ بن علی شیبانی :

کوفہ کے باشندہ، بہادر اور شجاع تھے۔ جنگِ صفین میں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے تھے۔ حضرت مسلم بن عقیل کی نصرت کے لیے بھی کمربستہ ہوئے تھے مگر حالات کی ناسازگاری کے بعد وہ بھی اپنے قبیلہ میں روپوش ہو گئے اور جب امام حسینؑ کربلا میں پہنچ چکے تو وہ بھی کسی نہ کسی صورت سے کوفہ سے آ کر انصارِ حسینی میں شامل ہوئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۱۷۔ جنادہ بن کعب بن حارث انصاری خزرجی :

امام حسینؑ کی ہمراہی میں مکہ معظمہ سے متعلقین سمیت آئے تھے اور حملۂ اولیٰ میں جنگ کر کے شہید ہوئے۔

۱۸۔ جوین بن مالک بن قیس بن ثعلبہ تیمی :

قبیلۂ بنی تیم میں سکونت رکھتے تھے اس لیے اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہوتے تھے اور جب کوفہ کے تمام قبائل امام حسینؑ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بھیجے جا رہے تھے تو وہ بھی قبیلۂ بنی تیم کے ساتھ عمر سعد کی فوج میں شامل ہو کر میدانِ کربلا تک پہنچے اور جب امام حسینؑ کے پیش کردہ شرائط صلح نامنظور کر دیے گئے اور جنگ کا ہونا قطعی قرار پایا گیا تو وہ اسی قبیلہ کے چند دوسرے افراد کے ساتھ شب کے وقت عمر سعد کی فوج سے جدا ہو کر رفقائے امام کی جانب آ گئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۱۹۔ حارث بن امراء القیس بن عابس کندی :

شجاعانِ روزگار میں سے اور عابد و زاہد تھے اکثر لڑائیوں میں کارنمایاں انجام دے چکے تھے۔ ان کے مذہبی احساس اور ثبات و استقلال کا اس واقعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ قلعۂ بجر کا محاصرہ کرنے والوں میں شامل تھے جب مرتدین کو اس قلعہ سے باہر نکال کر قتل کیا جانے لگا تو حارث نے اپنے حقیقی چچا پر حملہ کیا۔ اس نے کہا "میں تو تمہارا چچا ہوں" حارث نے جواب دیا کہ "مگر اللہ میرا پروردگار ہے اور اس کا حکم مقدم ہے" یہ کہہ کر اسے قتل کر ڈالا۔

کربلا میں وہ بھی عمر سعد کی فوج میں داخل ہو کر پہنچے تھے لیکن شرائط صلح کے نامنظور ہونے کے بعد اس سے علیحدہ ہو کر اصحاب حسینؑ کے ساتھ ہو گئے اور روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۲۰۔ حارث بن نبہان :

ان کے والد نبہان حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے غلام، بہادر اور شہسوار تھے۔ جنگ احد میں حمزہ کی شہادت واقع ہوئی۔ اس کے دو برس بعد نبہان نے دنیا سے رحلت کی۔ اس کے بعد سے حارث نے جناب امیرؑ کی خدمت میں رہنا اختیار کیا اور پھر امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی خدمت میں رہے۔ جب حضرت امام حسینؑ نے مدینہ سے ہجرت فرمائی تو حارث بھی ہمراہ رہے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۲۱۔ حباب بن حارث :

ابن شہر آشوب نے حملۂ اولیٰ کے شہداء میں ان کا بھی نام درج کیا ہے حالات بالکل معلوم نہیں ہوئے۔

۲۲۔ حباب بن عامر بن کعب تیمی :

قبیلۂ تیم اللات بن ثعلبہ میں سے کوفہ کے باشندہ شیعۂ علی تھے اور مسلم بن عقیل کی بیعت کی تھی۔ جناب مسلم کی شہادت کے بعد وہ اپنے قبیلہ میں پوشیدہ ہو گئے۔ جب امام حسینؑ کی کوفہ کی جانب روانگی کی اطلاع ان کو ہوئی تو وہ خفیہ طور پر کوفہ سے باہر نکلے اور راہ میں امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچ کر ہمراہ رکاب ہوئے یہاں تک کہ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۲۳۔ حبشہ بن قیس نہمی :

پورا نام و نسب : حبشہ بن قیس بن سلمۃ بن طریف بن ابان بن سلمۃ بن حارثہ ہمدانی نہمی تھا۔ حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ان کے دادا سلمہ بن طریف صحابۂ پیغمبرؐ میں سے تھے اور خود

حنبشہ بن قیس راوئ حدیث تھے۔ روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۲۴۔ حجاج بن زید سعدی تمیمی :

قبیلۂ بنی سعد بن تیم میں سے بصرہ کے باشندہ تھے۔ امام حسینؑ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے موقع پر چند خطوط رؤسائے بصرہ کے نام روانہ فرمائے تھے جن میں سے ایک مسعود بن عمرو ازدی کے نام تھا۔ مسعود نے اپنے قبیلہ کے تمام اقوام بنی تمیم، بنی حنظلہ، بنی سعد اور بنی عامر کو مجتمع کر کے ایک تقریر کی جس میں ان کو نصرتِ امام حسینؑ پر آمادہ کرنا چاہا۔ جس کے نتیجہ میں ایک جماعت نے نصرتِ امام کا وعدہ کیا۔ مسعود نے ایک خط امام کے نام تحریر کیا جس میں حضرت کی تشریف آوری عراق پر اظہارِ مسرّت کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ میں نے بنی تمیم اور بنی سعد کو تمام تر آپ کی نصرت پر آمادہ کر لیا ہے اور وہ سب آپ پر اپنی جان نثار کریں گے۔ یہ خط حجاج بن زید سعدی کے ہاتھ روانہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ کربلا میں آکر امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۲۵۔ حلاس بن عمرو ازدی راسبی :

اصحابِ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ میں سے تھے اور حضرت کے زمانۂ خلافت میں کوفہ میں پولیس کے افسر کی حیثیت رکھتے تھے وہ میدانِ کربلا میں عمر سعد کی فوج کے ساتھ آئے تھے مگر گفتگوئے مصالحت کے ناکام ہونے پر مخفی طریقہ سے شب کے وقت اصحابِ حسینؑ میں شامل ہو گئے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۲۶۔ حنظلہ بن عمر شیبانی :

ابن شہر آشوب نے ان کا نام بھی حملۂ اولیٰ کے شہداء میں ذکر کیا ہے۔ حالات معلوم نہیں۔

۲۷۔ زاہر بن عمرو اسلمی کندی:

اصحاب رسولؐ میں سے راوئ حدیث تھے اور بیعت رضوان کے شرف سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد جنگ خیبر میں شریک جہاد بھی ہوئے تھے۔ شجاعت ان کی ممتاز صفت اور نمایاں جوہر تھا اور اہل بیت رسولؐ کی محبت ان کے لیے سرمائہ اعزاز۔ جب زیاد بن ابیہ معاویہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا اور عمرو بن الحمق الخزاعی نے اس کی مخالفت کا علم بلند کیا تھا تو زاہر بھی ان کے ساتھ تھے۔ جب معاویہ نے عمرو بن الحمق کی گرفتاری کا حکم بھیجا تو زاہر کے نام بھی وارنٹ جاری ہوا تھا مگر وہ روپوش ہو گئے اور قبضہ میں نہ آسکے۔

۶۰ھ میں حج بیت اللہ الحرام سے شرفیاب ہوئے۔ اسی سلسلہ میں امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی اور وہ اصحاب حسینؑ میں شامل ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت کی ہمراہی میں کربلا آئے اور روز عاشورہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔ اصحاب ائمہ میں سے محمد بن سنان زاہری متوفی ۲۲۰ھ جو امام رضاؑ اور امام محمد تقیؑ کے رواۃ میں سے تھے انہی زاہر کی نسل سے تھے۔

۲۸۔ زہیر بن بشر خثعمی

حملۂ اولیٰ کے شہداء میں ان کا بھی شمار ہے۔ حالات معلوم نہیں۔

۲۹۔ زہیر بن سلیم بن عمرو ازدی:

شب عاشور جب لشکر یزید نے امام حسینؑ کو شہید کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا تو وہاں سے نکل کر اصحاب حسینؑ کی طرف آ گئے اور آپکی نصرت کرتے ہوئے حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۰۔ سالم مولیٰ عامر بن مسلم العبدی:

اپنے مالک کے ساتھ اسی قافلہ میں جو یزید بن شبیط قیسی کے ساتھ بصرہ سے مقام البطح

میں پہنچا تھا امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۱۔ سلیم :

امام حسنؑ کے باوفا غلام تھے اور کربلا میں نصرت امام حسینؑ کا حق ادا کرتے ہوئے حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۲۔ سوار بن ابی عمیر نہمی :

پورا نام و نسب : سوار بن منعم بن حابس بن ابی عمیر بن نہم الہمدانی النہمی راویانِ احادیث میں سے تھے۔ امام حسینؑ کے کربلا میں پہنچنے کے بعد گفتگوئے صلح کے دوران میں کربلا پہنچے تھے۔ روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں نصرتِ حسینؑ میں جنگ کا شرف حاصل کیا۔ یہاں تک کہ زخمی ہو کر گر گئے۔ دشمن ان کو گرفتار کر کے عمر سعد کے پاس لے گئے۔ اس نے چاہا کہ ان کو قتل کرا دے مگر ان کے ہم قبیلہ سپاہی مانع ہوئے اور انھیں بچا کر اپنے ساتھ لے گئے لیکن وہ زخمی اتنے ہو چکے تھے کہ جانبر نہ ہو سکے اور چھ مہینے تک انہی زخموں کی تکالیف میں مبتلا رہنے کے بعد انتقال کیا۔

۳۳۔ سیف بن مالک عبدی :

قبیلۂ عبد قیس سے بصرہ کے باشندہ اور ان شیعانِ علیؑ میں سے تھے جو ماریہ بنت منقذ عبدیہ کے مکان پر مجتمع ہوا کرتے تھے۔ یزید بن ثبیط قیسی کے ساتھ نصرتِ امام حسینؑ کے لیے روانہ ہوئے اور مقام ابطح پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۳۴۔ شبیب بن عبداللہ:

حارث بن سریع ہمدانی جابری کے غلام، صحابیٔ رسولؐ اور حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان کی تینوں لڑائیوں میں شرکت کا شرف حاصل کیے ہوئے تھے۔ کوفہ کے باشندہ تھے اور کربلا میں سیف بن حارث بن سریع اور مالک بن عبد بن سریع دونوں اپنے آقا زادوں کی معیت میں امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچے تھے۔ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۵۔ شبیب بن عبداللہ نہشلی:

طبقۂ تابعین میں سے حضرت علیؑ کے اصحاب میں محسوب ہوتے تھے اور آپ کے ساتھ تینوں لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ پھر امام حسنؑ اور ان کے بعد امام حسینؑ کے اصحاب میں اور آپ کے مخصوصین میں سمجھے جاتے تھے۔ جب امام حسینؑ نے مدینہ کو چھوڑا اور سفر غربت اختیار کیا تو شبیب بن عبداللہ وہیں سے آپ کے ہمراہ رکاب رہے یہاں تک کہ کربلا میں آپ کے ساتھ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۶۔ ضرغامہ بن مالک تغلبی:

انھوں نے کوفہ میں مسلم بن عقیل کی بیعت کی اور ان کے شہید ہونے کے بعد وہ بھی روپوش ہو گئے۔ پھر عمر سعد کی فوج کے ساتھ میدانِ کربلا میں پہنچے اور پوشیدہ طریقہ پر اصحاب حسینؑ سے ملحق ہو گئے۔ یہاں تک کہ حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۳۷۔ عامر بن مسلم عبدی بصری:

بصرہ کے باشندہ، انہی شیعانِ علیؑ میں سے تھے جو ماریہ بنت منقذ کے مکان پر جمع

ہوا کرتے تھے۔ یزید بن ثبیط قیسی کے ساتھ وہ بھی نصرتِ امام کے لیے روانہ ہوئے اور مقام ابطح پر آپ کی خدمت میں پہنچے۔ پھر روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۸۔ عباد بن مہاجر بن ابی المہاجر جہنی:

مکہ سے کوفہ کے راستے میں عرب کے ان صحرائی قبائل میں سے جن کی طرف سے گزر ہوتا تھا بہت سے لوگ خوش آیند دنیوی توقعات کو پیش نظر رکھ کر اس قافلہ کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ "میاہ جہینہ" نام کے چشموں کے پاس سے قبیلۂ جہینہ کے بہت سے لوگ اسی طرح آپ کے ساتھ ہو گئے تھے۔ ان ہی میں سے عباد بن مہاجر بھی تھے۔ جب مسلم و ہانی کے شہید ہو جانے کی خبر سننے کے بعد امام حسینؑ نے منزل زبالہ پر لوگوں کو حقیقی صورتِ حال سے مطلع فرماتے ہوئے انجام سے ناواقف افراد کو اپنے قافلہ سے جدا ہو نے کی ہدایت فرمائی اور اس کے نتیجہ میں سوا اُن جان نثاروں کے جو آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے تقریباً سب منتشر ہو گئے تو عباد بن مہاجر اُن گنتی کے باوفا افراد میں سے تھے جنھوں نے امام کا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں کیا اور وہ حضرت کے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ وہ روز عاشور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۳۹۔ عبد الرحمٰن بن عبد رب انصاری خزرجی:

صحابۂ رسولؐ میں سے حدیثِ غدیر کے راوی اور شاہد تھے[1]

حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے مخصوص شاگرد تھے۔ حضرت نے خود ان کو قرآن کی تعلیم دی اور ان کی تربیت بھی فرمائی تھی۔ وہ امام حسینؑ کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے اور میدانِ کربلا تک برابر ہمراہ رکاب رہے۔ صبح عاشور ان ہی سے بریر کی مزاحیہ گفتگو ہوئی تھی جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ انھوں نے بھی حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت حاصل کیا۔

---

[1] جریدا اصماد الصحابہ الذہبی صہ ۲۷۷

۴۰۔ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحبی:

طبقۂ تابعین میں سے معزز بہادر اور جنگ آزما تھے۔ کوفہ سے جو دوسرا وفد امام حسینؑ کے پاس بھیجا گیا تھا جس کے ساتھ تقریباً ۵۳ عرضداشتیں امام کی خدمت میں ارسال کی گئی تھیں جن میں سے ہر ایک دو تین اور چار دستخطوں سے تھی اس وفد میں قیس بن مسہر صیداوی اور عمارہ بن عبید سلولی کے ساتھ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بھی تھے۔ اس کے بعد امام حسینؑ نے مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا تو عمارہ اور عبدالرحمٰن کو ان کے ساتھ کر دیا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن عبداللہ کسی نہ کسی طرح کوفہ سے نکل کر میدانِ کربلا تک پہنچے اور امام حسینؑ کے اصحاب میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۱۔ عبدالرحمٰن بن مسعود:

وہ مسعود بن حجاج تیمی کے فرزند تھے جن کا تذکرہ سلسلۂ شہداء میں بعد کو آئے گا۔ دونوں باپ بیٹے عمر سعد کی فوج کے ساتھ آئے تھے اور محرم کی ساتویں تاریخ امام کی خدمت میں سلام کرنے کے قصد سے حاضر ہوئے، پھر واپس نہیں گئے۔ عبدالرحمٰن روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۲۔ عبداللہ بن بشر خثعمی:

پورا نام و نسب حسب ذیل تھا: عبداللہ بن بشر بن ربیعہ بن عمرو بن منارۃ بن ہمیر بن عامر بن ریشہ بن مالک بن واہب بن جلیحہ بن کلب بن ربیعہ بن عفرس بن خلف بن اقبل بن انمار الخثعمی۔ ان کے باپ بشر بن ربیعہ اپنے زمانے کے مشہور روزگار اور میدان جنگ کے نبرد آزما شہسواروں میں سے تھے۔ کوفہ کا مشہور احاطہ جو "جبانہ بشر" کہلاتا تھا ان ہی کے نام سے منسوب تھا۔ جنگ قادسیہ کے ذیل میں ان کا نام صفحاتِ تاریخ پر نمایاں ہے۔ ا... ے فرزند عبداللہ صفات شجاعت و جرأت د

نام آوری میں ان ہی کے قدم بقدم تھے۔ میدانِ کربلا میں فوج عمر سعد کے ساتھ پہنچ کر خفیہ طریقہ پر انصارِ حسینؑ میں شامل ہو گئے۔ یہاں تک کہ حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت حاصل کیا۔

۴۳۔ عبداللہ بن یزید بن ثبیط قیسی:

یزید بن ثبیط کے دس بیٹے تھے چنانچہ انھوں نے ان دسوں کے سامنے نصرتِ حسینؑ کا سوال پیش کیا لیکن ان میں سے صرف دو تھے جنھوں نے اس اہم ارادہ میں باپ کا ساتھ دیا۔ ان ہی دو میں ایک عبداللہ تھے، چنانچہ وہ اپنے باپ کی ہمراہی میں بصرہ سے نکلے اور مقام ابطح پر پہنچ کر خدمتِ امام میں حاضر ہوئے۔ روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۴۔ عبید اللہ بن یزید بن ثبیط قیسی:

وہ یزید بن ثبیط کے دوسرے فرزند تھے جنھوں نے نصرتِ حسینؑ کے تہیہ میں ان کا ساتھ دیا اور وہ بھی حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۵: عقبہ بن صلت جہنی:

"میاہ جہینہ" کے اعراب میں سے جو اثنائے راہ سے قافلۂ حسینی کے ساتھ ہو گئے تھے۔ ایک وہ بھی تھے اور منزلِ زبالہ میں امام حسینؑ کے حقیقتِ حال کے اظہار پر مشتمل خطبہ کو سنکر جب سوا خاص جان نثاروں کے اور سب نے اپنی اپنی راہ لی تو وہ امام کے ساتھ ہی رہے یہاں تک کہ روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۶۔ عمار بن ابی سلامہ دالانی:

نام و نسب: عمار بن ابی سلامہ بن عبداللہ بن عمران بن راس بن دالان ہمدانی۔ حافظ ابن حجر

لکھتے ہیں کہ انھوں نے رسالتمآبؐ کے زمانہ کا ادراک کیا تھا اور علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں شرکت کی تھی۔ کربلا میں امام حسینؑ کے ساتھ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۷۔ عمّار بن حسّان طائی:

نام ونسب: عمّار بن حسان بن شریح بن سعد بن حارثہ بن لام بن عمرو بن ظریف بن عمرو بن ثمامہ بن ذہل بن جذعان بن سعد بن طے۔ مخصوص وممتاز شیعانِ علیؑ میں سے مشہور بہادر وجنگ آزما تھے۔ ان کے باپ حسّان بن شریح حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے اصحاب میں سے تھے اور جنگ صفین میں آپ ہی کی نصرت میں شہید ہوئے۔ عمّار، امام حسینؑ کے ساتھ مکہ معظمہ سے آئے تھے اور روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔ ان کی اولاد میں سے عبداللہ بن احمد بن عامر بن سلیمان بن صالح بن وہب بن عمار بن حسان بن شریح طائی جلیل القدر عالم اور فقیہہ تھے جو اپنے والد کے ذریعے امام رضاؑ سے روایت کرتے تھے اور کتاب القضایا والاحکام کے مصنف تھے۔

۴۸۔ عمرو بن ضبیعۃ بن قیس بن ثعلبہ ضبعی تیمی:

بہادر، شہسوار اور جنگ کے میدان میں کارنمایاں انجام دیے ہوئے تھے۔ عمر سعد کی فوج کے ساتھ میدانِ کربلا میں پہنچے۔ پھر انصارِ امام حسینؑ میں شامل ہو گئے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۹۔ عمران بن کعب بن حارث اشجعی:

ان کا شمار بھی حملۂ اولیٰ کے شہداء میں ہے۔ حالات معلوم نہیں۔

۵۰۔ قارب مولی الحسینؑ:

قارب بن عبداللہ بن اریقط لیثی دئلی۔ ان کی ماں فکیہہ امام حسینؑ کی حرم سرا میں

رباب مادرِ سکینہ کی کنیز تھیں اور ان کی شادی عبداللہ بن ارلقیط کے ساتھ ہوئی اور اس طرح قارب کی ولادت ہوئی تھی وہ اپنی ماں کی ہمراہی میں امام حسینؑ کے ساتھ مدینہ سے مکہ اور پھر وہاں سے میدانِ کربلا تک پہنچے اور روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۵۱۔ قاسط بن زہیر بن حارث تغلبی:

وہ اور ان کے دو بھائی مقسط اور کردوس حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں سے تھے اور آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ پھر امام حسنؑ کے ساتھ رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے حجاز کی طرف مراجعت فرمائی۔ اس کے بعد وہ تینوں بھائی کوفہ میں قیام پذیر رہے۔ یہاں تک کہ جب امام کربلا میں وارد ہوئے تو وہ تینوں بھائی کسی نہ کسی طرح امام کی خدمت میں پہنچے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۵۲۔ قاسم بن حبیب بن ابی بشر ازدی:

کوفہ کے شیعان علیؑ میں سے بہادر، دلیر اور شہسوار تھے۔ عمر سعد کی فوج کے ساتھ کربلا پہنچے پھر پوشیدہ طریقے پر امام کے انصار سے ملحق ہو گئے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۵۳۔ کردوس بن زہیر بن حارث تغلبی:

وہ اور ان کے بھائی قاسط بن زہیر اور دوسرے بھائی مقسط تینوں اصحاب حضرت علیؑ میں سے تھے اور آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شرکت کی تھی۔ کربلا میں خفیہ طریقہ پر خدمتِ حسینؑ میں پہنچے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۵۴۔ کنانہ بن عتیق تغلبی:

کنانہ بن عتیق بن معاویہ بن جماعۃ بن قیس تغلبی کوفی شجاعانِ روزگار میں سے عابد و زاہد اور حافظِ قرآن تھے، لڑائی ٹھننے سے پہلے میدانِ کربلا میں خدمتِ امام میں پہنچے اور روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۵۵۔ مجمع بن زیاد بن عمرو جہنی:

"میاہ جہینہ" کے اعراب میں سے تھے جو اثنائے راہ میں امام کے ساتھ ہو گئے تھے اور جب منزلِ زبالہ میں امام کے خطبہ کو سنکر سوا مخصوص جان نثاروں کے دوسرے تمام لوگ متفرق ہو گئے تو مجمع بن زیاد امام کے ہمراہ ہی رہے اور روزِ عاشور پہلے ان کا گھوڑا زخمی ہو کر پے ہوا، پھر چند آدمیوں کو قتل کر کے وہ دشمنوں میں گھر گئے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۵۶۔ مسعود بن حجاج تیمی:

کوفہ کے بڑے مشہور شیعۂ علیؑ اور لڑائیوں میں کام کیے ہوئے تھے۔ اپنے فرزند عبدالرحمٰن بن مسعود کے ساتھ عمر سعد کی فوج میں میدانِ کربلا تک پہنچے اور ساتویں محرم کو امام کی خدمت میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہوئے تو پھر واپس نہیں گئے۔ روزِ عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۵۷۔ مسلم بن کثیر صدفی ازدی:

قبیلۂ ازد شنوہ میں سے اعرج یعنی لنگ تھے، انھوں نے رسالتمآبؐ کا ادراک کیا تھا۔ جنگِ جمل میں حضرت علی بن ابی طالبؑ کی نصرت میں شریکِ جنگ تھے کہ پنڈلی پر تیر پڑا جس کا اثر رہا۔ کوفہ سے نصرتِ امام حسینؑ کا تہیہ کر کے روانہ ہوئے اور کربلا میں پہنچ کر آپ سے قدمبوس ہوئے۔ حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۵۸۔ مقسط بن زہیر بن حارث تغلبی:

وہ اور ان کے دو بھائی قاسط اور کردوس اصحاب حضرت علیؑ میں سے تھے اور آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے وہ سب میدان کربلا میں تخفیہ طریقہ پر امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۵۹۔ منیع بن زیاد:

ان کا شمار بھی حملۂ اولیٰ کے شہداء میں ہے۔ حالات معلوم نہیں۔

۶۰۔ نصر بن ابی نیزر:

ابونیزر، نجاشی بادشاہ حبشہ یا کسی اور ملک عجم کے بادشاہ کی نسل سے تھے۔ بچپنے میں دین اسلام سے مشرف ہونے کا شوق پیدا ہوا۔ رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچے اور مذہب اسلام اختیار کیا تو آنحضرتؐ نے ان کی تربیت فرمائی اور آپ کی وفات کے بعد وہ حضرت علیؑ کی خدمت میں رہے اور آپ کے مملوکہ ایک نخلستان میں اصلاح و تربیت کے کام پر مامور ہوئے۔

ان کے فرزند نصر نے اپنی کمسنی اور نوجوانی کا زمانہ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے ساتھ اور بقیہ زندگی کا دور امام حسینؑ کی خدمت میں گزارا۔ یہاں تک کہ سفر عراق میں آپ کے ساتھ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا پہنچے۔ حملۂ اولیٰ میں پہلے ان کا گھوڑا کام آیا پھر وہ خود درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۶۱۔ نعمان بن عمرو ازدی:

کوفہ کے باشندہ، اصحاب حضرت علیؑ میں سے تھے اور آپ کے ساتھ جنگ صفین میں شریک بھی ہوئے تھے۔ وہ اور ان کے بھائی حلاس بن عمرو ازدی کربلا میں عمر سعد کی فوج کے ساتھ پہنچے تھے اور شرائط صلح مسترد ہونے پر اصحاب حسینؑ سے ملحق ہو گئے۔ یہاں تک کہ حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۶۲۔ نعیم بن عجلان انصاری:

نام ونسب: نعیم بن عجلان بن نعمان بن عامر بن زریق الانصاری الخزرجی، وہ اور ان کے دو بھائی نضر اور نعمان اصحاب حضرت علیؑ میں سے تھے اور جنگِ صفین میں کارِ نمایاں انجام دیے تھے اور تینوں شجاعانِ روزگار اور شعراء میں شمار ہوتے تھے۔

نعمان بن عجلان کو حضرت علیؑ نے عمرو بن ابی سلمہ مخزومی کو معزول فرما کر بحرین کا حاکم مقرر کیا تھا۔

نضر اور نعمان دونوں نے امام حسنؑ کی خلافت کے زمانہ میں انتقال کیا اور نعیم کوفہ میں مقیم رہے۔ جب امام حسینؑ سرزمین عراق پر پہنچے تو وہ کوفہ سے کسی نہ کسی طرح نکل کر آپ کی خدمت میں پہنچ گئے اور روز عاشور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

یہاں پر حملۂ اولیٰ کے پچاس شہداء کی تعداد پوری ہوگئی۔ اب ان افراد کا تذکرہ کیا جائے گا جو حملۂ اولیٰ کے بعد سے نماز ظہر تک شہید ہوئے تھے۔

خیمہ گاہِ حسینی پر ہجوم

جب تک حسینی جماعت اپنی مختصر تعداد میں سہی پوری موجود تھی۔ اس وقت تک دشمنوں کے لیے آگے بڑھنا ممکن نہ ہوسکا تھا لیکن اب جب حملۂ اولیٰ کے ذیل میں پچاس نفوس اس جماعت کے یکبارگی شہید ہوگئے اور جتنے انصارِ حسینؑ باقی رہ بھی گئے ان میں سے کسی کے پاس سواری کے لیے گھوڑا نہ رہا تو اب لشکرِ مخالف کو جرأت ہوئی کہ وہ خیامِ حسینی کا رخ کرے۔ اس موقع پر اگرچہ حسینؑ کے اصحاب کی تعداد بہت کم ہوچکی تھی مگر پھر بھی ان کی شجاعت کا عالم یہ تھا کہ تاریخ کا بیان ہے "انھوں نے جنگ کی، یہاں تک کہ دوپہر کا وقت ہوگیا۔ دنیا کی سخت ترین جنگ جو خلقِ خدا میں کبھی کسی کی نظر سے گزری ہو۔"

یزیدی لشکر کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح پسِ پشت پہنچ کر ان بہادروں کو گھیرے میں لے لے۔ مگر پشت کی جانب ان کے خیمے تھے جنھیں امام کے حکم سے اس طرح ایک دوسرے سے متصل اور طناب اندر طناب کر دیا گیا تھا کہ انھوں نے ایک مضبوط دیوار اور حصار کی شکل اختیار کر لی تھی اس لیے اس طرف سے حملہ غیر ممکن تھا۔ عمر سعد نے یہ دیکھا تو حکم دیا کہ طنابیں کاٹ کر خیموں کو ان کے چپ و راست سے گرا دیا جائے تاکہ پورے طور سے محاصرہ کرنا ممکن ہو سکے۔ اصحاب حسینؑ نے جو یہ دیکھا تو متفرق طور پر اپنے اپنے خیموں کے اندر داخل ہو کر منتظر رہے یہاں تک کہ جب کسی خیمہ میں کوئی دانش ہوتا کہ طنابیں کاٹ کر اس کو گرائے تو فوراً وہ قتل کر دیا جاتا اور لاش باہر پھینک دی جاتی۔ جب عمر سعد کو اپنی اس تدبیر میں بھی ناکامی ہوئی تو اس نے کہا کہ "اچھا! کسی خیمہ کے اندر جا کر گرانے کی کوشش نہ کرو بلکہ ان سب خیموں میں آگ لگا دو۔"[1]

ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کا خیمہ اور حرم سرائے عصمت آپ کے اصحاب کے مسلسل خیموں کی قطار سے علیحدہ تھے۔ دشمن کے سپاہی جب ان خیموں میں آگ لگانے لگے تو امام نے فرمایا کہ آگ لگا لینے دو اس لیے کہ جب وہ آگ لگا دیں گے اور شعلے بھڑکنے لگیں گے تو پھر وہ بھی اس طرف سے تم پر حملہ نہ کر سکیں گے اور جو اُن کا مقصد ہے وہ پورا نہ ہوگا۔ چنانچہ اصحاب حسینؑ نے مدافعت چھوڑ دی اور لشکر آگ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر نتیجہ نے ظاہر کر دیا کہ عمر سعد نے تدبیرِ جنگ کے لحاظ سے غلطی کی اور امام حسینؑ کی رائے دشمنوں کے تجربہ میں بھی بالکل صائب ثابت ہوئی، یعنی آگ لگا دینے سے دشمن کے لیے اس طرف کا راستہ بند ہو گیا اور اس کے بعد بھی مقابلہ سامنے ہی کی جانب سے کیا جا سکا۔ اس تدبیر کے بھی ناکامیاب ثابت ہونے پر کمینہ طینت شمر برافروختہ ہو گیا اور اس نے حملہ کر کے خاص خیمۂ امام حسینؑ پر نیزہ مارتے ہوئے کہا کہ آگ لاؤ تاکہ میں اس خیمہ کو اس کے رہنے والے سمیت جلا دوں۔ اس آواز کے سننے سے حرم سرائے عصمت میں ایک شور نالہ و فریاد کا بلند ہوا۔ امام حسینؑ نے اسکو للکار کر فرمایا کہ "اے شمر تو آگ اس لیے منگا رہا ہے کہ میرے خیمہ کو میرے اہل و عیال سمیت

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵

جلا دے، خدا تجھے آگ سے جلنا نصیب کرے"۔ لشکر یزید کے دوسرے سرداروں نے بھی شمر کو منع کیا اور شبث بن ربعی نے شمر کے پاس جا کر کہا "میں نے آج تک ایسی شرمناک بات نہیں سنی جیسی تم زبان سے نکال رہے ہو اور نہ اس سے بدتر اقدام دیکھا جس کا تم نے ارادہ کیا ہے۔ تم عورتوں کو خوفزدہ کرتے ہو؟" ان سب کی مخالفت سے مرعوب ہو کر شمر اپنے ارادہ سے باز آ کر خیمہ کے دروازہ سے ہٹ گیا۔

اتنی دیر میں زہیر بن قین نے دس بہادر ساتھیوں کو ساتھ لے کر حملہ کر دیا، اتنا سخت حملہ کہ شمر اور اس کے ساتھ والی فوج کو خیموں کے پاس سے دور کر دیا اور ابو عزۃ ضبابی کو جو شمر کا خاص آدمی تھا قتل کر دیا۔ افواج یزید نے جو اپنے ایک سربرآوردہ ساتھی کو اس حملہ میں قتل ہوتے دیکھا تو وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ان دس آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور سخت خونریز لڑائی ہوئی مگر ان بہادروں نے بھی بڑی پامردی سے مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں دشمن کو شکست ہوئی۔

پھر بھی کثرت اور قلت کا مقابلہ ہی کیا؟ صورت یہ تھی کہ اس مختصر جماعت میں کے ایک دو بھی قتل ہوتے تھے تو اس سے نمایاں کمی ظاہر ہونے لگتی تھی برخلاف افواج یزید کے جو کثیر تعداد میں تھے، اس لیے جتنے بھی قتل ہوتے کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔[1]

جو اصحاب حسینؑ اس کے بعد سے دوپہر کے وقت تک نماز ظہر کے ہنگامہ سے پہلے شہید ہوئے ان کے نام تاریخ میں حسب ذیل ملتے ہیں:۔

۶۳۔ بکر بن حی تیمی:

عمر سعد کی فوج کے ساتھ کربلا آئے تھے مگر جنگ چھڑنے کے بعد توفیق الٰہی دستگیر ہوئی اور امام حسینؑ کی طرف آ کر شریک جہاد ہوئے اور حملۂ اولیٰ کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۱

۶۴۔ عمرو بن جنادہ بن کعب خزرجی:

ان کے باپ جنادہ بن کعب کا تذکرہ حملۂ اولیٰ کے مقتولین میں ہو چکا ہے۔ عمرو بن جنادہ کا واقعۂ کربلا میں نو یا دس برس کا سن تھا۔ ان کی ماں بحریہ بنت مسعود تھیں جو اپنے شوہر کے ساتھ میدانِ کربلا میں موجود تھیں۔ جب جنادہ درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تو ان کی بیوہ نے یتیم بچہ کو ہدایت کی کہ وہ بھی جائے اور امام حسینؑ کی نصرت میں جنگ کرے۔ بچہ خدمتِ امام میں آیا اور طالبِ اجازت ہوا۔ آپ نے اجازت دینے سے انکار کیا۔ بچہ نے پھر رخصت طلب کی۔ آپ نے اصحاب کی طرف رُخ کر کے فرمایا، ابھی تو اس کا باپ معرکۂ جنگ میں قتل ہو چکا ہے۔ اب اگر یہ بھی قتل ہو گیا تو اس کی ماں کے دل پر کیا گزرے گی۔ یہ سنکر بچہ نے کہا کہ آقا! میری ماں نے ہی تو مجھے بھیجا ہے اور انھوں نے ہی مجھے یہ جنگ کا لباس پہنایا ہے، بہرطور اجازت حاصل کر کے بچہ میدان میں آیا اور لڑ کر قتل ہوا۔ افواجِ یزید میں کے کسی بے رحم نے بچہ کا سر کاٹ کر جماعتِ حسینی کی طرف پھینک دیا۔ شیر دل ماں نے بچہ کا سر اٹھا لیا اور کہا "شاباش! بیٹا شاباش!! تو نے امام پر نثار ہو کر میرا دل خوش اور میری آنکھوں کو خنک کیا۔" پھر اس نے سر کو فوجِ دشمن کی طرف پھینک دیا اور خود ایک گزر آہنیں لے کر دشمنوں پر حملہ آور ہوئی مگر امام نے اسے گوارا نہ کیا اور اس کو خیمہ کی جانب واپس فرما دیا۔

ظُہر کا ہنگام اور نمازِ ظُہر کا ہنگامہ!

لشکرِ یزید کو اب یہ فکر تھی کہ کسی طرح مہم جلد سر جائے۔ اسی عالم میں ظُہر کا وقت ہو گیا۔ ادھر ابو ثمامہ عمرو بن عبداللہ صائدی نے امام کی خدمت میں عرض کیا کہ "مولا، یہ لوگ اب آپ کے بالکل قریب آ گئے ہیں اور یہ یقینی ہے کہ آپ پر آنچ آنے سے پہلے میں قتل ہو جاؤں گا میں چاہتا ہوں کہ اس نماز کو کہ جس کا وقت آ گیا ہے آپ کے ساتھ پڑھ لوں اور اس کے بعد

خدا کی بارگاہ میں جاؤں۔" امام نے آسمان پر نظر کرتے ہوئے فرمایا "تم نے نماز کو یاد کیا۔ خدا تم کو نماز گزاروں اور یاد رکھنے والوں میں محسوب کرے۔ ہاں یہ نماز کا اوّل وقت ہے۔" پھر آپ نے فرمایا "ان لوگوں سے کہو کہ اتنی دیر جنگ سے ہاتھ روک لیں کہ ہم نماز پڑھ لیں۔"[1]

اللہ اللہ! رسول اللہؐ کا فرزند جس کے گھر سے نماز کی بنیاد قائم ہوئی وہ نماز کی خواہش کرے اور وہ پوری نہ کی جائے بلکہ مہلت کے سوال پر حصین بن تمیم صف سے باہر نکلے اور کہے کہ "تمہاری نماز قبول نہیں ہے۔"[2]

۶۵۔ حبیب بن مظاہر اسدی:

نام و نسب: حبیب بن مظاہر بن رئاب بن اشتر بن خجوان بن فقعس بن طریف بن عمرو بن قیس بن حارث بن ثعلبۃ بن دوران بن اسد۔ کنیت ابوالقاسم، عرب کے مشہور شہسوار ربیعہ بن خوط بن رئاب کے چچا زاد بھائی تھے۔ ابن کلبی کی روایت کے مطابق صحابی تھے اور رسول اللہؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔ شیخ طوسی نے انھیں اصحاب حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ، اصحاب امام حسنؑ اور اصحاب امام حسینؑ میں درج کیا ہے۔

حبیب بن مظاہر، میثم تمار اور رشید ہجری کی طرح حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ان صحابہ باختصاص میں سے تھے جنھیں آپ نے خاص طور سے علوم باطنی اور اسرار کی تعلیم دی تھی۔

سب سے پہلے جب معاویہ کے انتقال کی خبر کوفہ میں پہنچی تھی اور امام حسینؑ کو کوفہ کی طرف بلانے کا خیال بعض دماغوں میں پیدا ہوا تھا تو سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر شیعان کوفہ کا اجتماع ہوا تھا۔ اس جلسہ کی روداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر حبیب بن مظاہر بھی موجود تھے۔ صرف موجود ہی نہیں تھے بلکہ وہ اس جماعت میں نمایاں اور ذمہ دارانہ حیثیت

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۱ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۱

رکھتے تھے۔ چنانچہ جو پہلا خط امام حسینؑ کے نام شیعانِ کوفہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا اس میں سلیمان بن صرد وغیرہ کے ساتھ ان کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ ثبت تھا اور جب مسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہو کر مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے مکان میں فروکش ہوئے تھے تو سب سے پہلا اجتماع شیعوں کا جو ہوا تھا اس میں جناب مسلم نے امام حسینؑ کا خط پڑھ کر سنایا تھا۔ اس موقع پر سب سے پہلی تقریر عابس بن ابی شبیب شاکری نے کی تھی اور اس کی تائید حبیب بن مظاہر نے کی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم دوسرے لوگوں کے متعلق ذمہ واری نہیں لیتے مگر جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے ہر طرح امداد کے لیے آمادہ ہیں۔

میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے پاس پہنچنے کے بعد سے وہ برابر ایسے مواقع کے منتظر رہتے تھے کہ دشمن کے ساتھ گفت وشنید کے ذریعہ نصیحت کے فرض کو انجام دے سکیں۔ چنانچہ جب عمر بن سعد نے قرہ بن قیس حنظلی کو امام حسینؑ کے پاس بصیغۂ مراسلت بھیجا تھا اور قرہ بن قیس نے امام کے پاس آکر عمر سعد کا پیغام پہنچا کر واپس جانا چاہا تھا تو حبیب نے کہا تھا "قرہ بن قیس ظالم جماعت کی طرف کہاں جا رہے ہو۔ اس بزرگ کی نصرت کرو جس کے نانا کی بدولت خدا نے تم کو اور ہم کو اسلام کی عزت عطا کی"۔ قرہ نے کہا تھا "میں جا کر پیغام کا جواب کہہ دوں تو پھر اس مسئلہ پر غور کروں گا"۔ [1]

اس تقریر کا اثر قرہ کے دل پر ضرور ہوا تھا چنانچہ بعد میں وہ کہا کرتا تھا کہ اگر حرؑ جاتے وقت اپنا ارادہ مجھ پر ظاہر کر دیتے تو میں بھی اُن کے ساتھ نصرتِ حسینؑ کے لیے چلا جاتا۔ [2]

اس تاسف اور اظہارِ رنج سے ظاہر ہے کہ دل اس کا احساس سے معمور ہو چکا تھا اور ضمیر آمادہ کر رہا تھا مگر اس میں قوتِ ارادی اتنی نہ تھی کہ وہ حرؑ کی طرح اس خیال کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ وہ اس کے لیے سہارے کا محتاج تھا اور یہ اس کی عملی کمزوری تھی کہ سہارا نہ ملنے سے اس کے قدم رُک گئے۔

---

[1] ارشاد ص ۲۴۰ [2] ارشاد ص ۲۴۹

نویں تاریخ کی شام کو جب افواجِ یزید نے دفعتہً جماعتِ حسینی پر حملہ کر دیا اور امام نے ابوالفضل العباس کو مقصد دریافت کرنے کے لیے بھیجا اور جناب عباس بیس سواروں کے ساتھ جن میں زہیر بن قین اور حبیب بن مظاہر بھی تھے ان کے سامنے گئے اور پوچھا کہ اس بے وقت اقدام کا کیا منشار ہے اور جواب ملا کہ ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ یا تم سے بیعت لی جائے اور یا جنگ کی جائے۔

جناب عباس یہ کہہ کر کہ میں امام سے دریافت کروں تو آکر تم کو جواب دوں، امام کی خدمت میں واپس گئے۔ اور دوسرے اصحاب وہیں کھڑے رہے۔ تو اس وقفہ کو بھی حبیب نے بیکار نہ جانے دیا۔ زہیر بن قین سے کہا کہ "ان لوگوں سے تم کچھ گفتگو کرو اور نہیں تو میں کچھ بات چیت کروں"۔ زہیر نے کہا "نہیں آپ ہی گفتگو کیجیے"۔ اس وقت حبیب نے مخالف مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر کی "سوچو تو! کتنا بُرا انجام ہوگا پیشِ خدا اس جماعت کا جو اس کے سامنے جائے گی اس حالت میں کہ اس نے اولادِ رسولؐ کا خون بہایا ہو اور ملک کے ان عبادت گزاروں کو قتل کیا ہو جو پچھلے پہر سے اٹھنے والے اور کثرت سے ذکرِ الٰہی کرنے والے ہوں"۔

عزرہ بن قیس نے جو ایک خفیف الحرکات مسخرا انسان تھا، بات کاٹنے کے لیے پکار کر کہا "حبیب! تم اپنی طرف ہر موقع پر اشارہ کرتے رہتے ہو کہ میں بڑا عبادت گزار ہوں"۔ یہ بے موقع مداخلت سنکر زہیر کو غصہ آگیا اور انھوں نے کہا "عزرہ! اس میں شک ہی کیا ہے؟ بلاشبہ حبیب کا نفس ایسا ہے جس کا خدا نے تزکیہ کیا ہے اور اس کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا کی ہے"۔[1]

شبِ عاشور حبیب بن مظاہر نے امام حسینؑ سے اجازت چاہی کہ وہ جا کر قبیلۂ بنی اسد سے جو اطراف میں مقیم ہیں آپ کی نصرت کی خواہش کریں چنانچہ امام نے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۷

اجازت دے دی اور حبیب نے بنی اسد کے مجمع میں جاکر وعظ و نصیحت کے ذریعہ انھیں نصرتِ امامؑ کے فریضہ کی طرف توجہ دلائی جس پر سب سے پہلے عبداللہ بن بشیر اسدی نے لبیک کہی اور پھر دوسرے لوگ بھی آمادہ ہوکر حبیب کے ساتھ جماعتِ حسینی کی طرف روانہ ہوئے مگر یہ کہ اس واقعہ کی خبر عمر سعد کو ہوگئی اور اس نے پانچسو سوار سدِّ راہ ہونے کے لیے بھیج دیے جن کے مقابلہ کی یہ جماعت تاب نہ لاسکی اور سب لوگ واپس چلے گئے۔ ناچار حبیب خدمتِ امام میں تنہا واپس پہنچے۔

صبح عاشورہ جب امام حسینؑ نے اپنا تاریخی خطبہ ارشاد کیا تھا اور شمر نے انتہائی بے شرمی، بے حیائی اور کمینہ فطرتی سے آپ کی تقریر میں مداخلت کی اور کہا کہ "میں منافق ہوں اور خدا کی عبادت ایک حرف پر کرتا ہوں (یعنی صرف زبانی) اگر کچھ میری سمجھ میں آرہا ہو کہ آپ کیا کہتے ہیں"۔ تو حبیب بن مظاہر ہی تھے جنھوں نے اس گستاخی کا جواب دیا یہ کہہ کر "بخدا میں سمجھتا ہوں کہ تو خدا کی ستر حرفوں پر عبادت کرتا ہے (یعنی تیری عبادت مخلصانہ حیثیت سے یکرنگ نہیں بلکہ ہفتا درنگ ہے) اور میں اس بات کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ تو سچ کہتا ہے، تیری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ امام کیا فرماتے ہیں کیونکہ تیرے دل پر مُہر لگ چکی ہے"۔ [1]

پھر جب امام نے اپنی مختصر جماعت کو ترتیب دیا تو میسرہ کا سردار حبیب بن مظاہر کو قرار دیا۔ [2]

جب مسلم بن عوسجہ مجروح ہوکر گرے اور امام حسینؑ ان کے سرہانے تشریف لے گئے تو حبیب نے جو آپ کے ساتھ ساتھ تھے مسلم کو ان کی شہادت پر مبارکباد دینے کے بعد کہا کہ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ میں بھی بہت جلد تم سے آکر ملتا ہوں تو کہتا کہ کچھ وصیت کرو تاکہ میں اس وصیت کو پورا کروں اور اس طرح جو تمھاری قرابت اور مذہبی خصوصیت کا حق ہے اس کو ادا کروں۔ جواب میں مسلم نے امام حسینؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

---

[1] ارشاد ص ۲۴۸ [2] ارشاد ص ۲۴۶

کہ "اور تو کچھ نہیں وصیت بس یہ ہے کہ ان کی نصرت سے ہاتھ نہ اٹھانا" ظاہر ہے کہ اس وصیت نے حبیب کے دہکتے ہوئے جذبۂ قربانی کے لیے ہوا سے کچھ کم کام نہ دیا ہوگا۔

پھر کہاں ممکن تھا کہ حصین بن تمیم کے اس گستاخانہ کلام کو جو اس نے حسینؑ کی جانب سے نمازِ ظہر کے لیے التوائے جنگ کی خواہش پر کیا تھا وہ ٹھنڈے دل سے گوارا کر لیتے؛ چنانچہ انھوں نے بے تاب ہو کر کہا "قبول نہیں ہے؛ رسول اللہؐ کے فرزند کی نماز تیرے خیال میں قبول نہیں ہے اور تیری نماز قبول ہے؟" حصین نے یہ سنکر حملہ کر دیا اور حبیب بھی مقابلہ پر آ گئے اور انھوں نے اس کے گھوڑے کے منہ پر تلوار ماری جس سے وہ الف ہو گیا اور حصین زمین پر گر گیا۔ مگر اس کے ساتھیوں نے بڑھ کر اسے اپنے حلقہ میں لے لیا اور حبیب کے ہاتھ سے بچا کر لے گئے۔

اب حبیب میدانِ جنگ میں آ ہی چکے تھے۔ ایمان کا جوش اور شجاعت کی امنگ، دشمن کی جرأت و جسارت کا غصہ اور اس کے زندہ نکل جانے کا رنج، چنانچہ وہ اس مضمون کا شعر پڑھنے لگے:۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم اگر تعداد میں تمھارے برابر ہوتے یا تمھارے آدھے بھی ہوتے تو تم ہمارے سامنے سے یقینی بھاگ جاتے۔ اے بدترین خلائق حسب و نسب اور اخلاق کے لحاظ سے۔"[1]

پھر انھوں نے دوسرے شعر پڑھے جن کا مضمون یہ تھا:۔

"میں حبیب ہوں اور میرے باپ کا نام مظاہر ہے۔ میدانِ جنگ اور بھڑکتی ہوئی لڑائی کے ہنگام کا شہسوار ہوں۔ تمھاری تعداد ہم سے زیادہ ہے اور لڑائی کا سامان تمھارے پاس فراواں ہے مگر ہم اپنی بات کے زیادہ دھنی اور مشکلات کے زیادہ برداشت کرنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ حجت ہماری بالا، حقیقت نمایاں، فرائض کی پابندی زیادہ اور دامن صاف ہے۔"[2]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۱ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۱

ان اشعار میں حبیب نے اصحابِ حسینؑ کے کردار اور ان نفسیاتی خواص کو جو اُن کے ثبات و استقلال کے ذمہ دار تھے صاف طور پر بیان کیا ہے۔

حبیب نے سخت جنگ کی یہاں تک کہ ایک تمیمی پہلوان نے جس کا نام بدیل بن صریم تھا حبیب پر حملہ کیا۔ حبیب نے ایک ضربِ شمشیر میں اس کا کام تمام کیا لیکن اسی کے ساتھ بنی تمیم کے ایک دوسرے شخص نے ان پر نیزہ کا وار کر دیا جس سے وہ زمین پر آ رہے۔ ابھی وہ اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ ان کے پہلے کے شکست خوردہ حریف حصین بن تمیم نے ان کے سر پر تلوار لگائی جس سے وہ بے جان ہو کر گر گئے۔ وہ تمیمی جس کے نیزہ کے وار نے حبیب کو زمین پر گرایا تھا ان کا سر کاٹنے کے لیے قریب آیا تو حصین نے کہا کہ "میں ان کے قتل میں شریک ہوں"۔ تمیمی نے کہا "نہیں، کام میں نے تمام کیا ہے"۔ آخر حصین نے کہا کہ "مجھے اتنا کر لینے دو کہ میں ان کا سر اپنے گھوڑے کی گردن میں باندھ کر ایک دفعہ لشکر میں گردش کر لوں تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ میں نے ان کے قتل میں شرکت کی ہے۔ پھر تم اس کو لے لینا اور ابن زیاد کے پاس لے جانا۔ وہاں سے جو انعام ملے گا اس میں میں حصہ نہیں لوں گا"۔ پہلے تو تمیمی نے انکار کیا۔ مگر لوگوں کے کہنے سننے سے راضی ہو گیا۔ اس طرح گویا اس پہلی شکست کی خفت مٹائی جو اسے حبیب کے مقابلہ میں حاصل ہو چکی تھی۔

حبیب کی شہادت کا امام حسینؑ پر خاص اثر ہوا[1]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۲۔ جب شہادت امام حسینؑ کے بعد فوج والے کوفہ واپس ہوئے تو حبیب کا سر ان کے تمیمی قاتل نے لے کر اپنے گھوڑے کی گردن میں آویزاں کر لیا اور اس طرح ابن زیاد کے محل کی طرف چلا۔ راستے میں حبیب کے فرزند قاسم کی نظر اس پر پڑی تو وہ اس شخص کے ساتھ ہو لیے اور اس سے منت سماجت کے ساتھ کہا کہ یہ میرے باپ کا سر مجھے دے دو کہ میں دفن کر دوں۔ اس نے انکار کیا اور کہا یہ کیونکر ہو سکتا ہے، مجھے تو امیر ابن زیاد سے انعام لینا ہے۔ بچہ بے بسی کے ساتھ رو کر رہ گیا اور وقت کا منتظر ہو گیا۔ مصعب بن زبیر کے عہدِ حکومت میں جب باجمیرا (مقام) پر فوج کشی ہوئی ہے تو یہ تمیمی ظالم بھی فوج میں تھا۔ اس دوران میں ایک دن قاسم بن حبیب نے موقع پا کر اسے قتل کر دیا (طبری ج ۶ ص ۲۵۲)

حُر کی شہادت

حُر بن یزید ریاحی نے جن کے حالات میں پہلے درج ہو چکا ہے کہ وہ حملۂ اولیٰ میں اپنے گھوڑے کے پے ہونے کے بعد پیادہ ہو چکے تھے اور اس کے پہلے کئی مرتبہ لڑ بھی چکے تھے۔ اب حبیب کی شہادت کے بعد مضبوط ارادہ کر لیا کہ وہ شرفِ شہادت کو حاصل کر کے رہیں گے۔ چنانچہ انھوں نے میدان میں نکل کر یہ رجز پڑھنا شروع کیا۔ "میں قسم کھاتا ہوں کہ میں قتل نہ ہوں گا جب تک دشمنوں کو قتل نہ کر لوں اور مارا نہ جاؤں گا مگر پیش قدمی کی حالت میں، میں آج تلواریں لگاؤں گا، فیصلہ کن تلواریں، نہ میرے قدم پیچھے ہٹیں گے اور نہ کمزوری کا اظہار ہوگا۔" کبھی کہتے تھے "میں شمشیر زنی کروں گا اس بہترین خلائق کی طرف سے جس کے قیام نے سرزمینِ حرم کو عزت بخشی۔" معلوم نہیں امام کا اشارہ تھا یا خود اپنی خواہش سے زہیر بن قین نے حُر کے ساتھ مل کر جہاد شروع کیا۔ حالت یہ تھی کہ جب ایک گھر جاتا تھا تو دوسرا بڑھ کر اس کو چھڑانے کی کوشش کرتا تھا۔ تھوڑی دیر یہی صورت قائم رہی لیکن اس کے بعد پیادوں کی فوج نے حُر کو سختی سے گھیر لیا[1] اور زہیر کی مدافعت ناکام رہی۔ بہت سے لوگ ٹوٹ پڑے اور ایوب بن مسرح کے ساتھ ایک اور شخص نے کوفہ کے شہسواروں میں سے مل کر حُر کو شہید کیا[2] امام نے اپنے ناصر کی یہ قدر کی کہ جب اس کی لاش میدان سے اٹھا کر لائی گئی اور حضرت کے سامنے رکھی گئی تو آپ خاک و خون حُر کے چہرے سے صاف کرتے جاتے تھے اور فرماتے تھے "تم بیشک حُر ہو۔ تمھارے والدین نے تمھارا نام بہت ٹھیک رکھا تھا۔ تم دنیا میں بھی حُر ہو اور آخرت میں بھی حُر۔" مطلب یہ تھا کہ انسان کی حریت و شرافت کا جوہر اس کے افعال ہی سے نمایاں ہوتا ہے۔ دُنیوی خواہشوں کی قید و بند میں گرفتار اور ہوا و ہوس میں اسیر ہو کر حق و ناحق کے امتیاز کو مٹا دینے والا ہرگز حریتِ ضمیر اور شرافتِ نفس کے جوہر کا مالک نہیں ہو سکتا۔ یقیناً حُر نے تمام دُنیوی توقعات کو ٹھکرا کر

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۲ [2] طبری ج ۶ ص ۲۰۴۔ ارشاد ص ۲۱۵

حق کے راستے پر قدم رکھا تو وہ حُر ثابت ہوئے اور حُریت کے اصل جوہر کو انھوں نے اپنے عمل سے نمایاں کر دیا۔

۶۶۔ ابو ثمامہ صائدی:

نام و نسب: عمرو بن عبداللہ بن کعب الصائد بن شرحبیل بن شراحیل بن عمرو بن جشم بن حاشد بن جشم بن حیزون بن عوف بن سہمان الہمدانی الصائدی۔ ابو ثمامہ ان کی کنیت تھی وہ عرب کے شہواروں میں سے شیعانِ علیؑ کے ممتاز افراد میں سے تھے[1]۔ حضرت علیؑ کی صحبت سے شرفیاب ہوئے تھے اور آپ کے ساتھ تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ آپ کے بعد امام حسنؑ کی صحبت اختیار کی تھی مگر حسنؑ کی مدینہ کی روانگی کے بعد انھوں نے کوفہ ہی میں قیام باقی رکھا۔

جب مسلم بن عقیل امام حسینؑ کے نمائندہ کی حیثیت سے کوفہ آئے تو ابو ثمامہ نے گرم جوشی کے ساتھ ان کی تائید کی اور جب کوفہ پر ابن زیاد کا تسلط ہوا اور جناب مسلم کو خونریزی کے آثار نظر آئے تو انھوں نے ابو ثمامہ کو یہ خدمت سپرد کی کہ وہ زرِ اعانت اپنے پاس جمع کیا کریں اور اسلحۂ جنگ خریدیں اس لیے کہ وہ اس امر میں بڑی واقفیت رکھتے تھے۔

جناب مسلم کی شہادت کے بعد ابو ثمامہ مخفی طور سے کوفہ سے نکل کر نافع بن ہلال کے ساتھ عراق کے راستے میں جماعتِ حسینی سے ملحق ہوئے۔

ان کی وفاداری اور فداکاری کا یہ یادگار واقعہ تھا کہ جب عمر بن سعد نے کثیر بن عبداللہ کو پیغام دے کر امام حسینؑ کے پاس بھیجا تو ابو ثمامہ نے اس سے کہا کہ اپنی تلوار باہر رکھ دو جب وہ اس پر تیار ہوتے دکھائی نہیں دیا تو انھوں نے کہا کہ اچھا میں تمھاری تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے رہوں گا چونکہ اس نے یہ بھی منظور نہ کیا اس لیے اسے واپس جانا پڑا اور عمر سعد کو دوسرا قاصد بھیجنا پڑا جس نے پیغام رسانی کے فرض کو انجام دیا۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۰۴ - ارشاد ص ۲۱۵

ظہر کی نماز کا وقت آنے پر ان کی فرض شناسی کا بہترین نمونہ تھا کہ اس سخت موقع پر بھی ان کے دل میں یہ خواہش جاگزیں تھی کہ میں نماز جماعت امام کی اقتدا میں پڑھ لوں۔ پھر خدا کی بارگاہ میں جاؤں۔ امام حسینؑ اس پر اتنا خوش ہوئے کہ آپ نے ان کو دعا دی۔ فرمایا کہ "تم نے اس وقت نماز کو یاد کیا، خدا تم کو نماز گزاروں میں محسوب کرے۔"

اس کے بعد امام نے اصحاب سے فرمایا کہ ان لوگوں سے کہو کہ اتنی دیر جنگ سے ہاتھ روک لیں کہ ہم نماز پڑھ لیں۔ اسی التوا کے سوال پر ہنگامہ ہو گیا تھا جس میں حبیب بن مظاہر اور حرؑ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ جیسا کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے یہ سوچ کر نہایت تکلیف ہوتی ہے کہ ابو ثمامہ کی یہ تمنا کہ وہ نمازِ ظہر امام کی اقتدا میں ادا کر لیں پوری نہیں ہوئی بلکہ اسی ہنگامہ میں اپنے قبیلہ کے ایک شخص کے ہاتھ سے جو فوجِ یزید میں تھا وہ شہید ہوئے۔

نمازِ ظہر

جنگ ملتوی نہیں ہوئی تھی۔ ایسے موقع کے لیے شرع نے مخصوص حکم "نمازِ خوف" کا دیا ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ فوج کے دو حصے ہو جائیں۔ ایک حصہ دشمن سے مقابلہ کرے اور دوسرا حصہ نماز میں شریک ہو۔ وہ ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور باقی نماز تخفیف کے ساتھ فرادیٰ پڑھ کر تمام کرے اور جب یہ نماز ختم کر کے جائے اور دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ پہلا حصہ فوج کا میدانِ جنگ سے آ کر نماز میں شریک ہو مگر یہ تو اس وقت ہو سکتا ہے جب فوج کی اتنی تعداد ہو کہ اس کے ایسے دو حصے ہو سکتے ہوں کہ ان میں کا ایک دشمن کے ساتھ اتنی دیر مقاومت کر سکے کہ دوسرا حصہ واپس آئے مگر یہاں تو جماعت حسینی کی مجموعی تعداد بھی فوجِ مخالف کی کثرت کو دیکھتے ہوئے گویا کہ نہ ہونے کے برابر تھی مگر امام نے ان کی شجاعت پر اعتماد کامل رکھتے ہوئے زہیر بن قین اور سعید بن عبداللہ حنفی سے فرمایا کہ تم دونوں میرے سامنے کھڑے ہو جاؤ تاکہ میں نمازِ ظہر پڑھ لوں۔ چنانچہ یہ دونوں جان نثار اصحاب کی تقریباً نصف جماعت

کے ساتھ آگے بڑھے اور اپنے امام کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ حضرت نے نمازِ خوف ادا کی۔[1]

۶۷۔ سعید بن عبداللہ حنفی:

کوفہ کے معزز شیعانِ علیؑ میں سے تھے اور شجاعت و عبادت کی صفت سے موصوف تھے۔ اہلِ کوفہ کے جو دعوتی خطوط امام کے پاس مکہ بھیجے گئے تھے۔ ان میں کے سب سے آخری خط کو لے کر آپ کی خدمت میں پہنچنے والے ہانی بن ہانی شبیعی اور سعید بن عبداللہ حنفی تھے۔[2] حضرت امام حسینؑ نے ان خطوط کا جواب بھی انہی دونوں کے سپرد کیا تھا چنانچہ اپنے خط میں ان کے ناموں کا حوالہ بھی دیا تھا۔ اس طرح کہ "ہانی اور سعید، میرے پاس تمہارا خط لے کر آئے اور یہ دونوں سب سے آخری تمہارے نمائندے تھے جو میرے پاس پہنچے"۔ اس کے بعد آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ "میں تمہاری جانب اپنے چچازاد بھائی اور معتمد عزیز مسلم بن عقیل کو بھیجتا ہوں" یہ دونوں اس خط کو لے کر حضرت مسلم کے آگے روانہ ہو گئے۔[3]

جب مسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہو کر مختار کے مکان میں فروکش ہوئے اور کوفہ والے آپ کے پاس جمع ہوئے تھے اور آپ نے امام حسینؑ کا خط پڑھ کر سنایا تھا تو عابس بن ابی شبیب شاکری اور حبیب بن مظاہر کے بعد سعید بن عبداللہ حنفی کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے بھی نصرت و وفاداری کا عہد کیا تھا۔

شبِ عاشور جب امام حسینؑ نے اپنا تاریخی خطبہ ارشاد کیا تھا کہ میں اپنی بیعت سے تمھیں آزاد کرتا ہوں، تمھارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ تو اصحاب میں سے مسلم بن عوسجہ کے بعد سعید کھڑے ہو گئے تھے اور انھوں نے یہ جوش و ولولہ سے بھرے ہوئے الفاظ کہے تھے کہ "خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ بخدا اگر میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر جیتے جی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۲ - ارشاد ص ۲۵۲ [2] ارشاد ص ۲۰۹ [3] ارشاد ص ۲۱۰

جلا دیا جاؤں، پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے اور میرے ساتھ ستر مرتبہ ایسا ہی سلوک ہو تو بھی میں آپ سے جدا نہ ہوں گا۔ یہاں تک کہ آخری مرتبہ بھی موت مجھے آپ ہی کے قدموں پر آئے۔"

سعید کے لیے اپنی وفاداری و جان نثاری کے دعووں کے پورا کر دکھانے کا اب موقع آگیا کہ جب امام حسینؑ نماز ظہر میں مصروف تھے اور آپ نے سعید اور زہیر بن قین کو بطور محافظ اپنے سامنے کھڑا کیا تھا۔ سعید نے یہ صورت اختیار کی کہ وہ خاص حضرت کے سامنے کھڑے تھے اور جو تیر آپ کی طرف آنے لگتا تھا اسے بڑھ کر اپنے اوپر روکتے تھے۔ یہاں تک کہ زخموں کی کثرت سے زمین پر گر کر جان بحق تسلیم ہوئے[1] اس حالت میں کہ تیرہ تیر ان کے جسم میں پیوست تھے۔

۶۸۔ زہیر بن قین بن قیس بجلی:

اشراف عرب میں سے کوفہ کے باشندہ، بہادر تھے اور متعدد لڑائیوں میں شریک ہو چکے تھے۔ جمل اور صفین کی لڑائیوں کے بعد سے مسلمان "عثمانی" اور "علوی" نام کی دو جماعتوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ جو لوگ معاویہ کے طرفدار تھے ان کو "عثمانی" کہا جاتا تھا اور جو حضرت علیؑ کی طرف تھے وہ "علوی" کہلاتے تھے۔ زہیر عام طور پر "عثمانی" جماعت سے متعلق سمجھے جاتے تھے اور بظاہر وہ اہل بیت نبوی کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہ رکھتے تھے۔

زہیر ۶۰ھ میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ مناسک حج بجا لانے کے بعد کوفہ کی سمت جا رہے تھے کہ امام حسینؑ کا ساتھ ہو گیا۔ اگرچہ زہیر بظاہر امام حسینؑ کے ساتھ کوئی خاص عقیدت نہ رکھتے تھے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کی خاندانی وجاہت سے مرعوب ضرور تھے یعنی انھیں یہ احتمال تھا کہ اگر حسینؑ مجھ کو نصرت کی دعوت دیں گے تو میرے لیے رد کرنا اس کا ممکن

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۲

نہ ہوگا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ حسینی قافلہ سے دور رہتے تھے۔ مگر حسینؑ ان کی فطری صلاحیتوں سے واقف تھے اس لیے منزلِ زرود پر امام نے زہیر کو بلا بھیجا جس کے بعد سے زہیر بالکل حسینؑ کے ساتھ تھے۔[1]

ذوحسم کے مقام پر جب حُر کا لشکر حسینی قافلہ کے سدِ راہ ہونے کی غرض سے آچکا تھا تو امام نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرکے جو خطبہ ارشاد کیا تھا اس کے جواب میں زہیر نے والہانہ انداز سے فدا کارانہ جذبات کا اظہار کیا تھا۔

اس کے بعد جب حُر نے امام کو کربلا پہنچ کر روکنا چاہا تھا اور نہر کے قریب خیمے برپا کرنے دینے سے بھی انکار کیا تھا تو زہیر نے کہا تھا کہ ہمیں اتنی فوج سے جنگ کر لینے دیجیے، اس لیے کہ اس کے بعد اتنا لشکر آئے گا کہ اس سے مقابلہ کرنے کی ہم میں طاقت ہی نہ ہوگی۔ اس کے جواب میں امام نے فرمایا تھا کہ میں جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتا۔[2]

پھر نویں تاریخ کی شام کو افواجِ یزید کے غیر متوقع حملہ کے موقع پر جب ابوالفضل العباس بعد استفسارِ حال امام سے صورتِ حال بیان کرنے گئے تو حبیب بن مظاہر نے افواجِ مخالف کو وعظ و پند شروع کیا تھا اور عزرہ بن قیس نے بدتہذیبی کے ساتھ دورانِ کلام میں مداخلت کی تھی تو زہیر نے اس کا جواب دیا تھا کہ بے شک حبیب کے نفس کا خدا نے تزکیہ کیا ہے اور اس کی رہنمائی کی ہے۔ اے عزرہ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں اور اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم اس جماعت کے ساتھ شریک نہ ہو جو گمراہی کی حمایت کر رہی ہے اور پاک نفوس کو قتل کرتی ہے۔ زہیر کی یہ آواز تعجب کے ساتھ سنی گئی تھی اور عزرہ نے انھیں پہچان کر کہا تھا، کہ "زہیر تم اس گھرانے کے شیعہ نہیں تھے، تم تو عثمانی گروہ میں سے تھے۔" اور زہیر نے کہا تھا کہ "اس وقت میرے یہاں کھڑے ہونے سے تو تم کو سمجھ ہی لینا چاہیے کہ میں شیعۂ علیؑ ہوں۔ خدا کی قسم میں نے نہ حسینؑ کو کبھی خط لکھا تھا نہ کوئی قاصد بھیجا تھا، اور نہ

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔ [2] تفصیل سابق میں بیان ہوئی ہے۔

نصرت کا وعدہ کیا تھا لیکن راستے میں اتفاق سے میرا اور ان کا ساتھ ہوگیا۔ جب میں نے انھیں دیکھا تو رسول اللہؐ یاد آگئے اور اُن کی خاندانی خصوصیت کا مجھے خیال آگیا اور مجھے احساس ہوا کہ حقیقتاً وہ دشمنوں کے ظلم و تعدی میں مبتلا ہیں۔ بس میں نے طے کر لیا کہ مجھے ان کی مدد کرنا چاہیے اور ان کی جماعت میں داخل ہو کر اپنی جان ان پر فدا کرنا چاہیے۔ خدا اور رسولؐ کے اس حق کو ادا کرنے کے لیے جسے تم لوگوں نے ضائع و برباد کر دیا ہے۔" [1]

پھر شبِ عاشور جب امام حسینؑ نے اصحاب کو جمع کیا تھا اور انھیں اپنی بیعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کرنے کا اعلان کیا تھا تو اصحاب میں سے مسلم بن عوسجہ اور سعید بن عبداللہ کے بعد زہیر نے بھی تقریر کی تھی اور کہا تھا "بخدا میں پسند کرتا ہوں کہ ایک دفعہ قتل ہوں، پھر زندہ ہوں پھر قتل ہوں، یوں ہی ہزار دفعہ ہو لیکن آپ اور نیز آپ کے خاندان کے یہ جوان قتل ہونے سے محفوظ رہ جائیں۔" [2]

صبح عاشور جب امام حسینؑ نے اپنی مختصر فوج کو ترتیب دیا تھا تو زہیر بن قین کو میمنہ کا افسر مقرر کیا تھا اور زہیر نے میدان میں نکل کر فوج مخالف کے سامنے ایک معرکہ آرا تقریر بھی کی تھی، پھر جب لڑائی شروع ہوگئی تھی اور افواجِ مخالف کے صفوف میں سے یسار اور سالم میدانِ جنگ میں آئے اور عبداللہ بن عمیر کلبی مقابلہ کے لیے نکلے تھے تو ان دونوں نے کہا تھا کہ "ہم تم کو نہیں پہچانتے، ہمارے مقابلہ کے لیے زہیر بن قین یا حبیب بن مظاہر یا بریر بن خضیر کو آنا چاہیے۔" اس واقعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ زہیر فوجِ حسینی کے ان نمایاں افراد میں سے تھے جو دشمنوں کے نزدیک ممتاز حیثیت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔

ان کی شجاعت کے کارنامے صبح عاشور سے ہنگامِ ظہر تک متعدد بار ظاہر ہو چکے تھے۔ چنانچہ ظہر کے پہلے جب شمر نے مخصوص خیمہ حسینی پر حملہ کیا اور اپنا نیزہ خیمہ پر مار کر کہا تھا کہ آگ لاؤ، میں اس خیمہ کو اس کے رہنے والوں سمیت جلا دوں تو زہیر نے اپنے دس بہادر ساتھیوں

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۷ [2] ارشاد ص ۲۴۴

کے ساتھ حملہ کر کے اس کی فوج کو پسپا کر دیا[1]۔ پھر جب حبیب شہید ہو چکے اور حُر میدانِ جنگ میں آئے تو زہیر نے حُر کے ساتھ مل کر جنگ کی۔ اس کے بعد امام حسینؑ نے سعید بن عبداللہ اور زہیر کو مامور کیا کہ تم میری حفاظت کرو، یہاں تک کہ میں نمازِ ظہر ادا کر لوں چنانچہ سعید بن عبداللہ نماز تمام ہوتے ہوتے اتنے زخمی ہو گئے کہ وہ جاں بر نہ ہو سکے اور زہیر کے بھی دست و بازو جواب دے چکے تھے پھر بھی نمازِ ظہر کے بعد جب دشمن بہت قریب آ گئے تھے تو زہیر بن قین نے اپنی آخری جنگ کی۔ اس وقت وہ بڑے جوش کے ساتھ کہہ رہے تھے:۔

"میں زہیر ہوں، قین کا فرزند ہوں۔ میں اپنی تلوار سے دشمنوں کو حسینؑ کے پاس سے دور کروں گا۔" یوں ہی تھوڑی دیر تک وہ شمشیر زنی کرتے رہے آخر کثیر بن عبداللہ شعبی اور مہاجر بن اوس دونوں نے ایک ساتھ ان پر حملہ کیا اور انہی کے ہاتھ سے وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے[2]۔

۶۹۔ سلمان بن مضارب بن قیس البجلی:

زہیر بن قین کے چچازاد بھائی تھے۔ زہیر کے ساتھ ۶۰ھ میں حج کو گئے تھے۔ واپسی میں جب زہیر امام کی نصرت کے خیال سے آپ کے ساتھ ہو لیے تو سلمان نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ روزِ عاشور ظہر کے بعد شہید ہوئے۔

۷۰۔ عمرو بن قرظۃ بن کعب انصاری:

نام و نسب: عمرو بن قرظۃ بن کعب بن عمر بن عائذ بن زید بن مناۃ بن ثعلبہ بن کعب بن الخزرج الانصاری۔ ان کے والد قرظۃ بن کعب اصحابِ رسول اللہؐ میں سے تھے۔ جنگِ اُحد

---

[1] ارشاد ص ۲۵۲۔ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۲۔۲۵۳

اور اس کے بعد کی لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔

۲۳ھ میں خلیفۂ دوم کے زمانہ میں رَے ان کے ہاتھوں پر فتح ہوا تھا اور حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ان کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ پھر جب آپ جنگِ صفین کے لیے جانے لگے تو ان کو اپنے ساتھ لے گئے تھے اور کوفہ کی حکومت ابومسعود بدری کے سپرد کی تھی۔ قرظہ سب لڑائیوں میں حضرت علیؑ کے ساتھ رہے اور آپ ہی کے زمانۂ خلافت میں کوفہ میں ان کا انتقال ہوا اور آپ ہی نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ایک قول یہ ہے کہ معاویہ کے ابتدائی زمانہ میں جب مغیرہ بن شعبہ کوفہ کا حاکم تھا انھوں نے انتقال کیا۔

ان کے دو فرزند تھے۔ عمرو اور علی۔ کربلا میں عمرو امام حسینؑ کی طرف تھے۔ غالباً یہی بڑے تھے۔ اس لیے کہ ان کے والد قرظہ بن کعب کی کنیت ان ہی کے نام پر ابوعمرو تھی اور ان کا چھوٹا بھائی علی لشکرِ یزید میں تھا۔

عمرو بن قرظہ کوفہ ہی میں رہتے تھے۔ وہ امام کی خدمت میں میدانِ کربلا میں پہنچے تھے۔ محرم کی ابتدائی تاریخوں میں جب جنگ ہونے کا قطعی فیصلہ نہ ہوا تھا امام نے ان کو عمر سعد کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ "تم مجھ سے شب کے وقت دونوں لشکروں کے درمیان ملاقات کرو۔"

روزِ عاشور نمازِ ظہر کے بعد جب تمام اصحاب میں جذبۂ فداکاری تیز ہو گیا تھا اور شمع امامت کے پروانے جاں سپاری میں ایک دوسرے پر سبقت کر رہے تھے۔ عمرو بن قرظہ نے جنگ کرنا شروع کی۔ وہ اس مضمون کے شعر پڑھ رہے تھے۔ "تمام انصار کی جماعت جانتی ہے کہ میں ذمہ واری کے حدود کی حفاظت کروں گا۔ ایسے جواں مرد انسان کی طرح شمشیر زنی کرتے ہوئے جو پیچھے ہٹنے والا نہ ہو۔ حسینؑ پر میری جان اور میرا گھر بار سب فدا ہو۔"

کچھ دیر تلوار چلانے کے بعد پھر عمرو امام کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ جو تیر آتا اسے اپنے اوپر روکتے اور جو وار ہوتا خود سپر بن جاتے۔ آخر زخموں سے چور ہو گئے اور امام سے مخاطب ہو کر بولے "کیوں! فرزندِ رسولؐ، میں نے فرض کو ادا کیا؟" آپ نے فرمایا۔ "ہاں تم جنت

میں میرے آگے جاؤ گے۔ رسولِ خدا کو میرا سلام پہنچا دینا اور کہنا کہ میں بھی عنقریب آتا ہوں۔"
بہادر جانباز زخموں کی کثرت سے زمین پر گرا اور جاں بحق تسلیم ہوا۔

ان کا بھائی علی بن قرظہ جو فوجِ عمر سعد میں تھا صف سے باہر نکلا اور امام کو ناشائستہ الفاظ میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "تم نے میرے بھائی کو گمراہ کیا اور ورغلا کر قتل کرا دیا۔" امام نے فرمایا کہ "خدا نے تیرے بھائی کو گمراہ نہیں کیا بلکہ اس کی ہدایت کی اور گمراہی میں تجھے چھوڑ دیا ہے۔" اس نے کہا "خدا مجھے غارت کرے اگر میں تمھیں قتل نہ کروں یا اس کوشش میں خود ہلاک نہ ہو جاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے حملہ کیا۔ نافع بن ہلال نے آگے بڑھ کر اس پر نیزہ کا وار کیا جس سے وہ گر گیا۔[1]

۱۷۔ نافع بن ہلال جملی:

نام و نسب: نافع بن ہلال بن نافع بن جمل بن سعد العشیرۃ بن مذحج، اپنے قبیلہ کے سردار اور بہادر شخص تھے۔ حافظِ قرآن بھی تھے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے اصحاب میں سے اور احادیث کے حامل تھے۔ آپ کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں شریک بھی ہوئے تھے۔ عراق کی طرف امام کی روانگی کی اطلاع پا کر کوفہ سے روانہ ہوئے تھے اور راستے میں جماعتِ حسینی سے ملحق ہوئے تھے۔ اس وقت جبکہ جناب مسلم کی خبرِ شہادت بھی نہ آئی تھی ان کا ایک گھوڑا جس کا نام "کامل" تھا کوفہ میں رہ گیا تھا اور اس کے متعلق انھوں نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ بعد میں ان کے پاس پہنچا دیا جائے چنانچہ عذیب الہجانات میں عمرو بن خالد صیداوی، مجمع بن عبداللہ عائذی اور جنادہ بن حارث سلمانی وغیرہ پانچ آدمیوں کا قافلہ حسینی جماعت سے ملحق ہوا تھا اس کے ساتھ یہ گھوڑا بھی تھا۔

حُر سے ملاقات اور گفتگو کے بعد ذو حسم میں امام نے جو خطبہ پڑھا تھا اس کے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۸

جواب میں انھوں نے پُرزور تقریر کی تھی۔

کربلا میں جب نہر پر دشمنوں کی مزاحمت شروع ہوئی اور امام اور ان کے ساتھیوں پر پیاس کا غلبہ ہوا امام حسینؑ نے اپنے بھائی ابوالفضل العباس کو پانی لانے پر مامور کیا۔ جناب عباس بیس سوار اور بیس پیادوں کے ساتھ بیس مشکیزے لے کر آگے بڑھے اور نہر کے قریب پہنچے تو نافع بن ہلال نے علم اپنے ہاتھ میں لیا اور سب سے آگے ہو گئے۔ عمرو بن حجاج زبیدی نے جو نہر کا محافظ تھا ٹوکا اور کہا، کون ہے جو نہر پر جا رہا ہے؟ چونکہ عمرو بن الحجاج قبیلۂ زبیدہ سے تھا جو مذحج اور مراد کی ایک شاخ ہے اور قبیلۂ جمل جس سے نافع تھے یہ بھی مراد کی ایک شاخ، اس لیے نافع نے جب اپنا نام بتایا اور قبیلہ کا پتہ دیتے ہوئے کہا کہ ہم پانی پینے آئے ہیں تو عمرو نے کہا "تم شوق سے پیو، تمھیں پینا گوارا ہو" نافع نے جواب میں کہا "میں اکیلا تھوڑی پیوں گا، درصورتیکہ حسینؑ اور ان کے سب اصحاب پیاسے ہوں" یہ سنتے ہی فوج مخالف آگے بڑھی یہ کہتی ہوئی کہ "یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ان تک پانی پہنچ سکے۔ ہم یہاں مقرر اسی لیے کیے گئے ہیں کہ پانی کا ایک قطرہ بھی جماعت حسینی تک نہ جانے دیں" نافع ان لوگوں سے گفتگو کے لیے آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم لوگ تیزی سے مشکیں پانی سے بھر لو۔ چنانچہ ساتھیوں نے جلدی جلدی پانی بھر لیا اور جب ادھر سے نگہبانوں کی فوج آگے بڑھی تو ابوالفضل العباس کے ساتھ نافع بن ہلال اور دوسرے بہادروں نے اس کا مقابلہ کر کے پیچھے ہٹا دیا۔ اس دوران میں وہ لوگ جو مشکیں لیے ہوئے تھے ساحل سے اوپر آ گئے تھے چنانچہ بہادروں نے ان کو خیام حسینی کی طرف روانہ کر دیا اور خود وہیں کھڑے رہے۔ پاسبانوں کی فوج نے پھر بڑھ کر حملہ کیا۔

اس موقع پر نافع بن ہلال نے عمرو بن الحجاج کی فوج میں سے ایک شخص پر جو قبیلۂ صدا سے تھا نیزہ کا وار کیا جس سے بعد میں وہ ہلاک ہو گیا۔ بہرطور اصحاب حسینؑ پانی لے کر

خیامِ حسینی تک پہنچ گئے[1] جو اتنی بڑی جماعت کے لیے جن کے ساتھ گھوڑے بھی تھے صرف ذرا ہی دیر تک کے لیے تسکینِ عطش کا باعث ہو سکتا تھا۔

روزِ عاشور جنگ چھڑنے کے بعد ہی سے نافع کا ولولۂ جنگ کام کرنے لگا تھا چنانچہ افواجِ مخالف کے ایک پہلوان مزاحم بن حریث کے ساتھ ان کا دست بدست کامیاب مقابلہ ہوا تھا۔ اس کے بعد عمرو بن قرظہ کی شہادت کے موقع پر جب ان کے بھائی علی بن قرظہ نے امام کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے اور حملہ کیا تھا تو نافع نے اس کا مقابلہ کر کے اسے مغلوب کیا تھا۔

نافع تیراندازی میں بڑے مشاق اور یگانۂ روزگار تھے۔ انھوں نے اپنے تیروں کے سوفار پر اپنا نام لکھ دیا تھا اور تیروں کو زہر میں بجھا لیا تھا، چنانچہ ظہر کے بعد انھوں نے تیر لگانا شروع کیے۔ وہ کہتے جاتے تھے کہ "میں جملی ہوں اور علیؑ کے دین پر ہوں" اور افواجِ مخالف کے بارہ آدمیوں کو اس طرح قتل کیا اور بہت سوں کو زخمی، یہاں تک کہ دشمنوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر مارنا شروع کیا جس سے دونوں بازو ان کے شکستہ ہو گئے اور وہ گرفتار کر لیے گئے۔ شمر سپاہیوں کی ایک جمعیت کے ساتھ ان کو پکڑ کر عمر سعد کے پاس لے گیا۔ اس حالت میں کہ ان کی ڈاڑھی سے خون ٹپک رہا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس نے کہا "نافع یہ تم نے اپنے نفس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" نافع نے کہا "میرے ضمیر سے خدا واقف ہے۔ خدا کی قسم میں نے بارہ آدمی تم میں سے جان سے مارے ہیں اور زخمیوں کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ میں نے اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور اگر میرے بازو ٹوٹ نہ جاتے تو تم مجھے اس طرح ہرگز گرفتار نہ کر سکتے"۔ شمر نے کہا کہ "اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے"۔ عمر سعد نے جواب دیا کہ "تم گرفتار کر کے لائے ہو، تم کو اختیار ہے"۔ شمر تلوار کھینچ کر بڑھا تو نافع نے کہا "اگر تو مسلمان ہوتا تو کبھی ہم لوگوں کے خون میں ہاتھ نہ بھرتا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۴-۲۳۵۔

ہم لوگوں کی موت بدترین خلائق افراد کے ہاتھوں قرار دی۔" شمر نے تلوار لگائی۔ نافع شہید ہوئے۔ پست حوصلہ اور کمینہ فطرت شمر اس زخمی اور مجبور مجاہد کو قتل کرکے فتحمندی کا احساس کرنے لگا اور رجز کے اشعار زبان پر جاری کرکے حسینؑ کے باقی ماندہ اصحاب پر حملہ آور ہوا۔[1]

۷۲۔ شوذب بن عبداللہ:

ہمدان کی ایک شاخ قبیلۂ شاکر کے غلام زادوں سے اور عابس بن ابی شبیب شاکری سے وابستہ تھے۔ شیعانِ کوفہ میں اپنے اوصاف کی بنا پر نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور ایک طرف تو میدانِ جنگ کے شہسوار تھے دوسری طرف احادیث کے حافظ اور حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ سے استفادہ کیے ہوئے تھے۔ اور کوفہ میں اس باب میں مرجعیت رکھتے تھے، لوگ ان سے احادیث حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔

جب عابس، مسلم بن عقیل کا خط لے کر کوفہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے تھے تو شوذب بھی ان کے ساتھ تھے اور امام حسینؑ کے ہمراہ مکہ معظمہ سے پھر عراق آئے اور کربلا پہنچے تھے۔

روزِ عاشور عابس نے اپنے باوفا غلام سے کہا، "کیوں شوذب! تمہارا کیا ارادہ ہے؟" شوذب نے کہا، "ارادہ کیا ہے؛ یہی کہ آپ کے ساتھ رہ کر فرزندِ رسولؐ کی نصرت میں جنگ کروں اور قتل ہو جاؤں۔" عابس نے کہا، "شاباش، مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اچھا تو پھر آگے بڑھو اور امام پر جان نثار کرو تاکہ امام تمہاری مصیبت بھی اسی طرح دیکھ لیں جیسے اپنے دوسرے اصحاب کی دیکھی اور میں بھی تمہارے غم کو برداشت کرکے ثواب کا مستحق بنوں۔ یقیناً اگر اس وقت کوئی ایسا شخص میرے ساتھ ہوتا جس پر مجھے اس سے زیادہ اختیار حاصل ہوتا جتنا مجھے تم پر حاصل ہے تو میری خوشی یہ ہوتی کہ وہ میرے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۳۔

سامنے جائے تاکہ میں اس کے غم کو برداشت کروں، کیونکہ آج وہ دن ہے جس میں انسان سے جتنا ہو سکے اتنا اجر ثواب حاصل کرلے۔ اس لیے کہ آج کے دن کے بعد ہمارے عمل کا دفتر بند ہو جائے گا اور حساب کے سوا کچھ رہ نہیں جائے گا۔"[1]

یہ وہ الفاظ ہیں جنھیں اطمینانی حالت میں شاعری کے طور پر ہر شخص کہہ سکتا ہے لیکن عین مصیبت کے موقع پر واقعی طور پر ان کا اس طرح کہنا کہ عمل سے ان کی تصدیق ہوتی ہو بہت مشکل ہے۔ الفاظ سے صاف ظاہر تھا کہ راہِ حق میں مصائب اٹھانے کا ایک شوق ہے اور تکالیف کے برداشت کرنے کا ولولہ جو خود اختیاری طور پر عملی اقدامات کا محرک ہے۔

بہرطور شوذب آگے بڑھے۔ امام حسینؓ کو سلام کرکے رخصت ہوئے اور جنگ کرکے شہید ہوئے۔[2]

۴۷۔ عابس بن ابی شبیب شاکری:

نام و نسب: عابس بن ابی شبیب بن شاکر بن ربیعہ بن مالک بن صعب بن معویۃ بن کثیر بن مالک بن جشم بن حاشد الہمدانی شاکری۔ بنو شاکر قبیلۂ ہمدان کی ایک شاخ تھے اور ان ہی کی نسبت حضرت علیؓ ابن ابی طالبؓ نے جنگِ صفین کے موقع پر فرمایا تھا کہ اگر ان کی تعداد ایک ہزار ہو جائے تو خدا کی عبادت اس طرح ہونے لگے جس طرح کہ ہونا چاہیے۔

یہ لوگ بڑے شجاع اور جنگ آزما تھے اور "فتیان الصباح" کے لقب سے مشہور تھے جس کے معنی ہیں "وقتِ صبح کے جواں مرد" چونکہ غارت گری اور جنگ کا مقابلہ زیادہ تر اوقاتِ صبح میں ہوتا تھا اس لیے اس وقت کی طرف نسبت دی گئی۔

ہمدان کی ایک دوسری شاخ بنو وادعہ کے پاس ان لوگوں نے جاکر قیام کیا تو یہ بھی اُن

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۴ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۴

طرف منسوب ہونے لگے اور اسی لیے عابس شاکری بھی کہا جاتا تھا اور دادعی بھی۔

عابس شیعانِ کوفہ میں سے رئیسِ قوم، بہادر، مقرر، عبادت گزار اور شب زندہ دار تھے۔ متعدد لڑائیوں میں کارِ نمایاں انجام دے چکے تھے اور دلوں پر ان کی شجاعت کا سکہ قائم تھا۔

جب مسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہوئے تھے اور آپ نے پہلا جلسہ منعقد کر کے امام حسینؑ کا خط سنایا تھا تو اس وقت سب سے پہلے عابس ہی کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ "میں دوسروں کا ذمہ دار نہیں مگر جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے طے کر لیا ہے کہ آخری دم تک آپ لوگوں کا ساتھ دوں گا۔"

ان کی تقریر اتنی جامع اور پُر مغز تھی کہ حبیب بن مظاہر نے ان کی تعریف کی تھی اور ان ہی کی تائید میں اپنی نصرت و وفاداری کا عہد کیا تھا۔

جب کوفہ کے اٹھارہ ہزار آدمیوں نے مسلم کی بیعت کر لی اور آپ نے اس صورتِ حال سے مطمئن ہو کر امام حسینؑ کو اطلاع دینا چاہی تو آپ نے وہ خط عابس ہی کے ہاتھ مکہ بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ اس خط کو لے کر امام حسینؑ کے پاس پہنچے اور پھر آپ سے جدا نہیں ہوئے۔

ان کا غلام شوذب ان کے ساتھ تھا چنانچہ انھوں نے اپنے غلام کو اپنی طرف سے حسینؑ پر نثار کیا۔

جب شوذب درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تو عابس نے امام کی خدمت میں عرض کیا "بخدا روئے زمین پر کوئی ایسا نہیں جو مجھے آپ سے زیادہ عزیز و محبوب ہو۔ اگر مجھے قدرت ہوتی کہ میں اپنی جان سے زیادہ کوئی عزیز شے آپ کی خدمت میں پیش کروں تو ایسا ہی کرتا۔ مگر اب تو بس میری جان باقی ہے، بس اب اجازت دیجیے۔ میں آخری سلام عرض کرتے ہوئے خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ میں آپ کے اور آپ کے پدر بزرگوار کے دین پر قائم ہوں۔"

ان الفاظ کو کہہ کر امام سے رخصت ہوئے اور تلوار کھینچے ہوئے صفوفِ مخالف کے

سامنے پہنچے۔ ان کی پیشانی پر اس وقت ایک زخم موجود تھا جو شاید پہلے کسی حملہ میں آگیا تھا۔ فوج کوفہ کا ایک شخص زبیع بن تمیم جو واقعۂ کربلا میں موجود تھا بیان کرتا ہے کہ میں نے عابس کو آتے دیکھا تو پہچان لیا۔ اس لیے کہ میں انھیں اس کے پہلے لڑائیوں میں دیکھ چکا تھا اور ان کی شجاعت سے واقف تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا "ایتہا الناس! یہ شیروں کا شیر ہے۔ یہ ابن ابی شبیب ہے، دیکھو کوئی ایک شخص تم میں سے اس کے مقابلہ کو باہر نہ نکلے"۔ عابس نے آواز دینا شروع کی۔ کیا کوئی مرد میدان نہیں جو ایک مرد میدان کے مقابلہ کو نکلے؟ مگر فوج یزید میں سے کوئی شخص بھی باہر نہ نکلا۔ عمر سعد نے کہا اس بہادر کو پتھروں سے مار لو۔ چنانچہ ہر طرف سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ یہ عجیب طریقۂ جنگ دیکھ کر عابس نے زرہ اور خود بکتر اتار کر پھینک دیا اور تلوار سونت کر صفوف مخالف پر ٹوٹ پڑے۔ جس صف کی طرف رخ کرتے تھے سینکڑوں آدمی ان کے سامنے سے بھاگتے نظر آتے تھے۔ تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد فوج کے ایک بڑے حصہ نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر قتل کر دیا۔ پھر اُن کا سر قلم کیا گیا اور بہت سے آدمیوں نے آپس میں جھگڑنا شروع کیا۔ ہر ایک کہتا تھا کہ اس شخص کو میں نے قتل کیا ہے۔ بالآخر عمر سعد نے اس کا یہ کہہ کر فیصلہ کیا کہ جھگڑا نہ کرو۔ اس شخص کا قاتل کوئی ایک نہیں ہو سکتا۔ تم سب اس کے قاتل ہو۔ اس طرح یہ نزاع برطرف ہوئی۔

۷۴ و ۷۵۔ عبداللہ و عبدالرحمٰن فرزندان عروہ[2] بن حراق غفاری:

ابوذر غفاری کے قبیلہ سے حراق غفاری، اصحاب حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ میں سے تھے۔ اور آپ کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان کے معرکوں میں شریک رہے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے عبداللہ اور عبدالرحمٰن اشراف و شجاعان کوفہ میں سے شیعان علیؑ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ دونوں بھائی امام حسینؑ کے پاس میدان کربلا میں پہنچے اور آپ کے انصار

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۳۔ [2] بعض کتابوں میں عزرہ ہے (طبری ج ۶ ص ۲۵۴)

میں شامل ہوئے تھے۔

ظہر کے بعد وقت سخت سے سخت ہوتا جا رہا تھا۔ اصحاب حسینؑ میں سے ہر ایک کی اب یہ کوشش تھی کہ میں اپنی جان پہلے نثار کروں۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں نے امام کی خدمت میں عرض کیا "یا ابا عبداللہ! ہمارا سلام قبول کیجیے۔ دشمن اب آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور ہمارا بس نہیں چلتا۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ خود آپ کے سامنے قتل ہو جائیں اور آپ کی نصرت کا حق ادا کریں۔" امام نے فرمایا "اللہ تمھیں جزائے خیر عطا کرے۔ آؤ میرے قریب آؤ۔" یہ دونوں امام کے قریب ہی اس فوج سے جو بڑھ آئی تھی برسرپیکار ہو گئے۔ وہ یہ رجز پڑھ رہے تھے کہ:-

"تمام بنی غفار اور خندف و بنی نزار کے قبائل اس بات سے واقف ہیں کہ ہم فاسق و فاجر گروہ پر حملے کریں گے۔ باڑھ دار برّان شمشیروں کے ساتھ۔ اے میرے رفیقو! آلِ رسولؐ کی حفاظت میں شمشیر و نیزہ کے ساتھ جنگ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھو۔" آخر دونوں جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔[1]

۷۶۔ حنظلہ بن اسعد شبامی:

نام و نسب: حنظلہ بن اسعد بن شبام بن عبداللہ بن اسعد بن حاشد بن ہمدان الہمدانی الشبامی۔

شیعانِ کوفہ میں سے نام آور اور خوش تقریر، بہادر اور حافظِ قرآن تھے۔ امام حسینؑ کے پاس آپ کے میدانِ کربلا میں وارد ہونے کے بعد پہنچے تھے اور امام نے گفتگوئے صلح کے دوران میں اکثر ان کو عمر سعد کے پاس بسلسلۂ نامہ و پیام بھیجا تھا۔

روزِ عاشور ظہر کے بعد جب حسینی مجاہدوں میں سے بہت سے شہید ہو چکے تو وہ امام

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۲۔

کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور فوج کوفہ کو مخاطب کرکے بآوازِ بلند کہنے لگے :۔

"اے میری قوم کے لوگو! مجھے تمہارے متعلق اندیشہ ہے اس روزِ بد کا جو بہت سی قوموں کو نصیب ہوا، جیسے قومِ نوح اور عاد اور ثمود وغیرہ۔ اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا بلکہ ان کی بداعمالیوں ہی کا بدلہ دیتا ہے۔ اے میری قوم! میں تمہارے لیے اندیشہ رکھتا ہوں قیامت کے دن سے جبکہ تم اس دنیا سے پشت پھراؤ گے اور کوئی تمہارا بچانے والا خدا کے عذاب سے نہ ہوگا اور جس کی ہدایت سے خدا ہاتھ اٹھالے پھر اس کی ہدایت کون کرسکتا ہے۔ اے میری قوم! حسینؑ کو قتل نہ کرو، نہیں تو خدا تم پر عذاب نازل کرے گا اور جھوٹ کہنے والوں کا انجام ناکامی ہے[1]۔"

دشمن پر ایسی تقریروں سے اثر ہی کب ہوتا تھا۔ امام نے پکار کر فرمایا "اے ابن اسعد! خدا اپنی رحمت تمہارے شامل حال کرے۔ یہ لوگ عذاب کے مستحق تو اسی وقت ہوگئے جب انھوں نے حق بات کو قبول نہ کیا اور تم لوگوں کے خلاف فوج کشی کی۔ چہ جائیکہ اب! اب تو یہ تمہارے بہت سے نیک ساتھیوں کو قتل بھی کرچکے ہیں۔"

حنظلہ نے کہا "حضور سچ فرماتے ہیں۔ حضور سے بڑھ کر ان باتوں کو کون سمجھ سکتا ہے، اچھا تو اجازت دیجیے کہ ہم بھی جائیں خدا کی طرف اور اپنے ساتھیوں سے ملحق ہوں۔ امام نے فرمایا۔ جاؤ دنیا و آخرت کی نیکی اور ایسی سلطنت کی طرف جس کو زوال نہیں ہے۔" حنظلہ نے رخصتی سلام کیا۔ میدانِ جنگ میں گئے، لڑے اور شہید ہوگئے[2]۔

۷۷-۸۷۔ سیف بن حارث بن سریع و مالک بن عبد بن سریع بن جابر ہمدانی

دونوں چچا زاد بھائی اور ایک ماں کی اولاد تھے[3]۔ ان دنوں میں کہ جب صلح کی گفتگو ہورہی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۴۔ ارشاد ص ۲۵۲۔ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۴۔ ارشاد ص ۲۵۲۔ [3] طبری ج ۶ ص ۲۵۲

تھی، میدانِ کربلا میں پہنچ کر جماعتِ حسینی سے ملحق ہوئے تھے۔ ان کا غلام شبیب بھی ان کے ساتھ تھا اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوا تھا۔

روزِ عاشور جب بازارِ شہادت گرم تھا تو یہ دونوں جوان امام کے نزدیک کھڑے ہو کر رونے لگے۔ یہ ان کے دل کی بے چینی تھی جس نے الفاظ کو سرشکِ غم کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا اور ان کے منہ سے رنج کی وجہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ ان کی اس حالت کا مشاہدہ کر کے امام نے فرمایا کہ "کیوں! میرے بھائی کے فرزندو! روتے کیوں ہو؟ دیکھو تھوڑی دیر میں تمھارے لیے خوشی ہی خوشی کے سامان مہیا ہوں گے۔" دونوں نے عرض کیا "ہماری جان آپ پر قربان! ہم اپنے لیے تھوڑی روتے ہیں۔ ہمیں تو آپ کی بیکسی پر رونا آ رہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور پورے طور پر ہم سے آپ کی حفاظت کا امکان نہیں رہا ہے"۔ امام نے فرمایا "تمھیں اس صدمہ پر جو میری وجہ سے ہے اور اس ہمدردی پر جو میرے ساتھ ہے خدا بہترین جزا عطا فرمائے۔" [1]

حنظلہ بن اسعد شبامی کی شہادت کے بعد وہ دونوں حسینؑ کی خدمت میں سلامِ آخر بجا لائے اور لڑ کر شہید ہوئے۔ [2]

۷۹۔ جون (غلامِ ابوذر غفاری)

نام و نسب: جون بن حوی بن قتادہ بن اعور بن ساعدۃ بن عوف بن کعب بن حوی ابی ذر الغفاری۔ حبشی نسل سے فضل بن عباس بن عبد المطلب کے مملوک تھے۔ حضرت علیؑ نے ڈیڑھ سو اشرفی کو انھیں خرید فرمایا تھا اور ابوذر غفاری کو ہبہ کر دیا تھا تاکہ ان کی خدمت کریں۔ چنانچہ وہ ابوذر کے ساتھ رہے یہاں تک کہ ربذہ میں بحالتِ جلا وطنی بھی اُن کے ساتھ رہے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۳ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۴

جب ۳۲ھ میں ابوذر کا انتقال ہوا تو جونؓ مدینہ واپس آکر پھر حضرت علیؑ کی خدمت میں رہنے لگے اور آپ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ اور پھر امام حسینؑ کے پاس رہے۔

روزِ عاشور جب جنگ کے شعلے بلند ہو گئے تو جونؓ نے بھی امام حسینؑ سے اجازتِ جہاد طلب کی۔ آپ نے فرمایا "تم ہمارے ساتھ راحت کے لیے تھے۔ اب ہماری وجہ سے کیوں مصیبت میں مبتلا ہوتے ہو؟" یہ سننا تھا کہ جونؓ نے آپ کے قدموں پر گر کر عرض کیا۔ "فرزندِ رسولؐ! یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ راحت کے زمانہ میں تو میں نے آپ کے یہاں کے پیالے چاٹے اور اب سختی کے وقت میں آپ کا ساتھ چھوڑ کر چل دوں۔ خدا کی قسم میرے جسم سے بدبو آتی ہے، میرا حسب و نسب پست اور رنگ سیاہ ہے۔ آپ اپنے طفیل میں مجھے جنت کا مستحق بنا دیجیے کہ میری بُو، خوشبو سے بدل جائے۔ میرا حسب و نسب باوقار ہو جائے اور میرا رنگ سفید ہو جائے۔ بخدا میں آپ سے جدا نہ ہوں گا جب تک کہ یہ سیاہ خون آپ بزرگواروں کے نورانی خون میں مل نہ جائے۔" بہرطور اجازتِ جنگ ملنے پر جونؓ نے میدانِ جنگ میں آکر رجز پڑھنا شروع کیا:۔

"ذرا کفار دیکھیں تو کہ ایک سیاہ غلام شمشیر و نیزہ سے کس طرح جنگ کرتا ہے۔ آلِ رسولؐ کی نصرت و حمایت میں۔" اس کے بعد انھوں نے جہاد کیا اور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

حضرت امام حسینؑ کے دل میں جونؓ کے وہ الفاظ گھر کر چکے تھے، اس لیے آپ جب ان کی لاش پر تشریف لائے تو دعا کی "خداوندا! اس کے چہرہ کو روشن کر دے، اس کی بدبو کو خوشبو سے بدل دے اور اسے صالحین کے ساتھ محشور کر اور اسے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی حقیقی معرفت رکھنے والوں میں محسوب فرما۔"

۸۰۔ غلام ترکی:

حافظِ قرآن، حضرت امام حسینؑ کے غلام تھے جن کو آپ نے اپنے فرزند علیؑ بن الحسینؑ

(زین العابدینؑ) کو پہنچایا تھا۔ انھوں نے امام سے اجازتِ جہاد مانگی تو آپ نے فرمایا کہ خیمہ میں جاکر اپنے آقا سے اجازت حاصل کرو۔ چنانچہ وہ اجازت حاصل کرنے کے بعد تمام اہلِ حرم کی خدمت میں سلام آخر بجا لاکر میدانِ جنگ میں آئے اور یہ رجز پڑھنے لگے۔ سمندر میں میرے نیزہ و شمشیر کی گرمی سے آگ لگ جاتی ہے اور فضا میرے تیروں کی پرواز سے مملو ہو جاتی ہے۔ جب میری تلوار میرے ہاتھ میں چمکتی ہے تو مغرور حاسد کا دل شگافتہ ہو جاتا ہے۔"

جنگ کرکے انھوں نے بہت سے آدمیوں کو قتل کیا۔ بالآخر زخمی ہو کر گر گئے۔ امام حسینؑ ان کی لاش پر سرہانے تشریف لائے اور گلے میں باہیں ڈال دیں اور رخسارہ اپنا ان کے رخسارہ پر رکھ دیا۔ انھوں نے آنکھیں کھولیں اور اس عزت افزائی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

۸۱۔ انس بن حارث اسدی:

نام و نسب: انس بن حارث بن نبلیہ بن کاہل بن عمرو بن صعب بن اسد بن خزیمہ اسدی کاہلی، اصحابِ رسولؐ میں سے حدیث کے راوی تھے۔ وہ پیغمبر خداؐ کی زبانی شہادت حسینؑ کی خبر سنکر نصرت کے ارادہ سے اس دن کے منتظر رہنے لگے۔

واقعۂ کربلا کے موقع پر وہ بہت کبیر السن ہو چکے تھے مگر جذبۂ ایمانی ایسا رکھتے تھے کہ امام حسینؑ کے ساتھ کربلا پہنچے اور روز عاشورا اجازتِ جہاد حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عمامہ سے اپنی کمر چست باندھی اور بھوؤں کو جو آنکھوں پر لٹک آئی تھیں اونچا کرکے رومال سے پیشانی پر باندھا۔ امام نصرتِ دین میں ان کا یہ اہتمام دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے "شکر اللہ لک یا شیخ" یعنی اے بڈھے مجاہد خدا تیرے حسنِ عمل کی قدر کرے۔" بالآخر وہ جنگ کرکے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۸۲۔ حجاج بن مسروق جعفی:

جعف بن سعد العشیرہ کی نسل سے کوفہ کے معزز شیعہ تھے اور حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کی صحبت سے شرفیاب ہوئے تھے۔ جب امام حسینؑ مکہ میں قیام گزیں تھے تو وہ کوفہ سے جاکر آپ کے ہمراہ رکاب ہوئے اور اوقاتِ نماز میں اذان کی خدمت انجام دیتے لگے۔

جب امام مکہ سے عراق کی طرف روانہ ہوئے تو وہ آپ کے ساتھ تھے چنانچہ اس موقع پر جب حرؑ کے لشکر سے ملاقات ہوئی تھی اور نمازِ ظہر کا وقت آیا تھا تو تاریخ میں یہ تصریح موجود ہے کہ حسینؑ نے حجاج بن مسروق کو اذان کا حکم دیا[1] روزِ عاشور انھوں نے بھی اذنِ جہاد حاصل کیا۔ میدان میں جاکر رجز پڑھا۔ جنگ کرکے بہت سے دشمنوں کو قتل کیا اور آخر جامِ شہادت نوش کیا۔

۸۳۔ زیاد بن عریب ہمدانی:

نام ونسب: ابو عامر زیاد بن عمرو بن عریب بن حنظلہ بن دارم بن عبداللہ بن کعب الصائد الہمدانی۔ ان کے باپ کو خدمتِ رسولِ خدا میں حضوری کا شرف حاصل تھا اور خود زیاد بڑے عابد و زاہد، شب زندہ دار اور تہجد گزار تھے اور شجاعت میں بلند پایہ رکھتے تھے روزِ عاشور سخت جنگ کرنے کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۸۴۔ سالم بن عمرو بن عبداللہ مولیٰ بنی المدینۃ الکلبی:

بنو المدینۃ قبیلۂ کلب قضاعہ کی ایک شاخ تھے۔ زید بن حارثہ صحابی اور محمد بن سائب کلبی صاحب تفسیر بھی اسی نسل سے تھے۔

---

[1] ارشاد ص ۲۳۵۔

سالم اسی خاندان کے غلام تھے اور شیعانِ کوفہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مسلم بن عقیل کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے تھے اور آپ کی شہادت کے بعد گرفتار کر لیے گئے تھے مگر کسی طرح موقع پاکر رہا ہو گئے اور اپنی قوم میں مخفی ہو گئے تھے۔ جب امام حسینؑ کے میدانِ کربلا میں وارد ہونے کی خبر سنی تو قبیلۂ کلب کے لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچ کر آپ کے انصار میں داخل ہوئے اور روز عاشور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۸۵۔ سعد بن حارث مولیٰ امیر المومنین:

حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے غلام تھے۔ آپ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ اور پھر امام حسینؑ کی خدمت میں رہے۔ مدینہ سے کربلا تک آپ کے ساتھ آئے تھے اور روزِ عاشور انھوں نے بھی اپنی جان آپ پر نثار کی۔

۸۶۔ عمر بن سندب حضرمی:

شیعان کوفہ میں سے تھے۔ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ جمل اور صفین کے معرکوں میں شریک ہوئے تھے۔ ۵۱ھ میں جب حجر بن عدی کا حکومتِ بنی امیہ سے تصادم ہوا تھا تو وہ حجر کے اعوان میں داخل تھے اور اسی لیے جب حجر کو گرفتار کر کے شام بھیجا گیا تو وہ روپوش ہو گئے تھے اور زیاد بن ابیہ کے ہلاک ہونے کے بعد کوفہ واپس آئے تھے۔ جب مسلم بن عقیل کوفہ میں وارد ہوئے تھے تو وہ ان کے انصار میں شریک ہو گئے تھے اور مسلم کی شہادت کے بعد مخفی طور پر امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچے۔ روز عاشور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۸۷۔ قعنب بن عمرو النمری:

شیعانِ بصرہ میں سے تھے۔ حجاج بن زید سعدی کے ساتھ امام حسینؑ کی خدمت میں

حاضر ہوئے اور روزِ عاشور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۸۸۔ یزید بن ثبیط العبدی:

وہ شیعانِ بصرہ اور ابوالاسود دؤلی شاگرد حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے مصاحبین میں سے تھے۔ جب امام حسینؑ مکّہ سے عراق کی طرف روانہ ہوئے تھے تو ابن زیاد نے اپنے نائب کو جو بصرہ میں تھا خط لکھا تھا کہ "بصرہ کے لوگوں سے ہوشیار رہنا کوئی شخص نصرتِ حسینؑ کے لیے وہاں سے آنے نہ پائے۔" مگر بصرہ میں عبدقیس کے قبیلہ کی ایک خاتون ماریہ بنت منقذ بڑی محبِ اہل بیتؑ تھیں اور ان کا مکان شیعانِ بصرہ کے اجتماع کا مرکز تھا چنانچہ انہی کے مکان پر ایک جلسہ کے دوران میں یزید بن ثبیط نے نصرتِ حسینؑ کے ارادہ کا اظہار کیا تھا اور اپنے دس فرزندوں کو بھی اس کی ترغیب دلائی تھی مگر ان میں سے صرف دو تیار ہوئے تھے۔ عبداللہ بن ثبیط اور عبیداللہ بن ثبیط (جن کا تذکرہ اس کتاب میں پہلے ہو چکا ہے) ان کے بہت سے ساتھیوں نے جو اس مکان میں جمع ہوا کرتے تھے ان کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا مگر انھوں نے ان کے مشوروں کی طرف کوئی اعتنا نہ کی اور چل کھڑے ہوئے۔ کچھ اور لوگ بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور بالآخر عراق کے راستے میں ابطح کی منزل پر امام وارد ہوئے تھے۔ جب یہ لوگ اس مقام پر پہنچ کر امام کے خیمہ کی طرف شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے لیے گئے تو امام خود ان کے آنے کی خبر سن کر ان سے ملنے کے لیے دوسرے راستے سے ان کی جائے قیام پر تشریف لے جا چکے تھے اور جب انھیں نہ پایا تو وہیں انتظار کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ یہ لوگ امام کے ان کے خیمہ میں موجود نہ ہونے سے مایوس ہو کر واپس ہوئے تھے کہ امام کو اپنے ہی یہاں بیٹھا پایا۔ اس وقت کی ان کی خوشی کا اندازہ غیر ممکن تھا۔ انھوں نے آیتِ قرآن پڑھی کہ اللہ کے فضل و رحمت سے مومنین کو خوش ہونا چاہیے۔ اس کے بعد امام کی خدمت میں سلام عرض کیا اور عزمِ نصرت کا اظہار کیا۔ امام

دعائے خیر دی۔

روزِ عاشورہ وہ اپنے فرزندوں کے بعد جنگ کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے[1]

۸۹۔ یزید بن مغفل جعفی:

اصحابِ علیؑ بن ابی طالبؑ میں سے تھے اور آپ کے ساتھ جنگِ صفین میں شریک ہوئے تھے۔ خریت بن راشد ناجی نے جب سرزمین اہواز میں خروج کیا تھا تو حضرت علیؑ نے معقل بن قیس کی سرکردگی میں اس کی سرکوبی کے لیے لشکر روانہ کیا تھا۔ اس لشکر میں یزید بن مغفل میمنۂ فوج کے سردار مقرر ہوئے تھے۔

مرزبانی نے معجم الشعراء میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ تابعین میں محسوب ہیں ان کے باپ صحابہ میں سے تھے۔ انھوں نے روزِ عاشورا امام حسینؑ کی نصرت کی۔ جنگ کے موقع پر وہ رجز پڑھ رہے تھے:۔

"اگر نہ پہچانتے ہو مجھے تو پہچان لو کہ میں مغفل کا فرزند ہوں۔ میدانِ جنگ کا شہسوار اور مکمل اسلحہ رکھنے والا ہوں، میرے ہاتھ میں تیز شمشیر رہتی ہے جس کو غبارِ جنگ کے اندر شہسوار دشمن کے سر پر بلند کرتا ہوں۔" بالآخر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۹۰۔ رافع بن عبداللہ مولیٰ مسلم الازدی:

مسلم بن کثیر اعرج کے غلام تھے۔ اپنے مالک کے ساتھ کربلا آئے تھے اور روزِ عاشور بعد ظہر جنگ کر کے شہید ہوئے۔

۹۱۔ بشر بن عمرو بن الاحدوث الحضرمی الکندی:

اصلی میں حضرموت کے رہنے والے تھے لیکن کوفہ میں محلہ بنی کندہ میں قیام کرنے سے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۸

کندی کیے جانے لگے۔ جب کربلا میں صلح کی گفتگو ہو رہی تھی اس زمانہ میں آکر انصارِ حسینؑ میں شامل ہوئے تھے۔

روزِ عاشور انھیں خبر ملی تھی کہ ان کا فرزند عمرو رے کی سرحد میں قید ہو گیا ہے۔ اس وقت امام حسینؑ نے ان سے کہا تھا کہ تم خاص طور پر میری بیعت سے آزاد ہو، جاؤ اور اپنے بیٹے کی رہائی کا بندوبست کرو۔ مگر ان کے جذبۂ ایمانی نے ان کو اس کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ وہ امام حسینؑ کا ساتھ چھوڑ کر نہ گئے اور اصحابِ حسینؑ کے سلسلہ میں تقریباً بالکل آخر میں شہید ہوئے۔

۹۲۔ سوید بن عمرو بن ابی المطاع الخثعمی:

ضعیف العمر، عابد و زاہد اور بڑے نماز گزار تھے۔ متعدد لڑائیوں میں شریک ہو کر کارہائے نمایاں انجام دے چکے تھے۔

روزِ عاشور شریکِ جنگ تھے اور اصحابِ حسینؑ میں سب سے آخر میں وہی ایک باقی رہ گئے تھے[1] چنانچہ بشر بن عمرو حضرمی کے بعد انھوں نے میدان میں نکل کر جنگ کی اور بالآخر وہ اس درجہ زخمی ہو کر گرے کہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا کہ ان کی روح جسم سے مفارقت کر گئی ہے مگر حقیقتاً ان میں جان باقی تھی۔ چنانچہ جب امام حسینؑ شہید ہو چکے تو انھیں ہوش آیا۔ اور ان کے کان میں آواز گئی کہ حسینؑ قتل ہو گئے۔ بس وہ بیتاب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی تلوار لوگ لے جا چکے تھے۔ ایک چھرا موجود تھا، اس سے انھوں نے اپنے نزدیک کے دشمنوں پر حملہ کیا۔ آخر دشمن ٹوٹ پڑے اور سر اُن کا جسم سے جدا کر لیا۔

اب جبکہ اصحابِ حسینؑ کا (بنی ہاشم کے علاوہ) سلسلہ ختم ہو چکا ہے تو بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کی نوعیت اور حیثیت پر ایک نظر پھر ڈال لی جائے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۶

ان اصحاب کے ان حالات سے جو سلسلہ وار پیش ہوئے ہیں یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ کچھ گمنام اور غیر معروف شخصیتوں کے مالک نہیں تھے بلکہ اعداد و شمار کے ذریعہ یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان میں مندرجہ ذیل اشخاص کو اصحابِ رسولؐ ہونے کا شرف حاصل تھا:۔

(۱) مسلم بن عوسجہ (۲) زاہر بن عمرو اسلمی کندی (۳) شبیب بن عبداللہ مولیٰ ہمدان (۴) عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری خزرجی (۵) عمار بن ابی سلامہ دالانی (۶) مسلم بن کثیر صدفی (۷) حبیب بن مظاہر (۸) انس بن حارث اسدی۔

وفاتِ رسول اللہؐ سے واقعۂ کربلا تک پچاس برس کا زمانہ گزر چکا تھا، اس لیے ان میں سے کسی کی عمر پچپن یا ساٹھ برس سے کم نہیں قرار پاسکتی اور اُن میں سے بعض کی عمر اس سے یقیناً زیادہ تھی۔ جیسے انس بن حارث۔ عبدالرحمٰن بن عبدرب۔ حبیب بن مظاہر۔ مسلم بن عوسجہ۔ ان کے علاوہ سوید بن عمرو خثعمی۔ عام انسانی طبیعت کے تقاضوں کے لحاظ سے ان بوڑھے مجاہدین میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی وقتی جوش یا ولولۂ جنگ کی وجہ سے تیغ آزمائی پر تیار ہوگئے تھے۔

حسب ذیل اصحاب حضرت علیؑ تھے جو اصطلاحاً تابعین میں داخل ہیں اور تابعین کا مرتبہ صحابہ کے بعد سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

(۱) عبداللہ بن عمیر کلبی (۲) مجمع بن عبداللہ مذحجی (۳) جنادہ بن حارث سلمانی (۴) جندب بن حجیر کندی (۵) امیہ بن سعد طائی (۶) جبلہ بن علی شیبانی (۷) حارث بن نبہان (۸) خلاس بن عمرو ازدی (۹) شبیب بن عبداللہ نہشلی (۱۰) قاسط بن زہیر تغلبی (۱۱) کردوس بن زہیر تغلبی۔ (۱۲) مقسط بن زہیر تغلبی (۱۳) نعمان بن عمرو ازدی (۱۴) نعیم بن عجلان انصاری (۱۵) ابوثمامہ صائدی (۱۶) شوذب بن عبداللہ (۱۷) جون غلام ابوذر غفاری (۱۸) حجاج بن مسروق جعفی۔ (۱۹) سعد بن حارث (۲۰) یزید بن مغفل جعفی (۲۱) عمر بن جندب حضرمی۔

ان میں سے اکثر جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں جنگ کر چکے تھے اور بعض

ایسے بھی تھے جو حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ کے زمانۂ خلافت میں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکے تھے اور بعض شاگرد کی حیثیت سے آپ سے علمی استفادہ کر چکے تھے۔

حسب ذیل حفاظِ قرآن تھے:-

(۱) بریر بن خضیر ہمدانی جو سید القراء کے لقب سے ملقب تھے اور کوفہ میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے (۲) عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری (۳) کنانہ بن عتیق تغلبی۔ (۴) نافع بن ہلال جملی (۵) حنظلہ بن اسعد شبامی (۶) غلام ترکی۔

حسب ذیل علماء و راویانِ حدیث تھے:-

(۱) مسلم بن عوسجہ (۲) حبشہ بن قیس نہمی (۳) زاہر بن عمرو اسلمی (۴) سوار بن ابی عمیر نہمی۔ (۵) عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری (۶) حبیب بن مظاہر اسدی (۷) نافع بن ہلال جملی (۸) شوذب بن عبداللہ (۹) انس بن حارث اسدی۔

حسب ذیل شجاعانِ روزگار تھے جن کی لڑائیوں کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے:-

(۱) حُر بن یزید ریاحی (۲) مسلم بن عوسجہ اسدی (۳) حارث بن امراء القیس کندی (۴) عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن کدن ارحبی (۵) سعید بن عبداللہ حنفی (۶) مسعود بن حجاج تیمی (۷) زہیر بن قین بجلی (۸) عابس بن ابی شبیب شاکری (۹) زیاد بن عریب ہمدانی (۱۰) سوید بن عمرو بن ابی المطاع خثعمی۔

اس کے علاوہ عبادت اور زہد و تقویٰ میں تو ان میں سے اکثر افراد جن کے نام مندرجہ بالا مختلف عناوین کے تحت میں درج کیے جا چکے ہیں شہرۂ آفاق تھے بلکہ بعض اپنی مخصوص شجاعت کے ساتھ عبادت و ریاضت کے لیے بھی مشہور تھے جیسے عابس بن ابی شبیب اور زیاد بن عریب جن کے متعلق تاریخ میں صراحت موجود ہے کہ وہ شب زندہ دار تھے اور سعید بن عبداللہ حنفی جن کے اوصاف میں عبادت کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ سب کے سب مایہ ناز افراد تھے جن کی زندگیاں مکمل طور پر معیاری حیثیت رکھتی تھیں۔

اور اسلامی اخلاق کی زندہ تصویریں تھیں۔

امام حسینؑ کو میدانِ کربلا میں ایسے ہی افراد کی ضرورت تھی۔ آپ جانتے تھے کہ ایک قائد کو اپنے ساتھ والوں کی وجہ سے کتنی کشمکش میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ اسی لیے آپ عوام کے مجمع کو اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے سفرِ عراق اور کربلا کے قیام کے دوران میں حتی کہ روزِ عاشور تک برابر ہر ہر موقع پر یہ کوشش جاری رکھی کہ جن اشخاص میں کچھ بھی خامی ہو وہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔

درحقیقت آپ ایک ایسے اہم مقصد کی تکمیل کے لیے جو آپ کے پیش نظر تھا عوام پر بھروسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔

حسینؑ کو جس طرح کا مقابلہ منظور تھا اس کی نوعیت سطحی نظریں کبھی سمجھ ہی نہ سکتی تھیں اس لیے کہ اس کے پہلے جتنی بھی لڑائیاں کبھی لڑی گئیں ان کا مقصد فریق مخالف کو مادی طور پر شکست دینا ہوتا تھا۔ اس مقصد کے حاصل ہونے میں خرابی واقع نہیں ہوتی اگر ایک ہزار آدمیوں میں سے سو بھی ثابت قدم رہیں بشرطیکہ وہ بہادری سے دشمن پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ثابت ہوجائیں۔ مگر امام حسینؑ کو طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا نہیں تھا بلکہ طاقت کا مقابلہ کردار سے، باطل کا مقابلہ حق سے، تشدد کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرنا تھا۔ آپ کو اپنے خون کے چھینٹوں سے ایک ایسی دنیا کو خوابِ غفلت سے جگانا مقصود تھا جس پر بے حسی اور بے ہوشی چھائی ہوئی تھی۔ آپ کردار کے ایسے نمونے پیش کرنا چاہتے تھے جو موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بن سکیں۔ یہ مرحلہ بڑا نازک تھا۔ یہاں ساتھ والوں کے انتخاب کا مسئلہ بڑا اہم تھا۔

امام حسینؑ کو اگر طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا ہوتا تو آپ نے ویسے انتظام کیے ہوتے مگر چونکہ آپ کا مقصد یہ نہ تھا بلکہ آپ یہ چاہتے تھے کہ بہبودِ اسلامی دنیا میں احساس و بیداری پیدا کریں۔ اس کے لیے آپ کے ساتھ ملکِ عرب کے چیدہ اور منتخب عابد، زاہد، متقی اور پارسا افراد ہی ہو سکتے تھے۔ آپ نے اپنے ساتھ ایسے ضعیف لیے جن کی عمروں کا بیشتر حصہ محراب

گزر چکا تھا۔ کیونکہ ایسے ہی افراد کے کمریں کس کر، تلواریں سونت کر میدان میں آنے سے مسلمانوں کی آنکھیں کھل سکتی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتے تھے کہ اسلام پر کیا ایسا وقت آ پڑا ہے کہ ایسے ایسے عابد و زاہد بھی تلواریں کھینچ کر میدان جنگ میں آ گئے ہیں۔

حسینؑ کے ساتھیوں کی شخصیت کا صرف دوسرے مسلمانوں پر نہیں جو غیر جانبدار یا خالی الذہن تھے بلکہ خود افواجِ مخالف پر جو ہوا و ہوس کے پنجوں میں اسیر اور حکومت کی کورانہ اطاعت کے شکنجہ میں گرفتار تھیں زبردست اثر پڑ رہا تھا۔ جس کے مختلف شواہد واقعات کی صورت میں نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔ مثلاً مسلم بن عوسجہ کی شہادت پر جب لشکر مخالف میں خوشیاں ہونے لگی تھیں تو شبث بن ربعی بول اٹھا کہ کیا غضب کی بات ہے کہ مسلم بن عوسجہ کا سا شخص قتل ہوا اور تم لوگ خوشیاں مناؤ۔ میں نے بچشم خود خدمتِ اسلام میں اس شخص کے کارناموں کا مشاہدہ کیا ہے۔ یا جب بریر ہمدانی جنگ کر رہے تھے اور لشکر یزید کی جانب سے ان پر حملہ کرنے کے لیے ایک شخص بڑھا تھا تو اس پر فوج کے دوسرے لوگوں نے منع کیا تھا کہ "ارے یہ تو بریر حافظِ قرآن ہیں جو مسجد میں حفظِ قرآن کرایا کرتے تھے۔" یا جب عابس بن ابی شبیب میدان میں آئے تھے تو صفوفِ مخالف سے یہ آواز بلند ہوئی تھی کہ "یہ شیروں کا شیر ہے۔ یہ عابس بن ابی شبیب ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس قسم کے روایات دوسروں تک صرف مخالفین ہی کی زبانی پہنچ سکتے تھے اور اس لیے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نسبتاً اس قسم کے بہت کم واقعات ہم تک پہنچ سکے ہیں اور اس طرح ان سے اس عام اضطراب اور انتشار کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے جو حسینی مجاہدوں کے مقابلہ میں افواجِ یزید میں پایا جاتا تھا۔

ان اصحاب کی شرکت واقعۂ کربلا کی نوعیت کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت ضروری تھی۔ اگر امام حسینؑ صرف اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ کربلا کی سرزمین پہ آ گئے ہوتے تو یہ کہا اور سمجھا جاتا کہ یہ ایک خاندانی جنگ تھی جیسا کہ عام طور سے بتلایا جاتا ہے۔

کہ امیہ اور بنی ہاشم ایک ہی خاندان کی دو شاخیں تھیں اور ان میں برابر خانہ جنگی رہا کرتی تھی مگر امام حسینؓ کے ساتھ تقریباً ملک عرب کے ہر قبیلہ اور مختلف مقامات کے ممتاز اور سربرآوردہ افراد موجود تھے جن میں نقطۂ مشترک صرف اصول کا احساس اور ایک وجۂ خاص یعنی فریضۂ دینی کا اتحاد ہی ہو سکتا تھا اور بس۔

چنانچہ اس اصول اور مقصد کی اہمیت کو زیادہ نمایاں کر دیا امام حسینؓ کے اس طریقۂ کار نے کہ آپ نے ہر شخص سے یہ اصرار کیا کہ تم میرا ساتھ چھوڑ دو اور مجھے اس مہم کو یکہ و تنہا سر کرنے دو۔ یہ صورت اس لیے اختیار کی گئی کہ عام طور پر عوام صائب الرائے نہیں ہوتے۔ جو بھی رائے ہوتی ہے وہ لیڈروں کی۔ اب اگر امام حسینؓ واقعات کی حقیقی نوعیت سے ہر ہر متنفس کو پورے طور پر آگاہ نہ کرتے تو یہ صرف آپ ہی کا اقدام سمجھا جاتا کیونکہ دوسروں نے صرف آپ کے اثر اور دباؤ سے اس معاملہ میں آپ کا ساتھ دیا ہوتا۔ مگر امام حسینؓ یہ چاہتے تھے کہ ہر دماغ پر وزن ڈال کر اسے خود اس کے فعل کا محرک اور ذمہ دار بنا دیں۔ ایسا نہیں تھا کہ حسینؓ اپنے مقصد کے لیے ان سب کو نذر کر رہے ہوں۔ بلکہ حقیقتاً ان میں سے ہر ایک نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر حسینی مقصد پر خود نثار کیا۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کا محرک انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ہر طرح خود اس کا ضمیر تھا اور درحقیقت یہی ان کے ثبات قدم اور استقلال کا بڑا راز تھا۔

اٹھائیسواں باب

اقربائے امام یعنی بنی ہاشم کی قربانیاں!

اصحاب کی شہادت کے بعد اب حسینؑ کے اعزہ یعنی بنی ہاشم کی باری تھی حقیقت میں اصحاب کی وفاداری کا یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا کہ جب تک ان میں کا ایک بھی باقی رہا انھوں نے بنی ہاشم میں سے کسی ایک فرد کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچنے دیا حالانکہ اس درمیان میں جنگ مغلوبہ بھی ہوئی۔ تیروں کی بارش بھی ہوئی مگر اس سب میں کوئی ایک زخم بھی کسی ایک ہاشمی جوان یا بچہ کو لگنے کا تاریخ میں پتہ نہیں ہے۔

ان سب کی شہادت کے بعد امام حسینؑ کے بیٹے، بھائی، بھتیجے اور بھانجے ایک ایک کرکے جام شہادت نوش کرنے لگے چنانچہ ان کے حالات بھی ترتیب شہادت کے مطابق درج کیے جاتے ہیں

۱۔ علی اکبرؑ:

آپ امام حسینؑ کے فرزند تھے اور سلسلۂ بنی ہاشم کے شہداء میں سب سے پہلے آپ ہی کی ذات تھی۔[1] آپ کی والدہ لیلیٰ بنت ابی مرہ بن عروہ بن مسعود بن معبد الثقفی تھیں اور ان کی ماں میمونہ بنت ابی سفیان بن حرب۔

اس طرح علی اکبر باپ کی طرف سے بنی ہاشم میں داخل اور ماں کی طرف سے قبیلۂ ثقیف سے تعلق رکھتے تھے نیز آپ کی والدہ امیر شام معاویہ بن ابوسفیان کی بھانجی اور یزید کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ اس لحاظ سے آپ کو موافق اور مخالف سب ہی عزت کی نگاہ سے دیکھتے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۶ ۔ الاخبار الطوال ص ۲۵۴

تھے اور آپ کی عظمت کا احساس رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ دربارِ شام میں آپ کا تذکرہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ معاویہ نے اپنے حاضرینِ دربار سے پوچھا تھا کہ تمھارے نزدیک منصبِ خلافت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ درباریوں نے خوشامد میں کہہ دیا تھا کہ "آپ" مگر خود معاویہ نے کہا "نہیں! سب سے زیادہ مستحق خلافت حسینؑ کے فرزند علیؑ ہیں جن کے دادا رسول اللہؐ تھے۔ ان میں بنی ہاشم کی شجاعت، بنی امیہ کی سخاوت اور قبیلۂ ثقیف کی خودداری کی صفتیں یکجائی حیثیت سے موجود ہیں۔"

اس دور کے اموی شعراء آپ کی تعریف و توصیف میں اشعار بھی نظم کیا کرتے تھے چنانچہ ابوعبیدہ اور خلف احمر نے جو دو بڑے ادیب ہیں ان اشعار کو نقل کیا ہے جو علی اکبر کی شان میں اس زمانہ میں کہے گئے تھے۔ ان کا مضمون یہ ہے:۔

"کوئی بھی زمین پر اُن کے مثل آنکھوں سے دکھائی نہیں دیا۔ ان کے ضیافت خانہ میں مہمانوں کے لیے گوشت برابر پکتا رہتا ہے اور جب پک جاتا ہے تو مہمانوں سے عزیز نہیں کیا جاتا۔ جب ان کے مہمان خانہ کی آگ روشن ہوتی ہے تو ان کی عزت اور بزرگی اس آگ میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس آگ کو مصیبت زدہ اور غریب لوگ دیکھیں یا کسی ایسے شخص کی نظر پڑ جائے جو بیکس اور بے بس ہو اور اسے دیکھ کر مہمان خانہ میں چلا آئے۔ آپ کبھی دنیا کو دین پر ترجیح نہیں دیتے اور نہ حق کو باطل کے عوض فروخت کرتے ہیں۔ میرا روئے سخن لیثیؑ کے فرزند کی طرف ہے جو صاحبِ عطا وجود ہیں۔ وہ جو بڑے حسب و نسب والی خاتون کے فرزند ہیں۔"

ممکن ہے کہ اموی سیاست کی بڑی امیدیں آپ کی ذات سے وابستہ ہوں۔ اس کے منصوبے ہوں کہ آپ کی تنہا ئی خصوصیت پر زور دیتے ہوئے آپ کے اوصاف و کمالات کو سراہ کر فطری حیثیت سے آپ کے دل میں یہ احساس جاگزیں کیا جائے کہ آپ بنی ہاشم میں ایک علیحدہ شان اور حیثیت کے مالک ہیں اور اس طرح خاندان بنی ہاشم میں پھوٹ پڑنے کے امکانات پیدا ہو جائیں۔

اگر علی اکبر کی جگہ کوئی کمزور نفس کا انسان ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ سیاست کی ان چالوں کا شکار ہو جاتا مگر آپ کا بلند اور پاکیزہ نفس اس فریب میں آنے والا نہ تھا۔ آپ نے کبھی ان باتوں کی طرف اعتنا بھی نہ کی اور اموی فریب کاریوں کی شکست پر آپ نے میدانِ کربلا میں فرزندِ فاطمہ زہراؑ کی حمایت میں اپنا خون بہا کر کبھی نہ مٹنے والی مہر ثبت کر دی۔ اور آپ کی والدہ گرامی لیلیٰ نے محبتِ آلِ رسولؐ میں ان تمام روح فرسا مصائب و آلام کو جو واقعۂ کربلا کے دوران میں اور اس کے بعد اہل بیتِ نبوت کو متواتر پیش آتے رہے، انتہائی صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کر کے ان کے ساتھ اپنی روحانی یگانگی اور اتحاد کا اتنا مکمل ثبوت فراہم کر دیا کہ آج ان کے متعلق اس حقیقت کا بیان کرنا کہ انھیں خاندان بنی امیہ سے قریب کا تعلق تھا طبیعت پر بار گزرتا ہے۔

علی اکبر صورت و سیرت دونوں میں رسول اللہؐ کا نمونہ تھے اور بہت نمایاں شباہت رکھتے تھے اس لیے امام حسینؑ کو اپنے اس فرزند کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ کربلا پہنچنے سے قبل قصرِ بنی مقاتل میں امام حسینؑ نے خواب میں ایک سوار کو دیکھا تھا جو یہ کہہ رہا تھا کہ یہ لوگ جا رہے ہیں اور موت ان کی طرف بڑھ رہی ہے چنانچہ اسے سن کر علی اکبر نے آپ سے سوال کیا تھا کہ بابا کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ امام نے جواب دیا تھا کہ بے شک ہم حق پر ہیں۔ اس پر علی اکبر نے خوش ہو کر کہا تھا کہ پھر ہمیں موت کی کیا پروا ہے[1]؟ اسی ایک واقعہ سے علی اکبر کے استقلال اور حق کی راہ میں فداکاری کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔

شیخ مفیدؒ کی تصریح کے مطابق علی اکبر کی عمر واقعۂ کربلا میں انیس برس کی تھی اور حسن و جمال میں اپنی آپ مثال تھے[2]۔ وہ اکبر اس لحاظ سے کہے گئے کہ واقعۂ کربلا میں شہید ہونے والے علی اصغر کے لحاظ سے بڑے تھے مگر اپنے باپ کی اولاد میں وہ امام زین العابدینؑ سے سن میں چھوٹے تھے اس لیے اُن کے اعتبار سے اِن کو علی اصغر کہنا درست ہے[3]۔

---

[1] ارشاد ص ۲۳۶ [2] ارشاد ص ۲۵۳ [3] ارشاد ص ۲۶۹۔

حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں اپنا ایک خاص گھوڑا جس کا نام لاحق تھا علی اکبرؑ کی سواری کے لیے دیا تھا۔[1]

آپ صبحِ عاشور ہی سے بے چین ہوں گے کہ میدانِ جہاد میں جاکر ہاشمی شجاعت کے جوہر دکھائیں مگر حسینی تدبّر نے جو نظامِ عمل قائم کر دیا تھا اس میں دراندازی کا کسی کو حق نہ تھا۔ جب سب اصحاب شہید ہو چکے تو سب سے پہلے علی اکبرؑ نے اذنِ جہاد طلب کیا۔[2] امام نے اپنے فرزند کو نرغۂ اعدا میں بھیجنے کے متعلق پس و پیش تو نہیں کیا مگر دل کی بے چینی نے جذبات میں تلاطم ضرور پیدا کر دیا۔ آپ نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا "خداوندا گواہ رہنا ان لوگوں کے ظلم پر کہ اب جا رہا ہے ان کی طرف وہ نوجوان جو صورت و سیرت اور گفتار میں تیرے رسولؐ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ جب ہم تیرے پیغمبرؐ کی زیارت کے مشتاق ہوتے تو اس کا چہرہ دیکھ لیتے تھے۔"

کوئی شک نہیں کہ اس مختصر مناجات کے الفاظ اس بے پایاں اندوہ کی پوری تشریح کر رہے ہیں جو اس وقت امام کے دل پر غالب تھا مگر اسی کے ساتھ وہ اس عزتِ نفس اور بلندی نگاہ کے بھی حامل ہیں جو حسینؑ کی ذات سے مخصوص تھی۔ ان کو زیادہ قلق ہے تو اس بات کا کہ اس وقت میرے جدِ بزرگوار رسول اللہؐ کی تصویر مجھ سے جدا ہو رہی ہے۔

یہی وہ امتیازی شان ہے جس سے حسینؑ حقیقتاً حسینؑ معلوم ہوتے ہیں۔ "جا رہا ہے" کے الفاظ میں اذنِ جہاد لازمی طور پر مضمر ہے۔ چنانچہ اس مناجات کے عنوان ہی سے علی اکبرؑ سمجھ گئے کہ مجھے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت حاصل ہے۔ اب میدان میں آئے اور یہ رجز پڑھنے لگے:-

"میں ہوں علیؑ حسینؑ کا بیٹا اور علیؑ کا پوتا۔ ربِ کعبہ کی قسم سب سے زیادہ ہم کو رسول اللہؐ کی وراثت کا حق پہنچتا ہے۔ خدا کی قسم ہمارے بارے میں فیصلہ زنا زادہ کی اولاد ہرگز نہیں کر سکتی۔"[3]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۲ [2] ارشاد ص ۲۵۳ [3] طبری ج ۶ ص ۲۵۶۔ ارشاد ص ۲۵۵

یہ رجز شہدائے کربلا میں سب سے الگ ایک خاص انداز کا حامل تھا۔ دوسرے شہداء کے رجز میں زیادہ تر شجاعان عرب کے معمول کے مطابق اپنی شجاعت کا اظہار مقصود تھا یا امام سے اپنے عہد وفا کی تجدید لیکن علی اکبرؑ کا رجز ایک تبلیغی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے مختصر الفاظ میں رسول اللہؐ کے ساتھ اپنی قرابتداری اور استحقاقِ وراثت اور اپنے مدِمقابل کی پستی کو دکھاتے ہوئے اسکی اطاعت سے انکار پر زور دیا گیا تھا۔ گویا امام حسینؑ کے مقاصدِ جنگ کا اعلان کیا جا رہا تھا۔

جناب علی اکبر نے کئی حملے کیے[1] اور برابر یہی اشعار پڑھ رہے تھے۔ اس شدید جنگ میں آپ خود بھی بہت زخمی ہو گئے تھے مگر پھر بھی پے در پے حملے کیے جاتے تھے۔ فوجِ مخالف میں کے ایک سپاہی مرّہ بن منقذ بن نعمان عبدی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ اگر اب کی مرتبہ اس جوان نے پھر حملہ کیا اور میری طرف سے گزرا تو میں ضرور اس کے باپ کو اس کے غم میں مبتلا کروں گا۔" ایسا ہی ہوا۔ علی اکبر تلوار ہاتھ میں لیے دشمنوں پر حملہ آور ہو رہے تھے کہ مرّہ نے پشت کی طرف سے نیزہ مارا جو سینہ کے پار ہو گیا۔

علی اکبر گھوڑے سے زمین پر گرے اور دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر کر آپ کے جسم کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

فطری حیثیت سے علی اکبر کی شہادت کا حسینؑ پر بڑا اثر ہوا۔ آپ نے فرمایا "خدا غارت کرے اس جماعت کو جس نے تجھے قتل کیا۔ اے میرے فرزند کتنی جرأتیں بڑھ گئیں ان لوگوں کی خدا اور اس کے رسولؐ کے مقابلہ میں! تیرے بعد دنیا کی زندگی پر خاک ہے۔"[2]

آپ نوجوانانِ بنی ہاشم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ "اٹھاؤ، اپنے بھائی کی لاش۔" سب نوجوان آگے بڑھے اور انھوں نے علی اکبرؑ کی لاش کو لا کر اس خیمہ کے آگے رکھ دیا جو مرکزِ سپاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔[3]

---

[1] اخبار الطوال ص۲۵۴، طبری ج ۶ ص۲۵۶ [2] طبری ج ۶ ص۲۵۶۔ ارشاد ص۲۵۳ [3] طبری ج ۶ ص۲۵۶

۲۔ عبداللہ بن مسلم بن عقیل:

آپ کی والدہ رقیہ بنت علیؑ بن ابی طالبؑ تھیں جو ام حبیب بنت عباد بن ربیعہ بن یحییٰ بن علقمہ تغلبیہ کے بطن سے تھیں جنھیں حضرت علیؑ نے جنگِ یمامہ یا عین التمر کے اسیروں میں سے خرید فرمایا تھا۔ اس اعتبار سے عبداللہ امام حسینؑ کے چچا زاد بھائی کے فرزند بھی تھے اور بھانجے بھی۔

مسلم بن عقیل کی عالمِ غربت میں شہادت بھی ایک تازہ سانحہ کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا اثر امام حسینؑ کے دل پر بہت زیادہ تھا چنانچہ اسی لیے شبِ عاشور آپ نے اپنے اصحاب کو مجتمع کر کے جو تقریر فرمائی تھی اس کے آخر میں اولادِ عقیل سے خاص طور پر یہ خطاب فرمایا تھا کہ "تمھارے لیے مسلم کی شہادت کافی ہے۔ تم چلے جاؤ۔ میں تم کو اجازت دیتا ہوں"۔ مگر ان سب نے متفق ہو کر کہا تھا کہ یہ ممکن نہیں ہم سب بھی آپ پر اپنی جانیں نثار کریں گے"۔[۱]

ان میں سب سے پہلے شہید عبداللہ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بہت کمسن تھے۔ علی اکبرؑ کی شہادت سے خیمہ حسینی میں جو کہرام برپا ہوا تو کمسن بچے گھبرا کر باہر نکل پڑے۔ بے رحم دشمنوں کو موقع مل گیا۔ عمرو بن صبیح صدائی نے عبداللہ بن مسلم بن عقیل کو تیر لگایا[۲] جو آپ کی پیشانی کی طرف آیا۔ آپ نے گھبراہٹ میں ہاتھ اپنا پیشانی پر رکھا تیر نے ہاتھ کو پیشانی کے ساتھ چھید دیا۔ پھر دوسرا تیر آیا جو سینہ پر پڑا اور اس نے کام تمام کر دیا[۳] دوسری روایت یہ ہے کہ ایک ظالم نے نیزہ کا وار کیا اور سینہ پر مارا۔ اس سے آپ نے شہادت پائی[۴]

۳۔ محمد بن مسلم بن عقیل:

عبداللہ کے مختلف البطن بھائی تھے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ آپ کی والدہ ام ولد تھیں۔ عبداللہ کی شہادت کے بعد اولادِ ابی طالبؑ نے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ امام حسینؑ نے آواز دی۔

---

[۱] ارشاد ص ۲۴۴ [۲] الاخبار الطوال ص ۲۵۴ [۳] طبری ج ۶ ص ۲۵۶ [۴] ارشاد ص ۲۵۳۔

"ہاں میرے چچا کے فرزندو! موت کے مرحلہ کو سر کر دو۔" ان میں سے محمد بن مسلم ابو مرہم ازدی اور لقیط بن ایاس جہنی کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

۴۔ جعفر بن عقیل:

عبداللہ بن مسلم کی شہادت کے بعد جعفر بن عقیل نے جنگ کی۔ آپ یہ رجز پڑھ رہے تھے:۔

"میں مکہ کا رہنے والا ہوں۔ طالب کے خاندان کا ہاشم کی نسل اور غالب کے گھرانے سے۔ یقیناً ہم تمام قبائل کے سردار ہیں اور حسینؑ تمام پاکیزہ اشخاص میں سب سے زیادہ پاکیزہ۔"

بالآخر آپ کو عبداللہ بن عزرہ خشعمی نے تیر مار کر شہید کیا۔[1]

۵۔ عبدالرحمٰن بن عقیل:

آپ میدان جنگ میں آئے۔ رجز پڑھا اور جہاد کیا۔[2] آخر عثمان بن خالد جہنی اور بشر بن خوط ہمدانی دونوں نے مل کر آپ کو شہید کر دیا۔[2] دوسرا قول یہ ہے کہ عبداللہ بن عروہ خشعمی نے تیر کا نشانہ بنایا۔[3]

۶۔ محمد بن ابی سعید بن عقیل:

آپ نے میدان کربلا میں جہاد کیا اور لقیط بن یاسر جہنی نے آپ کی پیشانی پر تیر مارا جس سے آپ شہید ہو گئے۔

۷۔ محمد بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب:

آپ امام حسینؑ کے چچا زاد بھائی کے فرزند تھے۔ آپ کی والدہ کا نام خوصاء بنت حفصہ بن ثقیف تھا اور وہ قبیلۂ بنی بکر بن وائل سے تھیں۔ آپ اور آپ کے بھائی عونؑ جو جناب

---

[1] طبری ج ۶ ص ۳۵۶ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۶ [3] الاخبار الطوال ص ۲۵۴

زینب بنتِ علیؑ کے فرزند تھے دونوں اپنے والد بزرگوار عبداللہ بن جعفر کے بھیجے ہوئے آکر عراق کے راستے میں قافلۂ حسینی سے ملحق ہوئے تھے۔ اس وقت جب امام مکہ سے باہر نکل چکے تھے۔

روزِ عاشور عبدالرحمٰن بن عقیل کے بعد آپ میدان میں آئے اور جہاد کیا اور بالآخر عامر بن نہشل تمیمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔[1]

۸۔ عون بن عبداللہ بن جعفر:

آپ زینب بنتِ علیؑ کے بطن سے تھے اور اس طرح امام حسینؑ کے حقیقی بھانجے تھے۔ اپنے بھائی محمد کے بعد آپ میدان کارزار میں آئے۔ اور عبداللہ بن قطبہ طائی کے ہاتھ سے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔[2]

۹۔ قاسم بن الحسنؑ:

آپ امام حسینؑ کے بڑے بھائی حضرت امام حسنؑ کے فرزند تھے۔ ابھی آپ حدِ بلوغ کو نہ پہنچے تھے کہ معرکۂ کربلا درپیش ہوا اور حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ جب میدانِ جنگ میں آئے تو فوجِ دشمن کے ایک سپاہی کا بیان ہے، معلوم ہوا کہ جیسے چاند کا ایک ٹکڑا سامنے نمودار ہو گیا۔ ان کے جسم پر زرہ بھی نہ تھی بلکہ ایک پیراہن پہنے ہوئے تھے۔ پیر میں نعلین ایسے تھے جن میں سے ایک کا تسمہ ٹوٹا ہوا تھا[3] صاف ظاہر ہے کہ انھیں اسلحۂ جنگ سے مسلح نہیں کیا گیا تھا۔ صرف ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے وہ نصرتِ امام کے جوش سے میدان میں آگئے اور حملہ کر دیا۔

عمر بن سعد بن نفیل ازدی کی نظر جو قاسم پر پڑی تو اس نے کہا کہ اس بچہ کو میں قتل کروں گا۔ بعض لوگوں نے روکا بھی مگر وہ نہ مانا اور قاسم کے پاس آکر سر پر تلوار لگائی۔ قاسم منہ کے بل زمین پر گر گئے اور اپنے چچا کو مدد کے لیے پکارا۔ حسینؑ غضب ناک شیر کی طرح جھپٹ کر

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۶۔ ارشاد ص ۲۵۲۔ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۶۔ ارشاد ص ۲۵۳۔ [3] طبری ج ۶ ص ۲۵۶۔ ارشاد ص ۲۵۳۔ ۲۵۴

قریب پہنچے۔ عمر بن سعد بن نفیل جس نے قاسم کو قتل کیا تھا ابھی پاس ہی موجود تھا۔ آپ نے اس پر تلوار کا وار کیا جس سے اس کا ہاتھ کہنی سے کٹ کر گر گیا۔ لشکر مخالف اس کے بچانے کے لیے حسینؑ پر ٹوٹ پڑا مگر اس طرح چاروں طرف سے بے تحاشا گھوڑے دوڑا کر وہ لوگ اسکی کمک کو آئے کہ وہ خود اپنے ہوا خواہوں کے گھوڑوں سے پامال ہو کر ہلاک ہو گیا۔

جب مجمع منتشر ہوا تو حسینؑ قاسم کے سرہانے کھڑے ہو کر حسرت و اندوہ کے ساتھ فرمانے لگے۔ "تیرے چچا پر بہت شاق ہے یہ امر کہ تو اسے پکارے اور وہ تیری خبر نہ لے سکے یا تیری آواز پر آنے کے بعد بھی تجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے۔"

اس کے بعد آپ نے خود قاسم کی لاش اٹھائی۔ اس طرح کہ سینہ سے سینہ ملا ہوا تھا اور پیر زمین پر خط دیتے جاتے تھے اور جہاں علی اکبر اور دوسرے عزیزوں کی لاشیں پہلے سے موجود تھیں قاسم کی لاش کو بھی وہیں لا کر لٹا دیا۔[1]

۱۰۔ ابوبکر بن الحسنؑ:

آپ امام حسنؑ کے فرزند تھے۔ آپ کی والدہ کا نام ام اسحٰق بنت طلحۃ التیمی تھا۔ عبید اللہ بن عقبہ غنوی نے تیر مارا جس سے آپ شہید ہو گئے۔[2]

۱۱۔ محمد بن علیؑ بن ابی طالبؑ:

آپ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے فرزندوں میں محمد بن حنفیہ سے چھوٹے تھے اس لیے محمد الاصغر کہلاتے تھے۔ آپ کی والدہ بقول اسماء بنت عمیس خثعمیہ اور بقول ام ولد[3] اور تیسرے قول کے مطابق لیلیٰ بنت مسعود دارمیہ تھیں۔[4]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۶۔ ارشاد ص ۲۵۴ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۶۔ ارشاد ص ۲۵۴
[3] طبری ج ۶ ص ۸۹ [4] ارشاد ص ۱۸۹۔

محمد اپنے والد بزرگوار کے بعد اپنے بھائی امام حسنؑ اور پھر امام حسینؑ کے ساتھ رہے اور روزِ عاشور میدانِ جہاد میں بہت سے دشمنوں کو قتل کیا۔ آخر قبیلۂ بنی ابان بن دارم کے ایک شخص نے آپ کو تیر مارا جس سے آپ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور وہ آپ کا سر جدا کر کے عمر سعد کے پاس لے گیا۔[1]

۱۲۔ عبداللہ بن علیؑ:

آپ کی والدہ امّ البنین فاطمہ بنت ابوالعجل حزام بن خالد بن ربیعۃ بن عامر الوحید بن کعب بن عامر بن کلاب تھیں۔[2] حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ نے اپنے بھائی عقیل سے جو انسابِ عرب سے خوب واقف تھے یہ فرمائش کی تھی کہ ایسے خاندان کی لڑکی تجویز کیجیے جو بڑے بہادرانِ عرب کی نسل سے ہو تاکہ اس سے جو اولاد ہو وہ بھی بڑی بہادر اور جنگ آزما ہو۔ عقیل نے کہا تھا کہ امّ البنین الکلابیہ سے عقد کیجیے جن کے باپ دادا بڑے شجاع و بہادر ہیں۔ چنانچہ آپ نے امّ البنین سے عقد کر لیا تھا۔

ان کے سلسلۂ اجداد میں ملاعب الاسنہ ابوبراء اور طفیل فارس قرزل اور عامر بن طفیل ملکِ عرب میں بہت مشہور سورما گزر چکے تھے۔

لبید بن ربیعہ شاعر جو معلقات میں سے ایک قصیدہ کا مصنف تھا وہ بھی اسی خاندان سے تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے خاندانی خصوصیات پر نعمان بن منذر بادشاہ حیرہ کے بھرے ہوئے دربار میں ان الفاظ میں فخر کیا تھا:۔

نحن بنو امّ البنین الاربعہ ونحن خیر عامر بن صعصعہ

الضاربون الھام وسط المجمعہ

اس آواز کو تمام قبائلِ عرب کے نمائندوں نے خاموشی کے ساتھ سنا تھا۔ ان اشعار سے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۷ [2] طبری ج ۶ ص ۳۹۰ و ۳۳۶

ظاہر ہوتا ہے کہ ام البنین اس سلسلہ میں پہلے بھی کوئی مشہور خاتون گزر چکی تھیں اور ان کے بھی چار بیٹے تھے جو بڑی شہرت کے مالک تھے۔"

ام البنین کے بطن سے حضرت علیؑ کے چار فرزند تھے۔

(۱) ابوالفضل العباس جو اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے (۲) عبداللہؑ جن کے حالات یہاں درج کیے جا رہے ہیں (۳) عثمان (۴) جعفر جو سب سے چھوٹے تھے۔

عبداللہ بن ابی المحل بن خرام بن خالد بن ربیعۃ بن عامر الوحید، ام البنین کا بھتیجا تھا اور کوفہ کے بڑے عمائد میں شمار ہوتا تھا۔ اتفاق سے اس وقت جب شمر، عبیداللہ بن زیاد کا خط لے کر کربلا کی جانب روانہ ہو رہا تھا وہ بھی دربار ابن زیاد میں موجود تھا۔ اس نے ابن زیاد سے کہا کہ "ہمارے خاندان کی ایک لڑکی کے فرزند حسینؑ کے ساتھ ہیں۔ آپ ان کے لیے امان نامہ لکھ دیجیے" جسے عبداللہ بن ابی المحل نے اپنے ایک غلام کرنان نامی کے ہاتھ کربلا روانہ کر دیا۔ وہ اس کو لے کر ان مجاہدوں کے پاس پہنچا اور کہا کہ آپ کے ماموں زاد بھائی نے ابن زیاد سے حاصل کر کے بھیجا ہے۔ ان چاروں نے یکزبان ہو کر کہا کہ ہمارے بھائی کو ہماری طرف سے سلام کہہ دینا اور کہنا کہ ہم کو ابن زیاد کے امان نامہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کی امان ہمارے لیے بہت کافی ہے[1] خود شمر بن ذی الجوشن بھی اسی خاندان یعنی آل وحید کلابی نسل عامر بن صعصوعہ سے تھا[2] چنانچہ کربلا پہنچ کر ابن زیاد کا خط عمر سعد تک پہنچانے کے بعد سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہی تھا کہ جماعت حسینی کے سامنے کھڑے ہو کر آواز دی کہ "کہاں ہیں ہماری بہن کے بیٹے"۔ یہ سنکر عباس اور آپ کے تینوں بھائیوں نے سامنے آکر پوچھا کہ ہم سے کیا کہنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا "تم لوگ امان میں ہو" مجاہدوں نے یکزبان ہو کر جواب دیا کہ "خدا لعنت کرے تجھ پر اور تیری امان پر، ہمارے لیے امان ہے اور فرزند رسولؐ کے لیے امان نہیں ہے"[3]

چونکہ روز عاشور انصار و اقربائے حسینؑ میں سے ہر فرد یہ چاہتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۶ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۴۔ [3] طبری ج ۶ ص ۲۴۲۔ ارشاد ص ۲۴۲۔

اپنے سے وابستگی رکھنے والی ہر عزیز ہستی کو خود اپنی زندگی میں راہِ حق میں نثار کیا جائے، اسی بناء پر جناب عباس نے بھی ایک ایک کرکے اپنے بھائیوں کو خود سے پہلے میدان میں بھیجا اور فرمایا کہ "بڑھو اپنے آقا پر نثار ہو[1] تاکہ تم کو قتل ہوتے ہوئے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں اور اس کو اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھوں کیونکہ تمہارے تو کوئی اولاد ہے نہیں[2]" مطلب یہ تھا کہ اگر تمہارے اولاد ہوتی اور قابلِ جنگ ہوتی تو تم اس کا انتظار کرتے کہ پہلے اس کو اپنے سامنے قتل ہونے بھیج دیں تو خود جائیں۔ چنانچہ عبداللہ جو آپ کے بعد ان بھائیوں میں سب سے بڑے تھے میدان میں گئے اور شدید جنگ کے بعد ہانی بن ثبیت حضرمی کی تلوار سے شہید ہوئے[3]

۱۳۔ عثمان بن علیؑ:

آپ ابوالفضل العباس کے دوسرے بھائی تھے۔ جب آپ کی ولادت ہوئی تو علیؑ بن ابیطالبؑ نے آپ کا نام عثمان رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں اپنے دوست عثمان بن مظعون کے نام پر اس مولود کا نام رکھ رہا ہوں۔ یہ عثمان بن مظعون بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔ رسول اللہؐ کے سامنے ان کا انتقال ہوا تھا اور آپ نے ان کو جنۃ البقیع میں دفن کیا تھا۔

جناب عباس نے عبداللہ کے بعد عثمان کو میدانِ جنگ میں بھیجا چنانچہ آپ نے جہاد کیا اور بالآخر آپ خولی بن یزید اصبحی کے تیر سے زمین پر گرے اور بنی ابان بن دارم کے ایک شخص نے آپ کا سر جسم سے جدا کیا[4]

۱۴۔ جعفر بن علیؑ:

آپ ام البنین کی اولاد میں سے سب سے چھوٹے تھے۔ عثمان کی شہادت کے بعد

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۵ [2] ارشاد ص ۲۵۵

[3] طبری ج ۶ ص ۲۵۷۔ ارشاد ص ۲۵۵ ۔ دینوری نے ہانی بن ثویب حضرمی لکھا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۵۵)

[4] طبری ج ۶ ص ۲۵۷۔ ارشاد ص ۲۵۵

جناب عباسؑ آپ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا، جاؤ! جیسے تمہارے دونوں بھائیوں کا صدمہ میں نے برداشت کیا ویسے تمہارا بھی برداشت کروں کیونکہ تم میں سے کسی کے بھی اولاد نہیں ہے۔" چنانچہ جعفر نے بھی جہاد کیا اور بالآخر ہانی بن ثبیت حضرمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے[1]

ایک روایت کے مطابق عبداللہ کے بعد جعفر اور جعفر کے بعد عثمان شہید ہوئے[2]

۱۵۔ ابوالفضل العباس بن علیؑ:

آپ کی ماں امّ البنین کے خاندانی خصوصیات کا تذکرہ اس کے پہلے آپ کے بھائی عبداللہ کے حالات میں ہو چکا ہے۔

۲۶ھ میں آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ چودہ برس آپ نے اپنے والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ ۴۰ھ میں حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد سے دس برس آپ اپنے بھائی امام حسنؑ کے زیر تربیت رہے اور ۵۰ھ میں امام حسنؑ کے زہر دغا سے شہید ہونے کے بعد سے عاشور محرم ۶۱ھ تک کا زمانہ آپ نے اپنے بھائی امام حسینؑ کی رفاقت میں بسر کیا۔ واقعۂ کربلا میں آپ کی عمر ۳۴ برس کی تھی۔

آپ حسن و جمال اور قوت و شجاعت میں اپنے زمانہ میں بہت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور عام طور پر "قمر بنی ہاشم" ہی کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ ایسے قدآور تھے کہ اسپ دوڑکا بہ پر سوار ہونے کے باوجود آپ کے پاؤں زمین پر خط دیتے جاتے تھے۔

یہ تو آپ کی ظاہری شان تھی اور باطنی اوصاف کے متعلق امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ "ہمارے چچا عباس بن علیؑ بڑے دیندار اور کامل الایمان تھے۔ آپ نے حسینؑ بن علیؑ کا ساتھ دیتے ہوئے معرکۂ کربلا میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور آخر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔"

نہر پر فوج مخالف کے قبضہ کے بعد جب اطفال حسینؑ پر پیاس کا غلبہ ہوا تو ابوالفضل العباس

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۷۔ ارشاد ص ۲۵۵ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۵

نہر سے پانی لانے پر مامور ہوئے۔ امام حسینؑ نے تیس سوار اور بیس پیادے بیس مشکوں کے ساتھ آپ کے ہمراہ کر دیے تھے چنانچہ جب نہر کے قریب پہنچے تو عمرو بن الحجاج جو نہر کا محافظ تھا مع اپنی سپاہ کے سدِ راہ ہوا۔ عباسؑ نے سواروں کی جماعت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور پیادوں سے فرمایا کہ تم تیزی سے اپنی مشکیں پانی سے بھر لو۔ مختصر یہ کہ عباسؑ کی قیادت میں مشکیں پانی سے بھر کر خیامِ حسینی میں پہنچا دی گئیں[1] اسی واقعہ کی بنا پر آپ کو "سقا" کا لقب حاصل ہوا۔

ابن زیاد کا تحریری امان نامہ ٹھکرا دینا آپ کی وفا شعاری کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ اس واقعہ میں اگرچہ تمام بھائی مشترک حیثیت رکھتے تھے مگر بہرحال آپ کے چھوٹے بھائی سب آپ کے مطیع تھے۔ اس لیے یہ سمجھنا بالکل درست ہے کہ دیگر بھائیوں کی وفاداری میں جناب عباسؑ کی انتہائی پختگی اور جان نثاری بہت بڑی حد تک اثر انداز تھی۔

جب محرم کی نویں تاریخ سہ پہر کے وقت عمر سعد نے اپنی فوج کے ساتھ انصارِ حسینؑ پر دفعتہً حملہ کر دیا تھا تو عباسؑ کو امام نے اس اچانک حملہ کا سبب دریافت کرنے پر مامور فرمایا۔[2]

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ عباسؑ کی سنجیدگی، معاملہ فہمی، وفاداری اور شجاعت پر امام حسینؑ کو کتنا اعتماد تھا۔

چنانچہ عباسؑ نے انتہائی صبر و سکون کے ساتھ اس نازک مرحلہ کو سر کیا اور ایک شب کے لیے جنگ ملتوی کرا لی۔

شبِ عاشور جب امام نے اپنے تمام اصحاب کو جمع کر کے فرمایا تھا کہ میں اپنی بیعت سے تم سب کو آزاد کرتا ہوں جس کا جدھر دل چاہے چلا جائے بلکہ تم میں کا ایک ایک میرے ایک ایک عزیز کو بھی اپنے ساتھ لیتا جائے تو عباسؑ بیتاب ہو گئے تھے اور سب سے پہلے آپ نے اس طرح اظہارِ خیال فرمایا تھا کہ "ہم ایسا کس لیے کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد زندہ رہیں؟

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۳۔ [2] ارشاد ص ۲۴۳

ہرگز نہیں، خدا وہ روز ہم کو نہ دکھائے۔" آپ کے بعد دوسرے اعزّہ نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔[1]

صبح عاشور جب حسینؑ نے اپنی اس مختصر سی جماعت کو بھی لشکر کے عنوان سے ترتیب دیا تو علمداری کا شرف ابوالفضل العباس کو عطا ہوا اور آپ نے اس آن بان کے ساتھ حسینی پرچم کی عزت کو قائم رکھا جو دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے۔

میدانِ جنگ میں عباسؑ و علی اکبرؑ سایہ کی طرح امام حسینؑ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے چنانچہ اس وقت جب آپ نے اتمامِ حجت کی غرض سے ناقہ پر سوار ہو کر صفوفِ مخالف کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر فرمائی اور آپ کی آواز خیام اہلِ حرم تک پہنچی اور ان میں سے شور رونے کا بلند ہوا تھا تو آپ نے عباسؑ و علی اکبرؑ کو بھیجا کہ انھیں خاموش کرو۔ رونے کا وقت بعد کو آئے گا۔

عباسؑ بن علیؑ کی شجاعت کا ایک بے نظیر مرقع وہ تھا جب عمر بن خالد صیدادی وغیرہ چار مجاہد ایک ساتھ صفوفِ مخالف پر حملہ آور ہوئے تھے اور لشکر میں گھس کر شمشیر زنی کرتے ہوئے چاروں طرف سے گھر کر انصارِ حسینؑ سے بالکل جدا ہو گئے تھے۔ یہ دیکھ کر حسینؑ نے عباسؑ کو ان کی امداد کے لیے بھیجا تھا چنانچہ آپ نے تن تنہا حملہ کر کے ایسی تلوار چلائی کہ لشکر مخالف پراگندہ ہو گیا اور آپ ان زخمی مجاہدوں کو اپنے مستقر کی طرف واپس لے چلے تھے۔

حضرت ابوالفضل کی شہادت اصحاب و اعزّہ میں سے سب کے آخر میں ہوئی ہے۔ دینوری کا بیان ہے کہ جناب عباسؑ حضرت امام حسینؑ کے سامنے کھڑے ہو کر تن تنہا آپ کی حفاظت میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح کہ جس طرف حضرت مڑتے تھے عباسؑ بھی رخ موڑ دیتے تھے یہاں تک کہ آپ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور اس کے بعد امام بالکل اکیلے رہ گئے۔[2] دوسری روایت ہے کہ جب عباسؑ اپنے تینوں بھائیوں کو امام پر نثار کر چکے اور سوا عباسؑ

---

[1] ارشاد ص ۲۲۴۔ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۵

اور حسینؑ کے کوئی ایسا باقی نہیں رہ گیا جو نصرتِ حسینؑ میں جہاد کرے تو ابوالفضل العباس نے حسینؑ سے اذنِ جہاد طلب کیا۔

امام حسینؑ نے اپنے بھائی کے سراپا پر حسرت و یاس سے نظر کی اور فرمایا "تم تو میرے علمدار ہو۔" آپ نے عرض کیا "اب مجھ کو بالکل تابِ ضبط باقی نہیں اور زندگی میرے لیے بارِ گراں ہو رہی ہے۔" امام نے فرمایا "اچھا جاتے ہو تو پانی کی فکر کرنا۔" عباس نے مشکیزہ لے لیا اور نہر کی طرف روانہ ہوئے۔ فوج دشمن نے مزاحمت کی۔ آپ نے حملہ کیا، صرف اس لیے کہ نہر کا راستا صاف ہو جائے۔

چنانچہ آپ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ نہر پر پہنچ کر مشکیزہ پانی سے بھر لیا اور چونکہ خود بھی آپ بہت پیاسے تھے اس لیے فطری طور پر ایک چلو پانی کا لے کر منہ کے قریب لے گئے، اس طرح کہ جیسے پینا چاہتے ہیں مگر حسینؑ اور اطفالِ حسینؑ کی پیاس یاد آگئی اور آپ نے پانی چلو سے پھینک دیا اور اسی طرح بھرا ہوا مشکیزہ دوش پر سنبھال کر نہر سے نکلے اور خیمہ گاہِ حسینی کی جانب روانہ ہو گئے۔ افواجِ مخالف کو ایک فردِ واحد کے مقابلہ سے گریز کرنے پر غیرت دلائی جا چکی تھی اور ان کو اب یہ کد تھی کہ پانی کسی طرح حسینؑ تک پہنچنے نہ پائے۔ چنانچہ آپ چاروں طرف سے گھیر لیے گئے۔ اس وقت کے آپ کے مشکلات کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ دوش پر مشک واضح طور پر جنگ سے مانع تھی اور پھر ایک ہاتھ سے آپ کو حسینی نشان کا بلند رکھنا بھی مقصود تھا مگر کیا کہنا آپ کی عدیم المثال جرأت و شجاعت کا کہ آپ نے اس عالم میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ حملے کرنا شروع کر دیے اور اس وقت آپ کی زبان پر یہ شعر جاری تھے:۔ "موت کتنے ہی نعرے لگائے میں موت سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ تلوار کے سایہ میں زمین پر گرا دیا جاؤں۔ میرا نام عباس ہے۔ مشک لے جاؤں گا اور ضرور لے جاؤں گا اور ہنگامِ جنگ موت کی کوئی پروا نہیں کروں گا۔"

اس امر کو دشمنوں کی بزدلی کا مکمل اعلان سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے عباس کے ہاتھوں کی

موجودگی اپنے لیے انتہائی خطرناک محسوس کی اور حکیم بن طفیل سنبسی نے آپ کے داہنے ہاتھ پر تلوار لگائی۔ چونکہ عباس کو اپنی جان سے زیادہ علم کا خیال تھا اس لیے آپ نے علم کو گرنے نہیں دیا بلکہ بائیں شانے پر لے لیا اور فرمایا "حالانکہ تم نے میرا داہنا ہاتھ قطع کر دیا ہے مگر یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنے دین کی حمایت نہ کر سکوں گا۔ خدا کی قسم اس فرض کو تو میں ہمیشہ انجام دیتا رہوں گا۔"

اس کے بعد زید بن ورقا رجہنی نے موقع پا کر آپ کے بائیں ہاتھ پر تلوار لگائی اور وہ بھی قطع ہو گیا۔ عباس نے پشتِ فرس پر جھک کر علم کو سینہ سے روکنا چاہا ہی تھا کہ قبیلۂ تمیم کے ایک شخص نے سر پر گرز کا وار کیا جس سے آپ زمین پر گر گئے اور بلند آواز سے پکارے کہ "بھائی میری خبر لیجیے۔"

امام حسینؑ پر اس آواز کا جو اثر نہ ہوتا کم تھا۔ آپ مثل شاہین کے جھپٹ کر بھائی کی لاش پر پہنچے تو دیکھا کہ عباس زخموں سے چور دونوں ہاتھ قطع، پیشانی شکستہ، ایک آنکھ میں تیر پیوست، زمین پر دم توڑ رہے ہیں۔

امام عالم رنج و ملال میں سرہانے بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ عباس کی روح نے جسد سے مفارقت کی۔ اب کوئی ایسا نہیں رہ گیا تھا جسے امام اذنِ جہاد دیتے۔ آپ لاش سے اٹھے اور آگے بڑھے تلوار نیام سے لی اور دائیں اور بائیں دشمنوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ آپ کے سامنے سے بھاگتے تھے تو آپ فرماتے تھے "بھاگتے کہاں ہو، تم نے میرے بھائی کو مار ڈالا، بھاگتے کہاں ہو، تم نے میرے بازو شکستہ کر دیے ہیں۔"

اس کے بعد آپ اپنے مستقر پر واپس پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔

اب دشمنوں کی کثرت تھی اور اکیلے حسینؑ تھے۔ نصرتِ اسلام کا فریضہ تھا اور وہ مستحکم عزم تھا جو اتنے مصائب اور عزیزوں کے داغ اٹھانے کے بعد بھی پہلے ہی کی طرح کوہِ گراں کی صورت اپنی جگہ قائم و برقرار تھا۔

سطحی نظر سے مجاہدین کی یہ ترتیب خلافِ قیاس سمجھی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ عملی رہنمائی کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت امام حسینؑ خود میدانِ جہاد میں قدم رکھتے ہوئے عملی مثال پیش فرماتے۔ پھر آپ کے عزیز یکے بعد دیگرے جاتے اور آخر میں اصحاب کی نوبت آتی۔ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے نہج البلاغہ میں رسول اللہؐ کے طریقۂ جنگ کے متعلق فرمایا ہے کہ آپ خطرہ کے موقعوں پر اپنے اہلبیت اور اعزّہ کو آگے رکھتے تھے اور انھیں اپنے اصحاب کی سپر بناتے تھے۔ مگر میدانِ کربلا میں ترتیب اس کے خلاف رکھی گئی۔ یہاں اصحاب پہلے میدان میں بھیجے گئے اور پھر اعزاء اور آخر میں خود امام حسینؑ تشریف لے گئے۔

مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ کربلا اور دوسرے معرکوں کی نوعیت میں بڑا فرق تھا۔ دوسرے ہر موقع پر یہ یقینی تھا کہ کچھ لوگ قتل ہوں اور کچھ صحیح وسلامت محفوظ رہیں لہٰذا یہ کوشش کی جاتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خطرہ وہی برداشت کریں جو رسول اللہؐ کے قرابت خاندانی تعلقات رکھتے ہوں اور وہ لوگ زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں جو غیروں کی حیثیت رکھتے ہوں۔ مگر معرکۂ کربلا میں عاشور کے دن یہ بالکل یقینی تھا کہ زندہ بچنے والا کوئی نہیں۔ بہرحال جتنے بھی ہیں ان سب کو شہید ہونا ہے۔ جہاں تک خطرہ سے بچانے کی کوشش کا تعلق تھا وہ شب عاشورہ کی جاچکی تھی اور اس وقت حضرت امام حسینؑ نے باصرار تمام فرمایا تھا کہ "مجھے تنہا اس خطرہ کو قبول کرلینے دو۔ تم سب اپنی جانوں کو خطرہ میں مبتلا نہ کرو۔ مگر ہر ایک نے اعزہ واصحاب میں سے انکار کرتے ہوئے اپنی جانیں حسینؑ پر قربان کرنے کے عزم بالجزم کا اعلان کردیا تھا۔ اس کے بعد اب یہ سوال تو باقی ہی نہیں رہا تھا کہ کون قتل ہو اور کون زندہ رہے۔ زندگی کی دلفریبیاں تو بہت پہلے ٹھکرائی جاچکی تھیں۔ اب تو ہر ایک کے سامنے بس موت ہی تھی۔ اب اس صورت میں سوال تھا تو صرف قبل اور بعد کا۔ مگر واقعۂ کربلا کی نوعیت یہ تھی کہ جتنا وقت گزرتا جاتا تھا امتحان سخت تر ہوتا جاتا تھا۔ پانی بند تھا ہی اور روزِ عاشور دن چڑھنے اور تمازتِ آفتاب میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ پیاس کی تکلیف

لحظہ بہ لحظہ بہت بڑھتی جاتی تھی۔ پھر اس حالت میں کثیر التعداد دشمنوں سے پیہم نبرد آزمائی، ساتھیوں کی جدائی اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ جتنی بھی کسی مجاہد کی شہادت میں دیر واقع ہوتی تھی اس کا امتحان شدید تر ہوتا جاتا تھا۔

امام حسینؓ اپنے اصحاب اور اعزہ کی وفاداری پر کتنا ہی اعتماد کیوں نہ رکھتے ہوں مگر آپ ان پر اتنا بار نہیں ڈالنا چاہتے تھے جو اُن کی قوتِ برداشت سے باہر ہوتا۔ آپ کے لیے لازم یہی تھا کہ آپ دوسروں کے صبر و تحمّل اور اپنی قوتِ برداشت کے امتیاز پر نظر رکھتے ہوئے نظامِ جنگ مرتب فرماتے۔

حقیقتاً حسینؓ کے لیے نسبتاً یہ بہت آسان ہوتا کہ سب سے پہلے آپ اپنی جان کا ہدیہ راہِ حق میں پیش کر دیتے۔ اس صورت میں آپ کی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی اور اس کو کسی ایسے شہید کی قربانی سے بڑا درجہ نہ دیا جا سکتا جس نے کبھی بھی حمایتِ حق میں اپنے نفس کی قربانی پیش کی ہو۔

اس صورت میں آپ کی قربانی اس سے زیادہ وقیع نہیں سمجھی جا سکتی جتنی کہ بقول نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی قربانی کہ آپ دینِ حق کی تبلیغ کی وجہ سے سولی پر چڑھا دیے گئے یا سقراط کی قربانی کہ ان کو اصول کی حمایت میں زہر کا جام پینا پڑا۔ اور حسینؓ کے لیے اس منزل سے گزر جانا مشکل ہی کیا ہوتا جب کہ آپ اُس باپ کے بیٹے تھے جس کا قول یہ تھا کہ مجھے اس کی پروا نہیں کہ موت مجھ پر آ پڑتی ہے یا موت پر میں جا پڑتا ہوں۔ نیز یہ کہ موت سے اس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ پستانِ مادر سے مانوس ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آپ اس گھرانے کے بزرگ تھے جس کے بچوں کا یہ قول تھا کہ "موت شہد سے زیادہ شیریں ہے"، بلکہ اس زمانہ میں ملک عرب کے ہر بہادر کا اصولِ زندگی یہ تھا کہ وہ موت کا تلواروں کے سایہ میں آنا اپنے لیے باعثِ مباہات سمجھتا تھا۔

مگر حسینؓ کی شہادت کو جو خاص امتیاز حاصل ہے وہ اسی لیے کہ آپ نے ایسے ہر ہر فرد کو

جو آپ کی ذات سے دور یا قریب کا تعلق رکھتی تھی اپنی موجودگی میں راہِ حق میں نثار کر دیا۔

انصاف سے دیکھا جائے تو تمام ساتھیوں کا ایک ایک کر کے سامنے ہونا، بھتیجوں کا آنکھوں کے سامنے دم توڑنا، جوان بیٹے کا خاک پر ایڑیاں رگڑنا اور جان نثار بھائیوں کا عالمِ جوانی میں موت کی نیند سو جانا یہ وہ مصائب تھے جن میں سے ہر ایک انسانی نفس کے لیے موت سے زیادہ ناقابلِ برداشت قرار پا سکتا ہے۔ حسینؑ کا کمال عمل محض یہی نہیں تھا کہ وقت اور موقع آنے پر آپ نے اپنی جان راہِ خدا میں پیش کر دی بلکہ آپ کے نفس کا کمال یہ تھا کہ آپ نے جان سے عزیز تر ہستیاں رضائے حق کے راستے میں یکے بعد دیگرے قربان کر دیں اور جب تک صبر و تحمل کے ساتھ ان تمام دشوار گزار منازل کو طے نہ کر لیا اس وقت تک خود اپنی جان کا ہدیہ پیش نہیں کیا۔

قوتِ برداشت کے اس خاص درجہ میں حسینؑ کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ عملی حیثیت سے اس بلندیٔ نفس کی توقع کیا امام حسینؑ کے سوا کسی اور سے کی جا سکتی تھی جو اُسے آپ اپنے بعد کے لیے چھوڑ دیتے؟

۱۶۔ طفلِ شیر خوار:

تمام اصحاب و اعزّا کی شہادت کے بعد غالباً دشمنانِ دین یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ حسینؑ کے صبر و تحمل اور ان کے مقابلہ میں تشدّد کی انتہا ہو چکی مگر ابھی ظالموں کے ترکش میں تشدّد کا ایک زبردست تیر باقی تھا اور اس کے مقابلہ میں حسینؑ کو ایک زبردست قربانی پیش کرنا تھی جس پر ہر مذہب و ملّت کا انسان یہ گواہی دینے پر مجبور ہے کہ یزیدیوں کو انسانیت سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔

شیر خوار عبداللہؑ جو "علی اصغر" کے نام سے مشہور ہیں اور آپ کی والدہ رباب بنت

سلہ طبری ج ۶ صہ ۲۵۷ ۔ ارشاد صہ ۲۶۹

امراء القیس بن عدی کلبی تھیں جن کے بطن سے ایک صاحبزادی بھی متولد ہوئیں جن کا نام سکینہ بنت الحسینؑ تھا۔[1]

انسانیت لرزہ براندام تھی جب اس بچہ کو حسینؑ اپنے ہاتھوں پر لیے ہوئے تھے اور اس وقت ایک تیر ظلم نے باپ کے ہاتھوں پر بچہ کا کام تمام کر دیا۔[2] یہ تیر مارنے والا قبیلہ بنی اسد میں سے ایک ظالم تھا۔[3]

ایک روایت کے مطابق امام حسینؑ نے اس بچہ کو ہاتھوں پر بلند کر کے پانی کا سوال کیا اور اس وقت بجائے پانی پلانے کے سردار لشکر عمر سعد کے حکم سے حرملہ بن کاہل اسدی نے تیر لگا کر اس معصوم کو شہید کیا۔

---

[1] ارشاد ص ۲۶۹۔ [2] طبری ج ۶ ص ۲۲۰ و ۲۵۷ [3] طبری ج ۶ ص ۲۵۰۔ الاخبار الطوال ص ۲۵۵ ارشاد ص ۲۵۴۔

انتیسواں باب

جہادِ آخر اور شہادت

یہ سب کچھ ہوا۔ اصحاب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ عزیز جدا ہو گئے۔ بھتیجے قتل ہوئے۔ بیٹا تلواروں سے ٹکڑے ہوا۔ بھائی تہ تیغ ہوئے مگر امام حسینؑ نے کوئی ایسی جنگ نہیں کی جسے حسینؑ کی جنگ کہا جائے۔ ظاہری اسباب کی بنا پر نا واقف آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ آپ کو بذاتِ خود جنگ کرنے کا حوصلہ نہیں، نبرد آزمائی کا ولولہ ہی نہیں حالانکہ حقیقت میں آپ کی جنگ کا لطف تو جب ہی تھا کہ جب آپ تلوار لے کر حملہ آور ہوتے اور ایک طرف عباسؑ داد شجاعت دیتے ہوتے ایک طرف علی اکبرؑ معرکۂ جنگ میں جوہر دکھاتے ہوتے، ایک طرف اصحاب حفاظت کے لیے ساتھ ساتھ ہوتے۔ اس صورت میں جنگ کا منظر دوسرا ہی ہوتا۔ مگر حسینؑ نے سب کو دنیا سے ایک ایک کر کے رخصت ہو جانے دیا اور ان کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کی۔ پھر اب جب کہ دن بھر کی دھوپ سر پر پڑ چکی، ساتھیوں اور عزیزوں کے غم نے دل کو شکستہ کر دیا، کمر عباسؑ کے مرنے سے ٹوٹ چکی اور آنکھوں کی بصارت علی اکبرؑ کے ساتھ گویا جا چکی۔ یہ ستا دن برس کی بڑھاپے کی عمر کا انسان اب اس عالم میں بھلا تلوار کھینچ سکتا ہے اور جنگ کر سکتا ہے؟ مگر حسینؑ کو تو کربلا میں صبر و برداشت کی منزلوں کو طے کرنے کے ساتھ ساتھ فرائض کے حدود دکھلانا تھے۔ وہ شروع سے اسلامی آئین کے محافظ تھے اور ان ہی آئین و اصول کے لیے جنگ کر رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن کے سامنے "سپردگی" آئینِ اسلام کے خلاف ہے۔ حفاظت خود اختیاری کے لیے دفاع آخری امکان کے درجہ تک ہر انسان کا فرض ہے۔ حسینؑ نے اس فرض کو اس وقت انجام دیا جب کوئی دوسرا انسان اسے انجام نہیں دے سکتا تھا۔

اب علی اصغر کو نذرِ راہِ خدا کرنے کے بعد حسینؑ کے پاس کوئی ایسی قربانی نہ تھی جسے وہ حق کی بارگاہ میں پیش کرتے۔ اب بس ایک آخری مرحلہ تھا جو آپ کے لیے پہلے ہی بہت آسان تھا۔ آپ نے اسے خود اب تک اپنے لیے مشکل سے مشکل تر بنایا تھا۔ اب جب کہ یہ تمام مشکلیں ختم ہو چکی ہیں، اب جب کہ منزلِ عمل کے درمیانی قلعوں کو تمام و کمال فتح کر چکے ہیں ظاہری طور پر آپ سے بڑھ کر اس وقت دل شکستہ کوئی نہیں مگر حقیقتاً آپ سے بڑھ کر اس وقت کامیابی کے احساس سے بالیدہ کوئی دوسرا نہیں۔ کسی کے قدم جن راستوں کے تصوّر سے ڈگمگا سکتے تھے انھیں آپ عملی طور پر استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ طے کیے ہوئے کھڑے تھے۔ آپ سے بڑھ کر اس وقت فتحمندی کا احساس کسی دوسرے کو ہو نہیں سکتا تھا۔ اب آپ کے لیے اپنا سر شمشیرِ قاتل کے سپرد کر دینا تھا۔ یہ بالکل آسان تھا مگر وہ پیغمبرِ اسلامؐ کے نواسے اور علیؑ کے بیٹے نہ ہوتے اگر اپنا سر جھکا کے خاموشی سے دشمنوں کو دعوت دے دیتے کہ آؤ یہ سر قلم کر لو۔ ہونے والا ہے آخر میں یہی، مگر ذرا میدانِ جنگ کو بدر و اُحد، خندق و صفین کا نمونہ بن جانے دو۔ ذرا بھولی ہوئی دنیا کو علیؑ کی یاد آجانے دو۔ ذرا نہ دیکھی ہوئی آنکھوں کے سامنے حمزہؓ و جعفرؓ کی تصویر کھنچ جانے دو۔

آج ہی تو موقع آیا ہے کہ حسینؑ اپنے نانا کے اس قول کو سچ کر دکھائیں کہ حسینؑ کو میری جرأت و سخاوت میراث میں ملی ہے۔ سخاوت کے مظاہرے بہت ہوئے تھے مگر جرأت کے عملی اظہار کا وقت اب آیا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو رسول اللہؐ کو میدانِ جنگ میں عام طور پر تلوار لے کر خود جہاد کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے کہ ساتھ والے موجود رہے۔ حسینؑ بھی جب تک ایک لائق جنگ مجاہد بھی ساتھ رہا اپنے نانا رسول اللہؐ کی بالکل تصویر بنے رہے مگر اب جب کہ آپ کی حمایت میں تلوار کھینچنے والا کوئی باقی نہیں رہا تو حسینؑ نے یہ دکھلا دیا کہ اگر ضرورت ہوتی تو میرے نانا رسول اللہؐ بھی عملی حیثیت سے کس پایہ کی شجاعت و جرأت کا مرقع کھینچتے۔

آپ رخصت کے لیے خیمہ میں آئے اور ایک یمنی چادر کو جا بجا سے چاک کر کے باقی لباس کے نیچے پہنا[1]۔ شاید اس لیے کہ بعد شہادت جب لباس کو لوٹا جائے تو یہ بوسیدہ کپڑا جسم پر رہ جائے۔ اس کے بعد میدان جنگ میں تشریف لے گئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حسینؑ غمزدہ، دل شکستہ۔ تشنہ و گرسنہ ہونے کے باوجود تن تنہا جب تلوار کھینچ کر فوج مخالف پر حملہ آور ہوئے تو تمام گزشتہ بہادروں کے کارنامے محو ہو گئے اور انسانی حافظہ میں قیامت تک اس شجاعت و جرأت کی تصویر محفوظ رہ گئی۔

مگر یہ غیر مساوی جنگ ظاہری اعتبار سے اب عنقریب ختم ہونے والی تھی اس لیے کہ ایک کا ہزاروں سے مقابلہ کہاں تک جاری رہ سکتا تھا۔ تاہم آپ نے اپنے دشمنوں کے دلوں میں وہ دھاک بٹھا دی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی آپ کا مقابلہ کرنے کی جسارت نہ کرتا تھا۔ یزیدی افواج کی اس سراسیمگی کو دیکھ کر شمر نے فوج کو للکارا اور نئے سرے سے ترتیب لشکر کو درست کر کے سواروں کو پیادوں کے پیچھے کھڑا کیا اور تیر اندازوں کو حکم دیا کہ وہ تیر باراں کریں۔ اتنی شدت سے تیر برسائے گئے کہ جسم حسینؑ ساہی کے کانٹوں کی طرح ہو گیا۔

اس وقت دوبارہ شمر نے چلا کر کہا۔ "خدا تم سے سمجھے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو، انہیں قتل کرو۔ خدا کرے تمہاری مائیں تمہیں روئیں۔"

اس طرح غیرت دلائے جانے کے بعد وہ لشکر بے کراں حسینؑ پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑا۔ اور آپ پر تیروں، تلواروں اور نیزوں کا مہینہ برسنے لگا جس سے یقین ہے کہ گھوڑا بھی کافی زخمی ہو گیا ہو گا اور اس سے مجبور ہو کر آپ پشت فرس سے زمین پر تشریف لائے مگر پیادہ ہونے کے بعد بھی آپ نے مقابلہ جاری رکھا۔

اثنائے جہاد میں ایک موقع ایسا آیا کہ حضرت تمام فوج کو بھگا کر نہر تک پہنچ گئے۔ دشمنوں کو اندیشہ ہوا کہ آپ کہیں پانی سے سیراب نہ ہو جائیں۔ اس وقت حصین بن تمیم نے تیر لگایا جو آپ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۰ [2] ارشاد ص ۲۵۷ [3] ارشاد ص ۲۵۷

کے دہن پر پڑا اور خون منہ سے اُبلنے لگا۔ آپ نے چلّو میں خون لیا۔ آسمان کی طرف اچھال دیا اور پھر شکر خدا کا ادا کیا۔[1]

اسی اثنا میں بے حیا لشکرِ یزید کا ایک دستہ اپنی شکست کی خفت کو مٹانے کیلئے شمر کی قیادت میں خیام حسینی کی طرف جس میں اہل حرم تھے غارت گری کے ارادہ سے متوجہ ہوا اور آپ کے اور خیام کے بیچ میں حائل ہوگیا۔ یہ دیکھنا تھا کہ آپ نے پوری فوج کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اگر تمہیں مذہب کا پاس اور آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے تب بھی دنیا میں اپنی قومی شرافت کا ثبوت دو۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ میرے خیام سے تعرض نہ کرو۔ شمر اپنی حرکت پر شرمندہ ہوا اور خیام کی طرف سے پلٹ آیا۔[2]

اب شمر نے پیادوں کو اپنے ساتھ لے کر خود آپ کا محاصرہ کر لیا۔ مگر عالم یہ تھا کہ جس طرف آپ رُخ کرتے تھے ادھر کی جماعت منتشر ہو جاتی تھی۔[3] غالباً اسی موقع کا تذکرہ فوجِ دشمن کے ایک سپاہی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ میں نے کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا جو زخمی ہو چکا ہو اور اس کے اولاد، عزیز اور ساتھی سب قتل ہو چکے ہوں اور پھر وہ حسینؑ کا ایسا مطمئن اور ثابت قدم نظر آئے اور ان کی سی جرأت و ہمت سے مقابلہ کرے۔ حالت یہ تھی کہ پیادے چاروں طرف سے انہیں گھیرتے تھے اور وہ تلوار لے کر ان پر حملہ کر دیتے تھے تو وہ سب داہنے بائیں سے یوں ہٹتے تھے جیسے گوسفندوں کا غول بھیڑیے کے حملہ کے وقت منتشر ہوتا ہے۔[4]

اس وقت آپکی زبان پر یہ تاریخی الفاظ تھے جن سے ایک طرف فریضۂ ہدایت پورا ہو رہا تھا اور دوسری طرف نتائج کی طرف صاف اشارہ تھا۔

"یاد رکھو کہ اللہ میرے قتل سے انتہائی ناراض ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ تمہارے ذلت دینے سے اللہ مجھے عزت دیگا اور پھر میرا بدلا تم سے اسطرح لیا جائیگا جس

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۸ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۸ [3] طبری ج ۶ ص ۲۵۹ [4] طبری ج ۶ ص ۲۵۹ ارشاد ص ۲۵۶-۲۵۷

کا تمہیں اس کے قبل تصور بھی نہ ہوگا۔ یاد رکھو کہ مجھے قتل کرنے کے بعد خود تمہارے درمیان تفرقہ پڑ جائے گا۔ خانہ جنگیاں ہوں گی اور بالآخر تمہارا خون بھی بہایا جائے گا۔ پھر اس کے بعد آخرت کی سزا۔ وہ اس سے بھی زیادہ ہے[1]۔"

اس کے بعد آپ پر ہر جانب سے شدت کے ساتھ حملے ہونے لگے اور آخر زخموں سے چور ہو کر آپ زمین پر گر گئے اور کھڑے ہونے کی قوت باقی نہ رہی۔

۱۷۔ عبداللہ بن الحسینؑ

آپ حسنؑ بن علیؑ کے فرزند تھے۔ آپ کا سن اپنے بھائی قاسم سے بھی کم تھا اور آپ کی والدہ ام الرباب بنت امراء القیس، رباب مادرِ سکینہ و علی اصغر کی بہن تھیں۔

جب امام حسینؑ زخموں سے چور ہو کر زمین پر تشریف لا چکے تھے۔ اس وقت آپ خیمہ سے برآمد ہوئے اور امام کی طرف چلے۔ جناب زینب بنت علیؑ نے آپ کو روکنا چاہا مگر آپ کسی طرح نہ رکے اور دوڑتے ہوئے امام کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت بحر بن کعب بن عبیداللہ تیمی حضرت پر تلوار کا وار کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے اس سے کہا "زنِ خبیثہ کے بیٹے کیا تو میرے چچا کو قتل کرے گا؟" مگر اسپر بھی جب اس نے تلوار کا وار کر ہی دیا تو آپ نے اسے ہاتھ پر روکا۔ ہاتھ جلد کے آخری حصہ تک کٹ کر لٹکنے لگا اور آپ کے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔ "یا اماہ"۔ امام حسینؑ نے آپ کو اپنے سینہ سے لگا لیا اور فرمایا کہ بیٹے صبر کرو، اس مصیبت پر اور اس کے اجر و ثواب کے منتظر رہو۔ تم بھی اپنے بزرگوں یعنی رسول اللہؐ، علیؑ بن ابی طالبؑ، حمزہؓ، جعفرؓ اور حسنؑ کی خدمت میں پہنچنا چاہتے ہو[2]۔ ابھی آپ یہ فرما ہی رہے تھے کہ حرملہ نے چلہ کمان میں جوڑ کر تیر مارا جس سے عبداللہ کی شہادت واقع ہوئی۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶ [2] ارشاد ص ۲۵۶

۱۸ - امامؑ کی شہادت

دیر تک حضرت امام حسینؑ خستہ و مجروح بر سرِ خاک باقی رہے جب کہ آپ کو شہید کر دینے سے بظاہر کوئی امر مانع نہ تھا مگر ہر شخص اس جرمِ عظیم کے ارتکاب سے بچنا چاہتا تھا۔[1] شمر للکارا کہ آخر اب کیا انتظار ہے؟ آخر مالک بن نسر بدی آگے بڑھا۔ اس نے آپکے سر پر تلوار لگائی جو کاسۂ سر تک پہنچ گئی۔[2] بالآخر زرعہ بن شریک کی تلوار[3]۔ سنان بن انس کا نیزہ[4] اور پھر شمر بن ذی الجوشن کا خنجر وہ تھا جس نے اس مجسمۂ حق کی شمعِ حیات گل کر دی، سچائی کی گردن قلم ہوئی اور شہیدِ حق، شہیدِ انسانیت، شہیدِ راہِ خدا کا سر نیزہ پر بلند کر دیا گیا۔

۱۰ محرم ۶۱ھ کی وہ یادگار تاریخ جمعہ کا دن ہے کہ انسانی تاریخ کا یہ سب سے اہم واقعہ رونما ہوا۔

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۵۔ ارشاد ص ۲۵۷، طبری ج ۶ ص ۲۵۰ نے مالک بن بشر کندی لکھا ہے الاخبار الطوال ص ۲۵۵ [3] الاخبار الطوال ص ۲۵۵ [4] طبری ج ۶ ص ۲۶۰۔ الاخبار الطوال ص ۲۵۶

تیسواں باب
شہادت کے بعد

حضرت امام حسینؑ اور آپ کے اقرباء و انصار کے شہید کیے جانے پر مظالم کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ آپ جو لباس پہنے ہوئے تھے وہ بھی اتار لیا گیا۔

اسحٰق بن حیوۃ حضرمی نے قمیص لی۔ بحر بن کعب نے زیرجامہ۔ اخنس بن مرثد نے عمامہ، بنی دارم کے ایک شخص نے تلوار[۲] اور قیس بن اشعث نے قطیفہ (چادر یمانی) جو خز کی تھی لے لی۔ اسی لیے کوفہ میں وہ "قیس قطیفہ" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا[۳]

اس کے بعد یزیدی فوج نے خیام اہل بیت نبوی پر چھاپہ مارا اور ان میں کا تمام اسباب و سامان لوٹ لیا[۴] حتیٰ کہ مخدرات عصمت کے سروں سے چادریں تک اتار لیں[۵]۔ اس کے بعد خیموں میں آگ لگا دی گئی اور عمر بن سعد نے اپنی فوج میں آواز دی کہ کون کون ایسے ہیں جو لاش حسینؑ کو گھوڑوں سے پامال کرنے کے لیے تیار ہوں، اس پر دس آدمی آمادہ ہوئے۔ جنہوں نے لاش مطہر کے ساتھ اس ظلم کو بھی انجام تک پہنچایا[۶]

سر امام حسینؑ جو تن سے جدا کیا جا چکا تھا خولی بن یزید اصبحی کے ہاتھ ابن زیاد کے پاس پہلے روانہ کیا گیا[۷] پھر کچھ شہداء کے سر قطع کر کے اس کے بعد شمر بن ذی الجوشن، قیس

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۲۵۹ [۲] ارشاد ص ۲۵۷ [۳] طبری ج ۶ ص ۲۶۰۔ ایک روایت میں اس شخص کا نام عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث ہے اور لکھا ہے کہ وہ "عبدالرحمٰن قطیفہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ (کتاب البلدان ص ۱۷۲) ص ۲۵۶
[۴] الاخبار الطوال ص ۳۵۶ [۵] طبری ۶ ص ۲۶۰۔ [۶] طبری ج ۶ ص ۲۶۱-۲۶۲۔ ارشاد ص ۲۵۸ [۷] الاخبار الطوال

بن اشعث، عمرو بن الحجاج اور عزرہ بن قیس کے ساتھ روانہ کیے گیے[1]

امام حسینؑ کے پسماندگان میں صرف ایک بیمار فرزند علیؑ بن الحسینؑ پردہ نشین خواتین اور کچھ چھوٹے بچے رہ گئے تھے جو رات بھر خیموں کے جلنے کے بعد اسی کھلے ہوئے صحرا میں مقیم رہے۔

۱۱ محرم کو عمر بن سعد نے اپنی فوج کے کشتوں کو جمع کیا اور ان پر نماز جنازہ پڑھ کر دفن کیا[2]۔ مگر شہدائے راہِ خدا کی لاشیں اسی طرح بے دفن چھوڑ دیں اور شام ہوتے ہوتے اہل بیتِ رسولؐ کو بطور قیدیوں کے ساتھ لے کر ابن سعد کوفہ کی جانب روانہ ہوگیا اور بقیہ شہداء کے سروں کو جو تعداد میں بہتر تھے نیزوں پر بلند کر کے ساتھ لے گئے[3]

۱۲ شہدائے بے سر کو لشکرِ یزید کے کربلا سے چلے جانے کے بعد قبیلہ بنی اسد نے جو کربلا سے تھوڑی دور پر غاضریہ میں رہتا تھا آکر دفن کیا[4]

حضرت امام حسینؑ کو اسی مقام پر جہاں کہ اس وقت ضریح موجود ہے اور آپؑ کے پائینِ پا علی اکبرؑ کو[5] جناب عباسؑ کو غاضریہ کے راستہ پر نہرِ فرات کے قریب جہاں کہ آپ شہید ہوئے تھے اور دوسرے اعزاء اور اصحاب کو ایک گڑھا کھود کر یکجا دفن کر دیا جن کے قبور کا وثوق کے ساتھ معین کرنا موجودہ ماخذوں کے لحاظ سے غیر ممکن ہے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ امام حسینؑ کے گرد و پیش ہی دفن ہیں اور حائر کا احاطہ ان سب کو گھیرے ہوئے ہے[6]۔ شہداء کے سر جب کوفہ پہنچ گئے تو شمر نے ان سروں کو ابن زیاد کے سامنے پیش کیا[7]

اس موقع پر ابن زیاد نے سرِ امام حسینؑ کے ساتھ بے ادبی کی جسارت کی اور وہ ایک چھڑی سے آپ کے لب و دنداں پر ضرب لگانے لگا۔ یہ گستاخی دیکھ کر زید بن ارقم صحابی رسول کو تاب نہ رہی۔ انہوں نے کہا ارے یہ لب وہ ہیں جن پر میں نے خود رسول اللہؐ کے لبوں کو بوسہ لیتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ کہہ کر رونے لگے۔ ابن زیاد نے کہا اگر تم بوڑھے

---

[1] ارشاد ص ۲۵۸ [2] طبری ج ۶ ص [3] الاخبار الطوال ص ۲۵۶ [4] طبری ج ۶ ص ۲۶۰ ارشاد ص ۲۵۸۔
الاخبار الطوال ص ۲۵۷ [5] ارشاد ص ۲۵۸، [6] ارشاد ص ۲۶۵، [7] الاخبار الطوال ص ۲۵۷

نہ ہوتے اور عقل نہ جا چکی ہوتی تو میں ابھی تمہاری گردن مارنے کا حکم دے دیتا۔ زید بن ارقم اٹھ کر ابن زیاد کو برا کہتے اور مسلمانوں کو اس کی حکومت تسلیم کرنے پر لعنت ملامت کرتے چلے گئے۔[1]

ادھر اہل بیت نبوت کا لٹا ہوا قافلہ قیدیوں کی شکل سے اسی شہر کوفہ میں کہ جہاں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے دورِ حکومت میں زینبؑ و ام کلثومؑ شاہزادی کی حیثیت سے رہ چکی تھیں لایا جا رہا تھا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ حدودِ شہر میں داخل ہوں حاکم کی طرف سے یہ منادی کر دی گئی تھی کہ اس موقع پر کوفہ میں کوئی شخص سلاحِ جنگ کے ساتھ گھر سے باہر نہ نکلے۔ نہ کوئی شخص ہتھیار لگائے ہوئے کوفہ کی سڑکوں پر دکھلائی دے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ پر کسی خاص دہشت کے سبب سے سوار اور پیادوں کے بڑی تعداد میں پہرے بٹھلا دیے گئے۔ تماشائیوں میں سے بعضوں کو اصل واقعہ کی خبر تھی اور بعض بے خبر حکومت کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے یہی سمجھتے تھے کہ مخالفینِ اسلام کی جماعت پسپا ہوئی ہے۔ اور ان کے اہل و عیال گرفتار ہو کر آ رہے ہیں۔ سہل شہر زوری حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر عین اسی وقت کوفہ میں پہنچے۔ دیکھا کہ بازار سجا ہوا ہے تماشائیوں میں سے اکثر کے چہروں پر مسرت کے آثار نمایاں ہیں مگر ان ہی میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کے چہرے اداس ہیں۔ انہوں نے بڑھ کر ایک بوڑھے سے حال دریافت کیا۔ وہ ان کو ایک گوشہ میں لے گیا اور بچشم گریاں خاندانِ رسالت کی تباہی پر مندرجہ ذیل اشعار پر مشتمل مرثیہ پڑھ کر ان کو حقیقتِ حال سے مطلع کیا:۔

الم ترانِ الشمس اضحت مریضہ	لقتل الحسین و البلاد اضمحلت
وکانوغیاثا ثم اضحوا رزیۃ	لقد عظمت تلک الرزایا وجلت
وان قتیل الطف من آل ہاشم	اذل رقاب المسلمین و ذلت

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ قتلِ حسینؑ سے سورج کو گہن لگ گیا اور تمام آبادیاں مغموم ہو گئیں۔ ہائے افسوس خاندانِ رسالت تو لوگوں کے لیے فریاد رس تھا

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۶ - طبری ج ۶ ص ۲۶۲

لیکن آج وہ خود مبتلائے مصیبت ہوگیا۔ اور سچ تو یوں ہے کہ یہ مصیبتیں بڑی عظیم اور سخت تھیں۔ بہ تحقیق شہید کربلا کی شہادت سے مسلمانوں کی گردنوں میں رسوائی اور ذلت کا طوق پڑ گیا اور دراصل وہ ذلیل ہو گئے۔"

ابھی یہ مرثیہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ شادیانوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ اہل بیت رسولؐ کا تباہ حال قافلہ شہر میں داخل ہوگیا۔ آگے آگے نیزوں پر شہداؑ کے سر تھے اور ان کے پیچھے اسرائے آلِ محمدؐ تھے۔ ایک عورت جو اس منظر کو دیکھنے کے لیے اپنے کوٹھے پر بیٹھی ہوئی تھی قیدیوں سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگی کہ "تم کس قوم و قبیلہ سے ہو؟ جواب دیا گیا کہ "ہم اسرائے آلِ محمدؐ ہیں"۔ یہ سننا تھا کہ ایک کہرام برپا ہوگیا۔ مگر یہ وزاری کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سطحی نظر سے دیکھنے والے اس منظر کو اہل بیت نبوت کے لیے سخت توہین و ذلت کا باعث سمجھ رہے ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت حسینؑ کی تبلیغ منتہائے شباب پر پہنچ گئی اور دعوت حق کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔

اگر چشم حقیقت بین سے دیکھا جائے تو ایک طرف نیزہ پر سر حسینؑ جس کی پیشانی پر سجدۂ خالق کا نشان پڑا ہوا اور چہرے سے نور ساطع تھا اور دوسری طرف مخدرات عصمت جو نامحرموں کے مجمع میں چادر و مقنع سے محروم کر دیے جانے کے بعد بھی غیرت و حیاء کا مجسمہ اخلاق محمدیہ کی تصویر بنی ہوئی جاہ و جلال کی چادروں میں پنہاں طہارت و عفت کے لباس میں ملبوس تھیں۔ دونوں نے سچائی کے پیکر میں روح پھونک دی اور دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے جہالت و ضلالت کے پردوں کو چاک کر کے پھینک دیا۔

اس موقع پر جبکہ آلِ رسولؐ کا لٹا ہوا قافلہ کوفہ سے اس بے کسی کے عالم میں گزر رہا تھا کہ اس کو دیکھ کر پتھر کا دل بھی پگھل جاتا۔ زنان کوفہ نے فطری طور پر بے چین ہو کر رونا شروع کیا تو علیؑ بن الحسینؑ (سید سجادؑ) نے ضعف و ناتوانی کے باعث تھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ "تم ہی نے تو ہمارا خون بہایا۔ اب تمہاری عورتیں ہمارے حال پر رو رہی ہیں؟ ہمارا اور تمہارا

فیصلہ خدا کے سپرد ہے"۔ پھر ذرا غم والم کی تاثیر میں اضافہ ہوا اور مرد و زن سب مل کر رونے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ "تم لوگ ہماری مصیبت پر نالہ و شیون کر رہے ہو۔ پھر آخر ہم کو تباہ و برباد کس نے کیا ہے؟" بشیر بن خزیم اسدی ناقل ہے کہ اس وقت زینبؑ بنت علیؑ نے مجمع کی طرف رُخ کیا اور موعظہ فرمانا شروع کیا۔ میں نے کبھی ایک پردہ نشین خاتون کو آپ کی طرح پُر زور تقریر کرتے نہ سُنا تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی زبان سے آپ کے پدر بزرگوار علیؑ ابن ابی طالبؑ بول رہے ہیں۔

آپ نے لوگوں کی طرف سکوت اختیار کرنے کا اشارہ کیا جس سے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ آپ نے فرمایا کہ "حمد کا سزاوار اللہ ہے اور صلوٰۃ و سلام میرے پدر بزرگوار محمد مصطفےٰ اور ان کی عترت سے مخصوص ہے۔ اے اہل کوفہ۔ اے اہل مکر و دغا تم روتے ہو؟ خدا کرے تمہارے آنسوؤں کو تھمنا نصیب نہ ہو اور تمہاری نوحہ و فریاد کی آوازوں میں سکون پیدا نہ ہونے پائے"۔ پھر آپ کی تقریر کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ آپ نے فرمایا۔

"کیا تم لوگ سچ مچ آنسو بہا رہے ہو؟ اور چیخیں مار مار کر رو رہے ہو؟ حقیقتاً تمہارے لیے ہے بھی یہی بہتر کہ زیادہ روؤ اور کم ہنسو۔ تم نے سمجھنے کی کوشش بھی کی کہ کس طرح تم نے رسولِ خدا کے جگر کو چاک کیا؟ ان کے محترم اہل حرم کو بے پردہ کیا اور ان کی ہتک حرمت کی؟ کیا تم کو اس پر تعجب ہے کہ آسمان نے خون برسایا؟ یہ تو کچھ نہیں۔ آخرت کا عذاب بہت سخت ہوگا اور اس وقت تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اس چند روزہ مہلت سے خوش نہ ہونا، خدا کو جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ اس کو موقع کے ہاتھ سے جانے کا اندیشہ نہیں۔ بلاشبہ وہ تمہیں ایک وقت تک تمہارے حال پر چھوڑے رہے گا"۔ راوی ناقل ہے کہ آپ کی اس دل ہلا دینے والی تقریر کے دوران میں میرے گرد و پیش تمام سامعین حالت اضطراب میں دانتوں میں انگلیاں دبائے ہوئے رو رہے تھے اور ایک بوڑھے کو میں نے دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ "میرے ماں باپ تم پر نثار۔ تمہارے بوڑھے تمام دنیا کے بوڑھوں

سے تمہارے جوان تمام جوانوں سے، تمہاری عورتیں تمام عورتوں سے اور تمہاری نسل تمام نسلوں سے افضل و بہتر ہے۔ نہ وہ کبھی ذلیل کی جا سکتی ہے نہ رسوا۔"

آپ کے بعد فاطمہ بنت الحسینؑ، ام کلثوم بنت علیؑ اور زین العابدینؑ (علیؑ بن الحسینؑ) نے متعدد خطبے ارشاد فرمائے جن سے اہلِ کوفہ کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے اور حکومت نے بے خبری اور عوام فریبی کا جو طلسم قائم کیا تھا وہ ٹوٹ گیا۔

حسینی شخصیت کا اثر اتنا زبردست تھا کہ خود حسینؑ کے قاتلوں میں سے ایک جب سرِ حسینؑ لیے ہوئے دربارِ ابن زیاد میں پہنچا تو اس کی زبان پر حسینؑ ابن علیؑ اور آپ کے شخصی اور خاندانی خصوصیات کے تذکرہ میں مندرجہ ذیل اشعار جاری ہوئے:

املأ رکابی فضۃ و ذھبا فقد قتلت الملک المحجبا

و من یصلی القبلتین فی الصبا و خیرھم اذ یذکرون النسبا

قتلت خیر الناس اما و ابا

(یعنی) "میرے پالان شتر کو طلا و نقرہ سے بھر دیجئے کیونکہ میں نے (آپکی خاطر سے) ایک بڑے ذی عزت بادشاہ کو قتل کیا ہے۔ اُسے جو بچپنے میں دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھ چکا تھا اور حسب و نسب میں دنیا بھر سے بہتر تھا۔ میں نے اُسے قتل کیا ہے جسکے ماں باپ دنیا میں سب سے بہتر تھے۔"

اس کے ضمیر کی آواز اضطراری طور پر اس کے منہ سے باہر نکل رہی تھی درآنحالیکہ اس نے محسوس نہ کیا کہ اس کے یہ الفاظ سیاستِ بنی اُمیہ کے لیے کس درجہ مضر ثابت ہو سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابن زیاد نے غضب ناک ہو کر اس سے کہا کہ "اگر تو انہیں ایسا ہی سمجھتا تھا تو پھر ان کے قتل میں شریک کیوں ہوا؟ تجھے مجھ سے کسی اچھے سلوک کی توقع نہ رکھنا چاہیئے بلکہ میں خود تجھے بھی ان ہی کے پاس بھیجدوں گا۔" چنانچہ وہ شخص اسی وقت قتل کر دیا گیا۔

ابن زیاد نے دربار میں پسماندگانِ حسینؑ کی حاضری کا حکم دیا۔ چنانچہ خاندانِ رسالت

کو قیدیوں کی حیثیت سے لاکر ابن زیاد کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اس نے ان کا دل دکھانے کے لیے امام حسینؑ کے دندان مبارک کو چھڑی سے ضرب لگانا شروع کیا۔ یہ بے ادبی دیکھ کر زید بن ارقم صحابیؓ رسولؐ نے کہا کہ یہ وہ لب و دندان ہیں جن کے رسولؐ بوسے لیا کرتے تھے۔

ایک روایت کے مطابق انس بن مالک دربار میں موجود تھے۔ وہ روئے اور کہنے لگے کہ حسینؑ سب سے زیادہ رسولؐ سے مشابہ تھے[1]۔

اس موقع کے لیے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی بڑی بیٹی جناب زینبؑ نے پہلے ہی لباس میں تبدیلی کر لی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ بہت پست اور معمولی درجہ کے کپڑے پہن لیے تھے اور اب اس وقت کنیزوں نے آپ کے گرد حلقہ باندھ لیا تھا[2]۔ مگر خلقی عظمت و جلال چھپانے سے نہیں چھپتے چنانچہ ابن زیاد نے زینب کبریٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ وہ کون عورت ہے؟ تین دفعہ اس نے یہی کہا مگر کچھ جواب نہ ملا۔ آخر ایک کنیز نے کہہ دیا۔ ارے یہ زینبؑ بنت فاطمہؑ ہیں۔ یہ سن کر ابن زیاد نے جو فتح و ظفر کے نشہ میں چور تھا۔ آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر کہ اس نے تم لوگوں کو رسوا کیا۔ تمہیں قتل کیا اور تمہارا جھوٹ ظاہر کر دیا۔"

"تم لوگوں" کے خطاب کے ساتھ اس فقرہ میں کہ "تمہارا جھوٹ ظاہر کر دیا" بڑی وسعت تھی۔ اس میں قرآن۔ حدیث۔ رسالت اور وحی سب کا انکار مضمر تھا۔ اب اسلامی اصول پر حملہ ہو رہا تھا جس پر حضرت زینبؑ نے خاموش رہنا اپنے لیے روا نہ جانا۔ فرمایا:۔

"حمد ہے اس خدا کے لیے جس نے ہم کو عزت دی محمد مصطفیٰؐ کے ساتھ اور ہمیں پاک و پاکیزہ قرار دیا۔ اس طرح جو حق ہے پاکیزہ قرار دینے کا۔ نہ وہ کہ جو تو کہتا ہے، رسوا وہ ہوتا ہے جو فاسق و فاجر ہو اور جھوٹ اس کا کھلتا ہے جس کے مدِ نظر ہمیشہ سچائی نہ رہے اور وہ ہم نہیں ہیں ہمارا غیر ہے۔"

اگر غیرت ہوتی تو ابن زیاد کو منفعل ہونا چاہیئے تھا مگر وہاں تو اقتدار کا نشہ اور

---

[1] صحیح بخاری ج ۱۱ ص ۱۸۸ [2] طبری ج ۶ ص ۲۶۲۔ ارشاد ص ۲۵۹ [3] طبری ج ۶ ص ۲۶۲

سلطنت کا غرور تھا۔ اسے خواہ مخواہ جناب زینبؑ کا دل دکھانے کا خیال پیدا ہوا اور یہ کہنے لگا۔ "دیکھا تم نے اللہ نے تمہارے بھائی اور دیگر عزیزوں کے ساتھ کیا کیا؟"

یہ طنزیہ فقرہ ایک عورت کے دل پر جو اثر کر سکتا ہے وہ ظاہر ہے مگر جناب زینبؑ نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔ "میں نے تو اچھا ہی اچھا دیکھا۔ وہ خاصان خدا وہ تھے۔ جن کے لیے شہادت کا درجہ خطِ تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا اور وہ اپنے پیروں سے چل کر قربانگاہ کی طرف گئے اور وہ دن بھی دور نہیں کہ جب پیشِ خدا تیرا اور ان کا مقابلہ ہوگا اور تجھ کو اپنے کرتوت پر جواب دہی کرنا ہوگی۔"[1]

اس پر ابن زیاد کو غصہ آگیا اور اس نے آپ کو تازیانہ سے ایذا رسانی کا ارادہ کیا۔ مگر عمرو بن حریث وغیرہ کے سمجھانے سے باز رہا۔ پھر بھی اس نے آپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ "خدا نے میرے دل کی مراد پوری کر دی۔ تمہارے سرکش بھائی اور گھرانے کے دوسرے نافرمان اور باغی اشخاص کو قتل کر کے" اس کے اس طنزِ کلام سے زینب کبریٰؑ کے دل پر چوٹ لگی اور آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے مگر آپ نے صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے اس کے جواب میں کہا کہ "ہاں بیشک تو نے میرے عزیزوں کو قتل کیا ہے، میری شاخوں کو کاٹ ڈالا ہے اور میری جڑ کو اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ اگر تیری مراد اس سے بر آگئی ہے تو خوش ہو لے۔"

اس نے کہا۔ "یہ بڑی قافیہ باز عورت ہے اور اس کے باپ بھی تو شاعر اور قافیہ باز تھے۔"

جناب زینبؑ نے پھر سکوت مناسب نہ سمجھتے ہوئے فرمایا۔ "بھلا ایک عورت کو قافیہ بندی اور شاعری سے کیا تعلق؟ اور میں تو اس عالم میں ہوں کہ مجھے قافیہ بندی کا ہوش کہاں۔ لیکن دل کی آواز تھی۔ جو میرے دہن سے نکل گئی۔"[2]

اس کے بعد وہ حسینؑ کے بیمار فرزند کی طرف مخاطب ہوا اور آپ کا نام دریافت کیا۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۲ [2] طبری ج ۶ ص ۲۶۳ - ارشاد ص ۲۵۹

آپ نے فرمایا "علی بن الحسینؑ"۔ وہ کہنے لگا۔ "کیا اللہ نے علی بن الحسینؑ کو قتل نہیں کیا؟" آپ نے سکوت کیا۔ ابن زیاد نے کہا "کیوں کچھ بولتے کیوں نہیں؟" آپ نے فرمایا کہ "میرے ایک اور بھائی کا نام بھی علیؑ تھا۔ جن کو لوگوں نے قتل کر دیا"۔ اس نے کہا۔ "نہیں بلکہ اللہ نے قتل کیا۔" آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ اللہ یتوفی الانفس حین موتھا۔ "یعنی اللہ ہی موت کے وقت قبضِ روح کرتا ہے۔" یہ اور بات ہے، وہ بولا کہ "یہ بچہ نہیں ہے سمجھ دار ہے لے جاؤ اس کو بھی قتل کر دو۔" یہ سننا تھا کہ جناب زینب کبریٰؑ دوڑ کر بھتیجے سے لپٹ گئیں اور کہا۔ مجھے بھی ان ہی کے ساتھ قتل کیا جائے۔ جناب زینبؑ کی اس بے تابی سے وہ ظالم بھی متاثر ہو گیا اور کہا۔ "رہنے دو! ان عورتوں کو لے کر یہی جائے گا"۔ [2]

لیکن موت پانے والے بیمار نے نہایت جرأت و استقلال کے ساتھ فرمایا کہ:۔

"ابن زیاد! تو مجھے موت سے ڈراتا ہے؟ کیا تو نہیں جانتا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہماری فضیلت"۔ یہ وہ پرشکوہ آواز تھی جو دربارِ ابن زیاد میں گونجی اور ہر شخص نے سہم کر اس کو سنا۔ ابن زیاد عرقِ انفعال میں ڈوب گیا۔

اس نے دربار برخاست کر دیا لیکن قیدیوں کو اس وقت تک کے لیے قید خانے میں رکھے جانے کا حکم دیا۔ جب تک کہ دمشق سے ابن زیاد کا قاصد اس کے تہنیت نامہ کا جواب لے کر واپس نہ آجائے۔

اس کے بعد ابن زیاد نے تمام اہل کوفہ کو مسجد جامع میں جمع ہونے کا حکم دیا۔

جب لوگ جمع ہو گئے تو عبید اللہ بن زیاد نے منبر پر جا کر بطریق اعلانِ عام یہ ناروا کلمات اپنی زبان پر جاری کیے کہ الحمد للہ الذی اظھر الحق واھلہ ونصر امیر المومنین یزید بن معاویۃ وجزبہ وقتل الحسین بن علی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۳ [2] طبری ج ۶ ص ۲۶۳

وشیعتہ" ان الفاظ میں اپنی فتح کا اعلان کرتے ہوئے جناب امیرؑ اور حضرت امام حسینؑ کے لیے انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کیے تھے جن کے سنتے ہی عبداللہ بن عفیف ازدی کھڑے ہوگئے یہ شیعانِ علیؑ میں سے ایک تھے جن کی بائیں آنکھ جنگِ جمل میں جناب امیرؑ کی نصرت میں کام آئی تھی اور پھر صفین میں سر پر ایک تلوار پڑی اور دوسری ضرب اَبرو پر پڑی جس سے داہنی آنکھ بھی جاتی رہی۔ اب ان کا دستور یہ ہوگیا کہ یہ صبح کو مسجد جامع میں آ جاتے تھے اور رات تک نمازوں میں مصروف رہتے تھے۔ پھر واپس جاتے تھے۔ انہوں نے نے ابن زیاد کے ان الفاظ کی رد کرتے ہوئے کہا۔ "او پسرِ مرجانہ! تو جھوٹا اور تیرا باپ جھوٹا اور وہ جھوٹا جس نے تجھ کو حاکم بنایا اور اس کا باپ جھوٹا اور مرجانہ کے لڑکے پیغمبرؐ کی اولاد کو قتل کرنے کے بعد راستبازوں کی طرح کلام کرنا چاہتا ہے؟" ابن زیاد نے غضب ناک ہوکر سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ان کو گرفتار کرلیں مگر عبداللہ نے اپنی قوم آزد کو آواز دی جس کے سات سو جنگی جوان کوفہ میں موجود تھے۔ چنانچہ کچھ بہادر ازدی ان کی امداد کے لیے آگئے اور سپاہیوں کے ہاتھ سے ان کو چھڑا کر نکال لے گئے اور ان کے مکان پر پہنچا دیا مگر رات کو مخفی طور سے ابن زیاد نے پھر ان کے گھر پر سے انہیں گرفتار کرایا اور بے رحمی کے ساتھ ان کو قتل کرا دیا اور ان کی لاش کو دوسروں کی عبرت کے لیے دار پر کھینچا۔[1]

دوسرے دن ابن زیاد کے حکم سے سرِ امام حسینؑ کو کوفہ کے کوچہ و بازار اور تمام قبائل میں گردش دی گئی۔ اور پھر دروازۂ قصر پر آویزاں کرا دیا گیا۔[2]

جس زمانہ میں اہلبیتؑ اطہار کوفہ میں اسیر تھے عام خیال یہ تھا کہ یزید تمام قیدیوں کے قتل کر دیے جانے کا حکم دے گا۔ اسی دوران میں کہ جب اسرائے آلِ محمدؐ کوفہ میں قید تھے ایک دن کسی نے قید خانے میں ایک پتھر پھینکا جس میں اس مضمون کی ایک تحریر بندھی ہوئی تھی۔ کہ آپ کے معاملات کے لیے ایک خط یزید کے پاس بھیجا گیا ہے۔ قاصد اس تاریخ کو جا

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۳ - ۲۶۴ - ارشاد ص ۲۶۰ [2] ارشاد ص ۲۶۰

رہا ہے اور اس تاریخ تک پلٹے گا۔ اگر نادقت تکبیر کی آواز سنائی دے تو اپنے متعلق حکم قتل کا یقین کر لیجئے گا اور اگر تکبیر نہ سنائی دے تو سمجھ لیجئے گا کہ انشاء اللہ امان ہے۔ لیکن قاصد کے آنے پر تکبیر کی آواز بلند نہیں کی گئی کیونکہ یزید نے حکم دیا تھا کہ قیدیوں کو دمشق روانہ کر دو[1]۔

ابن زیاد نے حکم دیا کہ امام حسینؑ کے سر کو نوکِ نیزہ پر بلند کر کے تمام شہر میں گردش دی جائے۔ پھر تمام شہداء کے سروں کو زحر بن قیس وغیرہ چند آدمیوں کے سپرد کیا اور انہیں دمشق کی طرف روانہ کیا اور ان کے عقب میں بیمار و ناتواں علیؑ بن الحسینؑ کی گردن میں طوق ڈال کر اور اہل حرم کو اونٹوں پر سوار کر کے مخفر بن ثعلبہ عائذی اور شمر بن ذی الجوشن کی نگرانی میں روانہ کیا[2]۔

خاندانِ رسولؐ کی تاراجی اور اپنی کامیابی کو نمایاں کرنے کے لیے عراق سے دمشق جانے کا وہ راستہ اختیار کیا گیا جس میں آبادیاں زیادہ پڑتی تھیں۔ راستے بھر امام زین العابدینؑ کا عالم یہ تھا کہ کسی سے کلام نہیں کرتے تھے۔ بالکل خاموش چلے جا رہے تھے[3] لیکن پسماندگانِ حسینؑ کے اس طرح تشہیر کیے جانے سے عام طور پر اموی حکومت کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا جانے لگا اور بہت سے مقامات پر بے چینی اور برہمی کے آثار نمودار ہوئے۔ بہر حال طرح طرح کے اندوہ و مصائب کو برداشت کرنے کے بعد یہ پسماندگان دمشق میں داخل ہوئے اس دن وہاں کے بازار خاص اہتمام سے سجائے گئے تھے اور مجمع کی یہ کثرت تھی کہ آفتاب نکلنے کے ساتھ ہی داخل ہونے کے باوجود یہ زوال کے وقت دربارِ یزید میں پہنچ سکے تھے۔

جب خاندانِ رسالت کا یہ لٹا ہوا قافلہ بازار سے گزر رہا تھا تو ابراہیم بن طلحہ بن عبید اللہ نے علیؑ بن الحسینؑ سے طنزاً پوچھا کہ "اے فرزندِ حسینؑ فتح کس کی ہوئی؟" آپ نے جواب میں فرمایا۔ "تم کو اگر معلوم کرنا ہے کہ فتح کس کی ہوئی تو نماز کے وقت جب اذان و اقامت کہنا اس وقت معلوم کر لینا کہ کس کو فتح ہوئی اور کس کو شکست؟"

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۶ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۷، طبری ج ۶ ص ۲۶۴ ارشاد ص ۲۶۰ [3] طبری ج ۶ ص ۲۶۳

جب اہل بیت نبوت حالتِ اسیری میں دروازۂ مسجد دمشق پر پہنچے تو ایک بوڑھا سامنے آیا اور اس نے ان کو دیکھ کر کہا۔ "حمد ہے اس خدا کی جس نے تم کو قتل اور ہلاک کیا اور ملکوں اور شہروں کو تمہارے مردوں سے خالی اور پُرامن بنایا۔ اور امیرالمومنین یزید کو تم پر غلبہ عطا فرمایا۔" اس بوڑھے سے یہ کلمات سُن کر بیمارِ کربلا علیؑ بن الحسینؑ نے فرمایا۔ "اے شیخ کیا تو نے قرآن میں یہ آیت پڑھی ہے؟ قل لا اسئلکم علیہ اجراً الا المودۃ فی القربیٰ۔" (یعنی) "کہدو (اے ہمارے حبیب) کہ میں سوا اپنے ذوی القربیٰ (اہلبیت) کی مودت و محبت کے تم سے اور کوئی اجر و معاوضہ اس تبلیغِ رسالت پر نہیں مانگتا۔" بوڑھے نے کہا کہ "ہاں یہ آیت میں نے پڑھی ہے"۔ آپ نے فرمایا وہ رسولؐ کے ذوی القربیٰ ہم ہی ہیں جن کی محبت تم پر فرض کی گئی ہے۔ پھر فرمایا۔ کیا یہ آیت بھی پڑھی ہے؟ واعلموا انما غنمتم من شیئٍ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ (یعنی) "یاد رکھو کہ جو تم کچھ منفعت حاصل کرو اور جو مال بغیر مشقت پاؤ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ، رسولؐ اور ان کے ذوی القربیٰ کا حق نکال دو۔" اس نے عرض کیا کہ ہاں یہ آیت بھی پڑھی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ وہ ذوی القربیٰ ہم ہی ہیں جن کا یہ حق خمس میں نکالنا واجب ہے اور کیا یہ بھی پڑھا ہے کہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا۔" اس نے عرض کیا کہ بیشک پڑھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ اہلبیتِ نبوت ہم ہی ہیں جن کو خدا نے برائی سے پاک رکھا اور معصوم بنایا ہے۔ بوڑھا یہ سُن کر حیران ہو گیا۔ اس نے تصدیق کے طور پر دریافت کیا کہ "خدا کی قسم سچ مچ تم وہی ہو؟" آپ نے زور دے کر فرمایا کہ "ہاں قسم بخدا ہم وہی آلِ رسولؐ اہل بیتِ نبوت، ذوی القربائے رسالت ہیں۔ بلاشک و شبہ اور اپنے جدِ رسولؐ اللہ ہی کی قسم کہ ہم وہی ہیں۔" یہ سننا تھا کہ بوڑھے نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ عمامہ سر سے پھینک دیا۔ سر آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا کہ "خداوندا گواہ رہنا کہ میں ہر دشمن آلِ محمدؐ سے چاہے وہ جن ہو یا انس بیزار ہوں اور ان سے

دوری چاہتا ہوں۔" پھر بیمارِ کربلا کی طرف مخاطب ہو کر پوچھنے لگا کہ "کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟" آپ نے فرمایا "ہاں اگر تم توبہ کرو تو قبول ہو گی اور تم ہمارے اصحاب میں شمار ہو گے۔ اس نے عرض کیا "میں توبہ کرتا ہوں اس گستاخی سے جو میں نے عدم معرفت کی بنا پر آپ کی شان میں کی تھی۔"

اس واقعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ بنی امیہ کے پچاس برس کے پروپیگنڈے کے نتیجہ میں عام مسلمان خصوصاً اہلِ شام کس حد تک آلِ محمدؐ سے ناآشنا ہو چکے تھے۔

ابن القفطی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جس وقت اسرائے آلِ محمدؐ اور سرہائے شہدا دمشق میں داخل ہو رہے تھے اس وقت یزید اپنے محل کے بالاخانہ پر جو مقام جیرون میں تھا اس منظر کا مشاہدہ کرنے کے لیے موجود تھا اور جونہی سرہائے شہدا نیزوں پر دور سے نظر آئے اس نے یہ اشعار پڑھے ؎

لما بدت تلك الحمول واشرفت ۔۔۔ تلك الرؤوس على ربى جيرون

نعب الغراب قل او لا تقل ! ۔۔۔ فلقد قضيت من الرسول ديونى

"جب وہ سواریاں نظر آئیں اور ان سروں کا سایہ جیرون کے ٹیلوں پر پڑا تو کوا کائیں کائیں کرنے لگا (جو کہ نحوست کی نشانی سمجھی جاتی تھی) میں نے کہا تو بول یا نہ بول میں نے بہرحال پیغمبرؐ سے اپنے قرضے وصول کر لیے ہیں۔"

ان دو شعروں سے ہی یزید کی غلط ذہنیت کا انکشاف صاف طور پر ہو جاتا ہے یعنی امام حسینؑ آپ کے انصار اور اہلِ حرم کے خلاف جو جو مظالم کیے گئے تھے ان کو وہ حضرت محمد مصطفیٰؐ سے قرضہ وصول ہونے کے برابر سمجھتا تھا۔

شہر دمشق میں داخل ہونے کے بعد یہ قافلہ اس دروازے کے پاس جو دربار شاہی سے قریب تھا روک دیا گیا اور وہاں کافی دیر تک ٹھہرائے رکھے جانے کے بعد اس کو اذن حضوری ملا اور اس دربار میں جو خصوصیت کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا۔ خاندانِ رسالت

مثل غلامانِ حبش وکنیزان ترک و دیلم اور طشت طلا میں حسین مظلومؑ کا سرِ مبارک یزید کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔

زحر بن قیس نے غلط طور سے بڑھا چڑھا کر اپنی جماعت کی بہادری اور اصحابِ حسینؑ کی بے بسی کا نقشہ کھینچتے ہوئے رودادِ جنگ یزید کو سنائی۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ سرکارِ والا حسینؑ بن علیؑ عراق کی طرف آئے۔ اٹھارہ آدمیوں کو لیے ہوئے اپنے اہل بیت میں سے اور ساٹھ آدمیوں کے ساتھ اپنے شیعوں میں سے تو ہم ان کے مقابلے کے لیے گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ غیر مشروط طریقہ پر اپنے کو امیر عبید اللہ بن زیاد کے سپرد کر دیں یا سیدال دقتال پر آمادہ ہو جائیں۔ انھوں نے جنگ کو سپردگی کے مقابلہ میں ترجیح دی تو سورج نکلنے کے بعد ہی ہم نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر اس طرح حملہ کر دیا جس طرح کبوتروں پر شکرے حملہ کرتے ہیں جس سے ان کو کسی طرف پناہ نہ ملتی تھی۔ چنانچہ زیادہ دیر گزرنے نہ پائی کہ ان کا پورے طور پر خاتمہ کر دیا گیا اور ان کے جسم بے لباس خاک و خون میں آلودہ چھوڑ دیے گئے۔[1]

اس موقع پر یزید اپنے ندماء کے ساتھ بیٹھا ہوا شطرنج کھیل رہا تھا اور شراب کے نشہ میں یہ شعر گا رہا تھا ؎

اُدر کاسا و ناولہا الا یا ایہا الساقی

پھر کیف و سرور کے ساتھ ساتھ بے دینی کا پارہ اور اونچا ہوا اور وہ یہ اشعار پڑھنے لگا ؎

لیت اشیاخی ببدر شہدوا جزع الخزرج من وقع الاسل

لاھلوا واستحلوا فرحًا ولقالوا یا یزید لا تشل

لعبت ہاشم بالملک ولا خبر جاء ولا وحی نزل

یعنی کاش میرے جنگِ بدر والے بزرگ زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ دینِ محمدی کے انصار

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۴۔ ارشاد ص ۲۶۱ ۔ دینوری نے اس تقریر کو شمر کی طرف منسوب کر کے درج کیا ہے (الاخبار الطوال ص ۲۵۷ - ۲۵۸)

کس طرح نیزوں کے پڑنے سے گھر گئے ہیں تو وہ اس صورت میں خوش ہو کر مجھے دعائیں دینے لگتے۔ بنی ہاشم نے حصولِ سلطنت کا ایک کھیل کھیلا تھا۔ حقیقت میں نہ کوئی خبر آئی تھی اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی تھی۔"

یہ سننا تھا کہ جناب زینب کبریٰؑ کھڑی ہو گئیں اور آپ نے معرکۃ الآراء تقریر شروع کی جس نے یزید کے جاہ و جلال کی تمام بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ کتنا سچا ہے میرے پروردگار کا ارشاد کہ "آخر میں ان لوگوں کی جو برے اعمال کرتے ہیں یہ نوبت پہنچی کہ وہ آیاتِ خداوندی کی تکذیب کرنے اور ان کی ہنسی اڑانے لگے۔ تو نے اے یزید! کیا یہ گمان کیا ہے کہ چونکہ تو نے ہم پر زمین و آسمان کے تمام راستوں کو بند کرتے ہوئے ہم کو اس حالت پر پہنچا دیا ہے کہ آج ہم تیرے سامنے قیدیوں کی طرح لائے جا رہے ہیں تو اس سے خدا کے نزدیک بھی ہم حقیر اور تو باعزت قرار پا گیا؟ یا یہ کہ تجھے یہ ظاہری کامیابی تیرے مقربِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی بہت سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی خیال کے ماتحت تو خوش ہو ہو کر اپنے شانوں پر نظر ڈال رہا ہے اس لیے کہ اس وقت تجھ کو یہی دکھائی دے رہا ہے کہ دنیا تیرے حکم کی پابند اور امورِ مملکت منظم و مرتب ہیں اور سلطنت و حکومت تیرے لیے تمام خطرات سے پاک و صاف ہو گئی ہے کیا تو بھول گیا خدا کے قول کو کہ نہ خیال کریں وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے کہ ہم جو ان کو مہلت دیتے ہیں وہ ان کے لیے کسی بہتری کا باعث ہوگی۔ ہم ان کو صرف اس لیے مہلت دیتے ہیں کہ وہ خوب دل کھول کر گناہ کر لیں۔ بالآخر تو ان کے لیے حقارت آمیز سزا مقرر ہی ہے۔ کیا اسلامی غیرت و حمیت اسی کی متقاضی ہے کہ تو اپنی عورتوں بلکہ کنیزوں تک کے لیے پردہ کا اہتمام کرے اور رسولؐ کی نواسیوں کو قید کر کے در بدر پھرائے اور پھر اس پر یہ کہنے کی جرأت کرے کہ لاھلوا واستھلوا فرحًا گویا تو اپنے مشرک بزرگوں سے داد کا طالب ہے۔ گھبرا نہیں تھوڑے ہی دنوں میں تو بھی اسی گھاٹ اتارا جائے گا اور اس وقت تو آرزو کرے گا کہ کاش تیرے ہاتھ شل اور زبان گنگ ہوتی اور تو نے جو کچھ کہا اور کیا وہ نہ کہا اور نہ کیا ہوتا۔ تیرے لیے اس سے بدتر کیا ہو سکتا ہے کہ روزِ حشر خدا

تیرا فیصلہ کرنے والا، محمد مصطفیٰ تیرے مقابل میں مدعی اور جبرئیلؑ ان کی طرف سے دعویٰ کے گواہ ہوں گے۔ اس وقت ان لوگوں کو بھی جنھوں نے تیرے افعال کی تائید کی ہے اور تیرا ساتھ دے کر تجھے مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کر رکھا ہے معلوم ہو جائے گا کہ ظالموں کو کیسا بُرا بدلہ دیا جاتا ہے۔ اگرچہ انقلابِ زمانہ نے یہ نوبت پہنچا دی ہے کہ میں تجھ سے بات کر رہی ہوں، میری نظروں میں تیری کوئی وقعت نہیں حتیٰ کہ تیری توبیخ و سرزنش کو بھی میں اپنے لیے ایک بڑی مصیبت خیال کرتی ہوں لیکن کروں کیا کہ دل بھرا ہوا ہے اور کلیجے میں آگ لگی ہے۔ خدا کی شان کہ خدا پرست افراد شیطانی لشکر کے ہاتھوں قتل ہوں۔ اچھا (اے یزید تجھ کو قسم ہے) تو کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھ اور اپنی پوری کوشش صرف کرے گا اور اپنی تمام جد و جہد ختم کر دے لیکن خدا کی قسم تو ہمارے ذکر کو اور ہماری زندگی کو فنا نہیں کر سکتا اور نہ ہمارے اصلی مقصد کو تو پہنچ سکتا ہے۔ اس خونِ ناحق کا دھبہ تیرے دامن پر قیامت تک باقی رہے گا اور تو کبھی اسکو دھو نہیں سکتا۔ تیری رائے یقیناً غلط، تیری زندگی بہت محدود اور تیرے اردگرد کا مجمع بہت جلد تتر بتر ہونے والا ہے۔ وہ دن بہت نزدیک ہے جب منادی ندا کرے گا کہ "ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔" شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے پیش رو بزرگوں کا انجام سعادت کے ساتھ اور ہمارے آخری بزرگ کا انجام شہادت و رحمت کے ساتھ مقرر کیا۔ اور وہی ہمارے لیے کافی اور بہترین ناصر و معین ہے۔"

اب یزید نے امام زین العابدینؑ کی دل آزاری کرنا چاہی اور آپ کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کی یہ آیت پڑھی۔ وما اصابکم من مصیبۃٍ فبما کسبت ایدیکم "جو مصیبت تم پر آئی وہ تمھارے ہاتھوں آئی۔" امام نے دوسری قرآنی آیت پڑھتے ہوئے بتایا کہ ہم پہلی آیت کے مصداق نہیں ہیں بلکہ اس آیت کے مصداق ہیں۔ ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب مبین من قبل ان نبرأھا ان ذلک علی اللہ یسیر[1] مطلب یہ ہو کہ ہماری مصیبت ایک عہد و

---

[1] کافی ج ۱ ص ۵۰۳

پیمان کے مطابق ہے جو ازل سے قلمبند ہو چکا تھا اور جس کی تکمیل ضروری تھی

پیہم حق کے اعلانات نے حاضرین کی نگاہوں سے باطل کے پردے بھی ہٹائے اور جرأتِ اظہار بھی پیدا کی۔ چنانچہ جب یزید نے بھی لب و دندانِ حسینؑ کے ساتھ اس بے ادبی کا اعادہ کیا جو کوفہ میں ابن زیاد کر چکا تھا، غالباً اس خیال کے ماتحت کہ کوفہ شیعانِ علیؑ کا مرکز رہ چکا تھا لہٰذا زیدبن ارقم، ابن زیاد کو برسرِ دربار ٹوک دینے کی ہمت کر سکے، بھلا دمشق میں کس کی مجال ہوگی کہ مجھ پر معترض ہو سکے۔ مگر ہوا یہاں بھی وہی۔

ابوبرزہ اسلمی کھڑے ہو گئے اور کہا، ارے تو اپنی چھڑی اس لب و دنداں پر لگاتا ہے جسے میں نے اکثر دیکھا کہ اس پر رسول اللہؐ اپنا منہ رکھتے تھے۔ یاد رکھ کہ اب قیامت کے دن بس تیری شفاعت ابن زیاد ہی کرے گا۔[1]

باوجود اس کے یزید کی ان جسارتوں اور گستاخیوں کو دیکھ کر اہلِ دربار کی ہمتیں بڑھ گئیں، چنانچہ ایک سرخ رنگ شامی کھڑا ہوا، اور کہنے لگا کہ اے امیرالمومنین! یہ لڑکی مجھے دے دیجیے اور اشارہ کیا اس نے فاطمہؑ بنت الحسینؑ کی طرف۔ یہ سننا تھا کہ آپ کانپنے لگیں اور اپنی پھوپھی جناب زینبؑ کبریٰ سے لپٹ گئیں۔ جناب زینبؑ نے بچی کو تسلی دی اور بلند آواز سے اس شامی سے کہا کہ کیا بکتا ہے؟ بخدا تو مر بھی جائے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ نہ یزید ایسا کر سکتا ہے۔ آپ کے آخری فقرہ پر یزید کو طیش آ گیا اور وہ کہنے لگا "تم غلط کہتی ہو۔ مجھے اس کا اختیار حاصل ہے اور اگر میں چاہوں تو ایسا یقیناً کر سکتا ہوں" جناب زینبؑ نے فرمایا "جب تک اسلام کا دعویٰ رکھتا ہے تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتا، یہ اور بات ہے کہ علی الاعلان تو ہمارے مذہب سے خارج ہو کر کوئی دوسرا دین اختیار کر لے"۔ اس پر یزید کا غصہ اور بڑھا اور وہ کہنے لگا "مجھ سے تم ایسی باتیں کرتی ہو۔ دین سے خارج تو تمھارے باپ اور بھائی تھے۔" جناب زینبؑ نے جواب دیا کہ میرے باپ اور بھائی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۷

کے دین ہی کو بظاہر اختیار کر کے تُو اور تیرا باپ اور دادا مسلمان کہلائے۔" یزید اس کے بعد اور زیادہ سخت کلامی پر اُتر آیا۔ ناچار زینب کبریٰؑ کو یہ کہنا پڑا "یزید تُو ایک ظالم حاکم ہے اور اپنے جبر و تشدد سے ہم کو دبانا چاہتا ہے۔" آپ کے اس جواب سے یزید کو کچھ شرم دامنگیر ہوئی اور وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد جب شامی نے پھر اپنی درخواست کو دُہرایا تو یزید نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا اور کہا کہ "دور ہو خدا تجھے غارت کرے۔"[1]

ایک دفعہ دربار میں یزید نے حضرت امام زین العابدینؑ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اے علی بن الحسین تمھارے باپ نے میری قرابتداری کا خیال نہ کیا، میرے حقوق کو نظر انداز کیا اور میری سلطنت میں منازعت کی تو اللہ نے ان کے ساتھ وہی کیا جو تم دیکھ رہے ہو۔" امام نے اس کے جواب میں وہی آیت پڑھی کہ ما اصاب من مصیبۃ فی الارض و لا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا۔ مطلب یہ تھا کہ یہ تو عالم امکان میں لیل و نہار رہتا ہی ہے، کسی کی فتح اور کسی کی شکست۔ اس کو دلیل حقانیت نہیں سمجھنا چاہیے۔

اب یزید کو فتح کی ترنگ اور بڑھی۔ یہ اس کی نفسیاتی خلش کا اثر تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ خود میرے دربار میں ہر شخص مجھے مجرم سمجھ رہا ہے۔ وہ صفائی کی کوشش کرنے لگا جو مزید اس کے خبث نفس کا ثبوت بن گئی۔ وہ اپنے خاندان کی مدت دراز کی اس سیاست کو کہ آلِ رسولؐ سے عوام کو ناواقف رکھا جائے فتح کے نشہ میں خود شکستہ کر رہا تھا۔ اس نے کہا "تم لوگ جانتے ہو ان پر یہ مصیبت کیوں آئی؟ صرف اس لیے کہ یہ اپنی جگہ سمجھتے تھے کہ میرے باپ علیؑ اس (یزید) کے باپ سے بہتر اور میری ماں اس کی ماں سے بہتر اور میرے نانا اس کے نانا سے بہتر تھے اور میں خود اس سے بہتر اور خلافت کا اس سے زیادہ مستحق ہوں۔ حالانکہ ان کا یہ خیال کہ ان کے باپ میرے باپ سے بہتر تھے۔ اس کا تصفیہ یوں ہو جاتا ہے کہ میرے باپ اور ان کے درمیان جھگڑا ہوا تو دنیا کو معلوم ہے کہ اس کا فیصلہ کس کے موافق ہوا۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۵۔ ارشاد ص ۲۶۲

بیشک ان کا یہ کہنا کہ ان کی ماں میری ماں سے بہتر تھیں اور یہ بھی کہ ان کے نانا میرے نانا سے بہتر تھے یقیناً درست ہے اس لیے کہ کوئی مسلمان رسولؐ کا مدِ مقابل دوسرے کو نہیں سمجھ سکتا مگر قرآن کی یہ آیت ان کے پیش نظر نہ تھی کہ سلطنت کا مالک اللہ ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلب کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ وہ ہر شئے پر قادر ہے۔

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ اوصاف امتیازی کے مقابلہ میں یزید نے اپنی شکست کا اقرار کر لیا مگر آخر میں دلیل وہی قہر و غلبہ کی پیش کر دی جس کی بناء پر نمرود، فرعون اور شداد تک بے جرم و خطا ثابت کیے جا سکتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ یہ معیار حقانیت نہیں ہے نہ قرآن کی آیت کا یہ مطلب ہے۔

خاندان بنی امیہ کا ایک شخص یحییٰ بن الحکم ان حالات سے اتنا متاثر ہوا کہ علانیہ اس نے اپنے اشعار میں حسینؑ کی شہادت پر اظہار رنج و ملال اور ابن زیاد کو برا کہنا شروع کر دیا۔ اس پر یزید نے یحییٰ کے سینہ پر ہاتھ مارا اور کہا، خاموش نہیں رہتے ہو؟[1]

اتنا ہی نہیں بلکہ یزید کی بیوی ہند بنت عبداللہ بن عامر بن کریز تو دربار میں نکل آئی کہ ارے رسولؐ کی بیٹی فاطمہؑ کے لال کا سر اور اس طرح؟[2] پھر بھی ایسا نہیں ہوا کہ اہل بیت نبوت کو فوراً مدینہ روانہ کر دیا جاتا بلکہ وہ عرصہ تک زنداں میں قید رہے، بے شک جب ملک میں بے چینی کے آثار نظر آئے اور سیاسی طور پر اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اب اس نے اہل بیت رسولؐ کو رہا کر دیا اور ان کے لیے ایک مکان خالی کرا دیا جس میں دمشق کی خاص خاص گھرانوں کی عورتوں نے آکر اہل بیت حسینؑ کو حسینؑ کا پرسہ دیا اور تین دن تک امام مظلومؑ کا ماتم برپا رہا۔[3]

نعمان بن بشیر انصاری کو جو جناب مسلم بن عقیل کے ساتھ تشدد نہ کرنے کے حکم

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۵ [2] طبری ج ۶ ص ۲۶۹ [3] طبری ج ۶ ص ۲۶۷

میں کوفہ کی حکومت سے معزول کر دیے گئے تھے اور اس کے بعد سے وہ دمشق میں گویا نظر بند رکھے گئے تھے، آلِ محمدؐ کا ہمدرد سمجھ کر ہدایت کی گئی کہ وہ پس ماندگانِ حسینؑ کو عزت و احترام کے ساتھ مدینہ پہنچانے کا انتظام کریں۔[1]

اب یزید قتلِ حسینؑ سے اپنے کو بری ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اس لیے اس نے امام زین العابدینؑ کو تنہائی میں اپنے پاس بلایا اور کہا، کہ خدا ابنِ مرجانہ پر لعنت کرے۔ اگر براہِ راست آپ کے والد کا اور میرا سامنا ہو جاتا تو جو کچھ وہ فرماتے میں منظور کر لیتا اور کبھی ان کو قتل کرنا گوارا نہ کرتا۔ بہرطور خدا کو جو منظور تھا وہ ہوا۔ اب آپ مدینہ تشریف لے جائیے اور وہاں سے مجھے خط لکھتے رہیے گا اور جو بھی ضرورت ہو اس سے مجھے مطلع کیجیے گا۔[2]

اس کے بعد تیس آدمی نعمان بن بشیر کے ساتھ کیے گئے اور نعمان نے حسبِ ہدایت اہلِ بیتِ رسالت کے ساتھ راستے بھر پورے احترام کا برتاؤ رکھا اور ان کو مدینہ تک پہنچایا۔[3]

اس لٹے ہوئے قافلہ کے پہنچنے سے مدینہ میں ایک کہرام برپا تھا۔ پردہ نشین خواتین تک بے تابانہ گھروں سے نکل آئیں چنانچہ خاندان عبدالمطلب کی ایک خاتون کا یہ عالم تھا کہ وہ بال بکھرائے ہوئے درد انگیز نوحہ پڑھ رہی تھیں جس کا مضمون یہ تھا کہ روزِ قیامت رسولِ خداؐ کو کیا جواب دو گے جب وہ پوچھیں گے کہ تم نے میرے بعد میرے اہلِ بیتؑ سے کیا سلوک کیا۔ جن کا عالم یہ ہے کہ کچھ ان میں سے قیدی بنائے گئے ہیں اور کچھ خاک و خون میں آغشتہ ہوئے۔ کیا میری خدمات کا یہی صلہ تھا کہ تم میری اولاد کے ساتھ میرے بعد یہ سلوک کرو۔[4]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۵ [2] طبری ج ۶ ص ۲۶۶۔ ارشاد ص ۲۶۳ [3] الاخبار الطوال ص ۲۵۸
[4] طبری ج ۶ ص ۲۲۱

اکتیسواں باب

اسیری اہلِ حرم کے واقعات پر ایک جامع تبصرہ

گزشتہ واقعات کی روشنی میں پورے طور پر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یزید کو انکارِ بیعت کے بہانے صرف قتلِ حسینؑ ہی مقصود نہ تھا بلکہ حقیقتاً وہ اس روحانی مرکز کو فنا کرنا اور عوام کی نظروں سے گرانا چاہتا تھا جو تعلیماتِ اسلامی کا محافظ ہوتے ہوئے ناجائز اقتدار کے تصرفات میں کسی بھی حیثیت کے ساتھ تعاون نہ کر سکتا تھا اور اسکی تمام ذمہ داری دمشق کی مرکزی حکومت پر تھی جس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے مدینہ فرمان بھیجا۔ حاکمِ مدینہ کو بدلا، مکہ میں حاجیوں کے لباس میں فوج کے سپاہی بھیجے۔ ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا اور اسے اس مہم کو سر کرنے کا پورا اختیار دیا۔ اگر یہ سب باتیں حکمِ یزید سے نہ ہوئی ہوتیں تو ابن زیاد اہل بیت کو دمشق نہ بھیجتا، کوفہ میں ہی قید رکھتا پھر اس کے اطلاع دینے کے بعد اگر یزید کو اہل بیتِ رسالت کی تذلیل و توہین مدِنظر نہ ہوتی تو قید کر کے شام بلانے کی کوئی وجہ نہ تھی بلکہ کربلا یا کوفہ ہی سے وہ مدینہ روانہ کر دیے جاتے۔ شہادت امام حسینؑ تک تو بفرضِ محال مان بھی لیا جائے کہ یزید کو اطلاع نہ تھی اور وہ ابن زیاد کا ذاتی فعل تھا مگر شہادتِ حسینؑ کے بعد تو ابنِ زیاد نے پس ماندگانِ حسینؑ کو اسی غرض سے کوفہ میں ٹھہرائے رکھا کہ ان کے متعلق یزید سے ہدایات حاصل کیے جائیں۔ چنانچہ اس کے بعد سے جو کچھ عملدرآمد ہوا وہ تو صراحتہً یزید کے احکام کے بعد ہوا۔ پھر بھی کیا اس خیال کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے کہ سرائے شہداء اور اہلِ حرم کا قید کر کے دمشق بھیجنا بھی ابن زیاد کا ذاتی فعل تھا۔

پھر اگر یزید کو خواہ مخواہ ان حضرات کی توہین منظور نہ ہوتی تو کوئی مکان پہلے سے مہیا کیا جاتا اور اسی میں اہل بیتِ رسالت کو اتارا جاتا اور یزید نے پہلی ہی بار عزت و احترام کے ساتھ سید سجاد علیؑ

بن الحسینؑ سے ملاقات کی ہوتی۔ مگر تاریخیں متفق ہیں کہ اہلِ حرم شام بلوائے گئے۔ یزید نے دربارِ عام اور نامحرموں کے مجمع میں اسرائے آلِ محمدؐ کو طلب کیا۔ اور کچھ نہ ہوا ہوتا تو اہلِ بیت کی یہی کیا کم بیحرمتی تھی جو بلا واسطہ یزید ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی نہ کہ مزید برآں چوب خیزران اور سرِ حسینؑ کے ساتھ بے ادبی! یہ وہ قیامت خیز منظر تھا کہ جس پر مسلمان تو مسلمان عیسائی بھی احتجاج کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ ان تمام مظالم کا موقع خود امام حسینؑ نے دیا۔ اہلِ حرم کو اپنے ساتھ رکھ کر، اسی لیے یہ امام کے عمل کا نازک ترین پہلو سمجھا گیا ہے۔ جس سے مشورہ دینے والے منع کرتے تھے مگر حسینؑ نے ان کا اپنے ساتھ رکھنا ضروری سمجھا تھا۔

حالانکہ عام طور پر میدانِ جنگ میں عورتوں اور بچوں کا کسی فریق کے ساتھ موجود ہونا اس کے حفاظتی اور مدافعتی مشکلات بہت بڑھا دیتا ہے اور فریقِ مخالف کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دیتا ہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

الھفی بقرّیٰ سجل حین احلیت علینا الوکایا والعدوا لمباسل

(یعنی) "افسوس ہے کہ اس جنگ کے میدان میں ہمارے خلاف فوج کشی کی، ہمارے ساتھ کی عورتوں اور سخت دشمن دونوں نے مل کر"

اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام حسینؑ اپنے ساتھ اہلِ حرم کو لے کیوں گئے۔ جہاں تک کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے امام حسینؑ نے کسی مشورہ دینے والے کے ان خیالات کو رد نہیں کیا جو آئندہ کے خطرات کے متعلق وہ پیش کرتے تھے۔ پھر بھی آپ نے ان کا ساتھ لے جانا ناگزیر بتایا۔ کبھی یہ کہہ کر کہ "منظورِ الٰہی یہی ہے کہ یہ قید ہوں" اور کبھی یہ کہہ کر کہ جو مقدر میں ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ امام حسینؑ تمام خطرات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اہلِ حرم کا اپنے ساتھ لے جانا ضروری سمجھتے ہیں اور اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے ساتھ رکھنے کو آپ کے مقصد کی تکمیل میں بڑا دخل تھا۔ اور وہ یہ کہ براہِ راست حضرت امام

حسینؑ کو نادی ذرائع اختیار کرتے ہوئے کسی سلطنت سے متصادم ہونا مقصود نہ تھا۔ آپ کا نقطۂ نظر یہ نہ تھا کہ خود تختِ حکومت پر بیٹھ کر مال و منال اور لذتِ حیات دنیا سے متمتع ہوں بلکہ آپ محض حقانیت کے تحفظ میں حمایتِ باطل سے بچتے ہوئے یزید کی بیعت سے انکار فرما رہے تھے۔ اور اس انکار پر اپنی آخری سانس تک قائم رہنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ تاکہ آپ کا یہ انکار دنیا کی آنکھوں کے سامنے حقیقت کے واضح ہونے کا ایک ذریعہ بنے اور وہ یزید کے افعال و اعمال کو آج اور کبھی شریعتِ اسلام کا جزء نہ سمجھ لے۔ اس کے لیے بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ آپ کی مقاومت کے کسی عنصر کے متعلق غلط توجیہوں کی اشاعت کرنا فریقِ مخالف کے لیے ناممکن ہو جائے۔ اور آپ کی شہادت عظمیٰ کو کسی "پراسرار حادثہ" کی شکل نہ دی جا سکے، اس لیے کہ اس صورت میں حقانیت کے دوامی تحفظ میں رخنہ پڑنے کا پورا پورا امکان باقی رہ جاتا۔ یہ مقصد امام حسینؑ کا اہل حرم کے ذریعہ سے انتہائی کامیابی کے ساتھ پورا ہوا اور آپ کی حقانیت و مظلومیت اتنی نمایاں ہو گئی کہ بنی امیہ کی کوئی تاویل، کوئی ملمع کاری اور سیاسی شعبدہ بازی اس کو مشتبہ نہ بنا سکی۔

تاریخ کی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ بنی امیہ نے ایک زبردست چال بنی ہاشم کے مقابلہ میں یہ چلی تھی کہ عثمان کو بحیثیت مظلوم پیش کیا اور اس خون کی ذمہ داری غلط طور پر بنی ہاشم اور بالخصوص حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ پر عائد کر دی، اس کے لیے عثمان کا خون بھرا کرتا اور ان کی زوجہ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں مدت تک مسجدِ جامع دمشق میں مجمع کے سامنے پیش کی جاتی رہیں اور مجمع ان کو دیکھ کر آہ و زاری کرتا اور سر و سینہ پیٹتا تھا۔ اس طرح ایک بہت بڑی جماعت کے دلوں کو اہلبیت رسولؐ سے منحرف کیا گیا اور آلِ ابوسفیان نے مقتول کے ورثا بن کر لوگوں کی ہمدردی حاصل کی۔ یہ پروپیگنڈا اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ آلِ بنی ہاشم میں اولادِ ابوسفیان کے ہاتھوں ایک ایسا غم انگیز حادثہ نہ ہو جائے جو ہمدردی کے اثرات کو معکوس کر دے۔ حقیقتاً امام حسینؑ کو شہید کر کے دشمن خود قہری طور پر اس کام کے انجام پانے کا ذریعہ بن گیا جس کا بنی امیہ اپنے جوشِ ظفر یابی میں ابتداءً اندازہ بھی نہ کر سکے۔ وہ روزِ عاشور تک اپنے اقدامات کے جواز

میں قتل عثمان کے واقعہ کا حوالہ دیتے تھے مثلاً حسینؑ اور آپ کے ساتھیوں پر پانی بند کرنے کی سند جواز اسی کو قرار دیا کہ اس کے پہلے عثمان پر پانی بند کیا جا چکا ہے، اس لیے یہ اس کا بدلا ہے۔ حالانکہ عثمان پر پانی بند کرنے میں بنی ہاشم کا کوئی ہاتھ نہ تھا مگر پروپیگنڈا تو یہی کیا گیا تھا لیکن پہلے تو خود کربلا ہی میں جوانوں، نوجوانوں اور سب سے آخر میں شش ماہہ بچہ کی شہادت سے مظالم کا درجہ اتنا اونچا ہو گیا کہ اب عثمان کا نام لینا بھی انسانی انصاف کی نگاہ میں غیر متوازن بات ہو گئی اور پھر اہل بیت اطہار کی اسیری نے تو آل رسولؐ کی مظلومیت کو اس نقطۂ معراج تک پہنچا دیا۔ جس کے بعد ہواخواہان بنی امیہ کی زبانیں بند ہو گئیں۔ اور انھیں پھر عثمان کے واقعۂ قتل کا نام لیتے ہوئے بھی شرم دامنگیر ہونے لگی۔ لطف یہ ہے کہ عثمان کی قمیص خون آلود اور ان کی زوجۂ مکرمہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی نمائش تو خود مقتول والی جماعت کے ہاتھوں سے ہوئی تھی جس کے ساتھ اس کا کوئی ثبوت نہ تھا کہ اس کا مرتکب کون ہوا ہے لیکن حسینؑ کے سر بریدہ اور ان کے اہل بیت اطہارؑ کی اسیری کی نمائش خود ان ہی ظالموں کے ہاتھ سے ہو رہی تھی جو اس ظلم کے مرتکب تھے اس لیے اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو کہیں اور ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس دنیا کی بھی جو اس کے پہلے جناب عثمان سے ہمدردی رکھنے کی وجہ سے آل ابوسفیان کے ساتھ اور بنی ہاشم سے منحرف تھی ہمدردیاں منقلب ہو گئیں۔ وہ اب بنی ہاشم کی غم خوار بن کر آل ابوسفیان سے منحرف ہو گئی۔ اگر امام حسینؑ اہل حرم کو ساتھ نہ لاتے تو حقیقت واقعہ اور اموی ذہنیت کا اس درجہ انکشاف غیر ممکن تھا۔

تاریخ اسلام میں یہ مثال موجود ہے کہ اس کے پہلے حسنؑ بن علیؑ زہر سے شہید کر دیے گئے مگر اس وقت تک حکومت بنی امیہ کے زور حکومت سے مرعوب یا سیاسی چالوں سے فریب خوردہ تاریخوں میں یہ مسئلہ مشتبہ بنا رکھا گیا ہے کہ اس سازش کی پوری ذمہ داری کس پر ہے؟ اسی طرح کربلا کے بے آب و گیاہ میدان میں بہتر یا سوا سو آدمی جنھیں چاروں طرف سے فوج آہنی حصار میں اس طرح محصور کر لیا گیا تھا کہ کسی آدمی کا آنا جانا بلکہ خبروں تک کی آمد و رفت ناممکن تھی۔

جب قتل ہو جاتے تو کسی کو کیا خبر ہوتی۔ بس ادھر قاتلوں کی زبانیں ہوتیں اور اپنی بے جرمی کی داستانیں اور ادھر سے کوئی جواب دینے والا نہ ہوتا۔ اس طرح حسینی مسلک مشتبہ بنا دیا جاتا اور نوعیت شہادت بالکل ہی بدل دی جاتی۔

اس صورت میں حسینؑ اپنے جان و مال اور اولاد سب کو حقانیت کے احیاء میں صرف تو کرتے لیکن نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ تاریخ کے اوراق اور کتب سیر کے صفحات میں یزید کے لیے مثل دیگر جنگ آزما ہستیوں کے غازی اور مجاہد کا لقب استعمال کیا گیا ہوتا۔ اور پیکر حقانیت حسینؑ بن علیؑ کے لیے (معاذ اللہ) مفسد اور باغی کے سے غلط الفاظ صرف کیے گئے ہوتے۔ اس طرح صرف امام حسینؑ ہی نہیں بلکہ آپ کے ساتھ حقانیت و صداقت بھی قتل ہو جاتے جس سے بڑھ کر حسینؑ کی شکست نہ ہو سکتی تھی۔

امام حسینؑ کے نزدیک آپ کی شہادت کے بعد آپ کے فلسفۂ شہادت اور حقانیت و صداقت کی تبلیغ کا قابل اطمینان کوئی ذریعہ ہو ہی نہ سکتا تھا۔ سوا ان ہی بے والی و وارث مخدرات عصمت کے جو قیدی بنا کر شہر بشہر پھرائی جا رہی تھیں، جن کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی۔ جن کی رگوں میں علوی اور فاطمی خون جوش کھا رہا تھا۔ جن کی زبانوں پر اظہار حق کی خاطر نبوی بلاغت اور علوی فصاحت الفاظ کی صورت میں موج زن تھی یا پھر علیؑ بن حسینؑ جن کو مشیت باری نے شدت مرض کی بناء پر نصرت حسینؑ سے روز عاشور میدان جہاد میں حصہ لے سکنے سے شاید اسی غرض سے باز رکھا تھا۔

امام حسینؑ خوب واقف تھے کہ بنی امیہ حدود انسانیت سے کتنا ہی گزر جائیں پھر بھی وہ بے والی وارث خواتین کو قتل کرنے کی ہمت نہ کر سکیں گے جن کا قصور زیادہ سے زیادہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے انتہائی اضطراب اور پریشانی کے عالم میں حکومت کے مظالم پر صدائے فریاد بلند کی۔

یہ صحیح ہے کہ روز عاشورا دشمنوں کے ہاتھ سے بعض عورتیں اور بچے بھی شہید ہوئے

تھے مگر معرکۂ جنگ کے خصوصیات دوسرے مواقع پر بطور سند پیش نہیں کیے جا سکتے بلکہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ یزید و ابن زیاد اپنے تمام ظلم و جور اور پست فطرتی اور بہیمیت کے باوجود اس پر قادر نہ تھے کہ وہ معرکۂ کربلا کے بعد اہل حرم حسینؑ میں سے کسی ایک فرد کو بھی قتل کرا دیتے۔ ہرگز ان میں اتنی جرأت و ہمت باقی نہ تھی اور نہ ان کے گرد و پیش کی فضا اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ چنانچہ کوفہ میں جب جناب زینب کبریٰؑ نے اپنی باطل شکن تقریر سے اموی حکومت کے فسق و فجور اور خبث و شقاوت کو طشت از بام کر دیا تھا تو ابن زیاد نے چاہا بھی تھا کہ آپ کو تازیانہ سے اذیت دے مگر اسی کے دربار والوں میں سے عمرو بن حریث سامنے آ گیا تھا اور مزاحم ہوا تھا۔

بعد کو یزید کا قتل حسینؑ کی ذمہ داری ابن زیاد پر عائد کرنا خود احساس شکست کی بنا پر تھا مگر چونکہ اہل حرم حسینؑ کے ساتھ بھی انتہائی بدسلوکیاں کی جا چکی تھیں لہٰذا اس کے افعال کی بابت کسی تاویل کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ جس کی بنا پر مورخین کو یہ سمجھنا پڑا کہ اگر اس کے دل میں قبل اسلام کے کینے اور بدر کی عداوتیں نہ ہوتیں تو وہ سر امام حسینؑ کا احترام کرتا اس کے کفن و دفن کا حکم دیتا اور اہل بیت رسالت کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا۔

بتیسواں باب

اُسرائے اہل بیتؑ کے مختصر حالات

اب جبکہ اسیری کے حالات بھی بیان ہو چکے اور اس کے نتائج پر بھی تبصرہ ہو گیا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کے قبل کے باب میں شہدائے کربلا میں سے ہر ہر فرد کے حالات پیش کیے جا چکے ہیں۔ اسی طرح یہاں اسیرانِ کربلا میں سے نمایاں افراد کے حالات بھی علیحدہ علیحدہ درج کر دیے جائیں۔

۱۔ علیؑ بن الحسینؑ:

زین العابدینؑ اور سید سجادؑ آپ کے مشہور القاب تھے۔ آپ امام حسینؑ کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ آپ کے ذریعہ سے قدرت کو عرب اور عجم کے کمالات کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا اس لیے کہ شہربانو یعنی آپ کی والدۂ گرامی یزدجرد آخری بادشاہِ ایران کی بیٹی تھیں۔ ۳۷ھ میں آپ کی ولادت ہوئی[1] جب کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کوفہ میں مسندِ خلافت پر متمکن تھے اور ابھی آپ کا سن پورے تین سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۱ رمضان ۴۰ھ کو علیؑ ابن ابی طالبؑ کی شہادت واقع ہوئی۔ پھر آپ پورے بارہ سال کے نہ ہوئے تھے کہ ۲۸ صفر ۵۰ھ کو آپ کے چچا حسن مجتبیٰؑ زہر دغا سے شہید کر دیے گئے۔

۶۰ھ میں آپ کی عمر ۲۲ سال سے کچھ زائد تھی جب ۲۸ رجب کو اپنے والد بزرگوار امام حسینؑ کے ساتھ عراق کے لیے روانہ ہوئے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ راستے میں یا کربلا

---

[1] کافی جلد ۱ ص ۴۹۶۔ ارشاد ص ۲۰۰

پہنچنے کے بعد کہاں آپ بیمار ہو گئے - بہرصورت - ۱۰ محرم ۶۱ھ کو امام حسینؑ کی شہادت کے موقع پر آپ اس قدر بیمار تھے کہ نشست و برخواست مشکل تھی اور ظاہر ہے کہ ساتویں محرم کو پانی بند ہونے کے بعد پھر آپ کو بھی تشنگی کی مصیبت اٹھانا پڑی جس سے ضعف و اضمحلال میں اضافہ ہو ہی جانا چاہیے تھا - اس کا نتیجہ تھا کہ آپ نصرتِ حسینؑ میں اس طرح شرکت نہ کر سکے جس طرح آپ کے دوسرے بھائیوں نے کی - مگر قدرت کو آپ کا امتحان دوسری طرح لینا منظور تھا - عاشور کے بعد آپ دشمنوں کے ہاتھوں، بہنوں، پھوپھیوں اور دیگر عزیز خواتین کے ساتھ پا بہ زنجیر ہو کر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے جائے گئے - دربار ابن زیاد میں آپ کی گفتگو اور یزید کے روبرو آپ کے پرزور احتجاج کا تذکرہ اس کے پہلے کیا جا چکا ہے - شام سے رہائی کے بعد آپ مدینہ میں رہے اور پوری زندگی عبادتِ خدا میں گزار دی - آپ کی عبادت کے متعلق وارد ہے کہ جب آپ نماز کے لیے وضو کرتے تھے تو چہرہ آپ کا زرد ہو جاتا تھا اور کوئی اس کا سبب دریافت کرتا تو آپ فرماتے تھے، تم کو نہیں معلوم کہ کس کی بارگاہ میں حاضری دینے جا رہا ہوں[1] ترکِ دنیا اور سادگی میں آپ کی زندگی حضرت امیرؑ کی سیرت کا نمونہ تھی - اسی کے ساتھ مدت العمر آپ احکامِ شرع اور علومِ اہل بیتِ نبوت کی خاموشی کے ساتھ تعلیم بھی دیتے رہے - پھر پوشیدہ طریقہ پر راتوں کو غریبوں اور مسکینوں کے لیے کھانا بھی پہنچایا کرتے تھے - اس طرح کہ خود انھیں بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ کون دے گیا ہے - جب آپ کی وفات ہوئی اور لوگوں کو آذوقہ پہنچنا بند ہوا اس وقت پتہ چلا کہ وہ آپ تھے جو دے جاتے تھے[2]

فرزدق کا قصیدہ آپ کی شان میں جو مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر انھوں نے نظم کیا تھا[3] ادبِ عربی کا ایک مخصوص شاہکار ہے - خود آپ کی دعاؤں کا مجموعہ "صحیفۂ کاملہ" کے نام سے عالم اسلامی میں مشہور و معروف ہے جس میں معارف کا دریا موجیں مارتا نظر آتا ہے - اس کو "زبورِ آلِ محمدؐ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے -

---

[1] ارشاد ص ۲۷۲ [2] کافی ج ۱ ص ۲۹۶، ارشاد ص ۲۷۵ [3] ارشاد ص ۲۷۶

افسوس ہے کہ آپ کی اس خاموش اور خالص روحانی زندگی کو بھی طاغوتی سلطنت نے برداشت نہ کیا اور آپ نے ۹۴ھ[1] یا ۹۵ھ میں زہر سے وفات پائی اور جنۃ البقیع میں اپنے چچا حضرت امام حسنؑ کی قبر کے پاس دفن ہوئے۔[2]

۲۔ زینبؑ بنت علیؑ:

آپ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ اور جناب فاطمہ زہراؑ بنت محمد مصطفےٰؐ کی بڑی بیٹی اور پیغمبر اسلامؐ کی بڑی نواسی تھیں۔ اس حیثیت سے آپ پسماندگان حسینؑ میں سب سے نمایاں شخصیت کی حامل تھیں۔ جب آپ کے جدِ بزرگوار حضرت محمد مصطفےٰؐ اور والدۂ گرامی جناب فاطمہ زہراؑ کی وفات ہوئی تو آپ بہت کمسن تھیں۔ ان کے بعد آپ اپنے والد ماجد حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے سایۂ تربیت میں پروان چڑھیں اور حضرت نے آپ کی شادی اپنے حقیقی بھتیجے عبداللہ بن جعفر کے ساتھ کی۔

حضرت علیؑ محبت و شفقت کے لحاظ سے زینبؑ کے ساتھ تقریباً حسنؑ و حسینؑ کے برابر برتاؤ کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی شہادت کے قبل ماہ رمضان میں آپ نے افطار کے دنوں کو جو اپنی اولاد پر تقسیم فرمایا وہ اس طرح کہ ایک رات امام حسنؑ کے یہاں افطار فرماتے تھے۔ ایک رات امام حسینؑ کے یہاں اور ایک رات عبداللہ بن جعفر کے مکان پر یعنی اپنی صاحبزادی جناب زینبؑ کے یہاں۔[1]

واقعۂ کربلا تک کم و بیش پچاس برس کی طولانی مدت میں غیر معمولی واقعات پیش آئے اور ان میں آپ نے غیر معمولی قوت برداشت کے مناظر کا کم از کم تین زندہ مثالوں میں برابر مشاہدہ فرمایا۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر آپ کے کردار بلند کی وہ مستحکم عمارت قائم ہوئی۔ جسے کربلا کے مصائب بھی ذرہ بھر متزلزل نہ کر سکے۔

مدینہ سے لے کر کربلا تک زینبؑ ہر منزل میں بالکل حسینؑ کے ساتھ تھیں اور اس لیے

---

[1] طبری ج ۸ ص ۹۵ [2] ارشاد ص ۲۷۰

اب تک کے جتنے واقعات اس کتاب میں درج ہوئے ہیں ان سب کو زینب کبریٰؑ ہی کی روئداد حیات سمجھنا چاہیے۔

ان میں سے بعض واقعات میں آپ کا ذکر صفحۂ تاریخ پر نمایاں طور سے نظر آتا ہے۔ چنانچہ قیام کربلا کے بعد ایک موقع وہ ہے جب بہن نے بھائی کی زبانی وہ حسرت آمیز اشعار سنے جن کا مطلب یہ تھا کہ زمانہ کا انداز صبح و شام یہی ہے کہ کوئی نہ کوئی لقمۂ اجل ہوتا ہے اور ہر ذی روح کو اسی راستے پر جانا ہے۔ ان اشعار سے زینب کبریٰؑ نے محسوس کیا کہ بھائی خود اپنی سنا رہے ہیں۔ وہ بیتابانہ بھائی کے پاس آئیں اور کہا ہائے کاش میں دنیا سے گزر چکی ہوتی۔ ارے آج محسوس ہو رہا ہے کہ میری ماں کا سایہ سر سے اٹھا۔ میرے باپ اور میرے بھائی حسنؑ آج ہی مجھ سے چھٹ رہے ہیں۔ آپ ہی تو اب ان سب کے جانشین ہیں۔ امام حسینؑ نے بہن کو تلقین صبر فرمائی۔ زینبؑ نے کہا، کیوں بھائی، کیا بالکل آپ مرنے پر تیار ہو گئے ہیں؟ حضرت نے ایک عربی کی مثل زبان پہ جاری فرمائی کہ لوترك القطا ليلا لنام۔ مطلب یہ تھا کہ اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ یہ سن کر جناب زینبؑ کی بے چینی اور بڑھی اور کہا "ہائے غضب! اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو زبردستی ہم سے چھین لیا جائے گا" یہ کہہ کر اپنے منہ پر طمانچے مارے، گریبان چاک کیا اور غش کھا کر گر پڑیں۔ امام کسی طرح بہن کو ہوش میں لائے اور بصیرت افروز الفاظ میں بہن کو صبر کی ہدایت فرما کر قسم دی کہ میرے بعد گریباں نہ پھاڑنا، منہ نہ نوچنا اور واویلا کہہ کر نوحہ نہ کرنا۔ پھر بہن کو لے جا کر اس جگہ بٹھا دیا جہاں زین العابدینؑ بیماری کے عالم میں لیٹے ہوئے تھے[1] تاکہ پھوپھی بھتیجے کی تیمارداری میں مصروف ہو جائیں اور ان کی توجہ اسی طرف مرکوز رہے۔

زینب کبریٰؑ نے اپنے بھائی کی اس وقت کی ہدایتوں کو سخت سے سخت مواقع پر بھی پیش نظر رکھا اور مصائب کی انتہائی شدت کے باوجود ایسی بے تابی کا مظاہرہ نہیں کیا کہ دشمنوں کو شماتت کا موقع ملے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۳۹۔ ۲۴۰۔

پھر نویں محرم کی عصر کو جب فوج دشمن نے حملہ کیا ہے تو جناب زینب ہی تھیں جنھوں نے پاس آکر امام حسینؑ کو اس صورتِ حال کی طرف متوجہ کیا۔

روزِ عاشور جب امام رخصت کے لیے تشریف لائے تو آپ نے جناب زینبؑ ہی سے وہ پیراہن لے کر پہنا جسے جا بجا سے چاک کر لیا تاکہ دشمن لوٹنے کے وقت بوسیدہ ہونے کی وجہ سے شاید اس پیراہن کو نہ لیں اور لاش آپ کی برہنہ نہ ہو۔

اس کے بعد زینب کبریٰ کی آنکھوں کے سامنے وہ مناظر پیش آئے جن کا تصور بھی لرزہ براندام کرنے کے لیے کافی تھا۔ بھائی کی شہادت، خیموں کی لوٹ اور پھر آتش زدگی اور اس کے بعد اسیری، ان تمام مراحل کو جناب زینبؑ نے ضبط و صبر کے ساتھ طے کیا۔

۱۱ محرم کی صبح کو جب پس ماندگان حسینؑ قیدی بنائے جا چکے اور لٹا ہوا قافلہ کوفہ کی طرف روانہ کیا گیا تو قتل گاہ سے ہو کر گزرا کہ جہاں افواجِ یزید کے مقتولین کو دفن کیے جانے کے بعد شہدائے راہِ خدا کی لاشیں بے غسل و کفن خاک و خون میں آلودہ چھوڑ دی گئی تھیں۔

اس جگر خراش منظر سے بیمار و ناتواں علیؑ بن الحسینؑ کا وہ عالم ہوا کہ جسے دیکھ کر جناب زینبؑ بے تاب ہو گئیں اور دریافت کیا کہ اے یادگارِ رفتگاں، یہ تمھاری کیا حالت ہے کہ روح تمھارے جسم سے پرواز کیا چاہتی ہے؟ بھتیجے نے جواب دیا، اے پھوپھی اس منظر کو دیکھ کر کس طرح برداشت کروں کہ میرے پدر بزرگوار اور چچا اور بھائی غرض کہ تمام عزیز و اقارب کو دیکھ رہا ہوں کہ سب کے سب اس میدان میں اپنے خون میں نہائے بے دفن و کفن پڑے ہیں اور کوئی ان کا نگراں ہے نہ پرسان۔ اس نازک موقع پر جناب زینبؑ ہی کا کام تھا کہ انھوں نے امام زین العابدینؑ کو تسلی اور دلاسا دیا۔

اس کے بعد کوفہ کا بازار، حالانکہ اس سے پہلے آپ نے کسی مجمع میں کوئی تقریر نہ کی تھی مگر جب آپ نے ماحول کے انتہائی خلاف ہونے کے باوجود تقریر شروع کی (جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے) تو جتنا مجمع آپ کے حدِ نظر میں تھا آپ کے ایک اشارے پر خاموش

ہوگیا۔ اس تقریر میں آپ نے اپنی اندوہناک حالت کا تذکرہ نہیں کیا اور نہ اس بنا پر ان سے کسی رحم وکرم کی التجا کی بلکہ ان کی بداعمالیوں پر سیر حاصل تبصرہ فرماتے ہوئے ان کو اپنے نفوس کا جائزہ لینے اور ان کے متعلق خود فیصلہ کر لینے کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ وہ آنکھیں جو قیدیوں کا تماشا دیکھنے کے لیے ان کی طرف اٹھی تھیں زمین میں گڑ گئیں اور مجمع میں ہر متنفس اپنے کو مجرم محسوس کرنے لگا۔

پھر دربارِ عام میں جب خاص طور پر ابن زیاد نے گفتگو کی تو وہاں بھی آپ نے علوی فصاحت وبلاغت کے وہ جوہر دکھائے جن کا اپنے طریقہ پر ابن زیاد کو بھی اعتراف کرنا پڑا اور جن کا اس کے پاس سوا ارادۂ تشدد کے کوئی جواب نہ تھا۔

اس کے بعد پھر دربارِ یزید میں آپ کی گفتگو جس کا ذکر بھی پہلے ہو چکا ہے کوئی شک نہیں کہ ایسے سخت اور ناخوشگوار ماحول میں اپنے سکون دماغ کو قائم رکھنا اور اپنے محسوسات کے پورے اظہار پر قادر ہونا بس زینب کبریٰؑ کا کام تھا۔ رہائی کے بعد ظالم کے دارالسلطنت میں مظلوم کا ماتم برپا کرنا بھی آپ ہی کا کارنامہ تھا۔ اور یہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد پہلی مجلس عزا تھی جو اسی سوگوار بہن نے برپا کی تھی۔

۳۔ امِ کلثوم بنتِ علیؑ:

زینب صغریٰ نام اور امِ کلثوم کنیت تھی[1] حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ اور جناب فاطمہؑ بنت محمد مصطفےٰؐ کی چھوٹی بیٹی۔ رسول اللہؐ کے زمانہ کے آخر میں متولد ہوئی تھیں اور تقریباً دو سال کی عمر میں اپنے نانا رسولِ خداؐ اور اس کے چند ہی مہینے کے بعد اپنی والدۂ گرامی کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئیں۔ اپنے چچا زاد بھائی محمد بن جعفر بن ابی طالب کے ساتھ آپ کا عقد ہوا تھا۔

---

[1] ارشاد ص ۱۸۹

بیوہ ہونے کے بعد سے آپ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہیں اور اسی دوران میں اپنے شفیق باپ کی شہادت سے انتہائی درجہ دل شکستہ ہوئیں۔ آخری رات جس کی صبح کو حضرت علیؑ کے سر پر ابن ملجم نے تلوار لگائی حضرت اپنی اسی بیٹی کے مہمان تھے اور اس رات کے تمام حالات جناب ام کلثوم ہی کی زبانی وارد ہوئے ہیں۔ جب علیؑ بن ابی طالبؑ کے سر مبارک پر ضربت لگ چکی ہے اور آپ بیت الشرف میں لائے گئے ہیں اور اس کے بعد زہر کی تاثیر بڑھ رہی ہے تو خصوصیت کے ساتھ ام کلثوم شدت سے گریہ کر رہی تھیں[1]

دینوری نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ جب حضرت امام حسینؑ مدینہ کی سکونت ترک فرما کر مکہ تشریف لے گئے تھے تو آپ کی دونوں بہنیں زینبؑ اور ام کلثومؑ آپ کے ساتھ تھیں[2]

بازارِ کوفہ میں زینب کبریٰ کے خطبہ کے بعد آپ نے بھی بصیرت افروز تقریر فرمائی تھی۔

۴۔ رقیہؑ بنت علیؑ بن ابی طالبؑ:

آپ عمر بن علیؑ کی حقیقی بہن بلکہ انھیں کے ساتھ تو ام پیدا ہوئیں۔ آپ کی والدہ ام حبیب بنت ربیعہ تھیں[3]

آپ کا عقد مسلم بن عقیل کے ساتھ ہوا تھا۔ مدینہ سے اپنے شوہر کی معیت میں حضرت امام حسینؑ کے ساتھ چلی تھیں۔ جب مسلم مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ کر دیے گئے تھے تو آپ اپنے بھائی امام حسینؑ کے ساتھ گئیں۔ مکہ سے روانگی کے بعد راستے میں آپ کو اپنے شوہر کی شہادت کی اطلاع ہوئی تھی اور کربلا پہنچ کر روز عاشور آپ نے

---

[1] ارشاد ص ۸ - ۹ [2] الاخبار الطوال ص ۲۲۰ [3] ارشاد ص ۱۸۹

اپنے صاحبزادے عبداللہ بن مسلم بن عقیل کو امام پر نثار کر دیا تھا۔ پھر اسیری میں اپنی دونوں بہنوں زینبؑ و ام کلثومؑ کے ساتھ روح فرسا مصائب و آلام کا مقابلہ کرتی رہیں اور رہائی کے بعد ان ہی کے ساتھ مدینہ واپس گئیں۔

۵۔ لیلیٰ ثقفیہ:

آپ علی اکبرؑ (ابن الحسینؑ) کی والدہ محترمہ تھیں۔ آپ کے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات کا تذکرہ علی اکبرؑ کے حالات میں ہو چکا ہے۔ آپ معرکۂ کربلا میں موجود تھیں اور اسیری میں دختران علیؑ و فاطمہؑ کے ساتھ مگر اس کے بعد سے آپ کے حالات زندگی کا تاریخ میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

۶۔ رباب بنت امراء القیس کلبی:

آپ علی اصغر اور سکینہؑ بنت الحسینؑ کی والدۂ گرامی تھیں۔ آپ میدان کربلا میں موجود تھیں اور اسیری میں بھی شریک لیکن رہائی کے بعد آپ نے مدینہ جانے سے انکار کر دیا اور ایک سال تک قبر حسینؑ پر خیمہ لگا کر مجاور کی حیثیت سے مقیم رہیں جس میں شب و روز مجلس گریہ و بکا اور نوحہ و ماتم میں مصروف رہتی تھیں۔[1]

ایک سال کے بعد مدینہ واپس ہوئیں۔ یہاں بھی آپ نے امام حسینؑ کا ماتم برپا کیا اور عرصہ دراز تک وہ ان کی کنیزیں اور ان سے وابستگی رکھنے والی خواتین نوحہ و زاری میں مصروف رہیں۔[2]

۷۔ فاطمہ بنت الحسینؑ:

آپ کی والدہ اُمِ اسحٰق بنت طلحہ بن عبداللہ تیمیہ تھیں۔[3]

---

[1] اصابہ معرج ۴ ص ۱۱۳ [2] کافی ج ۱ ص ۲۹۶ [3] ارشاد ص ۲۶۹

شیخ مفیدؒ نے لکھا ہے کہ امام حسنؑ کے فرزند حسنؑ (مثنیٰ) نے اپنے چچا حضرت امام حسینؑ سے آپ کی دو صاحبزادیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ عقد کی خواستگاری کی۔ حضرت نے فرمایا کہ ان دونوں میں سے جس کے ساتھ تم کہو تمھارا عقد کیا جائے۔ حسنؑ نے شرم سے سر جھکا لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ حضرت نے فرمایا، اچھا میں خود تمھارے لیے اپنی لڑکی فاطمہ کو منتخب کرتا ہوں کیونکہ وہ میری مادرِ گرامی فاطمہؑ بنتِ رسولؐ سے زیادہ مشابہ ہے[1]

حضرت امام حسینؑ کو اپنی صاحبزادی پر اتنا اعتماد تھا کہ جب آپ میدانِ کربلا میں بعزمِ جہاد تشریف لے جا رہے تھے تو چونکہ آپ کے فرزند امام زین العابدینؑ شدتِ بیماری سے غش میں تھے آپ نے مخصوص تحریری امانتیں ایک سربمہر بند لفافہ میں اور وصیت نامہ دونوں کو فاطمہ کے سپرد فرمایا۔ بعد میں فاطمہ نے یہ چیزیں اپنے بھائی کو سپرد کیں[2]

آپ واقعۂ کربلا کے بعد عرصہ تک زندہ رہیں اور راویانِ احادیث میں آپ کا شمار ہے۔ آپ کے صاحبزادے عبداللہ المحض آپ کے واسطہ سے نقلِ حدیث کرتے تھے[3]

آپ اپنے بھائی حضرت امام زین العابدینؑ کے ساتھ خلوص و محبت رکھتی تھیں اور اپنی اولاد کو حضرت کے پاس بیٹھنے اور استفادہ کرنے کی ہدایت کرتی تھیں[4]

آخر میں آپ کو اپنے شوہر حسنؑ بن حسنؑ کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ آپ نے ایک سال تک ان کی قبر پر اپنا خیمہ برپا رکھا[5] اور برابر دن کو روزہ رکھتی تھیں اور رات بھر نمازیں پڑھتی تھیں۔ جب ایک سال کامل ہو چکا تو خیمہ ہٹایا گیا اور آپ مدینہ واپس گئیں[6]

۸۔ سکینہ بنت الحسینؑ:

آپ رباب مادر علی اصغرؑ کے بطن سے تھیں۔ واقعۂ کربلا میں آپ بہت کم سن تھیں

---

[1] ارشاد ص ۲۰۱ [2] کافی ج ۱ ص ۱۷۹ و ۱۸۸ [3] کافی ج ۱ ص ۳۹۴۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۳
[4] ارشاد ص ۲۰۲ [5] بخاری ج ۱ ص ۱۴۷ [6] ارشاد ص ۲۰۳۔

واقعۂ کربلا کے بعد آپ کی زندگی کے جو حالات ملتے ہیں وہ معتبر و مستند طریقہ سے ثابت نہیں ہیں۔
جب کہ خواتین اہل بیت رسالت کا تذکرہ ہو رہا ہے تو بعض ایسی خواتین کا بھی یہاں ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو میدانِ کربلا میں خود تو موجود نہ تھیں مگر کربلا کے واقعات سے اہم تعلق رکھتی تھیں۔

۱۔ ام المومنین ام سلمہؓ زوجۂ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ ؐ:

آپ ازواجِ رسالتمآب ؐ میں انتہائی نیک نہاد اور مقدس و محترم بی بی تھیں آنحضرت ؐ نے ہجرت کے دوسرے سال جنگِ بدر کے بعد آپ سے عقد کیا تھا۔ رسول اللہ ؐ کی وفات کے بعد بھی ام سلمہؓ کو حضرت کے اہل بیت یعنی علیؑ بن ابی طالبؑ اور حسنؑ و حسینؑ کے ساتھ خاص الفت و محبت رہی۔ چنانچہ جنگ جمل کے موقع پر جب ام المومنین عائشہ نے حضرت علیؑ بن ابی طالب کے خلاف صف آرائی کی تھی اور اس کی خبر مدینہ پہنچی تھی تو ام المومنین ام سلمہ نے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے کہا کہ اگر میرے لیے گھر سے نکلنا شرعاً ممنوع نہ ہوتا اور مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ آپ اسے کبھی گوارا نہ کریں گے تو میں خود آپ کے ساتھ جنگ میں چلتی مگر کیا کروں مجبور ہوں کہ نکل نہیں سکتی۔

بہرحال اپنے فرزند عمر کو جسے میں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں میں آپ کے ساتھ بھیجتی ہوں۔ وہ آپ کی نصرت میں جنگ کرے گا۔ چنانچہ یہ برابر حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے ہمراہ رکاب رہے یہاں تک کہ آپ نے حکومتِ بحرین ان کو تفویض فرمائی جس پر وہ ایک عرصہ تک قائم رہے [۱]

ترمذی کی روایت ہے کہ ام سلمہ نے روز عاشور رسول اللہ ؐ کو خواب میں اس حالت سے دیکھا کہ آپ رو رہے تھے اور آپ کے سر و ریش مبارک پر خاک پڑی ہوئی تھی ام سلمہ

---

[۱] طبری ج ۵ ص ۱۶۷

نے سبب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "ابھی ابھی میرا حسینؑ قتل کر دیا گیا ہے۔"

صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق ام سلمہ کا وجود ۶۳ھ تک معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ نے اسی روز یعنی ۶۱ھ عاشور محرم کو انتقال فرمایا۔

۲۔ ام البنین زوجۂ امیر المومنین علیؑ بن ابی طالبؑ:

آپ کے نام و نسب اور خاندانی خصوصیات کا تذکرہ ابوالفضل العباس اور ان کے بھائیوں کے حالات کے ذیل میں آچکا ہے۔

جس ماں کے ایسے چار بیٹے ہوں اور وہ سب کے سب ایک ساتھ قتل ہو جائیں اس کے تاثرات زبان قلم سے کہاں ادا ہو سکتے ہیں۔ شرح کامل میں ابوالحسن اخطش عرب کے ایک بڑے ادیب کی زبانی یہ روایت درج ہے کہ واقعات کربلا سے مطلع ہونے کے بعد ام البنین روزانہ بقیع کی طرف عباس کے کم سن فرزند عبیداللہ کو ساتھ لے کر چلی جاتی تھیں اور وہاں عباس کا مرثیہ پڑھتی تھیں جو اتنا دردناک ہوتا تھا کہ مدینہ کے لوگ وہاں جمع ہو جاتے تھے حتیٰ کہ مروان بن الحکم کا سا خاندان نبوت کا دشمن بھی اکثر اس مجمع میں دکھائی دیتا تھا اور آپ کے پُردرد اشعار کو سنکر لوگوں کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے تھے۔

آپ کے یہ اشعار پر درد ہی نہیں بلکہ اس قوت نفس کے بھی حامل ہوتے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آپ عباس ایسے مجاہد راہ خدا کی ماں ہیں۔

چنانچہ آپ کے اشعار میں سے بعض تاریخ کے اوراق تک پہنچ کر ہماری نظر سے بھی گزرے ہیں جن کا مفہوم درج ذیل ہے۔

"کہاں ہیں اس منظر کے دیکھنے والے کہ جب میرا شیر دل عباس حملہ آور ہو رہا تھا، بھیڑیوں کے گلے پر اور اس کے پیچھے تھے حیدر صفدر (علیؑ بن ابی طالبؑ) کی اولاد میں سے کئی باہمت شیر ہائے افسوس کہ میرے فرزند کا سر گرز گراں سے شگافتہ

کیا گیا، اس وقت کہ جب اس کے دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے۔ اے عباس! مجھے یقین ہے کہ اگر تلوار تیرے ہاتھ میں رہتی تو کسی کی ہمت نہ تھی کہ تیرے قریب آسکتا۔"

"اے لوگو! اب مجھے "ام البنین" (فرزندوں کی ماں) نہ کہو، اس لیے کہ اس سے مجھے میرے شیر یاد آجاتے ہیں۔ میرے کبھی کئی بیٹے تھے جن کی طرف نسبت دیکر میں پکاری جاتی تھی۔ اب تو میرے بیٹے ہی نہیں رہ گئے۔ وہ چاروں جو مثل بازہائے شکاری کے تھے موت کے گلے میں باہیں ڈال چکے۔ نیزوں نے ان کے ٹکڑے کر دیے اور وہ سب زمین پر بے جان ہو کر گر گئے۔ کیا صحیح ہے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ عباس کے ہاتھ بھی قطع کر دیے گئے تھے۔"

جبکہ خواتین متعلقہ کربلا کا تذکرہ ہو رہا ہے تو اصحاب حسینی سے نسبت رکھنے والی ان خواتین کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن کا واقعاتِ کربلا میں کوئی کارنامہ تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے تاکہ واقعۂ کربلا کی ہمہ گیری کے سلسلہ میں اس کا پورا اندازہ ہو سکے کہ طبقۂ خواتین کا اس معرکہ میں کتنا حصہ ہے۔

۱۱۔ دلہم بنت عمرو:

یہ زہیر بن القین کی زوجہ تھیں۔ ان کا ذکر حضرت امام حسینؑ کے سفر عراق کے سلسلہ میں منزل زرود کے حالات میں آچکا ہے۔

یہ محترم خاتون اپنے شوہر کے ساتھ ۶۰ھ میں حج کو گئی ہوئی تھیں۔ ان کے شوہر زہیر اب تک خاندانِ رسولؐ سے کوئی خاص ربط ضبط نہ رکھتے تھے بلکہ عام طور سے عثمانی جماعت

میں سمجھے جاتے تھے مگر واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاتون کے دل میں مخفی طور پر سہی اہل بیتِ رسولؐ کے ساتھ عقیدت موجود تھی۔ اسی بنا پر جب منزل زرود میں حضرت امام حسینؑ نے زہیر کے بلانے کو آدمی بھیجا اور زہیر کو جانے میں تامل ہوا تو اس خاتون نے کہا کہ سبحان اللہ فرزندِ رسولؐ تمھارے بلانے کو آدمی بھیجیں اور تم نہ جاؤ۔ بڑے غضب کی بات ہے۔ ذرا جاکر سنو تو کہ حضرت کیا فرماتے ہیں۔ اسی بصیرت افروز فقرہ کا اثر تھا کہ زہیر گئے اور واپس آئے تو جان و دل سے امام کی نصرت پر آمادہ ہوکر۔ بے شک اس خاتون کو خود واقعۂ کربلا میں شرکت کا موقع نہیں ملا اس لیے کہ زہیر نے اسے اپنے ساتھ لے جانا پسند نہیں کیا بلکہ اسی منزل پر اسے طلاق دے کر اس کے میکے بھجوا دیا اور خود امام حسینؑ کے ساتھیوں میں شامل ہوگئے مگر اس کی محرک یہی خاتون تھی۔ اس لیے اسے واقعۂ کربلا کے تذکرہ میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۱۲۔ امِ وہب بنتِ معبد:

قبیلۂ نمر بن قاسط میں سے عبداللہ بن عمیر کلبی کی زوجہ تھیں۔ کوفہ میں قبیلۂ ہمدان کے مقام ثُبَیْرُ الجعد کے پاس ان کا مکان تھا جو کوفہ کی گنجان آبادی سے باہر نخیلہ کے حدود میں باغاتِ خرما کے قریب تھا۔ جب امام حسینؑ کے کربلا پہنچنے کی اطلاع ابن زیاد کو پہنچی اور اس نے اپنا لشکر گاہ نخیلہ میں قرار دیا اور عبداللہ نے اس فوج کشی کا سبب معلوم ہونے پر یہ ارادہ کیا کہ وہ حضرت امام حسینؑ کی مدد کو جائیں گے تو انھوں نے اپنے اس مبارک ارادہ کا ذکر اپنی اسی قابلِ اعتماد اور وفادار بیوی امِ وہب سے کیا۔ اس نے بغیر کسی تردد اور ہراس کے اپنے شوہر کی ہمت افزائی کی اور کہا "تم نے بالکل ٹھیک ارادہ کیا ہے۔ خدا تمھارے ارادہ میں برکت عطا کرے۔ ضرور ایسا ہی کرو اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ چنانچہ رات کے وقت دونوں روانہ ہوئے اور انصارِ حسین کے ساتھ کربلا میں جاکر ملحق ہوگئے۔

اس کا تفصیلی تذکرہ عبداللہ بن عمیر کلبی کے حالات میں ہوچکا ہے۔ طبقۂ خواتین میں یہی

وہ خاتون ہے جس کے بے گناہ خون نے شہدائے کربلا کے ساتھ کربلا میں جلتی ریت پہ بہہ کر اس مرقع کی دلدوزی اور دردانگیزی میں ایک مؤثر اضافہ کیا۔

سلام ہو اس خاتون پر جس نے مظلوم کی نصرت میں اپنے گھر بار، اپنے سہاگ اور پھر اپنی جان کو بھی نثار کر دیا۔

۱۳۔ زوجۂ مسلم بن عوسجہ:

فاضل سماوی نے لکھا ہے کہ بنی ہاشم کے علاوہ جتنے انصارِ امام حسینؑ تھے وہ کربلا میں اپنے اہل وعیال کو ساتھ نہ لائے تھے اس لیے کہ جو افراد مدینہ سے ساتھ آئے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ حضرت بیعتِ یزید سے بچنے کے لیے کیسے غیر اطمینانی طریقہ پر تشریف لیے جا رہے ہیں تو وہ اپنے ساتھ متعلقین کیوں لاتے اور جو لوگ راستے میں پہنچے یا کربلا میں آکر شریک ہوئے وہ دشمنوں کی ناکہ بندی سے بچتے ہوئے خود ہی کتنی مشکلوں سے جان بچا کر آئے تھے۔ پھر وہ اپنے ساتھ اپنے اہل وعیال کو کیونکر لا سکتے تھے۔

بس صرف تین آدمی تھے جو کربلا میں اپنے متعلقین کے ساتھ آئے تھے۔ ایک عبداللہ بن عمیر کلبی (جن کا ذکر ابھی ہو چکا) دوسرے حنادہ بن حارث سلمانی (ان کا ذکر ابھی آئیگا) تیسرے مسلم بن عوسجہ، یہ کربلا میں اپنے متعلقین کے ساتھ آئے۔ خود اصحابِ حسینؑ کے خیام کے ساتھ اپنا خیمہ لگایا اور عورتوں کو خیامِ حسینؑ میں اہلِ حرم کے پاس بھیج دیا چنانچہ جنگِ مغلوبہ میں قبلِ ظہر جب مسلم بن عوسجہ شہید ہوئے تو ان کی ایک کنیز نے بلند آواز سے روتے ہوئے کہا۔ "واسیداہ، وامسلم بن عوسجاہ" ہائے میرے آقا، ہائے مسلم بن عوسجہ" اسی آواز سے فوجِ شام کو یہ علم ہو سکا کہ مسلم شہید ہو گئے ہیں۔[1]

---

[1] ابصار العین ص ۱۲۸

۱۴۔ بحریہ بنت مسعود:

یہ جنادہ بن کعب انصاری کی زوجہ تھیں۔ اپنے شوہر اور بچہ کے ساتھ مکہ معظمہ سے حضرت امام حسینؑ کے قافلہ میں آئی تھیں۔ جب جنادہ بن کعب شہید ہو گئے تو انھوں نے اپنے نوعمر فرزند عمرو بن جنادہ کو نصرت حسینؑ کے لیے بھیج دیا۔ چنانچہ جب امام نے اجازت دینے میں تامل فرمایا اس بنا پر کہ ابھی تو اس کا باپ کام آیا ہے۔ اب اس کی بیوہ ماں کے دل پر کیا گزرے گی۔ تو بچہ نے کہا کہ مجھے میری ماں ہی نے تو بھیجا ہے اور انھوں نے ہی مجھے یہ جنگ کا لباس پہنایا ہے۔

جب یہ بچہ میدان میں جا کر اپنی قربانی پیش کر رہا تھا تو یہ مقدس خاتون اپنے خیمہ کے دروازے پر کھڑی اس منظر کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ بے رحم دشمنوں نے بچہ کا سر کاٹ کر فوج حسینی کی طرف پھینک دیا۔ تو ماں نے اس سر کو اٹھا لیا اور کہا "شاباش بیٹا شاباش! تو نے میرا دل خوش کر دیا اور میری آنکھوں میں ٹھنڈک ڈال دی"۔

پھر اس نے سر کو اٹھا کر فوج دشمن کی طرف پھینک دیا اور خود بھی ایک گرز آہنی لے کر حملہ کر دیا۔ امام نے حکم اسلامی یاد دلایا کہ عورتوں کو تلوار لے کر جہاد نہیں کرنا چاہیے تو وہ فرض شناس خاتون واپس چلی آئیں اور اہل حرم کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

قیاس کہتا ہے کہ مسلم بن عوسجہ اور جنادہ بن کعب دونوں کی متعلقہ خواتین اہل حرم حسینؑ کے ساتھ اسیری میں شریک ہوں گی مگر فاضل سماوی کی تحقیق یہ ہے کہ وہ کوفہ تک ساتھ رہیں اور کوفہ میں ان کے عزیز و اقارب ابن زیاد سے کہہ سنکر ان خواتین کو رہا کرا لے گئے۔ کوفہ سے شام تک جو لے جائی گئیں وہ صرف خاندان رسالت کی مقدس خواتین یا ان کے ساتھ ہمیشہ وابستگی رکھنے والی کنیزیں تھیں[1]۔

---

[1] ابصار العین ص ۱۳۲

تینتیسواں باب

گزشتہ واقعات کی روشنی میں حسینی شخصیت اور کارنامۂ حسینی پر تبصرہ

راہِ حق میں واقعۂ کربلا کے پہلے بھی بہت قربانیاں ہوئی ہیں مگر وہ انفرادی حیثیت رکھتی تھیں جیسے سقراط کا جامِ زہر پینا۔ جناب زکریا اور یحییٰ کا شہید کیا جانا (بقول نصاریٰ) حضرت عیسیٰؑ کا صلیب پر چڑھایا جانا اور بہت سے دوسرے انبیاء و مرسلین کا قتل کر دیا جانا مگر واقعۂ کربلا کی حیثیت اجتماعی تھی۔ جہاں حسینؑ کی قیادت و رہنمائی میں ایک جماعت مصروفِ کار تھی جس میں بچے بوڑھے اور جوان، آزاد اور غلام، عربی اور غیر عربی، قرشی اور غیر قرشی ہر سن اور ہر طبقہ کے افراد موجود تھے۔ جن میں مشترک نقطہ سوا ایک اتحادِ مقصد کے کچھ نہ تھا۔

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اتنے ہم دل اور ہم زبان، ہم خیال اور ہم آہنگ افراد دنیا میں نہ واقعۂ کربلا کے پہلے ایک نقطہ پر جمع ہوئے اور نہ اس کے بعد۔

حالانکہ جذباتِ انسانی میں ماحول اور سن و سال کے اختلاف سے کس قدر فرق ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جوان زیادہ تر اقدام پسند ہوتے ہیں اور جلد ہی میدانِ عمل میں کود پڑنا چاہتے ہیں۔ بوڑھے نسبتاً بردبار ہوتے ہیں اور ہر معاملہ میں بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں اور عورتیں زیادہ تر دل کی کمزور ہوتی ہیں اس لیے ہولناک موقع پر شدت سے متاثر ہو کر مردوں کے عزم و ارادہ کے بھی پست کر دینے کی باعث قرار پاتی ہیں۔ اور بچے تو ناموافق حالات میں رونے یا مچلنے ہی لگتے ہیں چنانچہ اگر کسی سخت موقع پر ایک مرد، ایک عورت، ایک بچہ اور ایک بوڑھا یکجا ہوں تو افتادِ طبع کے لحاظ سے ان کے رجحانات میں اتنا اختلاف ہوگا کہ ان میں کی ذمہ دار فرد کو کسی ایک راہِ عمل کے معین کرنے اور سب کو اس پر چلانے

ہیں کافی دقت محسوس ہوگی۔ چہ جائیکہ سو ڈیڑھ سو آدمیوں کی وہ جماعت جس میں ایک نہیں متعدد بوڑھے، متعدد جوان، متعدد بچے اور پھر ان کے علاوہ متعدد عورتیں موجود ہوں، اور پھر یہ تمام افراد بغیر کسی باہمی اختلاف یا کشمکش کے سخت سے سخت حالات میں بھی برابر سے شریکِ کار اور مصروفِ عمل ہوں تو اس کے متعلق بس یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے قائد کی قیادت عجیب تاثیر رکھتی تھی کہ اس نے جوانوں کے خون کی گرمی کو گھٹا کر اس میں بوڑھوں کے ساتھ ٹھہرنے کی صلاحیت پیدا کی اور بوڑھوں کی طبیعت میں حرارت پیدا کر کے ان کو جوانوں کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل بنایا۔ عورتوں کے دلوں میں اتنی قوت بھر دی کہ وہ شدید سے شدید ظلم و تشدد کے ہنگام میں پریشان و مضطرب نہ ہوں اور بچوں کی طبیعتوں میں وہ پختگی راسخ کر دی کہ ہولناک موقعوں پر بھی وہ رونے کے بجائے ہنستے نظر آئیں۔

امام حسینؑ کا یہ طریقۂ قیادت حقیقتاً ایک رازِ سربستہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ دشمنوں کے مقابلہ میں تو آپ نے بغرض اتمامِ حجت تقریریں کیں لیکن اپنے احباب و اعزہ میں جوشِ عمل پیدا کرنے کے لیے کوئی تقریر بھی نہیں کی بلکہ اس کے برخلاف آپ برابر ان کو اپنا ساتھ چھوڑ کر چلے جانے کی ترغیب دیتے رہے اور وہ سختی کے ساتھ آپ کی نصرت کا دم بھرتے رہے۔

اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بس امام حسینؑ کی مخصوص ذہنی تربیت تھی کہ حقانیت کی صحیح قدر و قیمت کا احساس اس طرح اُن کے دل میں اتار دیا تھا کہ وہ خود اپنے ضمیر کی تحریک سے قدم آگے بڑھانے پر گویا کہ اپنے کو مجبور پا رہے تھے۔ وہاں کسی خاطر داری اور مروّت یا دباؤ کا سوال نہ تھا بلکہ ان کی وہ جماعت تھی جو حق کو حق سمجھتے ہوئے راہِ حق پر گامزن تھی اور حقیقتاً ایسے ہی ساتھیوں کی حسینؑ کو ضرورت بھی تھی۔ اسی لیے آپ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت سے لیکر

شبِ عاشور تک ہر ہر موقع پر اپنی دشوار گزار مقاومت کے بظاہر ہولناک انجام سے اُن کو بار بار متنبّہ کرتے رہنے کو اپنا مستقل شعار بنا لیا تھا اور یہی آپ کا طریقہ کار تھا جس نے آپ کی مقاومت کو اعجاز کی حد تک کامیاب ثابت کر دکھایا۔

ایسا آج بھی ممکن ہے کہ دورانِ جنگ میں کسی فریق کی گولہ باری سے کوئی بستی بالکل تہس نہس اور ویران ہو جائے اور اس میں کوئی ایک متنفّس بھی زندہ باقی نہ رہے مگر ان لوگوں میں سے کہ جن کی جانیں اس گولہ باری کے ذیل میں ضائع ہو رہی ہوں گی۔ ناممکن ہے کہ ہر ایک اس مصیبت کے برداشت کرنے کا حقیقتاً آرزومند ہو اور خود اختیاری طور پر اس کو گوارا کر رہا ہو۔ ان میں سے بیشتر کا اگر بس چل سکے تو جس قیمت پر بھی ہو اپنے کو اس مصیبت سے بچا لیں مگر کربلا میں انصارِ حسینؑ میں سے ہر ایک خود ذاتی حیثیت سے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسلک کی حقانیت پر یقین کامل رکھتے ہوئے برضا و رغبت تمام آگے بڑھ رہا تھا۔ اس طرح کہ ان میں سے کسی ایک کے دامن عمل پر بھی کمزوری کا دھبّہ نہ آسکا۔

غداری اور مخالفانہ سرگرمی سے قطع نظر کرتے ہوئے کسی جماعت میں منسلک شدہ افراد کا باہم نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اختلاف رائے رکھنا عموماً قابلِ اعتراض عمل نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ عمل میں ہم آہنگی اور یک جہتی باقی نہیں رہتی لہٰذا مقصد اور نتیجہ تحریک کے استحکام پر اس کا بھی اثر بُرا پڑتا ہے مگر جماعت حسینی کے افراد میں باہم اختلاف رائے کا نام و نشان بھی نہ تھا بلکہ وہاں پوری جماعت نے اختیاری طور پر اور پورے شعور و ارادہ کے ساتھ اپنے تصور، خیال، ارادہ، عزم اور اقدام کو مستغرق کر دیا تھا۔ ایک انسان کے خیال، ارادہ اور اقدام کے اندر۔ اسی لیے یہ کہنا درست ہے کہ ایسے قائد اور ایسی جماعت کی مثال دنیا کے پردہ پر نظر نہیں آتی۔

جماعت میں سے ہر ایک رہنما کی ہستی اور اس کے مسلک پر جسے خود بھی اپنے دماغ و

عقل سے سمجھ چکا تھا، اپنے کو قربان کر رہا تھا اور رہنما ان میں سے ہر ایک کی مصیبت کو برداشت کرنے کے بعد اپنے کو سخت ترین موقع کی آزمائش کے لیے تیار پا رہا تھا۔ وہ سخت موقع وہ تھا جب آس پاس کوئی نہ رہا تھا اور صرف ایک اکیلے حسینؑ کی ذات تھی مگر اب بھی اس ایک اکیلے انسان کے عزم و ارادہ میں وہی جاہ و جلال اور استحکام تھا جو مددگاروں کے موجود ہونے کے عالم میں موجود تھا۔ چراغ بجھ گیا مگر اپنی روشنی چھوڑ گیا۔ وہ روشنی جو ہزاروں تاریکیوں کے پردہ میں اب تک جگمگا رہی ہے۔ کوئی شبہہ نہیں کہ ظلم اور تشدد کی آگ نے ابتدائے آفرینش سے آج تک لاکھوں بستیاں خاکستر کر دیں مگر مظلومیت میں کبھی شعور، اقتدار، اختیار اور فرائض کی بجاآوری میں اطمینان و سکون و وقار کا یہ مظاہرہ نظر نہیں آیا جو کربلا کے میدان میں نظر آ رہا تھا۔

سب سے پہلے جبروت و تشدد کے مقابلہ میں ظاہری حیثیت سے بے سروسامانی اور بے بسی کی جنگ کا نمونہ کربلا میں پیش کیا گیا اس لیے کہ اس کے پہلے طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہمیشہ ہوتا رہا تھا مگر طاقت کا مقابلہ کردار کی قوت سے کبھی نہیں کیا گیا تھا۔

اسی طریقۂ مقابلہ کو بہت ہی ناقص درجہ پر ہندوستان کی نجات کے لیے اختیار کیا گیا۔ مگر باوجودیکہ یہاں مقابل کے ظلم و تشدد کا درجہ اتنا سنگین نہ تھا جو بالعموم انسانوں کی بیش قیمت جانوں تک پہنچتا پھر بھی افراد میں وہ ہم رنگی و ہم آہنگی نظر نہ آسکی جو اس قسم کے مقابلہ کی کامیابی کا اصلی راز ہے۔

اس کے ساتھ واقعۂ کربلا میں یہ خاص خصوصیت تھی کہ وہاں طاقت کے مقابلہ میں بیکسی اور بے بسی کے باوجود بھی وہ "سپردگی" نہ تھی جو ظالم کی ہمت افزائی کی باعث ہو سکے بلکہ وہاں حفاظت خود اختیاری کے اس فطری آئین پر پورا عمل کیا جا رہا تھا جو اسلام کا بنیادی قانون ہے۔ اس طرح واقعۂ کربلا میں ایک ایسی

نوعیت پیدا ہوگئی تھی جسے دنیا آج تک نہ دہرا سکی ہے۔ نہ آئندہ کبھی دہرا سکے گی۔
اس مقابلہ کی عدیم المثال نوعیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کربلا کے میدان میں امام حسینؑ مخدراتِ عصمت اور اطفال خورد سال کو بھی اپنے ساتھ لائے جنھوں نے اپنے اپنے حدود کے اندر اس مجاہدۂ عظمیٰ میں نمایاں اور منظم حصہ لیا جس نے واقعۂ کربلا کے منفرد خصوصیات میں ایک بڑا اضافہ کر دیا جس کے متعلق گزشتہ ابواب میں سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا میں بوڑھے، جوان، بچے اور عورتیں سب ہی حقانیت کے تحفظ میں اپنے اپنے محل پر اپنا کام، فرض کے کامل احساس کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ جن کے لحاظ سے واقعۂ کربلا صرف دردانگیز اور جاں گسل واقعہ نہیں رہا بلکہ وہ مذہبی اخلاقی تعلیمات کا ایک بے مثال مرقع بن گیا جو اطمینان و سکون کے لمحات میں بھی اگر مرتب ہوتا تب بھی انتہائی تعریف کے قابل ہوتا چہ جائیکہ وہ ایسے پُر اضطراب عالم میں مرتب ہوا تھا جبکہ انسان کے ہوش بھی بجا رہنا مشکل ہیں۔

حسینی شخصیت کی بے نظیر رفعت

حسینؑ اپنے کردار کی بلندی میں منفرد ہوتے اس وقت بھی کہ جب یزید کی خلافت کے تمام عالم اسلامی میں تسلیم شدہ ہونے کے بعد تنہا انکار کی آواز ہی آپ نے بلند کی ہوتی لیکن اس وقت حسینؑ اور بھی بلند نظر آئے کہ جب آپ نے ہزاروں تلواروں نیزوں اور تیروں کے مقابلہ میں بھی اس انکار کو قائم رکھا۔ حسینؑ اس وقت بھی حسینؑ ہوتے جب آپ اکیلے قربانگاہ شہادت میں تنہا اپنی جان کا ہدیہ پیش کر دیتے۔ لیکن حسینؑ اور بھی بلند ہو گئے جب آپ نے اپنے ساتھ کم از کم بہتر قربانیاں اور بھی پیش کر دیں۔

حسینؑ بے شک حسینؑ ہی رہتے اگر آپ کسی جماعت کو پر جوش تقریروں کے ذریعہ سے

ترغیب و تحریص سے کام لیتے ہوئے اپنے ساتھ رکھنے میں کامیاب ہوئے ہوتے لیکن حسینؑ اور بھی بلند منزل پر نظر آئے کہ جب آپ نے اپنے ساتھ والوں کو اس قسم کی کسی صورت سے اپنے ساتھ رکھنے میں کامیابی حاصل نہیں کی بلکہ

آپ نے اپنی حقانیت کو اس طرح پر ان کے ذہن نشین کیا کہ ان میں سے ہر ایک حسینی عزم اور استقامت کا حامل ہو گیا یعنی عام طور پر تو ایک انسان کا اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھنا اور اپنے قدم کا مستقل رکھنا ہی ایک بڑا کارنامہ ہوتا ہے لیکن حسینؑ نے بہتّر آدمیوں کے دل و دماغ کو ایک مرکز پر جمع کر کے گویا ہر ایک سینہ میں اپنا دل اور ہر دل میں اپنا استقلال ودیعت کر دیا تھا۔ جسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ :-

حسینؑ ایک اکیلے میدانِ جہاد میں حسینؑ ہو کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ بوقت واحد بہتّر حسین میدانِ قربانی میں پیش کر رہے تھے۔ یعنی ایسے افراد جن میں ہر ایک قوم، قبیلہ اور سن و سال کے باہمی اختلاف کے باوجود اس ایک روح کا حامل تھا، جس روح کو ہم سوا لفظ "حسین" کے دوسرے کسی نام سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد حسینؑ اس وقت بھی حسینؑ ہی رہتے جب آپ اپنے اعزّہ و احباب کے داغ اٹھانے کے قبل جامِ شہادت نوش فرما لیتے لیکن حسینؑ اس وقت اور بلند سطح پر نظر آئے کہ جب آپ نے ان میں کی ہر فرد کو اپنے سامنے راہِ حق میں نثار کر دیا۔

پھر اس صورت میں بھی حسینؑ یقینی ایک مخصوص منزل پر ہوتے اگر اس کے بعد آپ بغیر مقابلہ کیے ہوئے اپنے کو نیزہ و شمشیر کے سپرد کر دیتے مگر حسینؑ اس وقت اس سے بھی بلند نظر آئے جب کہ ان ہی ہاتھوں سے جن پر ابھی ابھی طفلِ شیر خوار کا لاشہ اٹھا چکے تھے تلوار کے قبضہ کو مضبوط پکڑا اور مردانہ وار مقابلہ شروع کر دیا اور اس تنہائی کے عالم میں ہزاروں کے نرغے میں بھی آپ نے حمزہؓ و جعفرؓ اور حیدرِ صفدرؑ کے روایات کو زندہ کر دکھایا۔

حسینؑ اور بھی بلند منزل پر اس وقت نظر آتے ہیں جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ آپ نے

شدید سے شدید مصائب و آلام میں مبتلا ہونے کے باوجود شریعتِ اسلام کے عام فرائض و تعلیمات کو ایک لمحہ کے لیے نظر انداز نہیں فرمایا۔ چنانچہ اصحاب و اعزّہ کے لاشے اٹھانے کے ساتھ ساتھ غلاموں کے لیے بھی مساواتِ اسلامی کو برت رہے تھے جیسا کہ جونؓ غلام ابوذر غفاری اور غلام ترکی کے حالات میں درج کیا جا چکا ہے اور اس موقع پر بھی کہ جب آپ کے اصحاب ایک ایک کر کے شہید ہوتے جا رہے تھے اور جدال و قتال جاری تھا آپ نے نمازِ ظہر بجماعت ادا فرما کر احساسِ فرض کی بے نظیر مثال پیش کی۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ بوقت واحد آپ جہاد بھی کرتے جاتے تھے اور مقاصد جہاد کا عملی اعلان بھی۔

حسینؑ اس وقت بھی حسینؑ ہی رہتے کہ جب آپ صرف اپنے تمام اصحاب و اعزّہ کے ساتھ شہید ہو جاتے اور اپنے جہاد کو اپنی زندگی کے خاتمہ ہی پر ختم کرتے۔ مگر اس وقت حسینؑ میدانِ جہاد میں اور بھی بلند نظر آتے جب آپ نے اپنی شہادت کے بعد کے لیے اس شہادت کے مقاصد کی اشاعت کا انتظام کیا، اپنے اہلِ حرم اور چھوٹے بچوں کو ساتھ لا کر جن میں سے ہر ایک میں فرض شناسی اور حقیقت پروری اس طرح سرایت کیے ہوئے تھی کہ ابن زیاد کے دربار اور یزید کے قصرِ حکومت میں بھی ان پسماندگان میں سے کسی ایک متنفس نے اموی حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ یعنی وہ بیعت کا انکار جس پر حسینؑ کا سر نیزہ پر پہنچ گیا اب بھی قائم تھا۔ اور اب اس کے علمبردار سیّد سجادؑ، زینب خاتون، امِ کلثوم ہی نہیں بلکہ کمسن بچّے فاطمہ، سکینہ اور محمد باقرؑ بھی تھے۔

کردارِ حسینی کی لامتناہی رفعت کے مذکورہ بالا منازل میں سے ہر منزل وہ ہے جہاں انسانیت سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے اور اسی کو انتہائے امکان سمجھ لینے پر اکتفا کر لیتی ہے مگر حسینی عمل اس کے بعد بھی آگے بڑھتا ہی نظر آتا ہے اور آخر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی ذات تاریخ عالم میں ایک نئے انسانی تصور کا اضافہ کرتی ہے۔ وہ تصور جس کے خط و خال سمجھنے میں تیرہ سو برس سے اب تک دنیا مصروف ہے اور ابھی بہت کچھ سمجھنا اور سمجھ کر لفظوں میں بیان کر سکنا باقی ہے۔

چونتیسواں باب

فتح کس کی ہوئی؟

مادی نقطۂ نظر سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ معرکۂ کربلا کے نتیجہ میں یزید کو فتح ہوئی اور امام حسینؑ کو مکمل طور پر شکست ہوگئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی زبان و لغت میں بھی فتح پانے کے معنیٰ "قتل کر دینا" اور شکست کھانے کے معنی قتل کر دیا جانا نہیں قرار پا سکتے۔ بلکہ فتح نام ہے کامیابی یعنی مقصد کے حصول کا اور شکست ناکامی یعنی مقصد کے ہاتھ نہ آنے کا، لہٰذا معرکۂ کربلا کے نتیجہ کے متعلق کسی فیصلہ تک پہنچنے کے لیے طرفین کے مقاصد کو سمجھنا بہرحال ضروری ہے جیسا کہ پہلے ثابت کیا جاچکا ہے۔ یزید سے امام حسینؑ کو ذاتی اور شخصی اغراض کی بنا پر مخالفت نہ تھی۔ اگر بحیثیت ایک متنفس کے حسینؑ بس زندگانیٔ دنیا ہی کے خواہاں ہوتے اور یزید آپ کی دنیوی سیاست سے علیحدگی کو اپنے اقتدارِ سلطنت کے قائم رہنے کے لیے کافی سمجھتا تو عملی حیثیت سے کسی تصادم کا امکان ہی نہ ہوتا۔

مگر وہاں صورتِ حال یہ تھی کہ یزید مسلمانوں کے سروں پر بحیثیت ایک خود سر اور مطلق العنان فرمانروا کے مسلّط ہونے کے ساتھ ساتھ پیغمبرِ اسلامؐ کی نیابت کا دعویٰ دار تھا اور حسینؑ کے خاموشی کے ساتھ بیعت سے علیٰحدہ رہنے کو بھی وہ اپنے مقصد میں مزاحم سمجھتا تھا۔ وہ قبل اسلام کی مادہ پرستی کو پلٹانے کے لیے عملی طور سے کوشاں اور حسینؑ روحانیت اور خدا پرستی کو قائم رکھنے کے ذمہ دار، وہ جبر و ظلم اور استبداد کا سکہ چلانے کے درپے اور حسینؑ حق و راستی کا علم بلند کرنے پر مامور، وہ اسلامی حدود و امتیازات مٹانے پر تلا ہوا اور حسینؑ اسلامی خصوصیات کو باقی رکھنے کے فریضہ پر متعین تھے چنانچہ یزید نے

معرکۂ کربلا کے مقاصد کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے قہرمانی نقطۂ نظر کو بے نقاب کر دیا یہ کہہ کر کہ حسینؑ نے (عوام کو ان کے حقوق سے آگاہ کر کے) ہماری بلند عمارتوں اور آرائش و آسائش کے سامانوں کو خطرہ میں ڈال دیا تھا اس لیے ہمیں اپنے اقتدار اور دولت کو قائم رکھنے کے لیے جنگ کرنا پڑی۔ اور حسینؑ نے اپنی مقاومت کی نوعیت کو مندرجہ ذیل اشعار میں واضح فرمایا ہے جو ابن خشاب نے نقل کیے ہیں ؎

اللہ یعلم ان ما	بیدی یزید لغیرہ
وبانہ لم یکتسبہ	بخیرہ و بمیرہ
لو انصف النفس الحتوء	ن لقصرت من سیرہ
ولکان ذالک منہ اد	فیٰ شرہ من خیرہ

یعنی اللہ جانتا ہے کہ جو کچھ یزید کے پاس ہے وہ سب کا سب دوسروں کا ہے۔ خود اس کو کوئی استحقاق اس پر تصرف کا حاصل نہیں ہے۔ اگر وہ خیانت کرنے والا نفس انصاف سے کام لیتا تو اپنی رفتار بدل دیتا اور شرارت میں کمی کرتا۔

حسینؑ کا یہی نظریہ وہ تھا جس کا پھیلنا اور دوسروں کے دماغوں اور پھر زبانوں تک پہنچنا یزید کی تباہی کا باعث ہو سکتا تھا۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ استبدادی طاقت اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ افراد قوم کی قوتِ احساس اور جرأتِ اظہار ختم کی جائے۔

چنانچہ حکومت دمشق کی طرف سے ایسی ہی تدبیریں کی گئیں کہ عوام نے یہ سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ حکومت جائز ہے یا ناجائز اور اگر کوئی سوچتا اور سمجھ بھی لیتا تو اس میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ اپنے خیالات کا آزادی کے ساتھ اظہار کر سکتا۔ اس کے بالکل برخلاف امام حسینؑ کا مقصد یہ تھا کہ جمہور مسلمین میں قوت احساس اور جرأتِ اظہار کی صفتیں جو مفقود ہو گئی تھیں پھر سے پیدا ہو جائیں۔

حسینؑ اپنے بلند کردار سے ایک عام بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے جس کے ماتحت صرف طاقت و اقتدار کو حق نہ سمجھا جائے بلکہ اصل حق کو حق سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی طاقت پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ عام خیالات جس سطح پر قائم ہو جاتے ہیں اس سے اس وقت تک نہیں ہٹتے جب تک کہ فضائے دماغی میں ہلچل ڈالنے والا کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آتا۔

چنانچہ ۶۰ھ میں حکومتِ شام کے قبیح و مذموم افعال عام طور پر مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے پھر بھی ان پر ایک عام بے حسی چھائی ہوئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ امام حسینؑ کا ساتھ دینے والے بھی تعداد میں بہت کم تھے۔

لہذا فطری حیثیت سے ضرورت تھی کسی ایسے اچانک حادثہ کی بلکہ غیر معمولی واقعہ کی جو عام خلقت انسانی کی قوت احساس کو بیدار کر دے۔ چنانچہ امام حسینؑ کی شہادت نے اسی مقصد کو حاصل کیا۔

اسی کے ساتھ آپ کی عملی حیثیت سے نہایت شاندار مقاومت کی مثال نے ان میں پھر سے جرأت اظہار پیدا کر دی۔ بات یہ ہے کہ عام طور پر جب تک انسان میدانِ عمل میں کوئی صریحی مثال نہیں دیکھ لیتا ہے۔ اس وقت تک ہچکچاتا رہتا ہے لیکن مثال سامنے آجانے پر وہ خود بھی سرگرم عمل ہونے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

میدانِ کربلا میں نہ صرف حسینؑ ہی کو بلکہ بوڑھوں، جوانوں اور بچوں تک کو نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ اپنی اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھنے یا کانوں سے سن لینے والوں کے نزدیک راہِ حق میں موت کا مرحلہ پہلے سے بہت زیادہ آسان ہو گیا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اکثر وہی اسباب جن کے ذریعہ سے خاص طرح کا نتیجہ پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے حد سے بڑھ جانے پر توقع کے بالکل خلاف نتیجہ برآمد کرتے

ہیں جیسا کہ عرب کا مقولہ ہے الشیئ اذا تجاوز عن حدہ رجع الی ضدہ (یعنی) کوئی شئے جب اپنی حد سے تجاوز کرتی ہے تو اپنی ضد کی طرف مائل ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک جابر و قاہر حکومت کی طرف سے عوام پر اس پابندی کا عائد کیا جانا کہ اس کے طرزِ عمل کے خلاف آواز بلند نہ کی جائے زیادہ تر جبر و تشدد کی بنا پر ہوتا ہے لیکن یہی ظلم و تشدد جب حد سے گزر جاتا ہے تو پھر اسی دبی اور پسی ہوئی خلقت کی آواز ایک بے اختیار چیخ کے طور پر بلند ہوتی ہے جو آگے چل کر کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

یزیدی حکومت جو حسینؑ پر ظلم و ستم ڈھا رہی تھی وہ اسی غرض سے کہ آپ کے بظاہر عبرتناک انجام کو دیکھ کر پھر کسی کو ذرا بھی مخالفت کی جرأت نہ ہو اور امام حسینؑ اس کے تمام مظالم صبر و سکون کے ساتھ برداشت کر رہے تھے۔

نتیجۃً حکومت اپنے ذوقِ ستم رانی کے سبب سے یہ تمیز نہ کر سکی کہ ظلم و جور کو کس حد تک جبر کے دباؤ سے خلقت برداشت کرنے پر تیار کی جا سکتی ہے اور کس نقطہ تک پہنچ کر بظاہر وہ احساسات بھی پھر ہری لے کر چونک پڑتے ہیں اور شکنجۂ ظلم میں گرفتار اور بظاہر بے بس خلق خدا اس شدت سے پھڑپھڑاتی ہے کہ خود شکنجہ ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت امام حسینؑ یہ اعتماد کامل رکھتے تھے کہ آپ حقانیت کے تحفظ میں مصائب کا وہ غیر معمولی مقابلہ کر سکیں گے کہ خود ظلم و تشدد کے دست و بازو آپ کی قوتِ برداشت کے مقابلہ میں معطل و عاجز نظر آنے لگیں گے۔

حکومت کی توقع تو یہ تھی اور مظالم ڈھائے اسی لیے جاتے ہیں کہ دوسرے عبرت حاصل کر کے اس کے بعد ایسی جرأت نہ کریں گے اور حکومت کے منشاء سے کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے کا یہ دردناک انجام دیکھ کر کسی میں لب کشائی کی ہمت نہ

ہوگی۔ اسی خیال کے ماتحت پسماندگان حسینؓ کا لٹا ہوا قافلہ بحال تباہ شہر بشہر اور دیار بدیار تشہیر کیا گیا تھا۔ مگر اوراق تاریخ گواہ ہیں کہ نتیجۃً بالکل یزید کی توقع کے خلاف ظاہر ہوا جس کے آثار عین موقع جنگ ہی پر حرؒ بن یزید ریاحی کے لشکر شام سے جدا ہو جانے ہی سے نظر آنے لگے تھے۔ اور پھر شہادت حسینؓ کے بعد تیسرے ہی دن جب دربار ابن زیاد میں سر حسینؓ کے ساتھ بے ادبی کی جا رہی تھی تو بوڑھے صحابی زیدؓ بن ارقم نے سر دربار کھڑے ہو کر صدائے احتجاج بلند کی جس سے ظاہر ہو گیا کہ کربلا کے واقعہ سے حق گوئی کی جرأت کم نہیں ہوئی بلکہ زیادہ ہو گئی۔ پھر جب مسجد جامع میں لوگ جمع کیے گئے اعلان فتح سننے کے لیے تو باوجود یکہ وفاداروں کا خالص جماؤ تھا۔ پھر بھی حسینؓ اور آپ کے والد بزرگوار علیؓ بن ابی طالبؓ کا نام بے ادبی کے ساتھ آنا تھا کہ دفعتہً مسجد کی خاموش فضا میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی اور بوڑھے نابینا عبداللہ بن عفیف نے اس بے جگری کے ساتھ ابن زیاد کو ٹوکا جو تاریخ میں یادگار ہے۔

اسی طرح یزید نے اپنے دربار میں جب چوب خیزراں سے سر حسینؓ کے ساتھ بے ادبی کی تو ابو برزۂ اسلمی نیز سفیر بادشاہ روم نے جو عیسائی تھا اس کے منہ پر اس کو بہت کچھ سخت و سست کہا۔

یہ تھی حسینی فتح کہ باطل کے خلاف احتجاج ہونے لگا اور مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اپنے میں جرأت اظہار محسوس کرنے لگے تھے۔

معرکہ کربلا سے پہلے کس کی مجال تھی کہ یزید کے دربار میں امام حسینؓ کا نام عزت کے ساتھ لے سکے لیکن پس ماندگان حسینؓ کے قیدیوں کی صورت میں اس کے سامنے پیش کیے جانے کے بعد اس کے منہ پر حسینؓ کی تعریفیں ہوتی تھیں اور اس کو خاموشی کے ساتھ سننا پڑتا تھا۔

اس سب کے بعد نتیجہ کے لحاظ سے یہ ماننا لازمی ہے کہ حسینؓ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے لہٰذا وہ فاتح تھے اور یزید اپنے مقصد میں ناکام ہوا لہٰذا وہ یقیناً مفتوح تھا۔

پینتیسواں باب

مجرموں کی پشیمانی

فتح اور شکست کی ایک خاص شناخت یہ ہے کہ فاتح اپنے کارنامہ پر نازاں ہوتا ہے اور مفتوح اپنے طرزِ عمل پر شرمندہ و پشیمان۔ اب ظاہر ہے کہ حسینؑ جس راستے پر چلے تھے اس پر قائم رہے اور آپ نے جو کچھ کیا اور جو اس کا نتیجہ ہوا اس پر نہ آپ خود پشیمان ہوئے نہ آپ کے ساتھی۔ آپ کے پسماندگان اور آپ کے چھوٹے چھوٹے بچوں تک میں سے کوئی پشیمان ہوا نہ آپ کی اولاد یا آپ کے ماننے والوں میں سے کوئی آپ کے بعد پشیمان ہوا کہ حضرت امام حسینؑ نے ایسا کیوں کیا؟ جس کا نتیجہ آپ کی بربادی کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن آپ کے قاتل اور مخالف ہی نہیں بلکہ وہ بھی جنھوں نے عملی حیثیت سے آپ کی نصرت کا فرض ادا نہ کیا تھا یا نہ کر سکے تھے بعد میں پشیمان ہوئے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا۔

نفسیاتی حیثیت سے اظہارِ پشیمانی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے کبھی تو اس کے ماتحت اپنے طرزِ عمل کے متعلق تاویلوں اور عذر تراشیوں سے کام نکالا جاتا ہے اور کبھی اپنے سر سے ذمہ داری ہٹا کر دوسروں کے سر عائد کی جاتی ہے اور کبھی ندامت و افسوس کا صاف صاف اظہار کر دیا جاتا ہے۔

چنانچہ حقیقی معنی میں برمحل اور قابل صد ستائش اظہارِ ندامت حرؔ بن یزید ریاحی کا تھا جس کے ذیل میں انھوں نے روز عاشور نصرتِ حسینؑ کے اہم فریضہ کی پوری بجا آوری کرتے ہوئے اپنے بہتے ہوئے خون سے اپنی فردِ عمل کو دھو کر صاف بنا دیا اور سعادت شہادت حاصل کی۔ اس کے بعد جن جن لوگوں نے بھی اپنی اپنی پشیمانی کا اظہار مختلف

طریقوں پر کیا وہ بعد از وقت تھا۔

ان میں سب سے خفیف درجہ کے مجرم وہ اہل کوفہ تھے جنھوں نے مسلم بن عقیل کے واسطہ سے نصرتِ حسینؑ کا عہد و پیمان کیا تھا۔ مگر وقت آنے پر ان اسباب سے جن کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں ہو چکا ہے۔ کربلا نہ پہنچ سکے یا، پہنچنے کی کوشش نہ کی۔ ان کی پشیمانی نہایت سچے دل سے معرکہ کربلا کے بعد بہت جلد ہی وقوع میں آگئی جسے انھوں نے اپنی کوششوں سے بہ خونِ حسینؑ کا انتقام لینے کے لیے کی گئیں ایک قابل احترام درجہ دے دیا اور "توّابین" لقب حاصل کیا۔

ایسے مجرموں میں جنھوں نے فریضۂ نصرت کے ادا کرنے میں کوتاہی کی تھی۔ ایک عبداللہ بن الحر الجعفی تھا جسے راہِ کوفہ میں حضرت امام حسینؑ نے خود نصرت کی دعوت دی تھی مگر اس نے حیلہ و حوالہ سے اپنی جان بچائی[1] اور اس سعادت سے محروم رہا[2] اس پر اسے عمر بھر ندامت رہی جسے اس نے ان اشعار کی صورت میں ظاہر کرتے ہوئے کہا ؎

فیا لك حسرۃ ما دمت حیّا ۔۔۔ تردد بین حلقی والتراقی

حسین حین یطلب بذل نصری ۔۔۔ علی اھل العداوۃ الشقاق

فما النبی غداۃ یقول حزنا ۔۔۔ اتترکنی وتزمع للانطلاق

فلو فلق اللھف قلب حیّ ۔۔۔ لھم القلب ھنّی بانفلاق

(یعنی) تمام زندگی مجھے یہ رنج و ملال رہے گا کہ حضرت امام حسینؑ نے مجھ سے مدد طلب کی اور میں نے اس سعادت کو حاصل نہ کیا[3] پھر! واقعہ کربلا کے بعد جب ابن زیاد نے اس سے شکایت کی کہ تم عرصہ سے کہاں غائب تھے۔ تم نے حسینؑ کے مقابلہ کو جانے سے گریز کیا۔ معلوم ہوتا ہے تم ہمارے دشمنوں سے ہمدردی رکھتے تھے تو یہ سن کر اس کے جذبات میں اور زیادہ طوفان پیدا ہو گیا اور اب اس نے جو اشعار کہے ان میں سے دو شعر حسب

---

[1] ارشاد ص ۲۳۷ [2] الاخبار الطوال ص ۲۵۸

ذیل مقطعے سے

یقول امیر غادر حق غادر — الا کنت قاتلت الشہید ابن فاطمۃ
فیا ندمی الا اکون نصرتہ — الا کل نفس لا تسدد نادمۃ

"وہ امیر جو خود انتہائی غدار ہے مجھ سے پوچھتا ہے کہ تم فرزند فاطمہ زہراؑ کے خلاف جنگ میں شریک کیوں نہ ہوئے حالانکہ مجھے تو اسی کی ندامت ہے کہ میں نے ان کی نصرت کیوں نہ کی اور یقیناً جو شخص بھی صحیح راستہ نہ اختیار کرے اسے نادم ہونا ہی چاہیے۔"

اس کے بعد وہ کوفہ سے نکل کر سرزمین جبل کی طرف چلا گیا۔[1]

ان سے زیادہ مجرم وہ خلقت تھی جو حضرت امام حسینؑ کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان کربلا میں صف بستہ کھڑی تھی۔ چنانچہ ان میں سے بعض کے اظہار پشیمانی پر مبنی اقوال حسبۃ حسبۃ تاریخ نے ہم تک پہنچائے ہیں۔ مثلاً قرہ بن قیس کہ جو عمر سعد کے نمائندہ کی حیثیت سے امام حسینؑ کی خدمت میں آیا تھا واقعۂ کربلا کے بعد کہا کرتا تھا کہ اگر حر بن یزید نے مجھ کو مطلع کر دیا ہوتا کہ وہ جماعت حسینی کی طرف جا رہے ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ ضرور ہو لیتا۔[2]

اسی طرح رضی بن منقذ عبدی کہ جس نے میدان کربلا میں بریر ہمدانی پر حملہ کیا تھا اور بالآخر زیر ہونے پر کعب بن جابر بن عمرو ازدی کو اپنی کمک پر بلایا تھا اور اس نے بریر کو نیزہ مار کر قتل کر دیا تھا، واقعۂ کربلا کے بعد اپنی پشیمانی کا حسب ذیل اشعار میں اظہار کیا کرتا تھا۔

"مقدر میں اس طرح لکھا نہ ہوتا تو میں اس جنگ میں شریک ہی نہ ہوا ہوتا کہ ابن جابر کا احسان مجھ پر ہو سکتا۔ وہ دن میرے ہی لیے تمام عمر کے عار و ننگ کا باعث نہیں ہوا بلکہ متعدد نسلوں کی ذلت و خواری کا سبب ہو گیا۔ کاش بریر کے قتل اور حسینؑ سے مقاتلہ کے دن سے پہلے ہی میں مرکر قبر میں پہنچ گیا ہوتا۔"[3]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۷۰۔ [2] ارشاد ص ۳۴۹ طبری ج ۶ ص ۲۴۴ [3] طبری، ج ۶ ص ۲۴۸

شیث بن ربعی کو جو فوج ابن سعد کے بڑے سرداروں میں سے تھا یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ اللہ اس ملک والوں کو کوئی خیر نہیں پہنچائے گا۔ کتنے غضب کی بات ہے کہ ہم نے پانچ برس تک علیؑ بن ابی طالبؑ اور ان کے فرزند (حسن مجتبیٰؑ) کے ساتھ مل کر آلِ ابوسفیان سے جنگ کی۔ پھر اس کے بعد ان ہی کے فرزند حسینؑ کے مقابلہ میں جو اپنے ذاتی صفات کے لحاظ سے بھی تمام روئے زمین کے لوگوں سے بہتر تھے۔ ہم نے معاویہ اور زیاد کی اولاد کے ساتھ مل کر چڑھائی کر دی۔ یہ اتنی بڑی گمراہی تھی جس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتی۔[1]

ایوب بن مشرح حیوانی جس نے حر بن یزید ریاحی کے گھوڑے کو کربلا میں تیر مار کر قتل کیا تھا۔ عرصہ کے بعد جب وہ یہ روداد بیان کر رہا تھا تو حاضرین میں سے بعض نے پوچھا کہ کیا تم نے حر کو قتل بھی کیا تھا، کہا نہیں، بخدا میں نے انھیں قتل نہیں کیا۔ قتل کسی دوسرے نے کیا اور مجھے پسند بھی نہ تھا کہ میں انھیں قتل کروں۔ ابوالوداک (حاضرین میں سے ایک شخص) نے کہا کیوں؟ کہا عام خیال یہ ہے کہ وہ بہت نیک اعمال لوگوں میں سے تھے اب اگر ان کے مقابلہ میں ہاتھ اٹھانا گناہ تھا تو میں صرف زخمی کرنے اور مقابلہ میں کھڑے ہونے ہی کی حد تک گناہ گار ہوتا یہ بہتر تھا اس سے کہ میں ان میں سے کسی کے قتل کا مرتکب ہوتا۔ یہ سنکر ابوالوداک کو غصہ آگیا، کہا میرے نزدیک تو تم سے اللہ ان سب کے قتل کا مواخذہ کرے گا ارے کسی کو تیر لگایا، کسی کے گھوڑے کا خاتمہ کیا، کسی سے دست بدست مقابلہ کیا کبھی خود حملہ کیا اور کبھی دوسروں کو ترغیب دلائی اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنی موجودگی سے سوادِ لشکر میں اضافہ کیا اور جب حملہ ہوا تو میدان سے فرار کرنا گوارا نہ کیا اور تمھاری طرح دوسروں نے بھی یہی سب باتیں کیں تو تم سب ہی ان تمام شہداء کے قاتل ٹھہرے اور سب ہی کو اس جرم کی سزا ملنا ہے۔ ایوب کے پاس اس کا کوئی سنجیدہ جواب نہ تھا۔ وہ جل کر کہنے لگا کہ اچھا اگر تمھارے ہاتھ روز قیامت کا حساب ہو تو تم مجھے بھی کبھی نہ بخشنا۔[2]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۰ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۱

ان سے بھی بڑھ کر مجرم افواج یزید کا افسر عمر سعد تھا۔ اس کے تاثرات کا بیان حمید بن مسلم نے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عمر بن سعد میرا دوست تھا۔ جب وہ میدانِ کربلا سے واپس ہوا تو میں نے جاکر اس سے حالات دریافت کیے۔ اس نے کہا کچھ نہ پوچھ کوئی مسافر اپنی منزل کی طرف ایسے برے انجام کے ساتھ واپس نہیں ہوا ہوگا جیسے کہ میں۔ میں نے قریبی رشتہ داری کا پاس نہ کرتے ہوئے ایک جرمِ عظیم کا ارتکاب کیا۔[1]

اس سے بڑا مجرم حاکم کوفہ عبیداللہ بن زیاد تھا کہ جس نے تمام افواج کو اپنی نگرانی میں میدانِ کربلا کی طرف بھیجا اور عمر بن سعد کو قتلِ حسینؑ پر مامور کیا۔ وہ اپنے اس عمل سے متعلق ذمہ داری یزید پر عائد کرتا تھا۔ چنانچہ جب یزید کے مرنے پر عراق میں حکومت کے خلاف ہمہ گیر شورش برپا ہو گئی اور ابن زیاد کو بصرہ سے فرار اختیار کرنا پڑا تو اس نے قبیلہ بنی لیشکر میں سے ایک شخص کو راستہ بتانے کے لیے اپنے ساتھ لیا۔ اثنائے راہ میں ایک مرتبہ جب دیر تک ابن زیاد ناقہ پر سر جھکائے بیٹھا رہا تو اس شخص نے یہ خیال کرکے کہ وہ سو گیا ہے اس کو آواز دی۔ ابن زیاد نے جواب میں کہا کہ میں سو نہیں رہا ہوں بلکہ ایک اہم مسئلہ کے متعلق غور و فکر کر رہا تھا۔ اس شخص نے کہا، میں جانتا ہوں آپ کیا سوچ رہے تھے۔ پھر ابن زیاد کے دریافت کرنے پر اس نے بتلایا کہ "آپ حسینؑ بن علیؑ کے قتل کرا دینے پر خجالت و پشیمانی کا احساس کر رہے تھے اور بصرہ میں جو قصرِ ابیض تعمیر کرایا ہے اور اس میں رہنا نصیب نہ ہوا اس کے متعلق سوچ رہے تھے یا بصرہ کے خوارج کو جو محض بدگمانی اور توہم کی بناء پر آپ نے قتل کر دیا تھا اس پر پشیمان ہو رہے تھے۔" ابن زیاد نے جواب دیا کہ تم نے کوئی بات ٹھیک نہیں کہی۔ چونکہ حسینؑ بن علیؑ نے بادشاہ وقت کی مخالفت کی تھی اور اس نے مجھ کو ان کے قتل کرنے کا حکم دیا تھا لہٰذا اس کی ذمہ داری یزید بن معاویہ پر ہے مجھ پر نہیں ہے۔[2]

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۵۷ [2] طبری ج ۷ ص ۲۹

اسی پشیمانی کا نتیجہ تھا کہ جب یزید نے حجاز پر فوج کشی کرنا چاہی اور ابن زیاد کو لکھا کہ عبد اللہ بن زبیر کے مقابلہ کے لیے جاؤ تو اس نے انکار کر دیا اور کہا اس فاسق کے کہنے سے رسولؐ کے نواسے کو تو قتل کر چکا۔ اب کعبہ پر بھی فوج کشی کروں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔[1]

سب سے بڑا مجرم یزید بن معاویہ تھا جس کی تصدیق ابن زیاد کے یہاں سے ہو چکی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ اطلاع ملنے پر کہ حسینؑ کوفہ کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اس نے ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم اسی لیے مقرر کیا تھا کہ وہ انتہائی سخت گیری سے کام لے سکیگا۔ پھر جب ابن زیاد کے حکم سے مسلم بن عقیل شہید کر دیے گئے اور ان کا سر کاٹ کر یزید کے پاس بھیجا گیا تو یزید نے اس سے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ابن زیاد کے حسنِ خدمت کا اقرار کیا اور اس کو مزید ہدایت بھیجی کہ اب حسینؑ کا مقابلہ بھی اسی عنوان سے کیا جائے۔

پھر شہادتِ حسینؑ کے بعد ابن زیاد نے پہلے سر ہائے شہداء اور پسماندگانِ حسینؑ کی بابت یزید کی مرضی معلوم کر لی۔ اس وقت ان کو کوفہ سے دمشق کی طرف روانہ کیا اور تمام واقعات مظالم معلوم ہونے کے بعد یزید کی طرف سے ابن زیاد پر کوئی عتاب نہیں ہوا بلکہ وہ یزید کی زندگی کی آخری سانس تک کوفہ کے تختِ حکومت پر باقی رہا، اور یزید کی نوازشیں اسی پر نہیں بلکہ آلِ زیاد میں سے دوسرے افراد پر بھی اور زیادہ ہو گئیں۔ چنانچہ ابن زیاد کا ایک بھائی عبد الرحمٰن بن زیاد جو ۵۸ھ سے خراسان کا حاکم تھا۔ شہادتِ امام حسینؑ کو سننے کے بعد خراسان میں اپنی جگہ ایک دوسرے شخص کو قائم مقام بنا کر دمشق گیا اور خراسان کے خزانہ میں جو دو کروڑ درہم اس کے اقرار کے مطابق جمع تھے وہ اپنے نام معاف کرا لیے۔[2] پھر عبد الرحمٰن کے بعد خراسان کی حکومت اسی کے دوسرے بھائی مسلم بن زیاد کے سپرد کی گئی۔[3]

---

[1] طبری ج ۷، ص ۶ [2] الوزراء والکتاب ص ۱۸ [3] الوزراء والکتاب ص ۱۹ طبری ج ۶ ص ۲۷۲

ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ قتلِ حسینؑ یزید کے منشا کے مطابق اور اسی کے حکم سے عمل میں لایا گیا تھا، اسی بنا پر شروع شروع اس نے شہادتِ حسینی پر انتہائی شادمانی کا اظہار کیا لیکن اس کے بعد جب آثارِ انقلاب قوی سے قوی تر ہوتے گئے تو اس کا سارا نشہ ہرن ہوگیا اور وہ کفِ افسوس مل مل کر نہایت حسرت و یاس کے ساتھ کہنے لگا کہ "ہائے حسینؑ بن علیؑ کو قتل کرکے ابن زیاد نے مسلمانوں کی نظروں میں مجھ کو ذلیل و خوار اور قابلِ نفرت بنا دیا اور ان کے دلوں میں میری طرف سے کینہ و عداوت کے بیج بو دیے۔ قتلِ حسینؑ کو سنگین ترین جرم سمجھنے ہوئے مسلمانوں میں کے نیک و بد سب ہی مجھ سے بیزار ہو گئے۔ ہائے ابن مرجانہ (ابن زیاد) نے یہ کیا کیا۔ خدا اس پر لعنت کرے"[1]

انفعال و پشیمانی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی بات سے ہٹ جائے۔ امام حسینؑ اور یزید میں بنائے مخاصمت یہی تھی کہ یزید حسینؑ سے بیعت حاصل کرنے پر مصر تھا اور امام حسینؑ کو آخری حد تک انکار تھا۔ اب یہ تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے انکارِ بیعت کو اقرار سے تبدیل نہیں کیا۔ اس لیے کہ اگر ایسا کر دیا ہوتا تو سرِ نوکِ نیزہ پر نظر نہ آتا، مگر یہ دیکھنا ہے کہ یزید اپنے مطالبہ پر قائم رہا یا اس سے ہٹ گیا؟ یہاں پر یہ یاد کر لینا ضروری ہوگا کہ یزید کا حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ شخصی حیثیت سے نہ تھا بلکہ پیغمبرِ اسلام کے روحانی ورثہ دار کی حیثیت سے جب ایسا تھا تو جو حیثیت اپنی زندگی میں حسینؑ کو حاصل تھی وہی آپ کے بعد آپ کے فرزند علیؑ بن الحسینؑ کو حاصل ہوگئی تھی۔ پھر حضرت امام حسینؑ تو بنفسِ نفیس یزید کی گرفت میں کبھی نہ آسکے تھے اس لیے کہ یزید تھا دمشق میں اور حسینؑ تھے مدینہ، مکہ یا پھر کربلا میں، مگر آپ کے پسماندگان کے لیے ایسا وقت آیا کہ جب وہ سب کے سب قیدیوں

---

[1] طبری ج ۷، ص ۱۹

کی حیثیت سے یزید کے سامنے پیش کیے گئے۔ اگر یزید اپنے مطالبۂ بیعت پر قائم ہوتا تو اس کو علیؑ بن الحسینؑ کے سامنے اس سوال کو پھر پیش کرنا چاہیے تھا لیکن پس ماندگانِ حسینؑ میں سے کسی فرد کے سامنے بھی بیعت کا سوال پیش نہیں کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یزید اپنے مطالبۂ بیعت سے ہٹ گیا تھا۔ حالانکہ مظالم ڈھائے اسی لیے جاتے ہیں کہ کمزور فریق مرعوب و خوف زدہ ہو جائے مگر ابن زیاد کے دربار میں ایسا موقع پیش آچکا تھا کہ اس کے علیؑ بن الحسینؑ کو قتل کی دھمکی دینے پر آپ نے تیور بدل کر نحیف مگر عزم مستقل کی پوری ترجمانی کرتی ہوئی آواز میں کہا تھا "امّا علمت انّ القتل لنا عادۃ وکرامتنا الشہادۃ" (یعنی) کیوں ابن زیاد! ابھی تک تو نہیں سمجھ سکا کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہماری عزت ہے۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ ظلم اٹھانے والے ظلم کی سنگینی سے خوف زدہ نہیں ہوئے مگر ظلم کرنے والے ان کے صبر و استقلال کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ چنانچہ یزید میں اپنے تمام جبروت کے مظاہروں کے باوجود اب اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ پس ماندگانِ حسینؑ میں سے کسی کے سامنے سوالِ بیعت پیش کرتا۔ اس لیے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے حسینؑ کا سر بریدہ موجود تھا اور اس کے کانوں میں کربلا کے حالات گونج رہے تھے اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اگر سوالِ بیعت کہیں پھر کر دیا گیا تو دمشق کا دربار صحرائے کربلا بن جائے گا، لہٰذا دوسری طرح کی دل آزاریاں پسماندگانِ حسینؑ کے خلاف اختیار کی گئیں مگر سوالِ بیعت اٹھایا نہیں جا سکا۔ کیا اس سے بڑھ کر حسینؑ کی فتح اور یزید کی شکست کا دوسرا کوئی ثبوت درکار ہے؟

چھتیسواں باب

عالمِ اسلامی کے تاثرات

شہادتِ حسینؑ کے تفصیلات پر مطلع ہوتے ہی عالمِ اسلامی کے ہر فرد کے دل میں غم و غصہ کا طوفان برپا ہو گیا اور جو جو بھی اس کے ارتکاب کے ذمہ دار سمجھے گئے ان سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا جانے لگا اور قتلِ حسینؑ ان کے لیے رسوائی کی ایک سند بن گیا۔

چونکہ بظاہر حالات اس شہادتِ عظمیٰ سے اہلِ کوفہ کو قریب کا تعلق تھا لہٰذا ان کے دامن پر اس کا ایسا دھبہ لگا کہ صدیوں تک وہ دھویا نہ جا سکا، یہاں تک کہ ابوالعباس سفاح کے سامنے جب بصرہ اور کوفہ کی باہمی افضلیت کے بارے میں مناظرہ ہوا تو ابوبکر ہذلی نے کوفہ کی مذمت میں یہی چیز خاص طور سے پیش کی کہ یہاں کے لوگوں نے حسینؑ کو قتل کیا۔

ابوعثمان نہدی ایک صحابیٔ رسولؐ کوفہ میں رہا کرتے تھے۔ جب حسینؑ میدانِ کربلا میں شہید کر دیے گئے تو کوفہ سے وہ بصرہ کی طرف منتقل ہو گئے یہ کہہ کر کہ میں اس شہر میں نہیں رہوں گا جہاں رسول اللہؐ کا نواسا شہید کر ڈالا گیا ہو۔

پھر چونکہ کوفہ اور کربلا سرزمینِ عراق پر واقع ہیں لہٰذا عراق کے لیے بھی قتلِ حسینؑ باعثِ ذلت شمار کیا جانے لگا چنانچہ اہلِ عراق میں سے ایک شخص نے عبداللہ بن عمر سے دریافت کیا کہ حالتِ احرام میں مچھر مارنا جائز ہے یا نہیں؟ اس پر انھوں نے کہا کہ اہلِ عراق کو دیکھو یہ مچھر کے خون کے متعلق استفسار کرتے ہیں حالانکہ ان ہی لوگوں نے پیغمبرِ خداؐ کے نواسے کا خون بے دریغ بہا دیا۔ باوجودیکہ پیغمبرِ خداؐ

حسنؓ و حسینؓ کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ دونوں کائناتِ عالم میں میرے دو گلدستے ہیں[1]۔ شخصیتوں کے لحاظ سے شہدائے کربلا کے قاتلوں سے تنفر خود ان کے گھر والوں تک کو ہو گیا چنانچہ بریر ہمدانی کا قاتل کعب بن جابر جب اپنے مکان پر واپس ہوا تو اس کی بیوی یا بہن نوار بنت جابر نے کہا کہ میں تجھ سے اب عمر بھر بات نہیں کروں گی، تو نے فاطمہ زہراؑ کے فرزند کے خلاف جنگ میں شرکت کی اور سید القراء (بریر) کو قتل کیا۔[2]

ابن زیاد، جس نے براہِ راست کربلا کی طرف فوجیں بھیجی تھیں اس کے متعلق قبل اس کے کہ یزید کی سیاست میں کوئی تبدیلی واقع ہو اور وہ خود ابن زیاد کو قتلِ حسینؑ کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت شروع کرے۔ دوسرے لوگ اس کے درباریوں میں سے ابن زیاد کی ماں سمیہ کے حقارت آمیز تذکرہ کے ساتھ اسے برا کہتے تھے جسے یزید کو بہر حال خاموشی کے ساتھ سننا پڑتا تھا چنانچہ یحییٰ بن الحکم نے یزید کے پہلو میں بیٹھ کر حسب ذیل شعر پڑھ دیے تھے :۔

لهام بجنب الطف ادنیٰ قرابة ... من ابن زیاد العبد ذی الحسب الوغل

سمیة اضحیٰ نسلها عدد الحصیٰ ... وبنت رسول الله لیس لها نسل

(یعنی) "وہ سر جو میدانِ کربلا میں تنوں سے جدا کر دیے گئے، قرابت کے اعتبار سے ہم سے زیادہ نزدیک تھے بہ نسبت غلام زادہ ابن زیاد کے جو کمینہ خاندان سے ہے۔ افسوس سمیہ کی نسل تو سنگریزوں کی طرح پھیل گئی اور دخترِ رسولؐ کی نسل باقی نہ رہی۔"[3]

کسی اور کا کیا ذکر اسی سمیہ نے جو ابن زیاد کی ماں تھی بیٹے کو اس کے اس فعل پر لعنت ملامت کی۔[4]

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۱۸۸ ج ۴ ص ۳۲ [2] طبری ج ۶ ص ۲۴۷ [3] ارشاد ص ۲۶۱-۲۶۲
[4] طبری ج ۷، ص ۶

خود یزید کی رسوائی کے عالم کا پورا پورا اندازہ اسی کے اس قول سے ہو جاتا ہے کہ ابن زیاد نے مسلمانوں میں مجھ کو ذلیل و خوار اور قابلِ نفرت بنا دیا اور ان میں کے نیک و بد سب ہی مجھ سے بیزار ہو گئے۔

نہ صرف یہ کہ خود اس کے زمانہ میں لوگ اسے برا کہتے اور سمجھتے تھے بلکہ اس کے بعد آنے والی نسلوں میں بھی اس کے خلاف غم و غصہ کا قوی جذبہ پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ خود بنی امیہ میں سے اس کے بعد ہونے والے سلاطین اس چیز کے روادار نہ تھے کہ کوئی بھی اس کا ذکر تعظیم و احترام کے ساتھ کرے بلکہ خود اس کے بیٹے معاویہ بن یزید نے برسرِ منبر اپنے باپ کی بداعمالیوں کا اقرار کرتے ہوئے اس کے خالی کیے ہوئے تختِ حکومت پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔

دوسری صدی ہجری کے اوائل تک یہ جذبہ برقرار رہا چنانچہ عمر بن عبدالعزیز کے دربار میں کسی شخص نے ایک مرتبہ یزید کے نام کے ساتھ لفظ "امیرالمومنین" کہہ دیا تھا تو عمر بن عبدالعزیز نے غصہ سے کہا "تم اسے امیرالمومنین کہتے ہو؟ اور پھر حکم دیا کہ اسے بیس تازیانے لگائے جائیں۔ چنانچہ یہ سزا اس کو دی بھی گئی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ قتلِ حسینؓ اور یزید کی حکومت امتِ اسلامیہ کے دامن پر ایک دھبہ بن گئی جیسا کہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور فلسفی شاعر ابوالعلاء معری نے مندرجہ ذیل دو شعروں میں اس کا اظہار کیا ہے ؎

ازی الایام تفعل کل کرہ　　فما انا بالعجائب مستزید

الیس قریشکم قتلت حسیناً　　وکان علی خلافتکم یزید

(یعنی) "زمانہ کی نیرنگیاں میرے سامنے عجیب نقشے پیش کرتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ ان کو دیکھنے کی اب مجھے ہوس باقی نہیں رہی۔ کیوں؟ کیا تمہارے قریش نے حسینؓ کو قتل نہیں کیا اور کیا تمہاری خلافت کے تخت پر

یزید سا خطا کار نہیں بیٹھا؟

ظاہر ہے کہ اس درجہ وسیع اور دیرپا جذبۂ نفرت جو قاتلانِ حسینؑ کے خلاف عام طور پر خلقِ خدا میں پیدا ہو چکا تھا وہ بے نتیجہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لہٰذا ناممکن تھا کہ صورتِ حال میں انقلاب پیدا نہ ہوتا۔

سینتیسواں باب
آثارِ انقلاب

واقعۂ حرّہ، خلافت ابنِ زبیر، اضطرابِ عراق و ایران
اور دیگر جزئی واقعات

بڑے سے بڑے انقلاب کا سنگِ بنیاد وہی دو چیزیں ہیں کہ جو شہادتِ حسینؑ کے قہری نتیجہ کے ذیل میں عام طور پر مسلمانوں میں پیدا ہو چکی تھیں یعنی قوتِ احساس اور جرأتِ اظہار جب یہ دو چیزیں کسی خاص سلطنت، کسی خاص نظام یا کسی خاص اقتدار کے خلاف بروئے کار آجائیں تو پھر انقلاب کا رونما ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

چنانچہ حکومت یزید کے خلاف آثارِ انقلاب اسی وقت سے نمایاں ہونے لگے تھے کہ جب پسماندگانِ حسینؑ قیدیوں کی صورت سے کوفہ کے بازار میں تشہیر کیے جارہے تھے۔ حالانکہ ان قیدیوں کو خود رونے کی اجازت نہ تھی اور حکومت کی طرف سے فتح کی خوشیاں منانے کا اہتمام تھا مگر بہرطور پس ماندگانِ حسینؑ کی حالتِ زار کو دیکھ کر اور زینب و کلثومؑ اور علیؑ بن الحسینؑ کے زوردار خطبوں کو سنکر کوچہ و بازار میں گریہ و زاری کے شور سے ایک کہرام برپا ہو گیا تھا یہ رائے عامہ کا وہ بے ساختہ مظاہرہ تھا جسے کوئی طاقت دبا نہیں سکتی تھی۔

پھر جب پس ماندگانِ حسینؑ شام کی طرف روانہ کیے گئے تو یزیدیوں کے مقابلہ میں راستے میں بہت سی منزلوں پر شہروں کے دروازے بند کر لیے گئے۔ بہت سے مقامات

پر لوگ مسلح ہو کر نکل آئے اور اکثر جگہ جنگ کی صورت بھی پیش آئی چنانچہ یہ آغاز ہی وہ تھا جو بجائے خود کسی بڑے انقلاب کی اپنے انجام میں خبر دے رہا تھا۔

مدینۂ منورہ اور مکۂ معظمہ یہ دونوں مسلمانوں کے خاص مرکز تھے۔ مدینہ بنی ہاشم کا شہر تھا جن میں سے ابو طالبؑ کی اکثر اولاد حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جا چکی تھی مگر اس خاندان کے دوسرے افراد تو سب ہی مدینہ میں رہ گئے تھے۔ پھر اولاد ابو طالبؑ میں سے بھی محمد بن حنفیہ اور عبداللہ بن جعفر مدینہ ہی میں رہے تھے۔ خواتین میں سے بھی کئی باقی رہ گئی تھیں اہل مدینہ کتنے ہی بے حس سہی مگر اتنے دردمند دلوں کے تاثرات انھیں کہاں تک متاثر نہ بناتے۔ اسی وقت جب ابن زیاد نے سر امام حسینؑ دمشق کی جانب روانہ کیا۔ یزید نے عبدالملک بن ابی الحدیث سلمیٰ کو مدینہ روانہ کیا اور کہا کہ جا کر عمرو بن سعید بن عاص (حاکم مدینہ) کو قتل حسینؑ کی خوش خبری پہنچاؤ۔ عبدالملک جب مدینہ کے پاس پہنچا تو راستے ہی میں ایک شخص نے قریش میں سے اسے دیکھ کر پوچھا، کیوں کیا واقعہ ہے؟ اس نے کہا کہ واقعہ امیر کے پاس پہنچ کر معلوم ہوگا۔ یہ سننا تھا کہ اس نے کہا، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بخدا حسینؑ قتل ہوئے۔

عبدالملک نے عمرو بن سعید کے پاس پہنچکر شہادت حسینؑ کی اطلاع دی۔ اس نے کہا کہ جاؤ اور مدینہ میں اس کا اعلان کر دو۔ خود عبدالملک کا بیان ہے کہ میں نے عمر بھر میں رونے کا یہ شور نہیں سنا جو حسینؑ بن علیؑ کے قتل کا اعلان سننے کے بعد مدینہ میں بنی ہاشم کے گھروں سے بلند ہوا۔

عبدالملک اس اعلان کے بعد عمرو بن سعید کے پاس واپس آیا تو وہ اس کو دیکھ کر مسکرایا اور مثال میں عمرو بن معدی کرب کا یہ شعر پڑھا ؎

عجت نساء بنی زیاد عجۃ
لکعجیج نسوتنا غداۃ الارنب

اور کہا یہ آج کا ماتم بدلہ ہے اس ماتم کا جو بنی امیہ کی عورتوں میں عثمان کے قتل پر برپا ہوا تھا۔ پھر اس نے مسجد میں جا کر تقریر کی اور لوگوں کو امام حسینؑ کی شہادت سے مطلع کیا۔[1]

محمد حنفیہ کو جس وقت اطلاع ملی وضو کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ اسی طشت میں گرنے لگے۔[2]

عبداللہ بن جعفر کو حضرت امام حسینؑ کے ساتھ ہی ساتھ ان کے دونوں بیٹوں کی شہادت کی اطلاع بھی دی گئی۔ انھوں نے کلمۂ انا للہ وانا الیہ راجعون ؒ زبان پر جاری کیا۔ ان کا غلام ابوالسلاسل جو حسینی عظمت سے ناواقف تھا اور اپنے آقازادوں کے قتل سے متاثر تھا، کہنے لگا کہ یہ روزِ بد ہمیں حسینؑ کی بدولت دیکھنا پڑا۔ عبداللہ بن جعفر نے جو یہ سنا تو غضبناک ہو کر اپنی نعل سے اسے ضرب لگائی اور کہا "حرامزادے تو حسینؑ کے بارے میں ایسا کہتا ہے۔ بخدا اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو اپنی جان نثار کرتا۔ مجھے تو بس اس سے ایک طرح کا صبر آ گیا کہ میرے دونوں بچے میرے بھائی کے ساتھ وفاداری حق ادا کر کے صبر و استقلال کے ساتھ جاں بحق تسلیم ہوئے۔"

پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا "اللہ کا شکر ہے کہ اگر میں خود حسینؑ کی نصرت نہ کر سکا تو کم از کم میرے دونوں فرزندوں نے حق نصرت ادا کیا۔"[3]

ایک طرف عقیل بن ابی طالب کی بیٹیاں، مسلم کی بہنیں، ام لقمان اور ام ہانی، اسماء رملہ اور زینبؑ اپنے بھائی مسلم پر تو نوحہ نہیں کر رہی تھیں مگر حسینؑ کے غم میں عجیب پُر تاثیر انداز سے کہہ رہی تھیں:-

"کیا کہو گے (اے مسلمانو!) جب رسولؐ تم سے پوچھیں گے کہ میرے بعد تم نے میری اولاد اور میرے اہلبیت کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ کہ کچھ اُن میں سے قید

---

[1] ارشاد ص ۲۶۳ [2] طبری ج ۶ ص ۲۲۳ [3] ارشاد ص ۲۶۴

ہیں اور کچھ مقتول خاک و خون میں آلودہ ہیں۔ میں نے تمہارے ساتھ جو خیر خواہی کی اور جو خدمتیں انجام دیں ان کا یہی صلہ تھا کہ میرے بعد میرے گھرانے کے ساتھ ایسا سلوک کرو۔" [1]

ممکن نہیں تھا کہ یہ تاثرات اثر پیدا نہ کرتے۔ ان تاثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ مدینہ والوں نے آنکھیں کھولیں اور یزید کے افعال و اعمال کی جانچ کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ ۶۲ھ میں عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ وغیرہ شرفائے مدینہ کے وفد نے شام جاکر یزید کے حالات کا مطالعہ کیا۔ حالانکہ ان لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں دی گئیں مگر جب وہ واپس آئے تو انھوں نے یزید کی بے دینی کے حالات کو ظاہر کیا اور کہا کہ "ہم ایسے شخص کے پاس سے آرہے ہیں کہ جو کوئی مذہب نہیں رکھتا بلکہ شراب پیتا ہے۔ طنبورہ بجاتا ہے، گانے والیوں سے گانا سنتا ہے اور کتوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ اور رندوں بدمستوں کے ساتھ قصہ گوئی میں اوقات صرف کرتا ہے چنانچہ ہم سب اس کی بیعت کا قلادہ اپنی اپنی گردن سے اتار ڈالتے ہیں۔" [2]

علامہ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ اس وفد کے ارکان نے بیان کیا کہ "ہم نے یزید کی مخالفت اس وقت اختیار کی ہے کہ جب ہمیں اس کا اندیشہ پیدا ہوگیا کہ ہم پر عذاب الٰہی کے طور پر آسمان سے پتھر برسیں گے اس لیے کہ وہ ایسا شخص ہے جو اپنے باپ کی تصرف کردہ کنیزوں (اپنی سوتیلی ماؤں) بیٹیوں اور بہنوں تک کو اپنے لیے حلال سمجھتا ہے۔ شراب پیتا اور نماز کو ترک کرتا ہے۔"

اگرچہ مدینہ سے جو وفد دمشق گیا تھا اس کے ارکان کے رجحانات پر قابو رکھنے کے لیے تمام وہ تدابیر بروئے کار لائے گئے تھے جو اس کے بہت پہلے سے حکومت دمشق کے زیر تجربہ رہ کر کامیاب ثابت ہوتے رہے تھے مگر شہادت حسینؑ کا یہ اثر

---

[1] طبری ج ۷، ص۴ تاریخ کامل ج ۴ ص۵۲

تھا کہ اس مرتبہ وہ تمام ذرائع ناکامیاب ثابت ہوئے بلکہ اس وفد کے ایک رکن منذر بن زبیر نے اپنی تقریر میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ یزید نے مجھ کو ایک لاکھ درہم دیے ہیں مگر یہ چیز مجھے اس کے صحیح حالات آپ لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ میں صاف صاف بتلاتا ہوں کہ وہ شراب پیتا ہے اور اس نشہ میں ایسا سرشار ہوتا ہے کہ نماز ترک ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام واقعات انھوں نے بھی بیان کیے جو ان کے دوسرے ساتھی بیان کر چکے تھے۔

چنانچہ ۶۳ھ کے شروع ہوتے ہی اہلِ مدینہ نے متفق ہو کر یزید کے گورنر کو جو یزید کا ایک چچا زاد بھائی عثمان بن محمد بن ابوسفیان تھا مدینہ سے نکال دیا اور بنی امیہ کا باوجودیکہ وہ وہاں تقریباً ایک ہزار کی تعداد میں تھے محاصرہ کر لیا۔[1]

اب عمل اور ردِ عمل کے تحت میں یزید کی طرف سے تشدد اور مسلمانوں کی طرف سے مظاہراتِ نفرت کا ایک سلسلہ تھا جو جاری ہو گیا۔ قتلِ حسینؓ نے جو بیداری پیدا کی اس کے نتیجہ میں مدینہ والوں میں بے چینی پیدا ہوئی اور اب مدینہ والوں کی سرکوبی کے لیے مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں جو فوج بھیجی تو غیظ و غضب کی شدت میں اسے حکم دے دیا کہ فتح پانے کے بعد مدینہ کو تین دن کے لیے مباح سمجھ لینا یعنی بے محابا قتل و غارت کرنا اور جو مال یا ہتھیار یا قیدی ملیں وہ سب فوج کی ملکیت ہوں گے۔[2]

دینوری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "اگر اہلِ مدینہ پر فتح پانا تو تین دن تک برابر مدینہ کو لوٹتے رہنا"۔[3]

چنانچہ روز چہار شنبہ ۲۸ ذی الحجہ ۶۳ھ کو مدینہ منورہ میں قتل و غارت کر کے مکمل طور پر اس حکم کی تعمیل کی گئی[4] اور تین دن رات مسلسل اہلِ شام مدینے کو لوٹتے رہے۔[5]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۷۳، ۲۷۴۔ [2] طبری ج ۷ ص ۲ و ۷، [3] الاخبار الطوال ص ۲۶۰
[4] طبری ج ۷ ص ۸ [5] الاخبار الطوال ص ۲۶۱

ظاہر ہے کہ مدینہ میں قیدی جو مل سکتے ہیں وہ یہود یا نصاریٰ وغیرہ نہیں ہوں گے وہ صحابۂ رسولؐ اور تابعین کے گھرانوں کی عورتیں اور بچے تھے مگر یزید کی طرف سے ان کے لیے یہ صریح حکم موجود تھا کہ وہ فوج کے سپاہیوں پر تقسیم ہو جائیں گے۔

اس وقت باطل کا حوصلہ اتنا بلند تھا کہ باقی ماندہ اہلِ مدینہ سے جو یزید کی بیعت لی گئی وہ اس شرط کے ساتھ کہ وہ سب یزید کے غلام ہوں گے یزید ان کی جان و مال اور اہل و عیال کے بارے میں مکمل اختیارات کا مالک ہوگا۔[1] چنانچہ جب ام سلمہ زوجہ رسولؐ کے نواسے یزید بن عبداللہ بن ربیعہ بن الاسود نے ان الفاظ کے ساتھ بیعت کرنے سے انکار کیا تو انھیں فوراً قتل کر دیا گیا۔[2] یزید نے یہ سب واقعات سنے تو ان پر بجائے تاسف کے خوشی کا اظہار کیا اور یہ اشعار پڑھے کہ ؎

لیت اشیاخی ببدر شھدوا ۔۔۔ حزع الخزرج من وقع الاسل

حین حکت بقباء برکھا ۔۔۔ واستحر القتل فی عبد الاشل[3]

اس کے معنی یہ ہیں کہ مدینہ پر یہ حملہ اور اہلِ مدینہ کے ساتھ یہ سلوک بھی پیغمبرِ اسلامؐ سے بدلہ لینے ہی کے سلسلہ میں تھا۔

ادھر مکہ والے بھی کروٹ بدل چکے تھے چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے کہ جو عرصہ سے خلافت کے متمنی تھے امام حسینؑ کی شہادت کی خبر سن کر اور یزید و بنی امیہ کے خلاف نفرت و بیزاری کا قومی جذبہ لوگوں میں پاکر موقع کو غنیمت سمجھا اور ایک پُرزور تقریر میں کوفہ اور عراق کے لوگوں کی بے وفائی اور جفاشعاری کی پوری طرح مذمت کی اور حضرت امام حسینؑ کی صداقت اور حقانیت کا اظہار و اعتراف کرتے ہوئے کہا قسم ہے خدا کی حسینؑ نے شرافت و کرامت کے ساتھ جان دینے کو ذلت اور حقارت کے ساتھ زندہ رہنے پر ترجیح دی۔ قتل حسینؑ کے بعد ہم کبھی اس قوم کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ بخدا ان لوگوں نے

---

[1] طبری ج ۷ ص ۱۲، ۱۳ [2] الاخبار الطوال ص ۲۶۱ [3] الاخبار الطوال ص ۲۶۳

ایسے بزرگوار کو شہید کیا ہے کہ جو قلیل النوم اور کثیر الصوم تھا۔ راتوں کو عبادت الٰہی میں طولانی قیام کرنے والا، دنوں کو بکثرت روزہ رکھنے والا، شرف و بزرگی اور دین میں سب سے افضل اور امر خلافت کے لیے سب سے زیادہ مستحق اور موزوں تھا۔ قسم ہے خدا کی کہ اس نے کبھی قرآن کو غلط معنی نہیں پہنائے خوفِ الٰہی سے وہ بے حد رونے والا تھا اور بجائے میخواری کے ہمیشہ روزے رکھتا تھا اور بجائے شکاری کتے پالنے کے ذکرِ الٰہی کے جلسے اس کے گھر میں برپا رہتے تھے۔ اسی تقریر کا اثر تھا کہ اہل مکہ کو یزید سے بیزاری پیدا ہوئی اور عبداللہ بن زبیر کی بیعت کے لیے تیار ہوئے۔ یزید یہاں کے حالات سے بہت فکرمند ہوا اور اس نے کوشش کی کہ مکۂ معظمہ کی کسی ممتاز شخصیت کو اپنے ساتھ وابستہ کر سکے مگر قتل امام حسینؑ کا وہ بڑا جرم اس کے نامۂ عمل میں تھا کہ جو عبداللہ بن زبیر کی اطاعت نہ کرنا چاہتے تھے وہ بھی یزید سے بہرحال نفرت کرتے تھے چنانچہ عبداللہ بن عباس ایسے ہی شخص تھے کہ انھوں نے ابن زبیر کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یزید کو معلوم ہوا تو اس نے عبداللہ بن عباس کو لکھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس لا مذہب (ابن زبیر) نے آپ کو حرمِ الٰہی میں اپنی بیعت حاصل کرنے کے لیے بلایا تھا مگر آپ نے ہماری وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا ہے پس اپنے ابنائے وطن کو اور ان لوگوں کو جو پیرو نجات کے آپ کے پاس آمد و رفت رکھتے ہیں ابن زبیر اور میری نسبت اپنے صحیح خیالات سے برابر آپ مطلع فرماتے رہیں اس لیے کہ ابن زبیر آپ کو اپنی بیعت اور اطاعت میں لینے کے بعد آپ سے باطل کی تمنا اور اپنے گناہوں میں آپ کو شریک کرنے کی آرزو رکھتا تھا مگر آپ نے ہماری بیعت و اطاعت میں داخل رہتے ہوئے وفائے عہد کے حق کو پورا کیا ہے لہٰذا خدا اس صلہ رحم کی آپ کو جزائے خیر دے اور بہر طور میں بھی آپ کے اس صلہ رحم اور نیک سلوک کو بھولنے والا نہیں ہوں اور حسن صلہ و انعام کے آپ مستحق ہیں وہ بہت جلد

آپ کے پاس پہنچا دوں گا۔ مکرر یہ کہ آپ آنے جانے والوں کو ابن زبیر کی بیعت لینے اور اس کی چرب زبانی کے متعلق متنبہ کرتے رہیں کیونکہ عام طور پر لوگ اس کے متعلق آپ کی رائے کو زیادہ وقیع اور معتبر سمجھتے ہیں۔" عبداللہ بن عباس نے اس خط کا حسب ذیل جواب یزید کو روانہ کیا:۔

"تمھارا خط پہنچا، تم نے جو یہ لکھا ہے کہ میں نے عبداللہ بن زبیر کی بیعت تمھاری وفاداری کے خیال سے نہیں کی۔ یہ غلط ہے، تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں کبھی بھی تمھارا مداح اور ہوا خواہ نہیں رہا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس بات کو بھول جاؤں گا کہ تم نے ہی حسینؓ کو قتل کیا ہے؟ اور کیا بنی مطلب کے ان نوجوانوں کی خاک و خون میں بھری لاشوں کا ہولناک تصور میرے دماغ سے محو ہو جائے گا جن کے کپڑے تک لوٹ لیے گئے تھے اور بے گور و کفن گرم ریگ پر یوں ہی چھوڑ دی گئی تھیں؟ صرف ہوا کے جھونکوں نے خاک ڈال کر جن کی پردہ داری کا حق ادا کیا اور جانوران صحرائی نے ان کی حفاظت کے فرض کو پورا کیا یہاں تک کہ اللہ نے ایک قوم کے ذریعہ سے ان کے دفن و کفن کا سرانجام کیا۔

ہاں ہاں اے یزید! میں نہیں بھول سکتا اور کبھی نہیں، یہ کہ تم نے حسینؓ کو حرم خدا اور حرم رسولؐ سے نکلنے پر مجبور کیا اور ابن مرجانہ کو قتل حسینؓ پر مامور کیا۔ میں تو خدا کی ذات سے بہرحال امید رکھتا ہوں کہ وہ منتقم حقیقی بہت جلد تمھارے اعمال کے مطابق سزا دے گا اور عذاب میں مبتلا فرمائے گا کیونکہ تم نے اس کے نبیؐ کی عترت کو قتل کیا ہے اور ان کے قتل پر راضی ہوئے ہو اور جو تم نے لکھا ہے کہ تم میرے ساتھ صلہ رحم برتو گے اور انعام و اکرام سے پیش آتے رہو گے تو تم اپنی اس مہربانی اور صلہ رحم کو بس اپنے ہی لیے اٹھا رکھو ہم کو اس کی مطلق ضرورت نہیں ہے اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ میں لوگوں

کو تمھاری طرف مائل اور عبداللہ بن زبیر سے منحرف اور برگشتہ کروں تو اس کے متعلق میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ تمھارے لیے کبھی خیر و برکت نہ ہو اس لیے کہ تم مجھ سے اپنی نصرت اور حمایت کی امید رکھتے ہو درآنحالیکہ تم نے میرے ابن عم کو قتل کیا اور رسول اللہؐ کے ان اہل بیت کو ذبح کیا ہے کہ جو رشد و ہدایت کے چراغ اور تاریک راتوں میں روشن ستارے تھے۔ افسوس کہ ان کو تمھاری فوجوں کی گھنگھور گھٹا نے پوشیدہ کر دیا۔ کیوں اے یزید! کیا تم نے اپنے نمکخواروں کو اس لیے حرم الٰہی میں نہیں بھیجا تھا کہ حسینؑ کو اسی حرم مقدس میں قتل کر دیں؟ اور کیا تم حسینؑ کو برابر ڈراتے دھمکاتے نہیں رہے یہاں تک کہ وہ سفر عراق اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ تم نے ہی یہ سب کچھ کیا اور اس لیے کیا کہ تمھارے دل میں مخالفت خدا و رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی جن کی شان میں خدا نے آیۂ تطہیر نازل فرمائی جاگزیں ہے۔ اس آیۂ تطہیر کے مصداق آلِ رسولؐ ہی تھے نہ کہ تمھارے باپ دادا جو جفاکار، طاغی و باغی اور دشمن خدا و رسولؐ تھے۔ اب ان افعال و اعمال کے باوجود بھی کیا تم مجھ سے اپنی ہواخواہی کی امید رکھ سکتے ہو؟ اے یزید! سب سے زیادہ عظیم جسارت تمھاری یہ تھی کہ تم نے رسولؐ کی نواسیوں کو سربرہنہ کیا اور قیدی بنا کر عراق سے شام تک تشہیر کرایا تاکہ لوگوں کے دلوں پر اپنے غلبہ و تسلط اور قہاری کا یہ سکہ بٹھاؤ کہ بظاہر کس طرح ذریتِ رسولؐ کو مغلوب و مقہور کرنے میں تم کامیاب ہوئے ہو اور پھر اس پر تم نازاں ہو کہ اس طرح تم نے آلِ رسولؐ سے اپنے ان فاسق و فاجر اور کافر بزرگوں کے خون کا بدلہ لیا ہے کہ جو جنگِ بدر میں قتل ہوئے تھے اور جس کا کینہ تمھارے دل میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح چھپا ہوا تھا۔"

علامہ سبطِ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ جب یہ خط یزید نے پڑھا تو سخت برافروختہ ہوا۔

بلکہ ابن عباس کے قتل کا ارادہ بھی اس نے کیا مگر یہ کہ ابن زبیر کے خلاف جنگ میں مشغول ہونے کی وجہ سے قتل ابن عباس کی تدبیر نہ کر سکا۔

علامہ ابن اثیر نے بھی اپنی تاریخ (مطبوعہ مصر ج ۴ ص ۶۲) میں اس خط و کتابت کو کچھ کمی اور بیشی کے ساتھ درج کیا ہے۔

مدینہ میں قتل و غارت کے بعد یزید کی ہدایت کے مطابق اس کا فرستادہ افسر مسلم بن عقبہ مکہ معظمہ کی طرف متوجہ ہوا مگر محرم ۶۴ھ میں ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ پنجۂ موت میں گرفتار ہو گیا[1] تاہم مرنے سے پہلے ہی اس نے اپنی جگہ یزید کے کہنے کے موافق حصین بن نمیر سکونی کو سردارِ لشکر بنا دیا اور یہ ہدایت کر دی کہ دیکھو اہلِ مکہ کے ساتھ شام والے جو بھی کرنا چاہیں تم اس میں کوئی مزاحمت نہ کرنا[2] حصین نے مکہ پر حملہ کیا اور خانۂ خدا کا محاصرہ کر لیا۔ کئی مہینہ تک عبداللہ بن زبیر سے مقابلہ ہوتا رہا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ روز شنبہ ۳ ربیع الاول ۶۴ھ کو منجنیق نصب کر کے خانہ کعبہ پر پتھر ہی نہیں برسائے گئے بلکہ آتشباری کی گئی جس سے کعبہ میں آگ لگ گئی[3]

بس یہ آخری کارنامہ تھا جس کے بعد روز سہ شنبہ ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ کو یزید دنیا سے رخصت ہو گیا[4]

جس کے بعد حصین بن نمیر نے عبداللہ بن زبیر سے کہلا بھیجا کہ جس نے ہم کو تم سے جنگ کے لیے بھیجا تھا وہ تو ہلاک ہو گیا لہٰذا اب ہماری تمھاری جنگ بھی ختم ہو گئی۔ اب تم شہر کے دروازے ہمارے لیے کھول دو کہ ہم خانہ کعبہ کا طواف کر کے واپس جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ فوج واپس گئی[5]

الفخری لکھتا ہے کہ "یزید کے عہد حکومت کی مجموعی مدت صحیح حساب کے

---

[1] طبری ج ۷ ص ۱۴ [2] الاخبار الطوال ص ۲۶۳۔ [3] صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۳۲۔ طبری ج ۷ ص ۱۴

[4] طبری ج ۷ ص ۱۵ [5] الاخبار الطوال ص ۲۶۴

روسے کل تین سال اور چھ مہینے ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلے سال میں اس نے حسینؓ بن علیؓ کو شہید کیا۔ دوسرے سال میں مدینہ منورہ پر چڑھائی کی اور اس کو تین روز تک تاراج کیا اور تیسرے سال میں مکہ معظمہ پر فوج کشی کی۔ ان ہر سہ مظالم میں سے کربلا کے حادثہ نے بالخصوص دنیائے اسلام میں ایسی خوفناک سنسنی پھیلا دی کہ جو شخص بھی اپنے دل میں قوتِ احساس رکھتے ہوئے اس نازیبا اقدام کے تفصیلات سے مطلع ہوتا تھا۔ ممکن ہی نہ تھا کہ اس کا دل متاثر نہ ہو اس لیے کہ یہ اقدام صرف شرعی گناہ اور قانونی جرم نہ تھا بلکہ ایک بہت بڑی سیاسی غلطی تھی جس کے ماتحت یزید اور اس کے نالائق اور کمینہ مشیرانِ تدبیر مثلاً ابن زیاد و شمر وغیرہ نے ان لوگوں کو بھی اپنی مخالفت پر آمادہ کر دیا کہ جو رسولِ خدا کی عظمت کے قائل ہونے اور دین اسلام سے وابستگی رکھنے کے باوجود اموی حکومت کے ساتھ عقیدت اور وفاداری تو نہیں عدم تعرض اور رواداری کے مسلک پر آخر تک قائم رہنا ضرور چاہتے تھے۔

۶۴ھ میں یزید کی ہلاکت کے بعد عراق کے گھٹے ہوئے جذبات ابن زیاد کے خلاف اس طرح اُبلے کہ اسے "بیک بینی و دو گوش" بصرہ سے فرار کرنا پڑا[1] اسے اپنی ذات سے خلقِ خدا کی بیزاری کا اندازہ ہو گیا۔ راستے میں جب ایک شتربان کو سُنا کہ وہ اپنے اونٹ کی حُدی خوانی ان اشعار کے ساتھ کر رہا تھا ؎

یارب رب الارض والعباد　　العن زیادا وبنی زیاد
کم قتلوا من مسلم عباد　　حم الصلوٰۃ خاشع الفواد
یکابد اللیل من السُّہاد

"یعنی پروردگارا زیاد اور اولادِ زیاد پر لعنت فرما کہ انھوں نے کتنے نماز گزار، شب بیدار متقی اور پرہیزگار مسلمانوں کو بے جرم و خطا قتل کیا ہے۔" [2]

اہلِ عراق کا اشتعال اس کے خلاف اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جب تعاقب کرنے پر وہ خود

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۷۶ - ۲۷۷ - طبری ج ۷ ص ۲۱

نہ مل سکا تو دارالامارہ پر حملہ کر کے جو کچھ اس کا مال و متاع تھا سب لوٹ لیا۔[1]

کوفہ کا جو عالم تھا وہ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ جب کوفہ میں یزید کی ہلاکت کے بعد ابن زیاد کی حکومت تسلیم کیے جانے کی تحریک ہوئی تو یزید بن حارث بن رویم شیبانی نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہم تو ابن سمیہ سے نجات حاصل کرنے کے متمنی ہیں ہم ہرگز اس کی حکومت کو نہیں مان سکتے۔[2]

حالانکہ یہ یزید خود کربلا میں لشکر یزید کے اندر موجود تھا مگر وہ بھی اب بنی امیہ کی حکومت سے نفرت ظاہر کر رہا تھا۔ اس سے عام فضا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہمدان کی عورتیں حسینؓ کا ماتم کرتی ہوئی اور ان کے مرد تلواریں لیے ہوئے یہ سب مسجد میں آ کر مظاہرہ کرنے لگے کہ ہم اب ایسے اشخاص کا اقتدار برداشت نہیں کر سکتے جنھوں نے فرزند رسولؐ کا کربلا میں خون بہایا ہے۔[3]

بقول جناب نجم آفندی ؎

شہید ظلم کلیجے ہلا دیے تو نے — حسینؑ! درد کے دریا بہا دیے تو نے
ہر ایک ذرۂ بے حس میں اک تڑپ بھر دی — دماغ وضع کیے دل بنا دیے تو نے

انتہا یہ تھی کہ خود یزید کے بیٹے اور جانشین معاویہ بن یزید نے سر منبر اپنے باپ کے اعمال و کردار سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا۔ اس طرح کہ جب یزید کے بعد اسے خلیفہ تسلیم کیا گیا تو اس نے منبر پر جا کر حسب ذیل تقریر کی :-

"ایہا الناس! یہ امر خلافت اللہ کی ایک مستحکم رسی تھی مگر میرے دادا معاویہ بن ابی سفیان نے اس کے متعلق حقیقی معنی میں مستحق خلافت شخص علیؑ بن ابیطالبؑ سے جھگڑا کیا اور وہ مذموم طریقہ اختیار کیا جس سے سب ہی واقف ہیں۔ بہرحال

---

[1] طبری ج ۷ ص ۲۸ [2] طبری ج ۷ ص ۳۰
[3] صواعق محرقہ ص ۱۳۴، طبری ج ۷ ص ۳۰

جب وہ اپنے گناہوں میں چاروں طرف سے گھر کر قبر میں پہنچ گئے تو یہ منصب میرے باپ یزید کو پہنچا اور وہ بھی کسی طرح اس کے مستحق نہ تھے۔ انھوں نے رسولؐ کے نواسے حسینؓ بن علیؓ کو قتل کیا۔ بالآخر ان کی بھی عمر ختم ہوگئی اور وہ بھی اپنے گناہوں میں گرفتار قبر میں جا پہنچے۔"

اس کے بعد وہ رو دیا اور کہنے لگا کہ "سب سے بڑی مصیبت ہمارے لیے اس امر کا احساس ہے کہ ان کا انجام بُرا ہوا کیونکہ انھوں نے اولادِ رسولؐ کو قتل، شراب کو مباح اور حرمتِ خانۂ کعبہ کو برباد کیا۔ پس اب میں جو اس وقت تک خلافت کی شیرینی سے ناآشنا ہوں تو اس کی تلخی کا مزہ کیوں چکھوں۔ تم جانو اور تمھارا کام۔ مجھے خلافت سے کوئی سروکار نہیں۔ بالفرض دنیا اگر کوئی اچھی نعمت ہے تو بھی ہم اس میں سے بہت کافی حصہ پا چکے اور حقیقتاً اگر کوئی بری چیز ہے تو جتنا بھی اس وقت تک ہم کو اس میں سے ملتا رہا وہی بہت زیادہ ہے۔"

اس کے بعد وہ محل میں چلا گیا اور چالیس دن گزارنے کے بعد اس دارِ فانی سے رحلت کر گیا۔[1] بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اسے زہر دے دیا گیا۔[2] معاویہ بن یزید کے بعد خراسان میں بھی حرکت پیدا ہوگئی۔ انھوں نے اپنے یہاں کے گورنروں کو نکال دیا اور جنگ و جدال شروع کر دی۔[3] اب خلافت اولادِ ابی سفیان سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی۔ شام میں لوٹ کے مروان بن الحکم کی بیعت کی گئی اور خلافت پھر عرصہ تک اسی کی اولاد میں برقرار رہی۔

---

[1] طبری ج ۷، ص ۳۰ صواعق محرقہ ص ۱۳۲ [2] طبری ج ۷، ص ۳۲ [3] طبری ج ۷، ص ۴۲

اڑتیسواں باب

جماعتِ توّابین

مورخ طبری کا بیان ہے کہ جب حسینؑ بن علیؑ قتل کر دیے گئے اور ابن زیاد اپنے لشکر گاہ سے جو نخیلہ میں قرار دیا گیا تھا واپس ہو کر پھر کوفہ میں داخل ہوا تو شیعانِ علیؑ نے ایک دوسرے کو نفرین و ملامت اور اپنی کمزوری پر اظہارِ ندامت و شرمساری کرنا شروع کیا اور اچھی طرح محسوس کرنے لگے کہ ہم سے ایک بڑے جرم کا ارتکاب ہوا کہ پہلے تو امام حسینؑ سے نصرت کے وعدہ پر کوفہ تشریف لانے کی خواہش کی مگر جب آپ ہماری دعوت منظور فرما کر عراق تشریف لے آئے تو آپ کی مدد کو نہ گئے۔ یہاں تک کہ آپ ہمارے بالکل قریب ہی قتل کر ڈالے گئے لہٰذا انھوں نے طے کر لیا کہ یہ عار و ننگ ہم سے دور نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم ان لوگوں کو جنھوں نے حسینؑ و انصارِ حسینؑ کے قتل میں شرکت کی تھی قتل نہ کر لیں یا اس کوشش کے ذیل میں خود بھی اپنی اپنی جانیں دے نہ دیں۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں دوستانِ اہل بیت میں سے پانچ اہم شخصیتوں سے رابطہ قائم کیا۔ سلیمان بن صُرد خزاعی جو اصحابِ رسولؐ میں سے تھے، مسیّب بن نجبہ فزاری جو اصحابِ حضرت علیؑ میں سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے، عبداللہ بن سعد بن نفیل ازدی، عبداللہ بن وال تیمی اور رفاعہ بن شداد بجلی چنانچہ یہ پانچوں آدمی اور دوسرے بہت سے ممتاز افراد سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر جمع ہوئے اور مسیب بن نجبہ نے تقریر کی[1] جس میں کہا کہ ہم اپنی سچائی پر نازاں اور اپنی جماعت پر فخر کیا کرتے تھے لیکن جب خدا نے ہمارا امتحان لیا معلوم ہوا کہ ہمارے دعوے سراسر غلط تھے۔ ہم نے امام حسینؑ

---

[1] طبری ج ۷، ص ۴۷

کو دعوت دی اور ان کے پاس پیغام بھیجے کہ آیئے ہم آپ کی نصرت پر آمادہ ہیں لیکن جب آپ تشریف لے آئے تو ہم نے اپنی جان چرائی اور ہم نے اپنی جانوں اور اپنے اموال بلکہ اپنی زبانوں سے بھی اپنے فریضہ اور نصرت و حمایت کو پورا نہ کیا اور نہ اپنے قبیلہ ہی کو اس کے لیے آمادہ کیا۔ اب ہم خدا اور رسولؐ کو کیا جواب دیں گے جب کہ ہمارا کوئی عذر قابلِ قبول قرار پا ہی نہیں سکتا۔ البتہ یہ ایک صورت ہو سکتی ہے کہ قتلِ حسینؑ میں کسی حیثیت سے بھی جن جن نے حصہ لیا ہے ان سب اشخاص کو قتل کریں یا اس سلسلہ میں خود اپنی جانوں سے گزر جائیں۔ اب آپ لوگوں کو لازم ہے کہ کوئی اپنا سردار منتخب کریں جس کے زیرِ قیادت اس مہم کی تکمیل ہو۔

ان کی تقریر کے ختم ہوتے ہی رفاعہ بن شداد کھڑے ہوئے اور انھوں نے مناسب الفاظ میں ان کی تائید کی اور کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو آپ ہی کو اس مہم کی قیادت سپرد کی جائے اور آپ کی رائے نہ ہو اور دوسرے حضرات بھی متفق ہوں تو ہم اس ذمہ داری کو اپنی جماعت کے سب سے معمّر فرد سلیمان بن صرد کے سپرد کریں جو پیغمبرِ خداؐ کے صحابی ہیں اور جن کے کارنامے نصرتِ دین میں سب ہی کو معلوم ہیں اور جن کی اصابت رائے اور بصیرت بھی قابلِ اعتماد ہے۔ عبداللہ بن دال اور عبداللہ بن سعد نے بھی اپنی تقریروں میں مزید تائید کے ساتھ مسیب بن نجبہ اور سلیمان بن صرد دونوں کی اہلیت کا اقرار کیا۔ آخر میں مسیب بن نجبہ کی اختتامی تقریر کے بعد بالاتفاق سلیمان بن صرد کا اس جماعت کی قیادت کے لیے انتخاب ہو گیا۔

اب سلیمان کھڑے ہوئے اور انھوں نے انتہائی پر زور و اثر ایک تقریر کی جسے وہ اس کے بعد سے ہر جمعہ میں دہرایا کرتے تھے[1] اس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے:-

"ہم لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر اشتیاق کے ساتھ اہلبیتِ رسولؐ کی تشریف آوری کی راہ دیکھا کرتے تھے لیکن جب وہ آئے تو ہم نے تغافل اور تساہل سے کام لیا۔

---

[1] طبری ج ۷، ص ۴۸

یہاں تک کہ ہمارے ملک میں اور ہمارے قریب فرزند رسولؐ قتل کر دیے گئے جبکہ آپ آوازِ استغاثہ بلند کر رہے تھے لیکن کوئی لبّیک کہنے والا نہ تھا۔ گروہِ فاسقین نے ان کو اپنے تیروں کا نشانہ اور نیزوں کا سرمشق بنائے رکھا، یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اعدا نے بعد شہادتؑ آپ کا لباس تک لوٹ لیا۔ پھر اب اٹھنا ہے تو اٹھ کھڑے ہو۔ اللہ کا غضب حرکت میں آچکا ہے۔ بس اب طے کر لو کہ اپنے بیوی بچوں کے پاس پھر وقت تک واپس نہیں جاؤ گے جب تک اللہ کی خوشنودی کا سامان نہ کر لو گے اور بخدا میرے خیال میں تو وہ اس وقت تک تم سے خوشنود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے قاتلوں کو کیفر کردار تک نہ پہنچا دو۔ یا خود اسی راہ میں جان نہ دے دو۔ ہاں خبردار، موت سے ڈرنا نہیں کیونکہ جو کوئی موت سے ڈرتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے۔ دیکھو تو کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے جب گوسالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا تو ان کی توبہ کس طرح قبول ہوئی؟ ان سے کہا گیا کہ تم اپنے نفسوں کے قتل کرنے پر تیار ہو جاؤ۔ اس پر اس جماعت نے کیا کیا؟ وہ گردنیں بڑھا کر فیصلۂ قدرت کے اجراء کے لیے تیار بیٹھ گئے اس لیے کہ انھیں اپنے جرم کا صحیح احساس تھا اور یہ معلوم ہو گیا تھا کہ بغیر اس کے توبہ قبول نہیں ہو سکتی۔ اب تم بھی اگر اپنے کو مجرم سمجھ رہے ہو تو ایسی ہی قربانی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تلواریں تیز کر لو نیزوں کی انیاں درست کر لو اور پورے ساز و سامان سے تیار ہو کر منتظر ہو کر بیٹھ جاؤ کہ جب تمھیں دعوت دی جائے تو فوراً نکل کھڑے ہو۔ دیر نہ ہونے پائے۔"

یہ پُرجوش تقریر تھی جسے سن کر مجمع کے جذبات میں طوفان برپا ہو گیا۔ متعدد مقررین نے کھڑے ہو ہو کر اپنے تاثرات اور عزم جہاد کا اظہار کیا۔ عبداللہ بن وال تیمی خزانچی مقرر ہوئے اور طے پایا کہ ان کے پاس روپیہ جمع کیا جائے اور عزم و ولولہ سے بھرا ہوا یہ مجمع

منتشر ہوا۔

اب سلیمان نے مدائن میں سعد بن حذیفہ بن یمان اور دوسرے مقامات پر کچھ دوسرے اشخاص کو خطوط بھی لکھے[1] ان خطوط کے مضمون کا اہم حصہ حسب ذیل تھا:۔

"شیعانِ اہل بیتؑ نے اپنے اس موقف پر غور کیا ہے جو ان سے رونما ہوا۔ فرزندِ رسولؐ کے بارے میں جنھیں دعوت دی گئی تو وہ آ گئے اور انھوں نے جب دعوتِ نصرت دی تو اس پر لبیک نہ کہی گئی اور انھوں نے واپس جانا چاہا تو انھیں روکا گیا اور انھوں نے امان چاہی تو انکار کیا گیا اور انھوں نے چاہا کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں مگر دشمنوں نے انھیں نہ چھوڑا اور ان پر چڑھائی کر کے انھیں شہید کر ڈالا۔ پھر ان کا لباس لوٹ لیا اور لاشِ مطہر کو عریاں چھوڑ دیا۔ اب ہماری جماعت نے اس پیش آمد پر غور کیا ہے اور انھیں شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ ان سے اس معصوم کی مدد نہ کرنے میں بہت بڑی خطا سرزد ہوئی ہے جس کا کفارہ یہی ہے کہ ان کے قاتلوں کو قتل کریں یا خود اپنی جان دے دیں۔ اب یہ سب بالکل تیار ہو گئے ہیں لہٰذا آپ لوگ بھی تیار ہو جائیں ہم نے اس مہم کے آغاز کے لیے ایک تاریخ اور جگہ مقرر کر دی ہے جس میں سب کو مجتمع ہو جانا چاہیے۔ تاریخ یکم ربیع الثانی ۶۵ھ ہو گی اور جگہ مقام نخیلہ۔"

یہ خط سعد کو پہنچا اور انھوں نے مدائن کے شیعوں کو پڑھ کر سنایا اور اس کے ساتھ خود تقریر کی[2] جس میں کہا کہ "واقعہ یہ ہے کہ آپ لوگ متفقہ طور پر حضرت امام حسینؑ کی نصرت کا عزم رکھتے تھے اور جونہی ان کے تشریف لانے کی اطلاع ملے فوراً ہی ان کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر آپ کو اچانک ان کی شہادت کی خبر ملی جس سے مجبور ہو گئے۔ بہرحال اللہ کے یہاں

---

[1] طبری ج ۷، ص ۴۹ [2] طبری ج ۷، ص ۵۰

اپ کی نیتوں کا اجر ملے گا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ آپ کے برادرانِ دینی اہلِ باطل سے مقابلہ کے لیے آپ کی مدد کے خواستگار ہیں۔ اب غور کرنا ہے کہ اس بارے میں کیا کرنا چاہیے۔"

سب نے کہا کہ ہم ضرور ان کی مدد کریں گے۔ اور متفقہ طور پر دشمنانِ اہل بیتؑ سے جہاد کریں گے چنانچہ سعد بن حذلفہ نے سلیمان بن صرد کے خط کا جواب اقرارِ نصرت پر مشتمل روانہ کر دیا۔ اسی طرح کے جواب دوسروں کے بھی آئے۔ یہ سب کارروائیاں بالکل خاموشی سے ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ رازداری کے ساتھ کافی افراد اس تحریک سے متفق ہو گئے۔ تاہم ۶۱ھ سے لے کر ربیع الاول ۶۴ھ یعنی ہلاکتِ یزید تک حالات ایسے پیدا نہیں ہو سکے کہ اس سلسلہ میں کوئی عملی اقدام کیا جا سکتا۔[1] مگر یزید کی موت کے بعد اس تحریک میں زیادہ قوت پیدا ہوئی اور اب تقریباً علانیہ اس کی اشاعت کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ یہ تحریک مصر تک بھی پہنچ گئی اور عبید اللہ بن عبد اللہ کی مسلسل تقریروں نے جن میں شہادتِ امام حسینؑ کا تذکرہ نہایت مؤثر الفاظ میں کیا جاتا تھا۔ وہاں بھی جوش و خروش پیدا کر دیا۔[2]

یکم ربیع الثانی ۶۵ھ مقررہ تاریخ پر یہ لوگ نخیلہ میں جمع ہوئے تو یہ دیکھ کر کسی حد تک مایوسی ہوئی کہ جن لوگوں نے اقرارِ نصرت کیا تھا اور جن کے نام فہرست میں درج ہو چکے تھے وہ سولہ ہزار تھے مگر تاریخ معین پر جو تعداد جمع ہوئی وہ صرف چار ہزار کی تھی۔[3] تاہم یہ لوگ عزم و ارادہ کے پختہ تھے اس لیے قلتِ تعداد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھوں نے عملی اقدام کا تہیہ کر لیا۔

بعض لوگوں کی رائے تھی کہ قاتلانِ حسینؑ کوفہ ہی میں موجود ہیں ان سے یہیں سمجھ لینا چاہیے مگر سلیمان کی رائے یہ ہوئی کہ سب سے بڑا قاتل حضرت امام حسینؑ کا جو اس وقت موجود ہے ابن زیاد ہے جس نے تمام شرائطِ مصالحت کو مسترد کیا اور یہ کہا کہ جب تک

---

[1] طبری ج ۷، ص ۵۱ [2] طبری ج ۷، ص ۵۲ [3] طبری ج ۷، ص ۶۷

حسینؓ غیر مشروط طور پر اطاعت نہ کریں ان کو امان نہیں مل سکتی لہٰذا اسی کے مقابلہ کے لیے چلنا چاہیے۔ جب اس کے مقابلہ میں کامیابی ہو جائے تو پھر ان چھوٹے آدمیوں کو سزا دینا کون مشکل ہے۔ چنانچہ سب نے اس رائے پر اتفاق کر لیا۔[1]

شب جمعہ ۵ ربیع الثانی ۶۵ھ کو اندھیرے منہ یہ لوگ شام کی طرف روانہ ہو گئے۔[2]

سب سے پہلے ان لوگوں نے جا کر قبر حسینؓ کی زیارت کی۔ اس وقت ان کے گریہ و شیون کا عجب عالم تھا اور ہر ایک اس آرزو سے بیتاب تھا کہ کاش وہ نصرت امام میں روز عاشور کام آیا ہوتا اور اس شہادت کے درجہ کو حاصل کرتا۔ ایک شب و روز انھوں نے اسی عالم میں نوحہ و ماتم کے ساتھ ساتھ نماز و مناجات اور توبہ و استغفار میں بسر کیا۔ اس کے بعد جذبات کے انتہائی تلاطم میں وہ پورا مجمع قبر امام حسینؓ سے رخصت ہوا جس کے ساتھ سلیمان بن صرد اور دوسرے سرداروں کی انتہائی مؤثر تقریروں نے[3] ولولہ و جوش کے دریا کو شدت کے ساتھ طوفانی کر دیا۔

ان مجاہدین نے منزل بمنزل طے کر کے عین الوردہ میں جا کر اپنے صفوف مرتب کیے پانچ دن کے بعد شام کی فوجیں ابن ذی الکلاع اور حصین بن نمیر کی سرکردگی میں ان کے مقابل پہنچ گئیں۔ اب سلیمان بن صرد نے آخری انتظامات کیے اور اعلان کیا کہ اگر میں کام آجاؤں تو سردار لشکر مسیب بن نجبہ ہوں گے اور وہ شہید ہو جائیں تو سردار عبداللہ بن سعد بن نفیل ہوں گے اور ان کے بعد عبداللہ بن وال اور پھر رفاعہ بن شداد۔[4]

روز چہار شنبہ ۵ جمادی الاولیٰ کو پہلا مقابلہ ہوا۔ باوجودیکہ دشمن کی فوج بارہ ہزار تھی[5] اور یہ کل چار ہزار پھر بھی یہ غالب آئے مگر دوسرے دن آٹھ ہزار فوج کی کمک ان کے مقابل میں آ گئی جسے عبیداللہ بن زیاد نے روانہ کیا تھا۔ آج بڑی شدت کا مقابلہ رہا اور

---

[1] طبری ج ۷، ص ۶۸ [2] طبری ج ۷، ص ۶۹ [3] طبری ج ۷، ص ۷۰
[4] طبری ج ۷، ص ۷۴ [5] طبری ج ۷، ص ۷۵

رات آنے تک جنگ جاری رہی۔ اب زخمیوں کی تعداد مجاہدین میں بہت زیادہ تھی۔ تیسرے دن دشمنوں کی کثرت اور ان کی قلت سے حالت دگرگوں ہوگئی۔ پھر بھی جان توڑ مقابلہ کرتے رہے مگر آخر میں بزدل دشمنوں نے تیر باراں کا سلسلہ جاری کردیا چنانچہ ایک تیر آکر سلیمان بن صرد خزاعی کے لگا جس سے وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ان کے بعد علم لشکر مسیب بن نجبہ نے لیا اور بڑی بہادری سے کئی حملے کیے مگر آخر وہ بھی شہید ہوئے [1]

ان کے بعد عبداللہ بن سعد بن نفیل نے علم سنبھالا اور قبیلۂ ازد کی جماعت کو ساتھ لے کر مقابلہ شروع کیا۔ اس دوران میں مدائن کے تین سوار آئے جنھوں نے اطلاع دی کہ مدائن اور بصرہ سے کمک روانہ ہوچکی ہے مگر یہاں حالت اتنی نازک ہوچکی تھی کہ ان مجاہدین کی زندگی میں اس فوج کے پہنچنے کی امید نہ تھی آخر وہ نو دار دتینوں مجاہدین بھی لڑکر جاں بحق تسلیم ہوئے۔ [2] اور اس کے بعد عبداللہ بن سعد اور پھر عبداللہ بن دال بھی شہید ہوگئے [3] اب شام ہوگئی تھی اس لیے جنگ موقوف ہوگئی۔ نام زد سردار دل میں اب صرف رفاعہ بن شداد باقی تھے مگر اب حالت یہ تھی کہ ان کی تعداد چار ہزار سے گھٹ کر صرف چند سو باقی رہ گئی تھی اور ان میں سے بھی اکثر زخمی اور ناقابل جنگ تھے لہٰذا انھوں نے مقابلہ جاری رکھنے میں کامیابی کی صورت نہ دیکھتے ہوئے رات کے وقت اپنی قلیل فوج کے ساتھ مراجعت اختیار کی [4] اور اس طرح قاتلان حسینؑ سے بدلا لینے کی یہ پہلی کوشش منزل آخر تک پہنچی۔

---

[1] طبری ج ۷، ص ۷۶ [2] طبری ج ۷، ص ۷۷ [3] طبری ج ۷، ص ۷۸
[4] طبری ج ۷، ص ۸۰

انتالیسواں باب

خونِ ناحق کا انتقام

سلیمان بن صرد خزاعی کی سرکردگی میں جماعتِ توابین نے بھی قاتلانِ حسینؑ ہی سے انتقام لینا چاہا تھا مگر چونکہ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق براہِ راست حکومتِ یزید کے خلاف محاذ قائم کیا تھا اور اس کو اپنی قلیل تعداد کی بنا پر وہ کوئی خاص مادی نقصان نہ پہنچا سکے لہٰذا انفرادی حیثیت میں قاتلانِ حسینؑ سے وہ کوئی انتقام نہ لے سکے۔ پھر بھی قدرت اس قتلِ ناحق کے ارتکاب کرنے والوں کو زیادہ عرصہ تک مہلت دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ چنانچہ مشیئتِ ایزدی نے اس کام کے لیے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کو منتخب کیا۔

خاندانی اعتبار سے وہ رؤسائے عرب میں سے تھے۔ ان کے والد ابوعبیدہ اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں تسخیرِ ایران سے متعلق اکثر نبرد آزمائیوں میں شریک ہو چکے تھے اور "جسر ابی عبید" کی جنگ انہی کے نام سے منسوب ہے اور خود مختار اہلِ بیتِ رسولؐ کے ہمدرد کی حیثیت سے خاص طور پر مشہور ہوئے۔ اگرچہ جو خطوط حضرت امام حسینؑ کو کوفہ سے بھیجے گئے تھے ان میں ان کے نام کی صراحت نظر نہیں آتی۔ تاہم جب مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے تھے تو آپ نے مختار ہی کے گھر پر قیام کیا تھا۔[1]

اس کے بعد جب ابن زیاد کا کوفہ پر تسلط ہوا اور فضا مکدر ہوئی تو اس موقع پر مختار کوفہ میں موجود نہیں تھے بلکہ اپنی زمینداری میں کسی موضع پر گئے ہوئے تھے لہٰذا مسلم ان کے گھر سے منتقل ہو کر ہانی کے مکان پر قیام پذیر ہوئے۔ پھر ہانی کے گرفتار

---

[1] طبری ج ۷ ص ۵۸۔ ارشاد ص ۲۱۱۔

ہونے پر مسلم کو جہاد کے لیے نکلنا پڑا اور بالآخر مسلم و ہانی دونوں شہید ہوئے۔ اس کے بعد عمرو بن حریث نے رایتِ امان اس اعلان کے ساتھ بلند کیا کہ جو اس جھنڈے کے نیچے آجائے گا اس کا جان و مال محفوظ رہے گا۔ اس وقت مختار کوفہ واپس پہنچے[1] اور عمرو بن حریث کے رایتِ امان کے نیچے آگئے۔ لیکن ان کی طرف سے حکومتِ کوفہ اس درجہ بدظن تھی کہ انھیں اس جھنڈے کے نیچے پہنچ جانے پر بھی امان نہ مل سکی۔ ابن زیاد نے اپنے دربار میں بلا کر اپنی چھڑی سے ان کے چہرے پر ایسی ضربیں لگائیں کہ ان کی آنکھ کو صدمہ پہنچ گیا۔ اور پھر انھیں قید خانہ بھجوا دیا۔ چنانچہ جب حضرت امام حسینؓ کی شہادت واقع ہوئی تو وہ کوفہ میں مقیّد تھے اور غالباً قتل بھی کر دیے جاتے مگر ان کی بہن عبداللہ بن عمر کی زوجہ تھیں اور اگرچہ عبداللہ بن عمر بھی شروع میں یزید کی بیعت سے انکار کرتے تھے مگر شہادت حسینؓ پر مطلع ہونے کے بعد ان کا حوصلہ پست ہو چکا تھا اور وہ حکومتِ یزید کی طرف جھکنے لگے تھے۔

ادھر یزید عام طور پر عالم اسلام میں برہمی اور بیزاری سے متاثر ہو کر ہر ایسے شخص کی انتہائی دل جوئی اور مراعات کرنا چاہتا تھا کہ جو کم از کم اس کی حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے سے باز رکھا جا سکتا ہو لہٰذا اس موقع پر عبداللہ بن عمر کی کسی بات کو رد کر کے ان کو اپنے سے برگشتہ خاطر کرنا کسی طرح مناسب نہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر نے مختار کی بہن کے انتہائی اصرار سے مجبور ہو کر یزید کو مختار کی رہائی کے لیے خط لکھا اور یزید نے فوراً عبیداللہ بن زیاد کو تاکیدی حکم بھیجا کہ مختار کو رہا کر دیا جائے۔

اس طرح ابن زیاد ان کو رہا کرنے پر مجبور ہو گیا مگر شرط کر دی کہ تین دن کے اندر کوفہ چھوڑ دینا ورنہ تمھارا خون مباح ہو گا چنانچہ تین دن کے اندر مختار کوفہ سے حجاز کی طرف روانہ ہو گئے۔[2]

---

[1] طبری ج ۷، ص ۵۹

ایک سال سے زیادہ وہ حجاز میں مختلف مقامات پر گردش کرتے رہے اور اس دوران میں وہ برابر کہتے رہتے تھے کہ مجھے حضرت امام حسینؓ کے خون کا انتقام لینا ہے جو میں لے کر رہوں گا۔[1] جب دمشق کی فوجوں نے حصین بن نمیر کی سرکردگی میں عبداللہ بن زبیر کے مقابلہ میں فوج کشی کی اور مکہ معظمہ کا محاصرہ کیا تو مختار اس وقت مکہ میں تھے اور ۳ ربیع الاول ۶۴ھ کو جس دن خانۂ کعبہ میں آگ لگائی گئی اور شام کی فوجیں شہر مکہ میں داخل ہوئیں تو مختار نے اہلِ شام کے مقابلہ میں تقریباً تن تنہا جرأت و ہمت کے ساتھ شدید جنگ کی۔[2]

یہاں تک کہ اہلِ شام کو شکست ہوئی۔ اسی دوران میں ہلاکت یزید کی خبر آئی اور شام کی فوجیں واپس گئیں، مختار اس کے بعد بھی پانچ مہینہ سے کچھ زیادہ عبداللہ بن زبیر کے پاس مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔

اتنے عرصہ میں کوفہ کی حکومت میں انقلاب ہو چکا تھا۔ اہلِ کوفہ ابن زیاد کے نائب حکومت عمرو بن حریث کو نکال چکے تھے۔ اور عارضی طور پر عامر بن مسعود کو حاکم بنا دیا تھا جس نے عبداللہ بن زبیر کی اطاعت کر لی اور اہلِ کوفہ سے ابن زبیر کی خلافت تسلیم کرائی۔ مگر ابھی تک کوفہ میں نظم و نسق پورے طور پر قائم نہیں ہونے پایا تھا۔ مختار کو یہ وقت قاتلانِ امام حسینؓ سے انتقام کے متعلق اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے بہت مناسب معلوم ہوا۔ وہ کوفہ کی طرف روانہ ہو گئے[3] اور وہاں پہنچ کر ممتاز افراد شیعہ سے اپنی مہم کے بارے میں تبادلہ خیالات شروع کر دیا اور بہت سے اشخاص ان کے ساتھ متفق الرائے ہو گئے۔[4]

مگر جب سلیمان بن صرد خزاعی جماعتِ توابین کے ساتھ شامیوں کے مقابلہ کو نکلے اس وقت کوفہ میں مختار کو بھی قید کر کے داخل زنداں کر دیا گیا۔[5]

---

[1] طبری ج ۷، ص ۶۲ [2] طبری ج ۷، ص ۶۳ [3] طبری ج ۷، ص ۶۳ [4] طبری ج ۷، ص ۶۴ [5] طبری ج ۷، ص ۶۵

سلیمان کی شہادت کے بعد جب ان کی جماعت کے باقی ماندہ افراد رفاعہ بن شداد کے ساتھ کوفہ واپس ہوئے تو مختار قید خانہ میں تھے [1]

آخر کو عبداللہ بن عمر نے پھر عبداللہ بن زبیر اور ابراہیم بن محمد بن طلحہ کو جو اس وقت عبداللہ بن زبیر کی طرف سے کوفہ کا حاکم تھا مختار کی رہائی کے لیے خط لکھا جس کے بعد وفاداری کی قسمیں لینے کے بعد مختار کو رہا کر دیا گیا۔

اس کے بعد عبداللہ بن زبیر نے ان دونوں کو معزول کر دیا اور عبداللہ بن مطیع کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا [2] جو روز پنجشنبہ ۲۵ رمضان ۶۵ھ کو کوفہ میں وارد ہوئے [3]

اب مختار کے ساتھ بہت سے ممتاز صاحبانِ عزم و ہمت متفق الرائے ہو چکے تھے مگر مالک اشتر کے فرزند ابراہیم کی ایک اہم شخصیت تھی جن کا متحد بنانا اس مہم کے لیے ضروری محسوس ہوتا تھا چنانچہ ابراہیم کو مقصد سے پورے طور پر آگاہ کر کے انھیں بھی متفق بنا لیا گیا جس سے مختار کی تحریک کو بڑی قوت حاصل ہوئی [4]

اب برابر مختار ابراہیم کے یہاں آمد و رفت رکھنے لگے روزانہ شام کے وقت ابراہیم ان کے یہاں جاتے تھے اور رات گئے تک تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے۔ بالآخر اس امر پر اتفاق ہوا کہ شب پنجشنبہ ۱۴ ربیع الاول ۶۶ھ کو عملی اقدامات کا آغاز کر دیا جائے [5]

ان لوگوں نے باہم یہ رائے قائم کی کہ ہم کو قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لینے کے لیے دمشق جانے کی ضرورت نہیں بلکہ حقیقتاً قاتلانِ حسینؑ چونکہ یہیں کوفہ میں موجود ہیں لہٰذا ان سے ہم کو بدلہ لینا چاہیے لیکن اس صورت میں ابن زبیر کی حکومت سے ان کا تصادم لازمی تھا۔ اس لیے کہ قاتلانِ امام حسینؑ کا براہِ راست تعلق اگرچہ حکومتِ شام سے تھا مگر وہ

---

[1] طبری ج ۷، ص ۸۰ [2] طبری ج ۷، ص ۹۴ [3] طبری ج ۷، ص ۹۵

[4] الاخبار الطوال ص ۲۸۳-۲۸۳ - طبری ج ۷، ص ۹۸-۹۹ [5] طبری ج ۷، ص ۱۰۰

اس وقت کوفہ کے باشندہ تھے۔ ان سے انتقام لینے کے معنی تھے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا، اور ظاہر ہے کہ حکومتِ وقت کو اس صورت میں اپنے نظام کے تحفظ کی خاطر ان افراد کی حفاظت کرنا تھی جو اس شہر کے باشندہ تھے لہٰذا مختار اور ان کی جماعت کے لیے قاتلانِ حسینؑ سے اپنے حسب دلخواہ انتقام لینا ممکن ہی نہ ہوسکتا تھا جب تک کہ وہ کوفہ کی موجودہ حکومت کو ختم کرکے ایک خود مختار حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے چنانچہ اس نظریہ کے ماتحت ان کا حکومت ابن زبیر سے تصادم ناگزیر ہوا۔ اور نتیجتاً — عبداللہ بن مطیع کے تابِ مقابلہ نہ لاکر فرار اختیار کرنے پر کوفہ میں مختار کی حکومت قائم ہوگئی۔

اس طرح مختار دو حکومتوں کے غیظ و غضب کا مرکز بن گئے۔ ایک طرف حکومت شام جس سے براہِ راست قاتلانِ امام حسینؑ کا تعلق تھا اور دوسری طرف ابن زبیر کی حکومت جو کوفہ میں اپنے تسلط کے لیے مختار سے جنگ کرنا ضروری سمجھتی تھی۔

اس صورت حال کے دیکھنے کے بعد ہی ہم ان الزامات کی حقیقت کے متعلق بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں جو مختار کے متعلق عام تواریخ میں درج کر دیے گئے ہیں مثلاً یہ کہ وہ علمِ غیب کے مدعی تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میرے پاس جبرئیلؑ آتے ہیں۔ انھوں نے محمد حنفیہ کی مہدویت کا اعلان کرکے غلط طور پر اپنے کو ان کا نمائندہ بتایا اور ان کی طرف سے جعلی خط بنا کر ابراہیم بن مالک اشتر کو اپنا ہم خیال بنایا — وغیرہ وغیرہ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب حکومتوں کی طرف سے ان کے خلاف پروپیگنڈا تھا جس کی مثالیں برابر تاریخ میں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن زبیر کو یزید اور اس کے ہواخواہ ملحد کے نام سے یاد کرتے تھے۔ پھر اگر مختار کے خلاف اس قبیل کے الفاظ ملتے ہیں تو انھیں کیونکر حقیقت سمجھا جا سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک تو ان الزامات کا غلط ہونا ان افراد ہی پر نظر کرنے سے ثابت

ہو جاتا ہے جو مختار کے ساتھ تھے اور برابر ساتھ رہے جیسے کہ ابوالطفیل عامر بن واثلہ بن اسقع کنانی کہ جو صحابیٔ رسولؐ تھے۔[1]

اسی طرح ابوعثمان نہدی اور پھر رفاعہ بن شداد، یزید بن انس، عبدالرحمٰن بن سعید بن قیس، ورقاء بن عازب اور احمر بن شمیط وغیرہ۔ یہ سب صاحبان بصیرت اور دیندار لوگ تھے۔

ابراہیم بن مالک اشتر کے متعلق مان بھی لیا جائے کہ انھیں غلط تحریر دکھلا کر موافق بنا لیا گیا تھا تو بعد میں مختار کے ساتھ تقریباً ہر وقت رہنے کے باوجود انھیں مختار کے عقائد و اعمال پر اطلاع نہ ہوتی اور اطلاع ہونے کے بعد وہ منحرف نہ ہو جاتے؟ پھر اگر فرض کیا جائے کہ انھیں ہر وقت ساتھ رہنے کے باوجود ان باتوں کی اطلاع نہیں ہوئی تو آخر ان راویوں کو ان کی اطلاع کیونکر ہو سکی جو مختار کے ساتھ ویسے روابط بھی نہ رکھتے تھے۔

مختار کا خلوص تو اس سے ظاہر ہے کہ حکومت پانے کے بعد بھی مختار اور ان کے ساتھیوں نے اپنے نصب العین کو فراموش نہیں کیا اور چن چن کر انھوں نے قاتلانِ حسینؑ کو قتل کرنا شروع کر دیا جس طرح ان کا امتیازی نعرہ تھا یا لثارات الحسینؑ[2] اسی کے مطابق ان کا عمل ظاہر ہوا۔ اس کی تکمیل اس طرح ہو گئی کہ ایک طرف تو عبیداللہ بن زیاد شام کی فوج لے کر موصل پر حملہ آور ہوا، مختار نے اس کے مقابلہ کے لیے تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ یزید بن انس کو بھیجا[3]، اس فوج نے دشمن کے لشکر کو جنگ میں شکست بھی دے دی[4] مگر عین معرکۂ جنگ میں یزید بن انس کی جو پہلے سے بیمار تھے وفات ہو گئی اور ورقاء بن عازب نے فوجِ دشمن کی کثرت اور اپنی قلتِ تعداد

---

[1] ۱۰۰ھ میں وفات پائی۔ اصحابِ رسولؐ میں سب کے آخر میں انہی کی وفات ہوئی ہے (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۵۸)

[2] طبری ج ، ص ۱۲۰ [3] طبری ج ، ص ۱۱۳ [4] طبری ج ، ص ۱۱۴

کے سبب اپنے سردار کے انتقال کے بعد اس مہم کو کوفہ سے مزید کمک منگوانے تک ملتوی کر دینے کا فیصلہ کیا[1]

مختار کو یہ اطلاع ہوئی تو انھوں نے ابراہیم بن مالک اشتر کو سات ہزار فوج کے ساتھ ورقاء کی مدد کے لیے موصل کی طرف روانہ کیا۔ کوفہ کے سرداروں نے جو تقریباً سب ہی وہ لوگ تھے جو حضرت امام حسینؑ کے مقابلہ میں جنگ میں شرکت کر چکے تھے اس موقع کو غنیمت جان کر کہ ابراہیم کوفہ سے باہر گئے ہوئے ہیں اور مختار تقریباً اکیلے ہیں متفق ہو کر بغاوت کر دی اور مختار سے جنگ شروع کر دی[2] ان میں حسب ذیل افراد کے نام نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ شبث بن ربعی، شمر بن ذی الجوشن، محمد بن اشعث، زحر بن قیس، حجار بن ابجر، یزید بن حارث بن رویم شیبانی، عمرو بن حجاج زبیدی[3]، ان میں سے کوئی بھی نام واقعاتِ کربلا کا مطالعہ کر چکنے والوں کے لیے اجنبی نہیں ہے۔

مختار نے اپنے ساتھ والی جماعت کے ساتھ ان لوگوں کا معمولی طور سے مقابلہ جاری رکھا اور ایک قاصد کو ابراہیم بن اشتر کے پاس بھیج کر اطلاع دی کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ فوراً کوفہ کی طرف واپس آئیں۔ چنانچہ تیسرے دن وہ اپنے لشکر کے ساتھ کوفہ واپس آ گئے[4]

اب دشمنانِ آلِ رسولؐ کی سرکوبی کا ہنگام آ گیا تھا۔ چنانچہ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

پہلا ہی پانچ سو آدمیوں کا جتھا جو گرفتار ہو کر مختار کے پاس پیش ہوا تو مختار نے کہا۔ ان میں سے جو جو قتلِ حسینؑ کے موقع پر کربلا میں موجود ہوں انھیں مجھے بتاتے جانا۔ اُن کی میں جان بخشی نہیں کروں گا، باقی سب کو چھوڑ دوں گا۔ چنانچہ جن جن کے بارے میں یہ الزام ثابت ہوا وہ قتل کر دیے گئے۔ باقی سب کو اقرارِ وفاداری لینے

---

[1] طبری ج ۷، ص ۱۱۵ [2] طبری ج ۷، ص ۱۱۶ [3] طبری ج ۷، ص ۱۱۶ و ۱۱۷ [4] طبری ج ۷، ص ۱۱۸

کے بعد رہا کر دیا۔[1]

اس کے بعد مختار کی جانب سے شہر میں ندا دی گئی کہ جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے اسے امان ہو گی سوا اس شخص کے جو آلِ رسولؐ کے خون میں شریک ہوا ہو۔[2] یہ روز چہار شنبہ ۱۴ ذی الحجہ ۶۶ھ کا ذکر ہے۔[3]

ابو عمر کیسان پولیس کے افسر تھے۔ چونکہ قاتلانِ حسینؑ بھی اب گھروں میں چھپ گئے تھے اس لیے ابو عمرہ مامور ہوئے کہ ایک ہزار مزدور ساتھ لے کر جائیں اور جو جو مظالم کربلا میں شریک تھے ان کے گھروں کو مسمار کرائیں کیونکہ ابو عمرہ ان لوگوں سے خوب واقف تھے چنانچہ انھوں نے بکثرت گھر منہدم کرائے اور اس ذیل میں بہت سے دشمنانِ اہل بیتؑ قتل ہوئے۔[4]

اب بڑے بڑے نمایاں افراد جو قاتلانِ امام حسینؑ میں سے تھے تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ شمر بن ذی الجوشن[5] عبداللہ بن اسد جہنی، مالک بن نسر بدی، حمل بن مالک محاربی[6]، زیاد بن مالک، عمران بن خالد، عبدالرحمٰن بن ابی خشکارہ بجلی، عبداللہ بن قیس خولانی، عبداللہ بن صلخب، عبدالرحمٰن بن صلخب، عبداللہ بن وہب، عثمان بن خالد جہنی، بشر بن سوط قابضی[7]، خولی بن یزید اصبحی[8]، عمر بن سعد[9]، حکیم بن طفیل طائی سنبسی[10]، زید بن رقاد جہنی، حرملہ بن کاہل اسدی، عمرو بن صبیح صدائی[11] اور قیس بن اشعث[12]

کوفہ کی مہم سے فراغت کے بعد مختار نے ابراہیم کو پھر ابن زیاد سے جنگ کے لیے روانہ کیا۔[13] موصل سے پانچ فرسخ پر مقام خازر میں جنگ ہوئی شدید مقابلے کے بعد شام کی فوج کو شکست ہوئی اور خود ابن زیاد ابراہیم کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس کے علاوہ حصین بن نمیر سکونی اور شرحبیل بن ذی الکلاع جو شام کے دو مشہور سردار تھے وہ بھی اس جنگ

---

[1] طبری ج ۷، ص ۱۲۱ [2] طبری ج ۷، ص ۱۲۱ [3] طبری ج ۷، ص ۱۲۴ [4] الاخبار الطوال ص ۲۸۶

[5] طبری ج ۷، ص ۱۲۲ [6] طبری ج ۷، ص ۱۲۴ [7] طبری ج ۷، ص ۱۲۵ [8] طبری ج ۷، ص ۱۲۶

[9] طبری ج ۷، ص ۱۲۷ [10] طبری ج ۷، ص ۱۲۸ [11] طبری ج ۷، ص ۱۲۹ [12] طبری ج ۷، ص ۱۳۹

[13] الاخبار الطوال ص ۱۳۹

میں مارے گئے[1] ابراہیم نے ابن زیاد کا سر کاٹ کر مختار کے پاس بھیجا اور مختار نے اسے محمد حنفیہ کے پاس بھیج دیا[2] اس کے بعد ابراہیم نے موصل اور اس کے تمام اطراف پر تسلط قائم کر کے عمال مقرر کیے اور خود نصیبین میں جا کر قیام کیا[3] مختار اب کوفہ میں اکیلے رہ گئے۔

ابن زبیر کو مختار سے بنائے مخاصمت قائم ہی ہو چکی تھی اور عراق میں بصرہ پر ان کا تسلط قائم تھا۔ اس دوران میں انھوں نے بصرہ کے مقامی حاکم کو جو زیادہ ان کے نزدیک قابل اطمینان نہ تھا معزول کر کے اپنے بھائی مصعب بن زبیر کو بصرہ میں حاکم مقرر کیا۔ ممکن ہے اسی وقت اس کا مقصد مختار کے مقابلہ میں مہم کا سر انجام دینا ہو۔

ادھر کوفہ سے جو قاتلان امام حسینؑ مختار کے ہاتھوں بچ کر کسی طرح نکلے، جیسے شبث بن ربعی، محمد بن اشعث، مرہ بن منقذ عبدی، سنان بن انس اور عبداللہ بن عروہ خثعمی وغیرہ وہ سیدھے مصعب بن زبیر کے پاس بصرہ پہنچے[4] اور انھوں نے بھی اس کو مختار سے جنگ پر آمادہ کیا۔ خصوصیت کے ساتھ شبث بن ربعی اور محمد بن اشعث نے بڑے مبالغہ کے ساتھ اپنی مظلومی کے غلط افسانے سنا کر الحاح و زاری سے کام لیا اور کوفہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی[5]

دینوری کا بیان ہے کہ دس ہزار اہل کوفہ رفتہ رفتہ نکل کر بصرہ پہنچ گئے اور ان سب نے محمد بن اشعث کی سرکردگی میں مصعب کو کامیابی کا یقین دلایا[6]

اسی دوران میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ عبداللہ بن زبیر نے مکہ معظمہ میں محمد حنفیہ، ان کے متعلقین اور ان کوفہ کے آدمیوں کو جو مکہ میں قید تھے مقید کر دیا اور ایک مدت مقرر کر دی کہ اگر اس وقت تک انھوں نے بیعت نہ کی تو وہ سب زندہ جلا

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۸۸، طبری ج ۷، ص ۱۴۴ - ۱۴۵ [2] الاخبار الطوال ص ۲۸۸

[3] الاخبار الطوال ص ۲۸۹ [4] طبری ج ۷ ص ۱۲۴ و ۱۲۸ و ۱۲۹ و ۱۳۰ و ۱۴۶ -

[5] طبری ج ۷، ص ۱۴۶ - ۱۴۷ [6] الاخبار الطوال ص ۲۹۵۔

دیے جائیں گے۔ محمد حنفیہ نے ایک قاصد کے ذریعہ سے اس کی اطلاع مختار کو دی۔ مختار نے کوفہ سے فوج روانہ کی جس نے مکہ جا کر محمد حنفیہ اور ان کے ساتھ والوں کو قید سے رہائی دی۔ یہ لوگ تو ابن زبیر کا خاتمہ کر دینے پر آمادگی ظاہر کر رہے تھے مگر محمد حنفیہ نے حرم میں خونریزی سے سختی کے ساتھ ممانعت کی۔ اس لیے یہ لوگ محمد حنفیہ کو ایک محفوظ جائے پناہ تک پہنچا کر واپس آ گئے۔[1]

بالآخر مصعب بن زبیر نے غالباً اپنے بڑے بھائی عبداللہ بن زبیر کی ہدایت ہی کی بناء پر ایک لشکر گراں کے ساتھ کوفہ پر حملہ کر دیا۔ مختار نے بھی مقابلہ کی تیاری کی مگر اب مشیتِ الٰہی کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ مختار اپنے مقصدِ حیات کو پورا کر چکے تھے۔ ان کی طاقت بھی اس وقت یکجا نہ تھی کیونکہ ابراہیم بن مالک اشتر نصیبین میں تھے اور اس صورت حال کی انھیں کوئی اطلاع نہ تھی۔ مصعب کے پاس فوج بہت زیادہ تھی اور محمد بن اشعث وغیرہ رؤسائے اہلِ کوفہ بھی ساتھ تھے اس لیے خود کوفہ کے بہت سے لوگ جو دبے ہوئے تھے وہ بھی ان کا ساتھ دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ نیز مختار کے خلاف ایک طبقہ وارانہ سوال عرب اور غیر عرب کا اٹھا دیا گیا تھا اور یہ کہ مختار نے عجمیوں کو عربوں پر مسلط کر دیا ہے تمام عربوں کے جذبات کو مختار کے خلاف بھڑکا دیا گیا۔[2]

تاہم مختار نے اپنے پاس کے لشکر کے ساتھ کئی دن بڑی بہادری کے ساتھ مصعب سے جنگ کی جس کے دوران میں ان کے ساتھ کے کئی ممتاز سردار جیسے احمر بن شمیط اور عبداللہ بن کامل وغیرہ شہید ہو گئے۔[3]

اس جنگ میں فوجِ مخالف میں سے بھی ایک شخص جو دشمنانِ اہل بیتؑ میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا یعنی محمد بن اشعث قتل ہوا۔[4]

---

[1] طبری ج ۷، ص ۱۳۶ - ۱۳۷

[2] الاخبار الطوال ص ۲۹۵

[3] طبری ج ۷، ص ۱۴۸ - ۱۴۹

[4] الاخبار الطوال ص ۲۹۷ - طبری ج ۷، ص ۱۵۱

آخر الامر مختار کے تمام باوفا ساتھی شہید، عوام الناس منتشر اور وہ خود قلعہ کے اندر محصور ہو گئے۔ پھر چند جانبازوں کے ساتھ نکل کر انھوں نے آخری بار بڑی پامردی سے جنگ کی اور عین معرکۂ جنگ میں ۱۴ رمضان ۶۷ھ کو سرسٹھ برس کی عمر میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی۔[1]

عداوت اور قساوت کی حد یہ تھی کہ ان کے بعد ان کی بیوی عمرہ بنت نعمان بن بشیر انصاری کو بھی جنھوں نے مختار کو برا کہنے سے انکار کیا مجمع عام میں قتل کیا گیا۔[2]

یقیناً خوش قسمت ہے وہ انسان جو مشیت کے کسی مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے۔ مختار انھی خوش قسمت انسانوں میں تھے۔ ان کی ذات کے ساتھ قدرت نے اپنا ایک عملی نظام وابستہ کیا تھا اور اس نظام کی تکمیل کے ساتھ ان کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ اب وہ ختم نہیں ہو گئی بلکہ جاودانی طور پر باقی ہے۔ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

---

[1] طبری ج ۷، ص ۱۵۵ و ۱۶۱ [2] طبری ج ۷، ص ۱۵۸۔ الاخبار الطوال ص ۳۰۰

چالیسواں باب

اموی حکومت کا انجام

تاریخی حقیقت ہے کہ جب کسی قوم کو اس حد تک غلبہ و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کے صاحبانِ حل و عقد کے لیے محض ضروریاتِ زندگی ہی نہیں بلکہ فراوانی کے ساتھ سامانِ تعیش بھی فراہم ہو سکے تو اس میں عیش پسندی، جاہ طلبی، کمینہ طبعی، خود غرضی، ناعاقبت اندیشی، سہل انگاری اور نتیجتہً بزدلی پیدا ہو جاتی ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ منزلِ فنا میں حقیقتاً قدم رکھ چکی جیسا کہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے:-

واذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا (یعنی) جب ہم کسی آبادی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے دولت مندوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر ان پر ہمارا قانون فطرت منطبق ہو جاتا ہے اور ہم اس کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔"

رسول اللہؐ کے بعد سے دورِ یزید تک بنی امیہ کی مادی ترقیاں کس کو معلوم نہیں۔ دولت و ثروت، وسعت مملکت اور حشم و خدم کے لحاظ سے وہ قیصر و کسریٰ کی ہمسری کرتے نظر آتے تھے لیکن نفس پرستی اور تن پروری کے اعتبار سے ان سے بھی کہیں بڑھے ہوئے تھے۔

چنانچہ قانونِ فطرت کے مطابق ان کے انحطاط اور زوال کا وقت یوں ہی قریب آ چکا تھا اس پر ناعاقبت اندیش یزید نے نشۂ سلطنت و امارت سے سرشار ہو کر امام حسینؑ کو آپ کی

روحانی عظمت اور حقانیت کی ناقابلِ تسخیر طاقت کا خیال کیے بغیر شہید کر دیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر تھا اور وہ یہ کہ متزلزل اموی نظام تیزی کے ساتھ تباہی اور بربادی کے آخری درجہ تک پہنچ گیا۔

ادھر عبداللہ بن زبیر خون حسینؑ کا واسطہ دلا کر یزید کے مقابل آ گئے۔ ادھر اہلِ مدینہ جنھوں نے چپ چپاتے امام حسینؑ کو شہید ہوتے دیکھا تھا مخالف ہو گئے۔ توابین کا گروہ علیحدہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مختار نے ایک طرف علمِ مخالفت بلند کیا۔ پھر زید بن علی بن الحسینؑ بھی ۱۱۸ھ میں خون حسینؑ کے انتقام ہی کے طالب ہو کر اٹھے[1] اور اگرچہ شہید کر ڈالے گئے مگر ایک مستقل جماعت کی تشکیل کر گئے جو ظالم حکومت کے لیے خطرہ بنی ہے۔ بنی عباس علیحدہ خونِ مظلوم کا بدلہ لینے کے نام سے بنی امیہ کے مقابل میں آ ڈٹے۔[2]

یہ سمجھنا بالکل غلط ہوگا کہ ان تمام تحریکوں میں خلوص مضمر تھا بلکہ ان میں سے بعض میں سیاسی کروٹیں تھیں اور اسی لیے اولادِ امام حسینؑ کا ان میں ذرہ برابر ہاتھ نہ تھا۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ اولادِ امام انقلاب کنندگان سے علیحدہ رہتے ہوئے منع کرتے رہے مگر قانونِ فطرت کو پورا ہونا ضرور تھا اور وہ پورا ہو کر رہا۔

بہرطور جب ابومسلم خراسانی نے انتقامِ خون حسینؑ کے اعلان کے ساتھ مرو میں سیاہ جھنڈا نکالا تو ہزاروں آدمی اس کے نیچے جمع ہو گئے اور بالآخر بنی امیہ کا آخری بادشاہ مروان بن محمد جنگ زاب میں مارا گیا[3] اور اسی کے ساتھ اموی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

---

[1] ارشاد ص ۲۸۶ [2] اس تحریک کا آغاز محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس نے ۱۰۰ھ کے آخر ۱۰۱ھ کے شروع میں کیا (طبری ج ۸ ص ۱۳۵۔ الاخبار الطوال ص ۳۱۸۔ ۱۰۴ھ میں ابوالعباس (سفاح) عبداللہ بن محمد بن علی کی ولادت ہوئی (طبری ج ۸ ص ۱۷۴) ۱۲۷ھ میں مروان بن محمد تخت حکومت پر بیٹھا (طبری ج ۹ ص ۵۲) ۱۲۹ھ میں دعوت و تبلیغ اعلان کے ساتھ شروع ہوئی۔ طبری ج ۹ ص ۸۳۔ [3] طبری ج ۹ ص ۱۳۶

اکتالیسواں باب

بنی عباس کی سلطنت

شہادت امام حسینؓ کے کچھ عرصہ کے بعد جو بنی عباس نے دعوت کا آغاز کیا اور رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوئی یہاں تک کہ ابو مسلم خراسانی نے خراسان میں کامیابی حاصل کی اور ایران سے عراق تک تمام مملکت اسلامی میں بنی امیہ کے خلاف حرکت پیدا ہوئی تو یہ سب آلِ رسولؐ کی ہمدردی کے نام سے تھا۔

اگرچہ ان کی سیاہ پوشی کا شہدائے کربلا کے غم سے تعلق نہ تھا بلکہ وہ اپنی اس تحریک کے بانی محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کی وفات پر اظہار رنج وملال[1] اور پھر ان کے فرزند اور اس جماعت کے سرگروہ ابراہیم بن محمد کے قتل کیے جانے پر سوگواری کا مظاہرہ تھا[2] تاہم اکثر ناواقف یہی سمجھتے رہے کہ یہ بھی غم امام حسینؓ کی علامت تھی اور اس خیال کو اس لیے اور تقویت پہنچی کہ اموی خلیفہ مروان کے قتل کے بعد کوفہ کی مسجد جامع میں جو ان کا سیاہ پوش اجتماع ہوا وہ ۱۰ محرم ۱۳۲ھ یعنی عشرے کے دن تھا[3] جو شہادت امام حسینؓ کی تاریخ ہے۔

پھر لوگوں کو اہل بیتؑ اور عترتِ رسولؐ کے فضائل اور حقوق ہی کا واسطہ دے کر اس تحریک سے وابستہ کیا گیا۔ چنانچہ اعلانِ دعوت کے بعد ان کے ایک خاص کارکن ابوداؤد خالد بن ابراہیم نے ایک مجمع کے سامنے جو تقریر کی وہ حسب ذیل تھی:۔

"کیا تم میں کسی کو اس میں شک ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت محمد مصطفےٰؐ کو اپنی

---

[1] الاخبار الطوال ص ۳۲۴ [2] الاخبار الطوال ص ۳۴۳ [3] الاخبار الطوال ص ۳۲۴

رسالت کے لیے منتخب کیا اور تمام خلق کی طرف مبعوث کیا؟ (سب نے کہا نہیں اس میں کوئی شک نہیں) اچھا تو کیا اس میں کوئی شک ہے کہ اللہ نے ان پر اپنی کتاب نازل کی جسے جبرئیل امینؑ لے کر اترے اور اس میں احکام حلال و حرام کا بیان ہے؟ (سب نے کہا بے شک) پھر کیا اس میں شک ہے کہ آپ دنیا سے جب تشریف لے گئے تو پورے طور سے رسالت کے فرض کو انجام دینے کے بعد؟ (سب نے کہا، نہیں کوئی شک نہیں؟) اچھا وہ علم جو آپ پر اترا تھا کیا آپ کے ساتھ ہی اٹھ گیا یا آپ کے بعد باقی رہا؟ (سب نے کہا ضرور باقی رہا) جب باقی رہا تو کیا وہ آپ کی عترت اور اہل بیت کے سوا اور کے پاس ہو سکتا ہے؟ (سب نے کہا نہیں) تو پھر اگر ایسے امکانات پیدا ہوں کہ حکومت اسلامیہ اہل بیت و عترتِ رسولؐ میں آ جائے تو کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ ان کے سوا کسی دوسرے تک پہنچ جائے؟ (سب نے کہا، نہیں۔ ہم میں سے کوئی اس کو پسند نہ کرے گا)[1]

۱۳۰ھ میں طرید بن شفیق سلمی نے نصر بن سیار سے جنگ کی تیاری کے سلسلہ میں اپنی ایک تقریر میں کہا:-

"قبیلۂ مضر کے لوگ آلِ رسولؐ کے قاتل اور بنی امیہ کے اعوان و انصار ہیں۔"[2]

بیعت جو لوگوں سے لی جاتی تھی وہ کسی خاص بادشاہ کا نام لے کر نہیں بلکہ یہ کہہ کر کہ ابایعکم علیٰ کتاب اللہ عزّ وجل وسنّۃ نبیہ والطاعۃ للرضا من اھل بیت رسول اللہ۔

"میں تم سے بیعت لیتا ہوں کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ اور اہل بیت رسولؐ

---

[1] طبری ج ۹ ص ۸۷ [2] طبری ج ۹ ص ۹۷

کے رضا (پسندیدہ شخص) کی اطاعت پر۔[1]

تخطبہ نے اہلِ خراسان کو مخاطب کرکے جو تقریر کی اس میں کہا کہ "بنی امیہ نے عترتِ رسولِ خدا میں سے ان افراد کو جو نیکوکار اور پرہیزگار تھے خوف و دہشت میں مبتلا کیا۔ اب اللہ نے تمھیں مقرر کیا ہے کہ تمھارے ذریعہ بنی امیہ سے ان کا انتقام لے۔[2]"

۱۱ محرم ۱۳۲ھ کو عراق میں ہاشمی سلطنت کے قیام کا اعلان کیا گیا تو ابوسلمہ حفص بن سلیمان جو دوستانِ اہلِ بیت میں سے تھے وزیر مقرر کیے گئے وہ "وزیرِ آلِ محمدؐ" اور ابومسلم خراسانی "امین آلِ محمدؐ" کے نام سے مشہور ہوئے۔[3]

بیشک اہلبیتِ رسولؐ میں سے ذمہ دار افراد ان اقدامات کی حقیقت سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ آلِ رسولؐ کا نام صرف سیاسی مقصد براری کے لیے لیا جا رہا ہے چنانچہ جب خلافت کی پیش کش پر مشتمل خط حضرت جعفر بن محمد صادقؑ کے پاس بھیجا گیا تو آپ نے اسے قاصد کے سامنے ہی چراغ کے شعلہ میں جلا کر خاک کر دیا اور فرمایا کہ اہلِ خراسان حقیقت میں شیعۂ علیؑ نہیں ہیں۔ ابوسلمہ کو دھوکا دیا گیا ہے اور اسے نتیجہ میں قتل کر دیا جائے گا۔[4]

چنانچہ واقعہ یہی سامنے آیا کہ ادھر ابوالعباس سفاح عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کی خلافت کا اعلان ہوا اور اسی کے کچھ دن بعد ابوسلمہ کا خاتمہ کر دیا گیا[5] اور سفاح کے بعد تو آلِ رسولؐ کے ساتھ وقتاً فوقتاً ویسی ہی بدسلوکیاں کی گئیں جیسی بنی امیہ کے دور میں ہو چکی تھیں مگر اس سے اس تاریخی حقیقت پر کچھ اثر نہیں پڑتا کہ عوام کی ہمدردیاں بنی امیہ کے خلاف صرف اہلِ بیتِ رسولؐ اور آلِ محمدؐ کے نام ہی پر حاصل کی گئی تھیں اسی جذبۂ نفرت کی بنا پر جو انھیں شہادتِ امام حسینؑ کے بعد بنی امیہ سے پیدا ہو چکا تھا۔

---

[1] طبری ج ۹ ص ۹۹ [2] طبری ج ۹ ص ۱۰۶ [3] طبری ج ۱ ص ۱۴۲
[4] الوزراء والکتاب ص ۵۷ [5] الوزراء والکتاب ص ۶۰

بیالیسواں باب

تبدیل ذہنیت

امام حسینؑ کا مقصد جیسا کہ جا بجا اس کتاب میں بتایا گیا ہے براہ راست یہ نہیں تھا کہ یزید یا بنی امیہ کی حکومت کو مادی حیثیت میں تباہ و برباد کر دیا جائے اس لیے کہ اگر آپ کو یہی منظور ہوتا تو آپ نے شروع ہی سے مادی ذرائع اختیار کیے ہوتے اور اپنے گرد مناسب حال فوجی طاقت جمع کی ہوتی بلکہ آپ حقیقتاً ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے کوشاں تھے اور ظاہر ہے کہ فوجی طاقت اور تلوار انسانی اجسام کو ٹکڑے ٹکڑے کیا کرتی ہے مگر انکی ذہنیت کو تبدیل نہیں کر سکتی لہٰذا آپ نے اسکی طرف پوری توجہ نہیں فرمائی بلکہ نصب العین کی طور پر یہی رکھا کہ ان کی ذہنیت میں تبدیلی کریں۔ ایسی تبدیلی جو مستقل اور دیرپا ہو اور جس کے اثرات محو نہ ہو سکیں۔ اب دیکھنا چاہیے کہ امام حسینؑ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔

یہ بات ہر ایک کو معلوم ہو گی کہ مسلمانوں کی اکثریت نے خلفائے اسلام کو "اولی الامر" مانا اور ان کی اطاعت کو اطاعت خدا و رسولؐ کی طرح فرض قرار دیا۔ اس ذیل میں کسی درجہ تک "حق تشریع" بھی ان کے لیے تسلیم کر لیا گیا۔ اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ جو خلفاء کا راستہ ہو وہ ٹھیک ہے مگر آج شیعوں کا ذکر نہیں جو اس خلافت کو کسی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ جمہور مسلمین یعنی اہل سنت خلافت کے دو حصے قرار دیتے ہیں ایک "خلافت راشدہ" اور ایک غیر راشدہ جس کو "ملک عضوض" کہا جاتا ہے۔ عام طور پر حضرت علیؑ اور پھر امام حسنؑ کی خلافت جو معاویہ سے صلح کے قبل تک رہی خلافتِ راشدہ کی آخری حد مانی جاتی ہے۔ معاویہ اور پھر یزید اور دیگر خلفائے بنی امیہ و بنی عباس سب خلفاء

کہے جاتے ہیں مگر غیر راشدین۔ یہ تفریق امام حسینؓ کے بے پناہ احتجاج اور مخصوص رنگ کے جہاد ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔

آپ کی اس مقاومت کے باعث یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے صاف ہو گیا کہ خلفا میں سے کسی کو بھی حق تشریع نہیں ہے اور جس طرح بُرے اعمال اگر کوئی عام انسان کرے تو وہ گناہ ہیں اسی طرح مسلمانوں کا منتخب کردہ خلیفۂ وقت ان کا ارتکاب کرے تو وہ بھی گناہ ہیں اور سب سے بڑے گناہ ہیں۔ یہ بھی کہ برسرِ اقتدار حاکمِ وقت کی اطاعت اس مقصد کے تحفظ کے لیے اسی وقت تک ہے جب تک مفادِ خداوندی سے تصادم نہ ہو لیکن جب الٰہی قانون کا تقاضا اس حکومت کی مخالفت میں مضمر ہو تو ہر بندۂ خدا کا فرض ہے کہ وہ بمقتضائے حکمِ خداوندی مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے۔

اس طرح اس بھیڑ یا دھسان والی کیفیت میں جو ۶۰ھ تک نظر آ رہی تھی آپ نے ایک فرض شناسی کا احساس اور حکومتِ جور سے محاسبہ کا ایک جذبہ پیدا کر دیا جس کی بدولت پھر کسی سلطنت کی نظر میں اس کا خواب خرگوش پر کیف اور خوشگوار باقی نہ رہ سکا۔

اس کے بعد حسینؓ کا صبر و استقلال ایک دائمی مثال بن گیا جو ہر سخت موقع پر پیش کیا جاتا اور متزلزل دلوں میں استقلال پیدا کرتا رہا۔ چنانچہ اس وقت جب ۷۱ھ میں مصعب بن زبیر کے مقابلہ میں عبدالملک بن مروان نے لشکر کشی کی اور فوج مخالف کی کثرت سے مصعب کی فوج میں ابتری ہو گئی اور ایک عام رعب طاری ہو گیا تو مصعب نے عروہ بن مغیرہ بن شعبہ کو پکارا کہ ادھر آؤ۔ جب وہ قریب آیا تو مصعب نے کہا اس وقت حسینؓ کے حالات بیان کرو کہ انھوں نے کس طرح ابن زیاد کا حکم ماننے سے انکار کیا اور جہاد پر کمر ہمت باندھی۔ عروہ نے امام حسینؓ کے حالات بیان کیے مصعب نے جوش میں اپنے گھوڑے کو تازیانہ لگایا اور یہ شعر پڑھا ؎

فان الانی بالطف من آلِ ھاشم تأسوا فسنّوا الکرام التأسیا

(یعنی) "وہ جو کربلا میں ہاشمی گھرانے کے افراد تھے ایک ایسی مثال قائم کر گئے ہیں جو شریفوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے ایک بہترین نمونہ ہے۔"

یہ کہہ کر فوجِ دشمن کا جان توڑ مقابلہ کیا اور جنگ کرتے ہوئے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے۔ یہ ۱۵ جمادی الاولیٰ ۶۲ھ کا واقعہ ہے[1]

اس طرح حضرت امام حسینؓ نے جو قوتِ برداشت اور جرأتِ اظہار پیدا کر دی تھی وہ ہمیشہ ظلم و جور کی طاقتوں کے خلاف ایک خطرہ بنی رہی اور احساسِ انسانی کو بیداری کا جو پیغام دیا گیا تھا وہ اس وقت تک باقی ہے اور یونہی باقی رہے گا، جیسا کہ جوشؔ نے کہا ہے

یہ آج جو اک گونج ہے آزادی کی
یہ بھی ہے حسینؓ ابن علیؓ کی آواز

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۰۱ - ۳۰۳ - طبری ج ۷ ص ۱۸۴

تینتالیسواں باب

اخلاقی نتائج

واقعۂ کربلا کی حقیقی اور لافانی افادیت اس ردِّ عمل اور نیز ان انقلابات مادی سے بالکل علیٰحدہ اور مختلف ہے جو کہ قہری نتیجہ کے طور پر ہنگامی حیثیت سے مرتب ہوئے تھے وہ اس اخلاقی قوت سے وابستہ ہے جو نوعِ بشر کی ذہنیت کی صحیح تعمیر اور رہبری کرنے کی پوری ضمانت کر سکتی ہے۔

امام حسینؑ کی ذات اور ان کے کارنامۂ جاوید کو اس کے حقیقی فیوض و برکات کے لحاظ سے کسی ایک گروہ میں محدود کر دینا اسلام کی اس روح کے خلاف ہے جو خالق کائنات کو رب العالمین بتانے میں مضمر ہے۔ جب خدا کی خدائی کسی خاص گروہ سے مخصوص نہیں سمجھی جا سکتی تو حسینؑ ایسے فدیۂ راہ خدا کی قربانی کو کسی ایک گروہ میں محدود کرنا بھی سراسر غلط ہے۔ بلکہ آپ کی شہادت کا مفاد ان تمام لوگوں سے متعلق ہے۔ جو آپ سے انسانی زندگی کا سبق لینا چاہیں۔

ذیل میں واقعۂ کربلا سے مذہب، انسانیت اور اسلام کے متعلق جو فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ان کو سلسلہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ مذہب اور روحانیت کی طاقت کا مظاہرہ:

مادیت اور روحانیت میں جنگ ہمیشہ ہی برپا رہی اور آج بھی ہے۔ مذہب روحانیت کا علمبردار ہے۔ اس لیے آج جب کہ دنیا روحانیت کی طرف سے منہ موڑے

ہوئے ہے تو وہ مذہبی معتقدات کو اوہام کے نام سے تعبیر کر کے ان کی اہمیت کو گھٹاتی ہے مگر مذہب اپنی طاقت ہمیشہ منواتا رہا ہے۔

کربلا کی جنگ مذہبیت اور مادیت کے درمیان ایک عظیم الشان جنگ تھی۔ اس طرف تمام مادی مظاہر تھے جو آنکھوں کے سامنے تھے اور وہ ایک انسان کو مرعوب اور متاثر بنانے کے لیے کافی تھے اور اس مرعوبیت و تاثر کا لازمی تقاضا یزید کی بیعت کے لیے سرِ تسلیم خم کر دینا تھا۔ اور ادھر وہی "نادیدہ" حقیقتیں تھیں جنھیں مذہب انسانی دماغ میں راسخ کرتا ہے۔

دنیا نے دیکھ لیا کہ تمام مادی مظاہر حضرت امام حسینؑ اور ان کے جانباز رفقا کو متاثر بنانے میں ناکام ہوئے اور وہ انکار بیعت جو غیبی طاقت پر ایمان کا نتیجہ تھا پورے جاہ و جلال کے ساتھ آخر تک قائم و برقرار رہا اور نتیجہ کے اعتبار سے کامیابی حاصل کر کے دنیا کے سامنے روحانیت کی فتح کا لازوال نمونہ بن گیا۔

۲۔ حقانیتِ اسلام کی تصدیق و اشاعت:

ایک مذہب کی سچائی کا بڑا نشان ہے اس کے بانیان کا ثبات قدم اور استقلال کے ساتھ مصائب کو برداشت کرنا اور آخر وقت تک اپنے اصول سے منحرف نہ ہونا۔

مگر کسی مذہب کے عقیدت کیشوں میں عام افراد کا مصائب کو جھیل لینا یا اپنے کو قربانی کے لیے پیش کرنا کوئی ایسا مستند امر نہیں ہے اس لیے کہ عام افراد اکثر حقیقت حال سے بے خبر اور واقعی دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کے لیے بالکل ممکن ہے کہ وہ سراب کو آب اور مجاز کو حقیقت خیال کر لیں اور اپنے زعمِ باطل کی حمایت میں جان دینے پر بھی تیار ہو جائیں لیکن خود بانیٔ مذہب اور اس کے مخصوص واقف کار افراد اور گھر والوں کا جو اس کے اسرارِ زندگی اور رموزِ حیات

اور معیارِ اخلاق و اوصاف سے پورے طور پر واقف ہیں۔ اصول کی حمایت میں استقلال و ثباتِ قدم کے ساتھ مصائب کو برداشت کرنا اور ضرورت کے وقت جان کی قربانی پیش کرنا بیشک اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ اس اصول میں سچائی اور خلوص کا جوہر مضمر ہے۔

اسی لیے حضرت رسولؐ کا طرزِ عمل اپنی لڑائیوں میں بھی یہی تھا کہ وہ اپنے عزیزوں کو میدانِ جنگ میں سب سے آگے رکھتے تھے جس کا تذکرہ حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے۔ ان الفاظ میں کہ "جب خونریز جنگ کی صورت سامنے آتی تھی اور لوگوں کے قدم پیچھے ہٹتے تھے تو آپ اپنے گھرانے کے لوگوں کو آگے بڑھاتے تھے اور ان کو اپنے اصحاب کی حفاظت کا ذریعہ بناتے تھے۔ نیزہ و شمشیر کی آنچ سے۔" اس کا نتیجہ تھا کہ عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب رسولؐ کے چچازاد بھائی شہید ہوئے۔ جنگِ بدر میں جو سب سے پہلی اسلامی لڑائی تھی اور حمزہ بن عبدالمطلب جو حضرتؐ کے چچا تھے اُحد میں مارے گئے۔ اور جعفر بن ابی طالبؑ جو رسولؐ کے دوسرے چچازاد اور حضرت علیؑ کے حقیقی بھائی تھے موتہ کے معرکہ میں شہید ہوئے اور خود حضرت علیؑ ہر خطرہ میں موت کی طرف آگے بڑھتے نظر آئے۔

یہ طرزِ عمل رسولؐ کا بتلاتا ہے کہ خدا کا دین حضرت کو کس درجہ عزیز تھا اور آپ اس کے لیے کیسی قربانیاں پیش کرنے پر تیار رہتے تھے۔ آخر میں ضرورت پڑی ایک شہید کی جو کمال مظلومیت کا نمونہ ہو۔ اس کے لیے بھی رسولؐ کا جگر بند حسینؑ ہی آگے بڑھ کر آیا۔

امام حسینؑ کی قربانی کوئی خاموش قربانی نہ تھی بلکہ آپ عملی قربانی کے ساتھ ساتھ برابر اپنی زبان سے بھی حقیقی اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے اور اپنے کردار سے بھی احکامِ اسلام کی عظمت دلوں میں قائم کرتے رہے۔ آپ نے کربلا میں تبلیغِ حق کے پہلو کو کسی وقت نظر انداز نہیں کیا۔ اس وقت کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے چاروں طرف سے امامؑ پر راستہ بند کر دیا تھا، اور تیس ہزار کے لشکر نے دین و مذہب بلکہ انسانیت وغیرہ کو خیرباد کہہ کر فرزندِ رسولؐ کے قتل پر کمر باندھ لی تھی تو حالانکہ ان کا گمراہی سے باز آنا

ممکن نہ تھا اور حسینؑ اس سے پوری طرح واقف تھے۔ پھر بھی چونکہ ایک مبلّغ مذہب اور داعیٔ حق کا فریضہ یہی ہے کہ وہ حق کی آواز بلند کرے اور تبلیغ و دعوت میں کوتاہی نہ کرے لہٰذا اس فریضہ کو امام آخر دم تک ادا کرتے رہے۔

۹ محرم کو اس وقت جب کہ خونخوار لشکر کی یورش تھی اور حسینؑ اور ان کی مختصر جماعت کے قتل کر دینے کے لیے حملہ کر دیا گیا تھا تو آپ نے اپنے بھائی عباس کو بھیج کر ایک شب کی مہلت مانگی صرف اس لیے کہ اس رات بھر آخری دفعہ بیدار رہ کر خدا کی عبادت کر لیں چنانچہ شب اس طرح گزاری گئی کہ لھم دوی کدوی النحل (یعنی) اس جماعت کی آوازیں ذکرِ الٰہی اور تسبیح کے ساتھ اس طرح گونج رہی تھیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز آتی ہے"۔ اس طرح انھوں نے دکھلا دیا کہ سخت ترین مواقع پر کس طرح اصولِ مذہب کا خیال رکھنا چاہیے اور یہ کہ روحانی قوت عالم کی ہر قوت سے زیادہ پُر طاقت ہے۔

اس سے زیادہ سخت اور کٹھن وہ موقع تھا جب روزِ عاشور لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ حسینی جماعت کے بہت سے افراد قتل ہو چکے تھے اور نمایاں کمزوری محسوس ہونے لگی تھی اور تیروں کی بارش جاری تھی لیکن اس حالت میں بھی نمازِ ظہر بجماعت ادا کی گئی اور ایسی نماز کہ جس کی نظیر عالم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

امام روبقبلہ اور مجاہدین کی صفیں پیچھے اور دو بہادر جان نثار امام کے آگے سینہ سپر بنے ہوئے تھے کہ جو تیر آئے اپنے سینے پر لیں جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نماز ختم ہوتے ہوتے ان دو بہادروں میں سے ایک سعید بن عبداللہ حنفی زمین پر گر کر تڑپنے لگے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ تھے حقانیت کے وہ مظاہرات اور اسلامی تعلیم کے وہ نمونے جنھوں نے ایک طرف تو دنیا کو دعوتِ حق کی پُر زور آواز سے مملو کر دیا اور افرادِ اسلام کے اسلامی

احساسات کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور دوسری طرف یزید اور ہواخواہانِ یزید کے ظالمانہ افعال اور اسلام کش حرکات کا پردہ چاک کر دیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ کربلا کی جنگ میں حسینی جماعت کی ہر فرد ایک مبلغ کی حیثیت رکھتی تھی۔ بریر ہمدانی کا مباہلہ حبیب بن مظاہر کا مکالمہ، زہیر بن قین کا خطبہ اور تمام انصار و اقربا کے رجز ان سب کے ذریعہ حسینی اقدام کے اسباب و علل نہایت تصریح کے ساتھ میدان کربلا ہی میں بیان کر دیے گئے۔ خواہ ان کا اثر ظاہر ہوا یا نہ ہوا کیونکہ ایک مبلغ کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی آواز پر لبیک کہنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ سخت اور کٹھن موقعوں پر اور دشوار گزار منازل میں اپنے فریضہ کو ادا کر دے اور جو دعوت و اظہار کا حق ہے اسے پورا کر دے۔

یہاں تک کہ جب حسینی جماعت کے پیر و جوان سب دادِ شجاعت دے کر رخصت ہو چکے اور صرف مظلوم حسینؑ باقی رہ گئے دشمنوں کا نرغہ تھا۔ دل پر مصائب کا ہجوم اور آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی تو اس کے باوجود اپنے فریضہ سے ذرا دیر کے لیے بھی غافل نہ ہوئے انھوں نے کوئی دقیقہ اظہارِ حق میں اٹھا نہیں رکھا اور آخر نفس تک اپنے فرض کو ادا کرتے رہے۔

اس وقت بھی جب کہ شمر کا خنجر بوسہ گاہ مصطفےٰؐ کے قریب آ چکا تھا اور خامس آلِ عبا کی زندگی کا چراغ گل ہو رہا تھا حسینؑ نے اپنے قاتل کے حق میں بھی تبلیغ کا فرض ادا کیا اور اپنے نانا کی حقانیت کو ثابت کر دکھایا۔ یہ فرما کر کہ "اے شمر! ذرا اپنے چہرے سے نقاب اٹھا"، شمر نے نقاب ہٹائی۔ حضرت نے فرمایا "میرے نانا رسول اللہؐ نے سچ کہا تھا کہ اے حسینؑ! تمھارا قاتل ایک مبروص (کوڑھی) شخص ہوگا۔"

روحی لک الفداء! اے حسینؑ بن علیؑ آپ نے مرتے دم تک اپنے فریضہ سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ آپ نے اپنے نانا کے قول کی زیر خنجر بھی تصدیق کی۔ آپ کے خون کا ہر قطرہ

جو کربلا کی سرزمین پر گزر رہا تھا اسلام کی سچائی کا ایک دائمی نشان تھا۔

اخلاقی اور تمدنی تعلیمات

کربلا کا واقعہ مرقع مصائب ہونے کے ساتھ صرف دعوتِ آہ و نالہ اور تحریکِ اشک افشانی کا سرمایہ نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ وہ ایک درسگاہِ تعلیم و تربیت بھی ہے جس سے انسانی رفعت کی شاہراہیں سامنے آتی ہیں۔

حالانکہ عام طور پر کسی عمل میں کوئی ایک پہلو ہوتا ہے تعلیم کا مگر واقعۂ کربلا باوجود اپنی مختصر مدتِ وقوع کے تمام اہم تعلیمات کا مرکز ہے۔ ذیل میں کچھ عناوین کو درج کر کے واقعات کا حوالہ دیا جاتا ہے جن سے کسی حد تک واقعۂ کربلا کی ہمہ گیری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حریّت:

حریّت کے معنی خواہش کے مطابق مطلق العنانی کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے ضمیر کے فیصلوں پر بغیر کسی رکاوٹ کے عمل پیرا ہو سکے۔ ان رکاوٹوں میں سب سے بڑھ کر خود اپنے لذائذ اور ان چیزوں سے محبت ہے جو اس ضمیر کی آواز پر عمل کرنے سے خطرہ میں پڑتی ہیں۔

اگر انسان اپنی خواہشوں اور نفس کے تقاضوں سے آزاد ہو گیا تو دنیا کا کوئی ظالم اسے غلام نہیں بنا سکتا۔

حضرت امام حسینؑ کے سامنے ہر وہ چیز خطرہ میں تھی جو کسی انسان کو عزیز ہوتی ہے لیکن آپ نے اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق عمل کر کے ایسے ہنگام میں حریّتِ نفس کا ثبوت دیا جس کی شدتوں کا تصور بھی عام طور پر انسان کے لرزہ بر اندام کر دینے کے لیے کافی ہے۔

یہی حرّیت کے وہ معنی ہیں جس کے اعتبار سے آپ نے حرّ بن یزید ریاحی کو جو فوج باطل کا ساتھ چھوڑ کر حق کی طرف آ گئے حرّیت کی سند دیتے ہوئے فرمایا۔ انت کما سمتک امک "تم بے شک اسم بامسمّٰی ہو"۔ انت حر فی الدنیا والاخرۃ ۔ تم دنیا میں بھی حرّ ہو اور آخرت میں بھی"

یہ حرّیت آزادی اور غلامی کے اس مفہوم سے بالکل الگ ہے جو آج سیاسی دنیا میں رائج ہے۔ کسی آزاد ملک کے افراد بھی حقیقت میں غلام ہیں جب وہ گنگا جمنی توقعات کی بنا پر غلط مفادات کی راہ اختیار کیے ہوئے ہوں اور کسی "غلام" ملک کے بھی افراد آزاد ہیں۔ اگر وہ باوجود جبر و تشدد کے شکنجہ کے اپنے فرائض حق پرستی سے غافل نہ ہوں۔

استقلال:

سخت اور دشوار منزلوں کے سامنے آنے پر قدم میں لغزش نہ ہونا ثبات و استقلال ہے اور اس امتحان میں کربلا کے مجاہدین کا نمبر سب سے اول ہے۔

کون نہیں جانتا کہ گفتار اور کردار دو مختلف چیزیں ہیں۔ کہنا آسان ہے لیکن عمل کرنا مشکل ہے۔ ماضی قریب کی عظیم جنگوں میں بہت سی قوموں کی آزادی سلب ہوئی۔ ان میں سے کون وہ قوم تھی جس نے جنگ شروع کرتے وقت یہ اعلان نہ کیا ہو کہ ہم آخری قطرۂ خون گرنے تک دشمنوں کی غلامی قبول نہیں کریں گے مگر وہ ملک فتح ہو گئے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت ان میں کوئی فرد بھی قابل جنگ باقی نہ رہ گئی تھی۔ ہوتا یہی ہے کہ ان میں بہت بڑی جماعت ایسی باقی رہتی ہے جو جنگ کرنے کے قابل سمجھی جا سکے مگر مشکلات کے سامنے وہ سپر انداختہ ہو جاتی ہے۔

اس کے برخلاف اگر کربلا والوں پر نظر ڈالیے تو آپ کو وہاں کا بچہ بچہ اپنے قول کی کسوٹی پر پورا اترتا ہوا دکھائی دے گا اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس فوج کے سردار اور

اس کے ساتھیوں نے جو کہا اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔

حضرت امام حسینؑ نے جب یہ فرمایا تھا کہ "بیعت نہیں کروں گا" تو اس وقت اس کا صحیح مفہوم دنیا کو معلوم نہ تھا کیونکہ انسانی تخیل کے حدود ان امکانات کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے جہاں تک واقعات کی رفتار بعد کو پہنچ گئی۔

دنیا نہیں سمجھ سکتی تھی کہ اس "نہیں" میں کتنے مشکلات کے مقابلہ کا عزم مضمر ہے لیکن حسینؑ جس وقت "نہیں" کی آواز بلند کر رہے تھے تو دل کی گہرائیوں میں اپنی قوتِ ارادی کا جائزہ لینے اور موقع کی نزاکت پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ شدائد اپنے امکانات کی آخری حد تک پہنچ جائیں گے لیکن میرے عزم کو نہ بدل سکیں گے۔ چنانچہ نتیجہ نے ظاہر کر دیا کہ اس "نہیں" میں کتنا وزن تھا۔

راستے میں جب حرؑ کہتا ہوا جا رہا تھا کہ اپنے اوپر رحم کیجیے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ قتل ہو جائیں گے تو آپ نے فرمایا تھا کہ کیا اس کے آگے بھی کچھ ہے؛ جب انسان حق پر قائم ہے تو موت کے آنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

آپ کے فرزند علی اکبرؑ نے یہی کہا تھا کہ جب ہم حق پر قائم ہیں تو موت کی کوئی پرواہ نہیں۔

آپ کی اس قوتِ عزم کا اندازہ دشمن کو بھی تھا چنانچہ اس وقت کہ جب شمر ابن زیاد کا خط لے کر نویں تاریخ محرم کو آیا تھا کہ حسینؑ سے غیر مشروط طور پر اطاعت کا اقرار لو یا جنگ کرو اور عمر سعد نے خط دیکھا تھا تو بجائے اس کے کہ امام حسینؑ کے پاس جاتا اور آپ کو مضمون خط سے اطلاع دیتا اس نے اپنی جگہ پر کہہ دیا تھا کہ "حسینؑ اس طرح؛ تو اطاعت نہ کریں گے وہ اپنے باپ کا دل اپنے سینہ میں رکھتے ہیں[1]۔"

نتیجہ میں سب نے دیکھ لیا کہ میدانِ جنگ میں ہزاروں مصائب کے سیلاب تھے جو آتے تھے اور اس کوہِ عزم و استقلال سے ٹکرا کر واپس چلے جاتے تھے۔ گویا ان تمام مصائب

---

[1] ارشاد صہ ۲۴۲

کے ہجوم میں حسینؑ کی زبان پر یہ شعر جاری تھا کہ ؎

ان کان دین محمد لم یستقم
الا بقتلی یا سیوف خذینی

"اگر میرے نانا کا دین اس وقت تک برقرار نہیں رہ سکتا جب تک کہ میری رگ حیات قطع نہ ہو جائے تو اے خون آشام تلوارو آؤ یہ جسم حاضر ہے۔"

یہاں تک کہ اس وقت بھی کہ جب آس پاس کوئی موجود نہ رہا تھا اصحاب و انصار سب شہید ہو چکے تھے، خود آپ پر حملے ہو رہے تھے اور زخموں سے چور چور تھے، اس وقت بھی آپ کی ابرو پر شکن نہ تھی۔ خود فوج عمر سعد کا ایک آدمی بیان کرتا ہے کہ "خدا کی قسم میں نے کوئی دل شکستہ و زخم رسیدہ آدمی جس کے اولاد، بھائی، اعزا و انصار سب قتل ہو گئے ہوں ایسا نہیں دیکھا جو حسینؑ سے زیادہ مطمئن، مستقل مزاج، ثابت قدم اور باہمت ہو۔[1] خدا کی قسم ان سے زیادہ کیا، میں نے ان کے قبل اور ان کے بعد ان کے مثل بھی کوئی نہیں دیکھا۔[2]"

جماعتی تنظیم:

تنظیم اجتماعی ایک جمعیت کی وحدت خیال، وحدت قصد اور وحدت عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک شخص اگر تنہا ایک خیال پر قائم بھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اسے ساتھی بھی ایسے مل جائیں جو بلا استثناء سب آخر تک اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں۔ پیروؤں کا ثبات و استقلال ایک علیحدہ چیز ہے جو کسی انسان کی انتہائی عظمت کے بعد بھی ضروری نہیں ہے کہ حاصل ہی ہو جائے۔

ہمارے سامنے انبیاء و مرسلین کے حالات ہیں ہمیں معلوم ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے

---

[1] ارشاد مفید ص ۲۵۶ [2] طبری ج ۶ ص ۲۵۹

بنی اسرائیلؑ پر کتنے احسانات تھے۔ اُن کو مظالم سے چھڑایا۔ مصر کے ملک سے بچا کر نکال لے گئے۔ بیت المقدس کے فتح کرنے کے لیے تیار کیا مگر جب یہ لوگ حمل کی منزل سے دو چار ہوئے اور فلسطین کے قد آور آدمی دکھائی دیے تو انھوں نے موسیٰؑ سے صاف کہہ دیا کہ "وہاں تو بڑے بڑے زبردست لوگ موجود ہیں۔ ہم ہرگز نہیں جائیں گے جب تک کہ وہ خارج نہ ہو جائیں۔ ہاں جب وہ نکل جائیں گے تو پھر ہم اندر داخل ہوں گے۔" اس بڑے مجمع میں جو موسیٰؑ کے ساتھ تھا قرآن نے شمار کر کے بتایا ہے کہ کتنے آدمی تھے جو اپنی بات پر قائم رہے۔ صرف دو مخصوص آدمی وہ تھے جنھوں نے کہا کہ دروازہ میں داخل ہو جب تم داخل ہو جاؤ گے تو تمھیں فتح حاصل ہوگی اور خدا پر بھروسا کرو اگر ایمان رکھتے ہو۔ مگر دوسرے لوگوں نے کوئی اثر نہیں لیا اور نہایت دلشکن الفاظ میں کہا "ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے جب تک یہ اس میں موجود ہیں۔ ایسا ہی ہے تو آپ جائیے اور آپ کا پروردگار اور آپ دونوں مل کر جنگ کر لیجیے۔ ہم یہاں بیٹھ کر تماشا دیکھیں گے۔"

حضرت عیسیٰؑ کے شاگردوں کا تذکرہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ تھوڑے سے تو وہ لوگ ہی تھے جو ایمان لائے تھے۔ ان میں بھی یہ عالم تھا کہ شاگردوں ہی میں سے ایک تھا جس نے ان کے خلاف خبر رسانی کی اور ان کو گرفتار کرا دیا۔

انجیل بتا رہی ہے کہ یسوع مسیح نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو میرے بارے میں ٹھوکر نہ کھائے۔ ایک بڑے مخصوص شاگرد پطرس نے کہا کہ اے میرے باپ سب ٹھوکر کھائیں، میں نہیں کھاؤں گا۔ یسوعؑ نے فرمایا کہ (صبح کو) مرغ کے اذان دینے سے پہلے تو تین مرتبہ میرا انکار کرے گا۔ انجام یہی ہوا کہ جب حضرت مسیحؑ کو گرفتار کر کے لے چلے تو یہ شخص پیچھے پیچھے حالات دیکھنے کے لیے گیا۔ مخالف جماعت کو شک ہوا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کا آدمی ہے۔ پوچھا تم اُن کے طرفداروں میں سے ہو؟ کہا نہیں میں ان کو نہیں جانتا۔ دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا اور تیسری مرتبہ اس کے ساتھ

حضرت عیسیٰؑ کی شان میں نازیبا کلمات بھی استعمال کیے۔ اس وقت مرغ کی آواز آئی اور اس طرح مسیحؑ کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ اسی طرح باقی ساتھیوں نے بھی حضرت عیسیٰؑ کی کوئی نصرت و حمایت نہیں کی اور راہِ حق پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔

ہمارے پیغمبرؐ کی تاریخ زندگی بھی اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بہت سے اس طرح کے مواقع کا تذکرہ قرآنِ کریم کے اندر موجود ہے۔ ایک معمولی سا واقعہ یہ ہے کہ ایک افسر کی ماتحتی میں جس کا نام عبداللہ بن جبیر تھا پچاس آدمیوں کو درّۂ کوہِ اُحد پر کھڑا کر دیا گیا تھا کہ چاہے ہمیں شکست ہو چاہے فتح، تم اس جگہ سے نہ ہٹنا مگر جب جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی تو باوجود یکہ افسر روکتا رہا مگر سوا چند آدمیوں کے وہاں کوئی نہ رہ گیا اور سب مالِ غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فتح شکست کی صورت میں تبدیل ہو گئی اور مسلمانوں کی اکثریت صبر و استقلال سے عاری ثابت ہوئی۔

ایسے نمونے تاریخ میں بے شمار ہیں لیکن کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جو لوگ تھے ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کے قول و عمل میں اختلاف کی جھلک بھی نظر آ سکے۔

اسی وجہ سے امام حسینؑ فخر کرتے تھے کہ جیسے وفادار اور جاں نثار میرے ساتھی ہیں ایسے کسی کے نہ تھے۔

عزتِ نفس:

کوئی شک نہیں کہ زندگی عزیز شے ہے اور فطرتِ انسانی میں حیاتِ دنیا کی محبت ودیعت کی گئی ہے۔ انسان اسی کی خاطر سخت ترین دنیا کے مشکلات کو برداشت کرتا اور سرد و گرم عالم کا تحمل کرتا ہے اور تمام وہ ممکن ذرائع جن سے اس کی ہستی کی بقا کا امکان ہو اپنے لیے حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام نے بھی اس فطری رجحان کو روکنے کی وجہ نہیں بتائی بلکہ لاتلقوا بایدیکم الی التھلکہ (اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالو) کے حکیمانہ حکم سے حفاظتِ نفس

کو ایک لازمی فریضہ قرار دیا۔ لیکن زمانے کے لیل و نہار میں ایسے نازک مواقع بھی پیش آ جایا کرتے ہیں جب جذبات میں تلاطم اور طبعی و عقلی رجحانات میں تصادم ہوتا ہے۔ زندگی اپنی تمام دلفریبیوں کے باوجود اتنی مہیب صورت میں نظر آتی ہے کہ انسان بے اختیار اس سے آنکھیں موڑ لینا پسند کرتا ہے اور اسی محبوب زندگی سے جس پر وہ ہر ممکن چیز قربان کر دینا پسند کرتا تھا ہاتھ دھونے میں لذت محسوس کرتا ہے۔

یہ صورت کبھی غیر شعوری، شہوانی، جاہلانہ، ناعاقبت اندیش رجحانات سے پیدا ہوتی ہے اور اس موقع پر جان دینے سے نہ عقل بڑھ کر مرحبا کہتی ہے اور نہ شرع شاباش کی آواز دیتی ہے لیکن جس وقت موت سے بدتر زندگی اور زندگی سے بہتر موت میں معاملہ پڑ گیا ہو، جس وقت بقائے حیات اہم ترین مقاصد کے پامال ہو جانے پر موقوف ہو اور جس وقت عزتِ نفس اور فنائے وقتی کا سوال درپیش ہو جب کہ میزانِ عقل نے صورتِ حال کے مختلف پہلوؤں کو تول کر موت کو حیات پر ترجیح بھی دی ہو تو اس وقت موت کے منہ میں جا پڑنے والے حیاتِ دائمی کے مالک ہو جاتے ہیں۔

حسینؑ بن علیؑ نے کربلا میں اپنے فریضہ کا احساس کرتے ہوئے جو راستہ طے کیا تھا وہ اسی اصول پر مبنی تھا۔ آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ الموت خیر من رکوب العار "ننگ و عار کے برداشت کرنے سے موت کا آنا بہتر ہے" اور یہ کہ الموت فی عزّ خیر من حیوٰۃ فی ذل (یعنی) "عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے" صحرائے کربلا میں گونج کر فنا نہیں ہو گئے بلکہ ان کا پائیدار مفہوم آج بھی غیرت دار اقوام کے صحیفۂ حیات کا سرنامہ اور دیباچۂ زندگی کا عنوانِ اول ہے۔

یہ مختصر الفاظ علوِ ہمت کی منادی اور عزتِ نفس کے ترجمان ہیں اور ان ہی کو حسینؑ نے عملی وزن کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھا ہے۔

صبر:

یہ صفت تو حضرت امام حسینؓ کے ساتھ ایسی مخصوص ہوئی کہ "سید الصابرین" (صبر کرنے والوں کے سردار) کا لقب حاصل ہو گیا۔ مصیبت کے ہنگامی طور پر آجانے کے بعد پھر اس کو برداشت کر لینا تو ایک مجبوری کا سوال سمجھا جا سکتا ہے مگر کربلا میں حق کے شیدائی مصیبتوں کا خود استقبال کرتے تھے۔

حضرت امام حسینؓ کا خود تلوار نہ اٹھانا اور تمام ساتھیوں اور عزیزوں کو اپنے سامنے رخصت کرنا قوتِ برداشت کا انتہائی امتحان دینا تھا۔

یہی روح آپ کے تمام ساتھیوں میں بھی کارفرما نظر آتی ہے۔

وہ عابس کا کہنا اپنے غلام سے کہ "تمہارا کیا ارادہ ہے" اور شوذب کا جواب کہ "ارادہ یہی ہے کہ آپ کے ساتھ رہ کر فرزندِ رسولؐ کی نصرت میں جنگ کروں اور قتل ہو جاؤں" اور پھر عابس کا کہنا کہ "شاباش! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اچھا تو پھر بڑھو آگے اور امام پر جان نثار کرو تاکہ امام تمہاری مصیبت بھی اسی طرح دیکھ لیں جیسے اپنے دوسرے اصحاب کی دیکھی ہے۔ اور میں بھی تمہارے غم کو برداشت کر کے ثواب کا مستحق بنوں۔ یقیناً اگر اس وقت کوئی ایسا شخص میرے ساتھ ہوتا جس پر مجھے تم سے زیادہ اختیار ہوتا تو میری خوشی ہوتی کہ وہ میرے سامنے جہاد میں کام آئے۔ تاکہ میں اس کی مصیبت کو برداشت کروں کیونکہ آج تو دن ایسا ہے جس میں جتنا انسان سے ہو سکے اتنا اجر و ثواب حاصل کرے کیونکہ آج کے دن کے بعد پھر عمل کا دفتر ختم ہے اور حساب کے سوا کچھ نہیں ہے[1]"

یہ وہ الفاظ ہیں جنھیں اطمینان کے موقع پر شاعری کے طور پر ہر شخص کہہ سکتا ہے لیکن عین مصیبت کے موقع پر واقعی طور سے ان کا کہنا بہت مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے مصائب کے اٹھانے کا ایک جذبہ ہے جو خود اختیاری طور پر عملی اقدامات کا محرک ہے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۴۔

اسی طرح جناب ابوالفضل العباسؑ کا قول بھی اپنے بھائیوں سے کہ "بڑھو آگے بڑھو تاکہ میں تمھیں اپنی آنکھ سے قتل ہوتے دیکھ لوں" اسی ولولہ اور جذبہ کا آئینہ دار ہے۔

شجاعت :

علم اخلاق میں طے پایا ہے کہ انسان کی تمام قوتوں کا معتدل ہونا مجموعی طور پر فضائل کا سنگ بنیاد ہے۔

یہ دنیا والوں کی ناسمجھی ہے کہ وہ ہر اس شخص کو جو محل بے محل جنگ پر آمادہ ہو جائے۔ بہادر اور شجاع کہہ دیتے ہیں لیکن شجاعت حقیقتاً یہ ہے کہ انسان کے لیے جس وقت قدم اٹھانا مناسب ہو اور اقدام ضروری ہو۔ اس وقت پُر جگری کے ساتھ وہ آگے بڑھے اور وہ سب کچھ کرے جو اس کا فرض معلوم ہوتا ہو۔ چاہے اس سلسلہ میں اسے جان بھی دینا پڑے اور جس موقع پر اقدام مناسب نہ ہو بلکہ سکوت اور چشم پوشی کی ضرورت ہو۔ اس وقت تحمل سے کام لے۔ چاہے اس میں کتنے ہی مشکلات درپیش ہوں اور ناگوار امور تو کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اس صورت میں خاموشی اسی طرح شجاعت کا ثبوت ہوگی جس طرح پہلی صورت میں نبرد آزمائی۔

دنیا والے عموماً ظاہر بین ہوتے ہیں۔ وہ حقیقی اسباب و علل پر غور نہیں کرتے چنانچہ حضرت امام حسینؑ نے جس طرح اور جس موقع پر میدان کربلا میں اپنی عظیم قربانی پیش کی۔ اس کی حقیقی اہمیت و عظمت کا احساس کرنے والے دنیا میں بہت کم ہیں مگر ہر شخص ہر موقع پر جوش پیدا کرنے کے لیے واقعۂ کربلا کی مثال ضرور پیش کرتا ہے۔ گویا ہر شخص اپنے وقت کا حسینؑ اور ہر موقع اس کے لیے کربلا ہے مگر دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ محل کا تقاضا اور اسباب کی صورت مختلف ہوا کرتی ہے۔

حسینؑ ابن علیؑ کی شجاعت کا وہ صرف ایک رُخ ہے جسے کربلا پیش کرتی ہے اور

اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جسے حضرت نے دس برس تک اپنے بھائی امام حسنؑ کی صلح کا پابند رہ کر پہلے دکھلایا۔ اس دوران میں بہت سے تکلیف دہ واقعات پیش آئے مگر امام حسینؑ نے انھیں برداشت کیا اور کسی طرح مکدر فضا میں اپنی طرف سے اضطراب پیدا نہ کیا۔ بے شک جس وقت آپ کو یہ فرض معلوم ہوا کہ آپ کھڑے ہوں اور باطل سے ٹکرا جائیں تو پھر پہاڑوں کا استحکام آپ کے استقلال تک نہیں پہنچتا تھا۔

آپ کی شجاعت کا وہ رُخ بھی بے نظیر تھا اور یہ رخ بھی ایسا تھا جس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی مگر چونکہ سکون سے حرکت زیادہ نمایاں چیز ہے اور نفی سے زیادہ اثبات نظروں کو متوجہ کرتا ہے۔ اسی لیے عام نگاہوں میں شجاعت کا یہ ایجابی ہی پہلو زیادہ کھٹکتا ہے اور دنیا اسے دیکھتی ہے تو حسینی شجاعت کا کلمہ پڑھنے لگتی ہے۔

صرف آپ ہی نہیں بلکہ آپ کے ساتھی بھی اس صفت میں بے نظیر نظر آتے ہیں۔

کربلا کی جنگ میں جو پُر جگری کے مظاہرات سامنے آئے ہیں وہ انسان کے جسم پر رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے آج بھی کافی ہیں۔

یاد کیجیے ظہر کی نماز کو کہ کس طرح ادا کی گئی تھی۔ امام اور آپ کے اصحاب مصلّے پر نماز میں مصروف اور سعید بن عبداللہ حنفی سامنے سپر بنے ہوئے کھڑے تھے جو تیر دائیں یا بائیں طرف سے آتا تھا اسے اپنے جسم پر روکتے تھے یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو کر گر گئے تھے۔

یا ظہر سے قبل کا وہ وقت جب حملۂ اولیٰ کے بعد پچاس آدمی فوج حسینی کے ایک ساتھ شہید ہو گئے تھے اور اس سے لشکرِ مخالف کی ہمت بڑھ گئی تھی جس پر اب اس کی کوشش تھی کہ دم کے دم میں یہ مہم سر ہو جائے مگر یہ حضرت امام حسینؑ کی بے نظیر سیاست حرب اور حسینی جماعت کی بے مثال شجاعت ہی تھی جو ہر حملہ کو ناکام بنا دیتی تھی۔ آخر جب شمر نے مخصوص خیمۂ امام حسینؑ پر حملہ کیا اور اپنا نیزہ خیمہ پر مار کر کہا تھا کہ آگ لاؤ میں اس خیمہ کو اس کے رہنے والوں سمیت جلا دوں اور خیمہ سے ایک شور رونے کا بلند ہوا تو صرف دس بہادر جانباز

تھے۔ جنھیں لے کر زہیر بن قین آگے بڑھے اور شمر اور اس کے ساتھ کی فوج کو خیموں کے پاس سے دور ہٹا دیا تھا۔

یا یہ منظر کہ عمرو بن قرظہ جنگ کرتے ہیں اور کچھ دیر تلوار چلانے کے بعد پھر امامؑ کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں جو تیر آتا ہے اسے اپنے سینہ پر روکتے ہیں اور جو وار ہوتا ہے خود سپر بن جاتے ہیں۔ آخر زخموں سے چور چور ہو جاتے ہیں اور امام سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ "کیوں فرزندِ رسولؐ میں نے فرض کو ادا کیا۔" حضرت فرماتے ہیں کہ "ہاں تم جنت میں میرے آگے جاؤ گے"۔ بہادر جانباز زخموں کی کثرت سے زمین پر گرتا ہے اور جاں بحق تسلیم ہوتا ہے۔

یا یہ عالم کہ جب عابس تلوار کھینچے ہوئے فوج دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں اور بزدل دشمن کی فوج پتھروں کی بارش کر دیتی ہے تو عابس زرہ اور خود و بکتر اتار کر پھینک دیتے ہیں اور تلوار نیام سے لے کر فوج مخالف پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

یقیناً ان میں سے ہر منظر شجاعت کا ایک یادگار مرقع ہے اور ان سے زیادہ عظیم حسینی شجاعت کے کام میں لائے جانے کا وقت تھا جب ایک یکہ و تنہا اور بے کس کمر خمیدہ اور دل شکستہ کے سامنے ہزاروں آدمی بھاگتے نظر آتے تھے۔

تمام مجاہدین کربلا اور ان کے سالار حضرت سید الشہداءؑ کی شجاعت نے وہ مرقعے پیش کیے جن کا اثر دشمنوں کے دل پر مدت العمر رہا اور اس کا اظہار ان کی زبان سے ہوا کیا جیسا کہ بریر ہمدانی کے قاتل کعب بن جابر نے اپنے اشعار میں کہا:۔

"میری آنکھوں نے اس زمانے میں اور نہ اس کے پہلے ابتدائے عمر سے کبھی ان کی ایسی جماعت نہیں دیکھی جو اس شدت سے حرب و ضرب کرنے والی ہو۔ انھوں نے بغیر زرہ و بکتر کے جنگ میں غیر معمولی استقلال دکھلایا۔ یہ اور بات ہے کہ نتیجتہً انھیں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔"[1]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۴۸

یہ آخری فقرہ اس کی مادی ذہنیت کے لحاظ سے ہے جو کامیابی کو صرف جنگ کی ظاہری فتح میں مضمر سمجھتی تھی حالانکہ مستقبل نے ثابت کر دیا کہ فتح بھی اسی بہادر جماعت کو نصیب ہوئی اور ان کی مخالف اکثریت کو وہ ابدی شکست ہوئی جو تاریخ میں مثال نہیں رکھتی۔

ایثار

مشترکہ ضرورت کے وقت دوسرے کو اپنے نفس پر مقدم کرنا ایثار ہے۔ اس صفت کا بہترین اور مکمل نمونہ امام حسینؑ اور دوسرے مجاہدینِ کربلا نے پیش کیا۔

امام نے تو اپنے عمل سے یہ مثال قائم کر دی کہ ضرورت کے وقت دوست کیا دشمن کو بھی اپنی ذات پر مقدم کرو۔ یہ سبق حضرت نے اس وقت دیا جب عراق کی راہ میں فوجِ حُر کو جو سدِ راہ ہونے کے لیے آئی تھی آپ نے اپنے ساتھ کا سب پانی پلا دیا اور اپنے اور اپنے وابستگان کے مستقبل کے لیے اس کو محفوظ نہ فرمایا اور کربلا میں اصحاب و اقارب امام میں سے ہر فرد نے امام کے نفس کی حفاظت کو اپنے جسم و جان کے مقابلہ میں اس طرح مقدم قرار دے لیا تھا کہ وہ اپنی ہستی کو جیتے جی معدوم سمجھتے تھے۔ سعید کا امام کے مصلّے کے سامنے سپر بن کر کھڑا ہونا اور تیروں کا اپنے سینہ پر روکنا نہ بھولنے والے ایثار کا مرقع ہے۔

کربلا میں قربانی پیش کرنے کے لیے ہر ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتا تھا اور ہر ایک کا منشا یہ تھا کہ کم از کم وقت کے لیے سہی وہ خود اپنی جان سے گزر کر دوسروں کے تحفظ کا ذریعہ بن سکے اگرچہ یہ سب کو معلوم تھا کہ بچنے والا کوئی نہیں، پھر بھی فکر یہ تھی کہ جب تک ہم ہیں دوسروں پر آنچ نہ آنے پائے۔

انھیں اپنا غم نہ تھا، اپنی فکر نہ تھی، غم تھا اگر تو حسینؑ کا، فکر تھی تو ان کی تنہائی کی چنانچہ یاد کیجیے سیف بن حارث و مالک بن عبد دونوں بھائیوں کا، وہ امام کے پاس آکر

رونے لگنا اور امام کا فرمانا، کیوں رو تے ہو؟ اور ان کا کہنا کہ ہم اپنے لیے تھوڑی روتے ہیں، ہمیں تو آپ کی بیکسی پر رونا آرہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور یہ کہ اب ہم سے آپ کی حفاظت قرار واقعی طور پر نہ ہو سکے گی۔

اسی طرح یہ واقعہ بھی کہ بشیر بن عمرو حضرمی کو خبر پہنچتی ہے کہ ان کا فرزند عمرو رے کی سرحد میں قید ہو گیا ہے۔ امام بلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم میری بیعت سے آزاد ہو۔ جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو اور وہ باوفا مجاہد کہتا ہے کہ مجھے جیتے جی درندے کھا جائیں اگر میں آپ سے جدا ہوں۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔

انفرادی طور پر جان بچانے کے امکانات ٹھکرائے جا رہے تھے۔ صرف حسینؑ کے ساتھ حق وفاداری ادا کرنے کے لیے جناب ابوالفضل العباسؑ اور ان کے بھائیوں کو دو امان نامے پہنچے۔ ایک عبداللہ بن ابی المحل کے ذریعہ سے جو ان کی والدۂ گرامی ام البنین کا بھتیجا تھا اور ایک شمر کے ذریعہ سے جو اسی خاندان سے تھا مگر دونوں رد کر دیے گئے۔ اپنے سامنے زندگی کی راہ صاف ہونے کے باوجود دوسرے کی خاطر موت کو اختیار کرنا کوئی معمولی ایثار کا مظاہرہ نہیں ہے۔ پھر یہ بھی امام اور اس پوری جماعت کا ایثار ہی تھا کہ دین و مذہب کے تحفظ اور نوعِ انسانی کو مظالم سے بچانے کی خاطر اپنا سب کچھ نذر کر دیا اور کسی بھی شئے کو جو دنیا کے کسی بھی شخص کو عزیز ہوتی۔ انہوں نے قطعاً عزیز نہ کیا۔

مواسات:

دوسرے کو مصیبت میں مبتلا پا کر اس کا شریک اور ہمدرد بن جانے کا نام مواسات ہے کربلا میں حسینؑ اور انصار حسینؑ نے باہمی مواسات کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔

امام کی مواسات کا یہ عالم تھا کہ کوئی مصیبت انصار و اصحاب پر نہیں پڑی جس میں امام نے ان کا ساتھ نہ دیا ہو۔ انصار اور عزیزوں کی شہادت کے عنوان مختلف تھے لیکن جب

امام کی شہادت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک عنوان کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ ایک بیکس کے قتل کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ اس ایک ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔ اسی طرح اصحاب حسینؑ کی امام کے ساتھ مواسات دنیائے تاریخ میں بے نظیر ہے۔ وہ صرف اپنی جانیں نہیں دے رہے تھے بلکہ دنیا کو مواسات کا نہ بھولنے کے قابل سبق یاد کرا رہے تھے اور ایک بے نظیر مثالیہ قائم کر رہے تھے۔

حُسنِ معاشرت:

دوستوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے اور اپنوں میں کس طرح مساوات مدِنظر رہنا چاہیے۔ اس کا بہترین سبق امام حسینؑ نے دیا ہے۔ پہلے کے واقعات کا تذکرہ جبکہ اطمینان کے لمحے اور سکون کے اوقات تھے اتنا اہم نہیں ہے کیونکہ ان حالات میں دوسرے بھی معاشرتی حقوق کا کچھ نہ کچھ لحاظ کرتے ہیں مگر عاشور کے دن جب مصائب کا ہجوم تھا امام حسینؑ نے کس طرح حقوق کا لحاظ کیا ہے اور یہ خیال رکھا ہے کہ کسی کے ساتھ جانبداری اور پاسداری ہونے نہ پائے۔ اس کو قرار واقعی طور پر سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ جماعت حسینی میں عزیز بھی تھے اور غیر بھی تھے مگر آپ کا طرزِ عمل سب کے ساتھ اپنے اپنے حدود میں مساویانہ تھا اور پھر حفظ مراتب کے ساتھ یہی چیز مشکل ہے۔

جنگ کے میدان میں اور خیام حسینی کے قیام کی جگہ میں کافی فاصلہ تھا۔ چنانچہ امام کے نفس کو کتنا تعب اور کتنی مشقت برداشت کرنا ہوتی ہو گی مگر چونکہ آپ کو سب کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ کرنا ضروری تھا لہٰذا جو مجاہد آتا تھا اور اجازت جہاد مانگتا تھا بغور اسے دیکھتے تھے۔ اجازت جہاد دیتے تھے جب تک کہ جنگ کرتا تھا کھڑے ہو کر اس کی جنگ کا مشاہدہ فرماتے تھے اور جب زخمی ہو کر گرتا تھا تو اس کی لاش پر جاتے تھے۔ اس دھوپ، گرمی اور تمازت آفتاب میں ہر شہید کی لاش پر جانا اور

پھر واپس آنا کتنی سخت زحمت کا باعث ہوتا ہوگا۔ مگر امام کو تو دکھانا تھا کہ ایک سردار، ایک رئیس اور ایک افسر کو اپنے ساتھیوں، ماتحتوں یا سپاہیوں کے ساتھ کس طرح یگانگی اور مساوات کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ان سخت اوقات میں جبکہ ایک انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں رہ سکتے۔ یہ امام حسینؑ ہی کا کام تھا کہ معاشرتی حقوق کی نگہداشت کامل طور پر ملحوظ رکھی۔ پھر یاد کیجیے وہ واقعہ کہ جب بشر بن عمرو کو ان کے فرزند کی خبر ملی تھی تو امام حسینؑ نے ان کو بلا کر فرمایا کہ جاؤ اور اپنے فرزند کی رہائی کی فکر کرو اور اس مجاہد نے قطعی طور پر ساتھ چھوڑنے سے انکار کیا تھا اس وقت قدر دان امام نے ان کو پانچ قیمتی کپڑے دیے تھے جن کی قیمت پانچ ہزار اشرفی کے قریب تھی اور فرمایا تھا کہ اچھا تم نہیں جاتے ہو تو اپنے فرزند محمد کو بھیج دو تاکہ وہ ان کپڑوں کی قیمت سے اپنے بھائی کی رہائی کا سامان کرے۔ عام طور پر انسان فرائض کے پورا کرنے میں معمولی سے معمولی عذر کے ذریعہ اپنا بچاؤ کرتا ہے اور امام حسینؑ سے بڑھ کر ظاہری طور پر اس وقت مجبور کون سمجھا جا سکتا تھا۔ آپ اپنے وطن میں نہیں بلکہ سفر میں تھے۔ یہی مجبوری اظہار معذوری کے لیے کافی تھی۔ صورت واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے پاس نقد روپیہ بھی موجود نہ تھا۔ پھر اس وقت محصور بھی تھے۔ بے آب و دانہ بھی تھے۔ موت کی منزل کے سامنے بھی تھے۔ اپنی اور تمام ساتھیوں کی جان کا معاملہ درپیش تھا۔ ایسی حالت میں اگر اس پریشانی پر جو آپ کے ایک ساتھی کو درپیش تھی۔ آپ اخلاقی طور پر صرف اظہار افسوس پر اکتفا کرتے تو ان حالات کے لحاظ سے کوئی متنفس آپ کے طرز عمل پر حرف گیری نہیں کر سکتا تھا مگر حسینؑ اس دن کمال انسانیت کا مثالیہ قائم کر رہے تھے۔ آپ نے اس وقت بھی جب ہر شخص آپ کو مجبور سمجھ رہا تھا اور ان ہوش ربا پریشانیوں کے عالم میں جو درپیش تھیں آپ نے خود اپنے امکانات کا جائزہ لیا اور جو ممکن صورت امداد کی نظر آئی اس سے دریغ نہیں کیا۔

میدانِ کربلا میں عین معرکۂ جنگ میں اکثر ساتھیوں اور عزیزوں نے مختلف طریقوں پر حسینؑ سے مدد چاہی اور کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ نے مدد نہ دی ہو۔

یاد کیجیے وہ موقع جب عمرو بن خالد صیداوی، مجمع بن عبداللہ اور جنادہ بن حارث وغیرہ پانچ بہادروں نے انصار امام حسینؑ میں سے فوج مخالف میں گھس کر شمشیر زنی کرنا شروع کر دی تھی اور فوج اعداء نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر زخمی کر دیا تھا۔ یہ دیکھنا تھا کہ امام حسینؑ نے اپنے بھائی جناب عباسؑ کو اُن کی امداد کے لیے بھیجا اور آپ نے تن تنہا جا کر فوج پر حملہ کیا اور بہادروں کو دشمنوں کے حلقہ سے نکال لیا تھا۔

یہ عباسؑ وہی تھے جن کی زندگی امام کو اس قدر عزیز تھی کہ جب تک ایک مجاہد بھی موجود رہا عباسؑ کو مرنے کی اجازت نہیں دی مگر ساتھیوں کی قدر دانی ایسی تھی کہ ان کی خاطر اپنے ایسے عزیز بھائی کو فوج کے نرغے میں بھیج دیا اور خطرہ کی کوئی پروا نہیں کی۔

وہ بھی ایک طرح کی امداد ہی تھی کہ جب عبداللہ بن عمیر میدان میں مصروف جہاد تھے اور ان کی وفادار بیوی ام وہب گرز ہاتھ میں لیے میدان میں نکل آئی تھی اور پکار کر کہنے لگی تھی کہ "ہاں میرے ماں باپ تم پر نثار نصرتِ اولادِ رسولؐ میں کوتاہی نہ ہو"۔ عبداللہ سے کچھ بن نہ پڑتا تھا کہ زوجہ کو کس طرح خیمہ میں واپس کریں۔ امام نے جو یہ دیکھا آواز دی کہ "اے مومنہ خیمہ میں واپس جا، عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے"۔ حکمِ امام کا وہ نہیب تھا کہ فرض شناس خاتون فوراً واپس ہوئی اور خیمہ میں چلی گئی۔

اصحاب و اعزا میں زیادہ تر جو گھوڑے سے گرتا تھا یہی آواز دیتا تھا کہ یا ابا عبداللہ ادرکنی (یعنی) "اے امام میری خبر لیجیے"۔ اور آپ ہر ایک کی امداد کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ امام کی کوشش یہ تھی کہ کسی کا سر اس کے تن سے جدا نہ کیا جا سکے اور یہ ایک واقعہ ہے کہ امام کی زندگی میں سوا بعض انصار کے جنھیں امام کو آواز دینے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا اور کسی کا سر تن سے جدا نہیں کیا جا سکا۔

شہداء کی لاشوں کا احترام حضرت کو امکانی حد تک پیش نظر تھا۔ اصحاب کی شہادت کے موقع پر تو ساتھی اکثر موجود ہوتے تھے۔ جو لاش کی حفاظت کا سامان کر لیتے تھے مگر جب عزیزوں کی باری آئی تو پھر زیادہ تر خود حسینؑ کو ان کی لاشوں کے میدان سے اٹھوانے اور خیمہ تک لانے کا اہتمام کرنا پڑا۔ علی اکبرؑ کے لیے کچھ جوانان بنی ہاشم کے ذمہ یہ خدمت کی گئی کہ اپنے بھائی کی لاش خیمہ تک پہنچاؤ اور قاسم کی لاش آپ نے خود اٹھائی اور دوسرے بنی ہاشم کی لاشوں کے پاس پہنچائی۔ پھر بھی یہ تمنا دل میں یقینی ہو گی کہ کاش ان سب کو دفن بھی کر سکتے۔ اس لیے اگر حالات نے اتنی مہلت نہ دی کہ آپ بڑی لاشوں کو دفن کر سکیں پھر بھی آپ نے اس فرض کو کلیتہً تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑا چنانچہ شیر خوار علی اصغر کی چھوٹی سی لاش کو آپ نے اپنے ہاتھ سے سپردِ زمین کیا اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ اس سخت ترین ہنگامۂ مصائب میں ایسا نہیں ہونے پایا کہ کوئی ایک فریضۂ اخلاقی بھی آپ کی نظر سے اوجھل اور توجہ سے محروم رہ سکے۔

انسانی ہمدردی :

دوستوں کے ساتھ مراعات اور سلوک کرنا ایک معتدل فطرت انسان کا حصہ مزاج ہوتا ہے اور یہ کوئی غیر معمولی امر نہیں ہے لیکن دشمنوں کے ساتھ احسان کرنا اور ان لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا جو اپنے سے جنگ پر تیار ہوں ان کی ضرورت پر کام آنا جو اپنے خون کے پیاسے ہوں یہ ہر انسان کا کام نہیں ہے۔ یہ سبق حسینؑ نے دیا۔

اس سلسلہ میں ناظرین کو کربلا کے راستے سے منزلِ شراف کا واقعہ یاد ہو گا۔

کربلا میں آخر وقت تک دشمنوں کی خیر خواہانہ نصیحت سے باز نہیں آئے۔

اصحاب بھی امام کے راستے کے سالک اور آپ کے قدم بقدم تھے۔ ہر ایک نے نصیحت و دعوتِ حق کے فرض کو ادا کیا۔ زہیر بن القین کی تقریر اسی جذبۂ حق کوشی

کی ترجمان تھی۔ وہ کہہ رہے تھے :۔

" دیکھو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے برادر مسلم کو خیر خواہی کے ساتھ نصیحت کرے اور سچا مشورہ دے اور ہم تم ابھی تک بھائی بھائی ہیں اور ایک ہی دین اور ایک ہی ملت پر ہیں۔ جب تک ہمارے درمیان تلوار چلنے نہ لگے اس وقت تک تم اس کے مستحق ہو کہ ہم تم کو نصیحت کریں اور نیک صلاح دیں۔"

حقیقت میں حسینؑ اپنے کسی دشمن کے بھی دشمن نہ تھے بلکہ دوست تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح نجات کے راستے پر آجائے۔

صاف بیانی :

دنیا کے سیاست دان اور قیادت پسند افراد جب کسی تحریک کے داعی ہوتے ہیں تو وہ ان لوگوں کو جنھیں ساتھ لینا چاہتے ہیں طرح طرح کے مواعید سے اپنی حمایت پر آمادہ کرتے اور طرح طرح کے خوش آیند توقعات پیدا کرکے انھیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ فتح وظفر کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ مال و دولت اور جاہ و ثروت کے خواب دکھائے جاتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو اپنے گرد مجتمع کیا جاتا ہے۔

کون ہوگا جو اپنی کمزوریوں، مایوسیوں اور ناامیدیوں کو ان اشخاص پر ظاہر کردے جن سے اسے کام لینا منظور ہے۔ چہ جائیکہ کہنا کہ تم ہمارا ساتھ چھوڑ دو۔ ہمارے پاس سے چلے جاؤ اور ہم نہیں چاہتے کہ تم ہماری وجہ سے جان دو۔

مگر یہ حقیقت ہے کہ انسان کی سچائی، ایمانداری اور دیانت پر بڑا حرف آتا ہے اس سے کہ وہ دوسروں کو دھوکے میں مبتلا رکھے اور غلط توقعات قائم کراکے اپنے ساتھ لے یا کم از کم خاموش رہ کر عرصہ تک غلط فہمی میں مبتلا رہنے دے۔

امام حسینؑ نے شروع سے آخر تک اس بات کی کوشش کی کہ کوئی آپ کے متعلق غلط

فہمی میں مبتلا نہ ہو اور غلط توقعات کی بنا پر ساتھ دینے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ آپ برابر حقیقت حال اور اپنے آخری انجام سے مطلع کرتے رہے اور اعلان فرماتے رہے کہ ہمارا آخری نتیجہ اس سفر میں موت ہے۔

اس وقت جبکہ ابھی مدینۂ منورہ سے روانہ بھی نہ ہوئے تھے اور اغیار آپ کے ساتھ نہ ہوئے تھے صرف اعزّہ تھے جو ہمراہی پر آمادہ تھے اس وقت بھی آپ ایسی باتیں کرتے تھے جن سے خود بخود موت کے استقبال کی تیاری کا پتہ چلتا تھا۔

چنانچہ ابوسعید مقبری جو رجب سنہ ۶۰ھ میں یعنی اس زمانہ میں جب امام حسینؑ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے ہیں وہاں موجود تھے ناقل ہیں کہ میں نے امام حسینؑ کو دیکھا کہ آپ مسجد نبوی میں تشریف لے جا رہے تھے۔ اور آپ کی زبان پر ابن مفرغ شاعر کا یہ قول بطور تمثیل جاری تھا کہ

لا ذعرت السوام فی فلق الصبح مغیرا ولا دعیت یزیدا

یوم اعطیٰ من المهابة ضیما والمنایا یرصدننی ان احیدا

(یعنی) "یہ نہیں ہو سکتا کہ موت کے خوف سے میں ذلت کو برداشت کروں اور اس وقت کہ جب موت میری تاک میں ہو میں ہٹ جاؤں۔"

یہ کوئی تقریر نہیں تھی اور نہ کوئی خاص اعلان تھا مگر سننے والے نے سمجھ لیا اور بعد میں بیان کیا کہ ان اشعار کو سنتے ہی میں نے اپنے دل میں کہہ دیا کہ بخدا ان شعروں کا پڑھنا رمز سے خالی نہیں اور کوئی نہ کوئی خاص مہم آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کے بعد دو دن نہ گزرے تھے کہ آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے۔[1]

اب وہ وقت آیا کہ آپ مکہ معظمہ سے روانہ ہونے والے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ لوگوں کو بہت خوش آیند توقعات آپ کے متعلق قائم ہو چکے ہیں اس لیے کہ کوفہ عراق کا پائے تخت اور بڑا مرکز ہے۔ حضرت علیؑ کا دارالسلطنت رہ چکا ہے۔ لوگوں کی

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۹۱

غلط خیالی انھیں اس دھوکے میں مبتلا کیے ہوئے ہے کہ کوفہ علیؑ اور اولادِ علیؑ کے عقیدت سے بھرا ہوا ہے وہاں سے بارہ سو خط بھی آچکے ہیں کہ آپ آئیے اور ہم آپ کی نصرت میں اپنا خون پسینہ کی طرح بہانے کے لیے تیار ہیں۔ ان خطوط کے بعد حضرت مسلمؑ روانہ کیے جا چکے ہیں اور ان کا بھی خط آچکا ہے کہ اٹھارہ ہزار آدمیوں نے آپ کی بیعت کر لی ہے اس سب کے بعد امام حسینؑ کوفہ کی طرف روانہ ہو رہے ہیں تو عام افراد کا خیال اس کے متعلق یہی ہے کہ آپ ایک ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں تاج و تخت کے مالک ہوں گے اور بادشاہ تسلیم کیے جائیں گے اس لیے فطرۃً بہت سے لوگوں کو آپ کے ساتھ اس خیال سے ہو جانا چاہیے تھا کہ وہاں جا کر آپ کی سلطنت سے فائدہ اٹھائیں گے نیز چونکہ آپ زرخیز خطۂ زمین کی طرف جا رہے ہیں اس لیے وہاں جا کر مالی منافع بھی حاصل کریں گے۔ اس طرح یقیناً آپ جو کوفہ کی طرف تشریف لے جاتے تو ایک کثیر جماعت جو ایک لشکر کی حیثیت رکھتی ہوتی آپ کے ساتھ ہوتی لیکن یہ آپ کو منظور نہ تھا۔ آپ نے ضرورت محسوس کی کہ عام لوگوں کے سامنے حقیقت کو واضح فرما دیں اور سب پر آشکارا کر دیں کہ ان کے خوش آیند توقعات سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے آپ نے مکہ معظمہ سے روانگی کے ایک دن قبل حمد و صلوٰۃ کے بعد یہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا کہ :-

"موت اولادِ آدم کے گلے کا ہار ہے۔ میں اپنے اسلاف کی ملاقات کا مشتاق ہوں اتنا کہ جتنا یعقوبؑ یوسفؑ کی ملاقات کے مشتاق تھے۔ میرے لیے بہتر ہے وہ جگہ جہاں میں قتل کر کے گرایا جاؤں گا۔ میرے پیش نظر ہے۔ وہ منظر جب میرے جوڑ بند وحشی درندے قطع کر رہے ہوں گے۔ میرے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے ہوں گے اور اپنی حسرتیں میرے قتل سے نکال رہے ہوں گے۔ کوئی چارۂ کار نہیں ہے، کوئی مفر نہیں ہے، اس دن سے جو قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے۔ جو خدا کی مرضی ہو اسی میں ہم اہل بیت کی مرضی ہے۔

ہم اس کی آزمائش پر صبر کرتے ہیں اور جو صابرین کا اجر ہے اس کو پورا پورا حاصل کرتے ہیں رسولِ خدا سے ان کے جگر کے ٹکڑے دور نہیں ہو سکتے بلکہ وہ بارگاہِ قدس میں جنتِ اعلیٰ میں ان کے پاس جمع ہونے والے ہیں جن سے ان کی آنکھیں خنک ہوں گی اور ان کا وعدہ پورا ہوگا۔

جو اپنی جان میرے ساتھ فدا کرنا چاہتا ہو اور موت پر کمر باندھے ہوئے ہو وہ میرے ساتھ چلے۔ میں صبح ان شاء اللہ روانہ ہو جاؤں گا۔"

دیکھیے کن الفاظ میں لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر دنیا میں حقانیت اور سچائی کا ثبوت ہو سکتا ہے؟ کیا اس سے بڑھ کر صاف گوئی اور پاکبازی کا مظاہرہ ہو سکتا ہے؟ اب ساتھ چلنے والے وہی لوگ تھے جو جان دینے پر تیار تھے۔ جو حقیقۃً استقلال اور ثابت قدمی رکھتے تھے جن کو دنیا کی توقع اور راحت دنیا کا کوئی خیال اپنی طرف متوجہ نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ مجاز کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت کو حاصل کرنا چاہتے تھے

اس حقیقت پرور تقریر کے بعد وہی لوگ آپ کے ساتھ ہوئے جو دنیا کے مال و دولت اور جاہ و حشم کو ہیچ سمجھتے تھے جو حقیقی زندگی کے طالب تھے اور اسے موت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔

یہ تقریر مکہ معظمہ میں کی گئی تھی جس نے ہر قسم کی غلط فہمی کے پردہ کو چاک کر دیا اور حقیقتِ حال واضح کر دی مگر مکہ معظمہ سے روانگی کے بعد راستے کے اعراب، بادیہ نشین قبائل اور دوسرے بے خبر اشخاص امام کو دیکھتے ہیں کہ ایک جمعیت کے ساتھ ایک قافلہ کی صورت میں جا رہے ہیں دریافت کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے عراق کا ارادہ ہے۔ وہاں سے طلبی ہوئی ہے۔ زیادہ تر جو سنتا ہے اسے خیال ہوتا ہے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ ہو لیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ معظمہ سے ساتھ چلنے والی جماعت گو مختصر تھی مگر راستے میں طرح طرح کے لوگ شریک ہوتے گئے اور اس طرح وہ جمعیت جو اس کے قبل ایک قافلہ کی

حیثیت رکھتی تھی ایک لشکر کی صورت اختیار کر گئی۔

کوئی اور ہوتا تو اس ناخواندہ افتاد ہام کو غنیمت سمجھتا اور اس کے اپنے ساتھ ہو جانے کو بہترین اتفاق خیال کرتا۔ وہ چاہتا کہ کسی طرح انھیں گرویدہ بنائے رکھے اور اپنی گرفت سے نکلنے نہ دے مگر امام حسینؑ نے عرصہ تک اس صورت حال کو برداشت نہ کیا بلکہ اس وقت جب مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کے قتل ہونے کی خبر پہنچی اور عبداللہ بن یقطر جو آپ کے قاصد تھے ان کے بھی شہید ہونے کی اطلاع آگئی تو منزل زبالہ پر آپ نے قیام فرمایا اور ایک تحریر جسے سرکاری بیان کہنا چاہیے۔ آپ نے تمام اہل قافلہ کے مجمع میں پڑھ کر سنائی جس کا مضمون یہ تھا کہ:-

"ہمیں یہ دردناک خبر پہنچی ہے کہ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ اور عبداللہ بن یقطر شہید کر ڈالے گئے اور ان لوگوں نے جو ہماری دوستی کا دعویٰ کرتے تھے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس صورت حال کے بعد جو شخص تم میں سے واپس جانا چاہے وہ واپس چلا جائے ہماری طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہو گی۔"

حضرت کی اس تقریر کے بعد لوگ متفرق ہونے لگے یہاں تک کہ بس وہی منتخب جماعت رہ گئی جو آپ کے ساتھ مدینہ منورہ سے آئی تھی۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ مجمع چھٹ جانے کے بعد صرف وہی لوگ رہ گئے جو آپ کی مکہ معظمہ والی تقریر کو سن چکے تھے اور حقیقتاً موت پر آمادہ تھے۔

اس کے بعد کربلا پہنچ کر دسویں محرم کی شب کو جب کہ صلح کی گفتگو ختم ہو چکی تھی اور صرف ایک رات کی مہلت بمشکل مانگے سے ملی تھی اور ساتھ گنتی کے منتخب افراد رہ گئے تھے جو موت کے یقینی ہونے کا ذکر کئی بار سن بھی چکے تھے مگر حضرت نے چاہا کہ خطرہ کے بالکل سامنے آنے کے بعد بھی ساتھ والوں کو موقع دے دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے ایک مبسوط اور یادگار خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں صاف طور سے کہہ دیا کہ کل کا

دن ہمارا ان دشمنوں کے ساتھ تاریخی ہوگا۔ میں نے تمھارے متعلق غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تم سب اس وقت چلے جاؤ اور میری اجازت سے میرا ساتھ چھوڑ دو۔ تم پر میری طرف سے کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ دیکھو رات کا پردہ پڑ گیا ہے اسے تم اپنے لیے غنیمت سمجھو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ تم خود بھی جاؤ اور اتنا اور بھی کرو کہ ہر ایک تم میں سے میرے ایک ایک عزیز کا ہاتھ پکڑ لے اور اسے ساتھ لیتا جائے۔ اس کے بعد اپنے اپنے دیہات اور شہروں میں متفرق ہو جاؤ تاوقتیکہ تمھیں کشائش ہو اور بنی امیہ کی سلطنت سے نجات حاصل ہو یہ لوگ تو صرف میرے طالب ہیں جب میں انھیں مل جاؤں گا وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے۔ تو پھر انھیں کسی دوسرے کی فکر نہ ہوگی۔

یہ آخری اتمام حجت تھا لیکن ایسی جماعت کے سامنے جس میں کا کوئی فرد حقیقت حال سے بے خبر ہو کر یا کسی لالچ سے ساتھ نہیں آیا تھا لہٰذا ایک طرف اعزہ کھڑے ہو گئے اور دوسری طرف اصحاب اور سب نے امام کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کیا۔

امام حسینؑ نے اس طرز عمل سے یہ سبق دیا کہ دنیا میں حقانیت، ضمیر کی صفائی اور امانت کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ کسی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر اپنا مقصد نہ نکالے کبھی غلط توقعات قائم کر کے اپنی کار برآری نہ کرے۔ غلط فہمی کا سدباب کر کے جو حقیقی جان نثار ہوں بس ان کی ہی ہمدردی قبول کرے اور کسی کی غلط اندیشی اور فریب خوردگی سے فائدہ نہ اٹھائے۔

امن پسندی اور رواداری :

یہ اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے۔

امن و امان یعنی "جیو اور جینے دو" اس کی طرف خود اسلام کا نام تک اشارہ رکھتا ہے۔ اسلام مشتق ہے "سلم" سے اور اس کے معنی ہیں "صلح پسندی اور ایمان"

جو ایک بلند مرتبہ ہے وہ مشتق ہے "امن" سے۔ ایک سچے مسلم اور مومن کی شان یہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے افراد محفوظ رہیں۔ تمھارے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ تم بلا وجہ کسی سے برسرِ پیکار نہ ہو۔ کبھی فتنہ و فساد کے باعث نہ ہو لیکن اس کے ساتھ ایک اہم اصول اور ہے وہ یہ کہ باطل کی حمایت کبھی نہ کرو اور تمھارے عمل سے حق پامال نہ ہونے پائے۔

یہ دو عنصر امن پسندی مگر حمایتِ باطل سے علیحدگی ہی وہ ہوتے ہیں جن کے لیے اکثر صبر و سکون اور کبھی قیام و اقدام دونوں ہی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح کہ جب تک اپنے اوپر حمایتِ باطل کا الزام نہ آتا ہو اس وقت تک چاہے جتنے بھی نقصانات برداشت کرنا پڑیں اور ناگوار طبع حالات سے گزرنا پڑے۔ امن پسندی اور خاموشی قائم رہے مگر جس وقت خاموشی سے حق کا دامن تار تار ہوتا ہو اور باطل کو تقویت دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر آتی ہو اسی وقت سے خاموشی کی مُہر ٹوٹ جائے اور جس حد تک اقدام ضروری ہو اور آگے بڑھنا باطل پروری سے دامن بچانے کے لیے لازم ہو اس میں دریغ نہ کیا جائے چاہے اپنے اوپر اس میں جو بھی مظالم ہو جائیں۔

یہی چیز ہم کو پیغمبرِ اسلامؐ کی سیرت میں نظر آتی ہے۔ یہی امیر المومنین حضرت علیؑ کے یہاں، یہی حضرت امام حسن مجتبیٰؑ کے یہاں اور یہی حضرت امام حسینؑ کے واقعاتِ زندگی اور قدم کی رفتار میں صاف نمایاں ہے۔

کتاب کے ابتدائی حصوں میں پیغمبرِ خداؐ کے صلح حدیبیہ، پھر حضرت علیؑ بن ابیطالبؑ کے دورِ حیات اور پھر صلح امام حسنؑ کے حالات میں یہ مثالیں کافی وضاحت کے ساتھ درج ہوئی ہیں ان پر ضروری تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔

امام حسینؑ نے صلح حسنؑ کے بعد دس برس تک امام حسنؑ کی زندگی میں اور دس برس امام حسنؑ کے بعد رواداری اور خاموشی کی زندگی بسر کی۔ حالانکہ اس مدت میں کیسے صبر آزما

مراحل پیش آئے۔ امام حسنؓ کی وفات اور رسولؐ کے روضہ میں دفن سے ممانعت یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا مگر حسینؓ جن کی شجاعت و جرأت کا واقعہ کربلا نے دنیا سے کلمہ پڑھوا دیا۔ ایسے موقع پر خاموش رہے۔ یہ رواداری نہ تھی تو کیا تھا؟

یزید کی بالکل غیر آئینی خلافت کے سلسلہ میں امیر شام نے جو صورتیں اختیار کیں جلسے کئے ممالک اسلامیہ میں پیغام روانہ کیے۔ لوگوں کو بیعت پر مجبور کیا مگر امام حسینؓ کی طرف سے اس کے خلاف کوئی اس طرح کا اقدام نہیں ہوا کہ آپ اسلامی بلاد میں خطوط بھیجتے، احتجاجی جلسے کرتے۔ تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کو مخالفت پر آمادہ کرتے۔ ایسا نہیں ہوا۔

آپ کا ابتدائی اور انتہائی اقدام ان موقعوں پر یہی انکار تھا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ آپ جانتے تھے کہ اگر مسلمانوں میں سوچنے سمجھنے کی کچھ بھی صلاحیت باقی ہے تو یہ میرا انکار ہی حق پر سے پردہ ہٹانے کے لیے کافی ہے۔ اور اگر ان کی قوت شعور و امتیاز بالکل ختم ہی ہو گئی ہے تو کم از کم ہم تو تائید باطل کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ ہمیں دنیا سے مطلب نہیں ہے۔ وہ جسے چاہے خلیفہ اور بادشاہ بنائے اور جو کرنا ہو کرے مگر ہم سے تعرض نہ کرے۔ ہم سے بیعت کی خواہاں نہ ہو۔ یہ اصول تھا جس پر امام حسینؓ اول سے قائم تھے اور آخر تک قائم رہے اور اسی لیے معاویہ نے اپنی آزمودہ کاری اور جہاں دیدگی سے آپ کے خلاف کوئی سخت عملی قدم نہیں اٹھایا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حسینؓ امن و امان کے حامی ہیں۔ جب تک ہم خود انھیں مجبور نہ کریں گے وہ امن پسندی سے علیحدہ نہ ہونگے۔

لیکن اس کے بعد معاویہ کا انتقال ہو گیا اور یزید تخت خلافت پر بیٹھا باپ بیٹے میں نمایاں فرق تھا۔

یزید حسینؓ سے بجبر بیعت کا طالب ہوا اور مدینہ کے گورنر نے بیعت کا مطالبہ حسینؓ کے سامنے سختی کے ساتھ پیش کیا۔

یہ معلوم ہے کہ جب ایک بادشاہ دنیا سے جاتا ہے تو لوگوں میں خاص طور سے انتشار ہوتا ہے اور نظام حکومت بھی انتہائی کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر حسینؑ چاہتے تو چونکہ اس وقت مدینہ میں ولید کے پاس کوئی خاص فوج بھی موجود نہ تھی، ولید کو قتل کر دیتے اور مروان کا بھی کام تمام کر دیتے اور اس طرح وقتی حیثیت سے مدینہ میں آپ کی سلطنت قائم ہو جاتی اور پھر آپ کو موقع ہوتا کہ اطراف و جوانب میں خطوط لکھ کر اپنے زیر اثر ایک بڑا لشکر فراہم کر لیں مگر اس صورت میں ایک طویل سلسلۂ حرب و ضرب کے آغاز کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی جس کا نتیجہ بھی بہرحال مشکوک تھا۔

آپ نے خونریزی سے بچنے کے لیے مدینہ چھوڑنا گوارا کیا اور مکہ معظمہ تشریف لے گئے جہاں آپ کا جانا اس بات کا عملی ثبوت پیش کرتا تھا کہ آپ کا حقیقی مقصد صرف حمایت باطل سے الگ رہتے ہوئے اپنی اور اپنے متعلقین کی زندگی کو خطرہ سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس لیے کہ مکہ معظمہ وہ جگہ ہے جس کو (مامن الناس) تمام انسانوں کے لیے محل امن قرار دیا گیا ہے۔

یہاں آنے کے بعد دنیا کی کوئی تاریخ اس بات کا پتہ نہیں دیتی کہ آپ نے لوگوں کو مکہ معظمہ کے اندر اپنی طرف دعوت دی یا کچھ لوگوں کو باہر سے بلایا ہو اور لشکر کی فراہمی میں کسی قسم کا کوئی قدم اٹھایا ہو۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ سے جو نسبت آپ کو تھی اور مکہ والوں کو جتنی آپ کی ہستی عزیز ہو سکتی تھی اتنی عبداللہ بن زبیر کی نہیں تھی چنانچہ تاریخ بتلاتی ہے کہ امام حسینؑ کے مکہ میں وارد ہونے سے پہلے لوگ عبداللہ بن زبیر کے گرد آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن جب سے آپ تشریف لے آئے تھے تمام لوگوں نے عبداللہ کو چھوڑ دیا تھا اور امامؑ کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے تھے۔ پھر جب عبداللہ کے لیے مکہ میں یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اپنا مضبوط جنگی محاذ قائم کر لیں اور ایک عرصہ تک حکومت شام سے

برسرپیکار رہیں تو امام حسینؑ کے لیے یہ بدرجۂ اولیٰ ممکن ہوتا مگر آپ نے مکہ معظمہ میں خاموشی کے ساتھ قیام کرکے عملی طور پر اعلان کر دیا کہ ہم دنیا میں امن کے خواہاں ہیں چاہتے ہیں کہ دنیا میں سکون رہے مگر ہم بھی اپنے اس حق کے ساتھ جس پہ ہم ہیں قائم رہیں۔ امن و امان میں خلل بھی نہ پڑے اور باطل کی حمایت بھی نہ ہونے پائے۔

جب عراق والوں کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ امام حسینؑ نے اس طرح بیعت سے انکار کیا ہے تو انھوں نے خطوط لکھنا شروع کیے جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ان خطوط میں سے بعض میں یہ بھی درج تھا کہ اگر آپ آجائیں تو ہم نعمان کو باہر نکال دیں اور آپ کو حاکم بنا دیں مگر امام حسینؑ نے ان خطوط کے جواب میں جو کچھ لکھا اس میں یہ تاریخی فقرات بھی درج کیے کہ امام کے معنی صرف یہ ہیں کہ کتاب خدا پر عامل ہو۔ انصاف کا پابند ہو۔ حق کو اپنا اصول زندگی قرار دے اور اپنی ذات کو خدا کی خوشنودی کے لیے وقف رکھے۔

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں جو آرہا ہوں وہ اس لیے کہ کسی کے خلاف تلوار اٹھاؤں گا یا تختِ سلطنت پر قبضہ کروں گا بلکہ مجھے ہدایتِ خلق منظور ہے۔ اور کتابِ الٰہی و سنتِ رسالت پناہی کا اجرا مقصود ہے۔

خط میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ ہمارے سفیر کے پہنچتے ہی کوفہ کے حاکم کو باہر نکال دینا اور ہمارے فرستادہ کو نظم حکومت سپرد کر دینا، اس وقت میرے آنے کی امید کرنا۔

اسی لیے حضرت مسلم نے بھی جو آپ کی تحریر کے مطابق آپ کے معتمد خاص اور قابل اعتبار تھے، اور آپ کی ہدایت سے یک سرمو انحراف کرنے والے نہ تھے جہاں تک حالات ساتھ دیتے رہے اپنے عمل سے اسی کا ثبوت دیا۔

وہ عقیلؑ کا بھتیجا اور حسینؑ کا سفیر تھا جو فقیرانہ لباس میں بغیر کسی سابقہ اطلاع یا تزک و احتشام کے کوفہ میں داخل ہوا۔ نعمان بن بشیر دار الامارۃ کے اندر تخت و تاج کا

مالک اور حضرت مسلم کو اس سے نہ کوئی مطلب نہ تعرض۔ آپ جاتے ہیں اور ایک معمولی زمیندار مختار بن ابی عبیدہ ثقفی کے مکان میں فروکش ہو جاتے ہیں۔ وہاں اجتماع ہوتا ہے تو امام کا خط پڑھ کر سنا دیتے ہیں اور بس۔ لوگ امام کی اطاعت و وفا کا عہد و پیمان کرتے ہیں اور آپ ان سے بیعت لیتے ہیں۔ یہ بیعت اس کی دلیل نہیں ہے کہ آپ کوئی بغاوت برپا کرنا چاہتے تھے یا کسی سلطنت کی بنیاد قائم کر رہے تھے بلکہ یہ صرف اس قرارداد کی پہچان تھی کہ ہم حضرت امام حسینؑ کی پیروی اور اتباع پر آمادہ ہیں اور حضرت کی حمایت و حفاظت میں بجان و دل کوشاں رہیں گے۔ اسی لیے جب اٹھارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کر لی تھی تب بھی انھوں نے کوئی قدم حکومت کے خلاف نہیں اٹھایا۔ پھر بھی وہ اسی مختار کے گھر میں مقیم رہے اور نعمان بن بشیر کو اسی طرح تختِ حکومت پر رہنے دیا۔ خود نعمان کو اس کا احساس تھا کہ جناب مسلم کا طرزِ عمل معاندانہ نہیں ہے چنانچہ جب لوگوں نے کہا کہ مسلم بیعت لے رہے ہیں اور تم خاموش بیٹھے ہو تو نعمان نے جواب دیا۔ "میں بس اس شخص سے جنگ کروں گا جو مجھ سے جنگ کرے اور اس پر حملہ کروں گا جو مجھ پر حملہ آور ہو مگر میں بدگمانیوں پر عمل نہیں کرتا۔" [1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نعمان بھی اس بات کا احساس رکھتا تھا کہ مسلم کوئی بغاوت کا قدم نہیں اٹھا رہے ہیں۔

اس کے بعد ان اسباب کی بنا پر جن کا تذکرہ اپنے محل پر ہو چکا ہے۔ نعمان بن بشیر کو معزول کیا گیا اور عبیداللہ بن زیاد کوفہ کا گورنر مقرر ہوا اور پُرامن و صلح پسند خاموش و گوشہ گیر مسلم بن عقیل کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔

ابھی مسلم کے متعلق کوئی اطلاع آنے نہیں پائی تھی کہ امام حسینؑ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی۔ اس فوری اور بظاہر بے موقع روانگی ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مکہ

---

[1] الاخبار الطوال ص ۲۳۳

میں حسینؓ کو اپنے لیے خطرہ کتنا نزدیک نظر آ رہا تھا۔ جس ہستی کو عبادت الٰہی کا اتنا شوق ہو کہ مرتے مرتے عبادت کے لیے ایک شب کی مہلت مانگی ہو وہ حج کے عین موقع پر حج کو ترک کر دے۔ یقیناً آپ کو قوی اندیشہ تھا کہ اگر آپ مکہ معظمہ میں قیام کریں گے تو بہت جلد آپ خفیہ طریقہ پر قتل کر دیے جائیں گے۔ اس صورت حال سے مطمئن ہونے کے لیے ایک طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہیں حفاظتی تدابیر اختیار کیے جاتے مگر اس حالت میں تصادم کے امکانات بہت قریب ہوئے جاتے تھے۔ لہٰذا جس طرح مدینہ سے نکل کر آپ نے ثابت کر دیا تھا کہ مجھے جنگ کرنا منظور نہیں ہے اسی طرح قیام مکہ کو تاریخ حج سے صرف ایک دن پہلے جبکہ مسلمان تمام خطوں سے حج کے لیے جمع ہو رہے تھے ترک کیا۔

امام حسینؓ کوفہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے کوئی تیاری کی ہے؟ سامانِ جنگ ساتھ لیا ہے؟ نہیں بلکہ اس کے خلاف اہلِ حرم مع اطفال خورد سال آپ کے ساتھ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ امن و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کے خواہاں ہیں اور اپنی طرف سے جنگ کے امکانات پیدا ہونے دینا نہیں چاہتے۔

اس کے بعد جب کوفہ کے راستے میں بھی خونریزی کے آثار معلوم ہوئے اور حرؑ کا لشکر آتا نظر آیا تو آپ نے راستہ بدل دیا اور داہنی طرف کا رُخ کر کے ذوحسم پہاڑ کے دامن میں جا کر قیام کیا۔ مگر یہ آنے والی فوج خود تشدد پر آمادہ اور صلح پسندی سے علیحدہ تھی۔ اس لیے جدھر آپ کو متوجہ دیکھا اسی طرف یہ لشکر بھی متوجہ ہو گیا۔ اس وقت ان واقعات کا تفصیل سے ذکر کرنا مقصود نہیں ہے وہ پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ صرف یہاں تک کہ رواداری اور صلح پسندی کے ثبوت کا تعلق ہے۔ اجمالاً یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

حضرت کا سب سے پہلے حُر کے لشکر کو سیراب کر دینا بھی بڑا ثبوت اس کا تھا کہ آپ جنگجوئی کے طریقوں پر عمل نہیں فرما رہے تھے۔ ظہر کی نماز کے وقت حضرت امام حسینؑ نے ایک تقریر میں ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

"میں نے اس وقت تک تمھاری جانب آنے کا خیال نہیں کیا جب تک کہ تمھارے خطوط اور قاصد میرے پاس نہیں پہنچے۔ اس مضمون پر مشتمل کہ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ آئیے، شاید آپ کی وجہ سے ہم حق پر مجتمع ہو جائیں۔ اب اگر تم اس بات پر قائم ہو تو مجھ سے عہد و پیمان کرو اور میں تمھارے ساتھ کوفہ چلنے پر تیار ہوں اور اگر تمھیں یہ منظور نہیں ہے اور میرا آنا ناگوار ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس چلا جاؤں۔" [1]

کیا رواداری کا اس سے بڑھ کر مظاہرہ ہو سکتا ہے؟

عصر کی نماز کے وقت پھر آپ نے تقریر فرمائی۔ اور یہی کہا کہ اگر تمھیں میرا آنا ناپسند ہو تو میں واپس چلا جاؤں مگر حُر نے اسے نہ مانا اور آخر طے یہ ہوا کہ آپ نہ تو کوفہ کی طرف جائیں اور نہ مدینہ کی طرف بلکہ ایسا راستہ اختیار کریں جو کوفہ اور مدینہ کے علاوہ کسی دوسری طرف کو گیا ہو اور اسی قرارداد کے مطابق آپ روانہ ہوئے [2] مگر کربلا کی زمین کے قریب پہنچ کر ابن زیاد کا وہ انتہائی تشدد آمیز خط حُر کے پاس آیا کہ "حسینؑ کے ساتھ سختی سے کام لو اور حسینؑ کو اترنے پر مجبور کرو ایک خشک زمین پر جہاں کوئی پناہ لینے کا ٹھکانہ اور پینے کے لیے پانی نہ موجود ہو۔"

اس خط کے بعد حُر نے اتنی سختی برتی کہ قرب و جوار کے قصبے جو بہت نزدیک تھے جیسے نینوا، غاضریہ، شفیہ کسی میں قیام کرنے کی اجازت نہ دی اور کہا مجھے حکم یہی ہے کہ میں آپ کو کسی آباد مقام پر نہیں بلکہ چٹیل میدان میں اترنے پر مجبور کروں

---

[1] ارشاد ص ۲۳۵ — [2] ارشاد ص ۲۳۶۔

جہاں پانی بھی قریب نہ ہو۔ اس وقت اصحاب نے امام حسینؑ سے کہا کہ دشمن کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔ آپ جنگ کرلیں لیکن حسینؑ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا میں کسی صورت میں بھی ابتدار کرنا نہیں چاہتا[1] پھر عمر سعد کے کربلا پہنچنے کے بعد آپ نے کئی دن تک اس کے ساتھ مفاہمت کی گفت وشنید جاری رکھی۔

جب عمر سعد آپ سے ملاقات کے لیے رات کے وقت اس خیمہ کی طرف چلا جو دونوں لشکروں کے درمیان اسی مقصد کے لیے نصب کیا گیا تھا تو اس نے بیس سوار اپنے ساتھ لے لیے۔ شاید اس لیے کہ مخالف کا سامنا ہے۔ معلوم نہیں صورت حال کیا پیش آئے مگر جب امام حسینؑ تشریف لائے اور آپ کے ساتھ آپ کے اصحاب بھی ہو لیے تاکہ حضرت تنہا نہ رہیں تو آپ نے اصحاب کو علیحدہ ہو جانے کا حکم دیا اور فرمایا میں عمر سعد سے تنہا ملاقات کروں گا۔ اس طرح یہ ثابت کرنا تھا کہ خلوص اور نیک نیتی اور صبر وسکون کے ساتھ گفتگو کرنا ہے جس کے لیے کسی جمعیت کی ضرورت نہیں۔

جب عمر بن سعد نے یہ دیکھا کہ امام تنہا رہ گئے ہیں تو اس نے بھی ساتھیوں کو واپس کر دیا۔ امام حسینؑ کی گفتگو سراسر صلح پسندی پر مبنی تھی۔ آپ نے یہ کہا کہ میں واپس مدینہ چلا جاؤں گا۔ یہ کہا کہ مجھے ملک عرب سے باہر چلا جانے دو اور دور ترین سرحدوں میں زندگی گزارنے دو۔

مختصر یہ کہ امن عامہ کو قائم رکھنے کے لیے آپ اپنی ذات پر ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار تھے مگر یزید کو جائز خلیفۂ رسول یا اسلام کا سچا نمائندہ تسلیم کرنے پر آپ کسی طرح تیار نہ تھے۔

آپ کا رویہ تحفظِ امن کے بارے میں اتنا واضح تھا کہ فوج یزیدی کے

---

[1] ارشاد ص ۲۳۸-۲۳۹

افسر عمر سعد نے اپنے حاکم عبیداللہ بن زیاد کو خط لکھا کہ "مبارک ہو خدا نے فتنہ کی آگ کو بجھا دیا اور مسلمانوں کے شیرازہ کو مجتمع کیا اور امتِ اسلامی کے امر کی اصلاح کی۔ حسینؑ صلح پر آمادہ ہیں اور ان کے شرائط ایسے ہیں جنھیں قبول کرنے میں ہم کو عذر نہ ہونا چاہیے۔"

ابن زیاد بھی مصالحت کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ صرف شمر کی مفسدانہ دراندازی وہ تھی جس کی وجہ سے ابن زیاد نے اس آخری رشتہ کو توقعاتِ امن کے قطع کر دیا اور ابن سعد کو خط لکھا کہ ہم نے تم کو گفت و شنید اور مصالحت کے شرائط طے کرنے کے لیے نہیں بھیجا ہے بلکہ تم حسینؑ کے سامنے صرف غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ پیش کرو اور اگر وہ منظور نہ کریں تو پھر ان سے جنگ کرو۔[1] اس خط کا پہنچنا تھا کہ بس عمر سعد نے پوری فوج کو حسینؑ اور اصحاب حسینؑ پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے دیا۔ پھر بھی امام حسینؑ نے ایک رات کے لیے خونریزی کو اور روکا۔

صبح ہوئی عاشور کی قیامت خیز صبح، پیمانہ لبریز اور پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور کوئی امید صلح کی باقی نہیں ہے مگر حسینؑ اب بھی امن پسندی کا ثبوت دے رہے ہیں کہ میں اپنی طرف سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔

صبح عاشور اس وقت کہ جب امام خاموشی کے ساتھ اپنے خیمہ کے دروازے پر کھڑے تھے اور خیمہ کی پشت پر خندق میں آگ بھڑک رہی تھی۔ شمر نے آکر نہایت سخت جملہ کہا کہ "آخرت کی آگ سے پہلے دنیا ہی میں تم نے آگ کا سامان کر لیا۔" یہ اتنا اشتعال انگیز فقرہ تھا کہ ضعیف العمر مسلم بن عوسجہ کو بھی تاب نہ رہی اور امام سے اجازت مانگی کہ اسے تیر کا نشانہ بنائیں۔ مگر حضرت نے فرمایا کہ "نہیں ایسا نہ کرو میں جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتا۔"[2]

---

[1] ارشاد ص ۲۴۱ [2] ارشاد ص ۲۴۷

اتمام حجت کی تمام منزلیں امام حسینؑ کی طرف سے طے کی جا رہی ہیں جنھیں اپنی جان کا کوئی خوف نہیں ہے۔ جو موت کو اپنی آخری منزل سمجھ چکے ہیں اس کا بالتکرار اعلان فرماتے رہے ہیں جو موت کا استقبال کشادہ پیشانی کے ساتھ کرنے پر تیار ہیں اس کے بعد یہ امن پسندی، یہ صلح جوئی یہ اشتعال سے علیحدگی، یہ جذبات کی روک تھام یہ ساتھیوں کے ولولوں کی نگہداشت۔ یقیناً امام حسین اس دن جہاد بالسیف سے پہلے جہاد بالنفس کی منزل طے کر رہے تھے اور "جہاد اصغر" کے ساتھ "جہاد اکبر" کا فرض ادا کر رہے تھے۔

امام حسینؑ نے صبح کی میدان جنگ میں جبکہ تمام اشتعال انگیز صورتیں پیدا ہو چکی تھیں مگر اس کے بعد بھی آپ کی جانب سے جنگ کی تیاری کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ آپ گھوڑے پر سوار بھی نہیں ہوئے جو جنگ کا مرکب ہوتا ہے بلکہ ناقہ پر سوار ہوئے جو امن کی نشانی ہے اور اس کے بعد وہ تاریخی خطبہ پڑھا جس میں اپنے نام و نسب کا تعارف کرایا۔ اپنی بیگانہی کا بدلائل ثبوت پیش کیا اور اس کے آخر میں آپ نے پورے مجمع کے سامنے یہ اعلان کیا کہ اگر تم لوگوں کو میرا آنا پسند نہیں ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس جانے دو۔ یہی وہ بات تھی جو آپ نے حُر کے سامنے پیش کی تھی اور وہی اب پورے لشکر کے سامنے پیش کی جا رہی تھی۔ یہ وہ زبردست امن پسندی کے مظاہرات تھے جنھوں نے حُر کو فوج یزید کا ساتھ چھوڑ دینے پر مجبور کیا۔ جس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اس کے بعد جنگ چھڑ گئی دنیا میں جنگ کا قاعدہ تھا کہ بڑے سے بڑے بھی جنگ میں زرہ پہنتے تھے مگر کربلا میں حسینؑ۔ صرف ایک کرتہ پہنے ہوئے تھے خز کا جو ایک نہایت باریک کپڑا ہوتا ہے اور سر پر عمامہ باندھے تھے[1] اسے دیکھ کر ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا جنگ کی تیاری یونہی ہوتی ہے اور جس کو لڑنا منظور ہوتا ہے۔ وہ

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۵۹

یونہی میدان جنگ آتا ہے؟

قربانی:

حسینؑ کی قربانی ایک منظم حیثیت رکھتی تھی۔ اگر وہ اپنی شہادت کے مرحلہ کو سب سے پہلے طے کر لیتے تو یہ کہنے کو ہوتا کہ مصائب سے گھبرا کر اپنی جان دے دی لیکن آپ نے آہستہ آہستہ قربانی کے منازل کو طے کر کے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کا اقدام کسی وقتی جذبہ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ معاملہ فہمی اور فرض شناسی پر مبنی تھا۔

آپ کا مقصد یہ تھا کہ اپنی طرف نسبت رکھنے والی ہر عزیز شے کو خود اپنے ہاتھ سے قربان کریں اور جب اپنے نفس کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے تو اس متاع گراں مایہ کو قربانی کے میدان میں پیش کر دیں۔

آپ نے روز عاشور سب سے پہلے اپنے محبوب ترین اعوان و انصار اور ساتھ کے کھیلے ہوئے احباب کو قربان کیا۔ یہاں تک کہ عزیزوں کی باری آئی تو آپ نے ایک ایک کر کے ان سب کو میدان قربانی میں بھیجا۔ اپنے دل کی قوت، آنکھوں کی روشنی اور پیری کے سہارے علی اکبرؑ کے ایسے فرزند، قاسم و عبداللہ ایسے بھتیجے، ابوالفضل العباسؑ ایسے وفادار بھائی، سب کو فدیۂ راہ حق ہونے دیا اور سب کے بعد باغ امید کی آخری کونپل اور غنچۂ نا شگفتہ، علی اصغر کو خود اپنے ہاتھوں پر نشانۂ تیر ستم ہوتے دیکھ لیا۔ ابھی تک دل کے ٹکڑوں کی قربانی ہو رہی تھی۔ اب اعضائے بدن تک نوبت پہنچی۔ سطح جسم کا چپہ چپہ اور خون کا ہر ہر قطرہ قربان کیا۔ یہاں تک کہ تن اقدس پر تیروں کو جگہ نہ ملتی تھی اور دشمنوں کی تلواروں اور نیزوں کو جستجو کے بعد بھی کوئی خالی گوشہ دستیاب نہ ہوتا تھا۔ جب جسم کا ہر حصہ اور دل کا ہر ٹکڑا قربان ہو چکا تو اب حسینؑ کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ کوئی قربانی کے قابل شے باقی نہیں رہی تھی۔

صرف ایک رشتۂ حیات تھا جو روح و بدن کے اندر پوری کشمکش حیات کے باوجود قائم تھا اور سر و گردن کا ارتباط تھا جس میں اب تک جدائی نہ ہوئی تھی ایسے باہمت مجاہد کے لیے گزشتہ تمام قربانیوں کے مرحلے طے کر چکنے کے بعد یہ منزل بالکل آسان تھی۔ عصر کے ہوتے ہوتے حسینؑ اس قربانی میں بھی کامیاب ہو گئے اور خنجر شمر سے کچھ دیر راز و نیاز کے بعد ایک طرف نفس کی آمد و شد کا سلسلہ اور جسم و روح کا ظاہری اتصال قطع ہوا اور دوسری طرف سر و گردن کے باہمی ارتباط میں جدائی پیدا ہوئی۔

آسمان لاکھوں برس گردش کرے، زمانہ کے ورق ہزاروں بار اُلٹ جائیں لیکن اتنی شاندار، مکمل، منظم اور مرتب قربانی کی مثال پیدا نہیں ہو سکتی۔

بعض متفرق تعلیمات

واقعۂ کربلا کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ اتنے ہنگامہ خیز ماحول میں حضرت امام حسینؑ نے فرائض کے ایسے جزئیات تک کو پورا کیا ہے جنھیں عام انسان نسبتاً بالکل معمولی اور خفیف اضطراب کے موقع پر بھی ترک کر دیتے ہیں یا کم از کم ملتوی کرتے ہیں یا فرض کی پابندی میں کم از کم خفت پیدا کر دیتے ہیں مگر حضرت امام حسینؑ نے سخت سے سخت اوقات میں فرائض کی پابندی اتنی ہی سختی کے ساتھ کی جتنی کہ عام حالات میں ہو سکتی تھی۔ مثلاً چند چیزیں درج ذیل ہیں:۔

پردہ:

یہ شریعت اسلامیہ کا ایک قانون ہے کہ مرد اور عورت کے فرائض، طرز زندگی

اور نظامِ معاشرت جدا ہے۔ مرد پر جب موقع آئے تلوار لے کر جہاد واجب ہے۔ مگر عورت پر سے جہاد ساقط ہے۔ مرد میدان میں نظر آنا چاہیے اور عورت گھر کی چہار دیواری کے اندر۔ پردہ عورت کے لیے ایک لازمی فریضہ ہے اور اس کی پابندی تا حدِ امکان ضروری ہے۔

خاندانِ رسولؐ کی شان جس طرح تمام عبادات و واجبات کے ادا کرنے میں امتیازی درجہ رکھتی تھی۔ اسی طرح پردہ کے بارے میں بھی اس گھرانے کا اہتمام خصوصی امتیاز رکھتا تھا۔

دخترِ رسولؐ حضرت فاطمہ زہراؑ اس گھرانے کی مقدس خواتین کے لیے مورثِ اعلیٰ کی حیثیت رکھتی تھیں جنھیں پردہ کا اتنا خیال تھا کہ مرنے کے بعد جنازہ پر بھی نامحرم کی نگاہ پڑنا گوارا نہ تھی۔

کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے ساتھ اس گھرانے کی تقریباً تمام مقدس خواتین موجود تھیں۔ پیغمبر خداؐ کی نواسیاں زینب و ام کلثوم، حضرت علیؑ کی بیٹیاں فاطمہ اور رقیہ، بہویں: بیوۂ امام حسنؑ اور خود آپ کی ازواج لیلیٰ اور رباب، صاحبزادیاں فاطمہ و سکینہ اور دیگر عزیز خواتین۔ ان کے علاوہ کنیزیں تھیں۔ بعض اصحاب بھی اپنے متعلقین کے ساتھ آئے تھے جیسے مسلم بن عوسجہ، عبداللہ بن عمیر اور جنادہ بن کعب وغیرہ۔

حضرت امام حسینؑ نے اپنے اہلِ حرم کی پردہ داری کا اہتمام ہر لمحہ پیش نظر رکھا۔ راستے میں جب فوجِ حرؑ آتے دکھائی دی تھی تو آپ نے ذوحسم پہاڑی اسی لیے منتخب کی تھی کہ اسے پشت پر قرار دے کر خیامِ اہلِ بیت برپا کیے جائیں۔ چنانچہ یہ کام اتنی تیزی سے عمل میں لایا گیا کہ خیمے برپا ہو چکے اور اہلِ حرم خیموں میں فروکش ہو چکے اس وقت حرؑ کا لشکر وہاں پہنچ سکا۔

کربلا میں بھی حضرت نے جائے قیام کے لیے ریگستانی ٹیلوں کا ایک سلسلہ منتخب کیا تھا۔ پھر شبِ عاشور خیموں کی طنابوں کو ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ کر دیا تھا کہ کسی ایک خیمہ کی طنابیں کاٹ کر گرانا غیر ممکن ہو گیا تھا اور خیموں کے گرد خندق کھدوائی تھی اور اس شدید گرمی میں اس کے اندر آگ روشن کرائی تھی اسی لیے کہ پشت پر سے دشمن خیموں کی جانب نہ آسکے۔

یہ تمام انتظامات صبح عاشور آغازِ جہاد سے پہلے ہی مکمل ہو چکے تھے۔

بیبیاں خیموں کے اندر اور اعزہ میدانِ جہاد میں باہر تھے۔ کیا اس موقع پر اہلِ حرم کے دلوں میں اضطراب کی جو کیفیت تھی اس کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے جب کہ تیروں کی مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ زمین گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے سے لرز رہی تھی۔ چاروں طرف غبار سے تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ فوجوں کا سیلاب بار بار صفِ حسینی کے کوہِ استقلال سے ٹکرا کر شور کرتا ہوا واپس ہوتا تھا اور ہر مرتبہ بہنیں بھائیوں کے لیے، مائیں بچوں کے لیے، بیویاں شوہروں کے لیے فطرتاً مضطرب ہو جاتی ہوں گی مگر کیا ممکن تھا کہ ان میں سے کسی کا قدم خیمہ سے باہر نکلا ہو۔

وہ موقع اس سے زیادہ سخت تھا کہ ایک ماں کو خبر پہنچتی ہے کہ اس کا بیٹا مصروفِ جہاد ہے یا ایک بہن کو یہ کہ بھائی لڑ رہا ہے یا ایک خاتون کو یہ کہ اس کا شوہر دشمن کی فوج میں گھر گیا ہے اس موقع پر ایک شریف اور باعزت خاتون کے لیے اور وہ بھی عرب کی خاتون جو خود فطری شجاعت کا خون رگوں میں رکھتی ہو اور وہ بھی خاندان بنی ہاشم کی خواتین جن کو شجاعتِ حیدری ورثہ میں ملی ہو کتنا دشوار ہے کہ وہ صبر و سکون کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھی رہیں جب کہ کوسوں کی مسافت نہیں پہاڑوں کا اوٹ نہیں بلکہ صرف خیمہ کا پردہ اور میدانِ جنگ کی وسعت درمیان میں ہے۔

اس سے زیادہ سخت وقت وہ تھا جب خبر پہنچتی ہے کہ بیٹا، بھائی یا شوہر زخمی ہوکر گر گیا ہے اور اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے اور پھر اس کی فریاد کی آواز آتی ہے کہ یا ابا عبد اللہ ادرکنی۔ اور جب امام اس کی آواز پر جاتے دکھلائی دیتے ہیں۔ یہ موقع دل کی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دینے والا اور صبر و تحمل کی کشتی کو طوفانی بنا دینے والا ہے۔

ایسے موقعوں پر بعض اصحاب کی عورتیں نصرتِ حسینؑ کے شوق میں بے چین ہوکر میدان جہاد میں نکل آئیں جیسے عبد اللہ بن عمیر کی زوجہ اور عمرو بن جنادہ کی ماں تو امام حسینؑ نے ان کو فرضِ اسلامی کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے اور انھیں خیموں کی طرف واپس کر دیا۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ زوجہ عبد اللہ بن عمیر اور مادر عمرو بن جنادہ میں جرأت و شجاعت کا جوہر حضرت زینب و حضرت کلثومؑ سے زیادہ تھا، جن کی رگوں میں علیؑ بن ابی طالبؑ کا خون گردش کر رہا تھا۔ ہرگز نہیں مگر یہ ان کے احساس فرائض کی پختگی تھی کہ انھوں نے کسی وقت بھی اپنی حد سے قدم آگے نہیں بڑھایا۔

بہت زیادہ سخت موقع وہ تھا جب خود امام حسینؑ نیزہ و شمشیر و تبر کا نشانہ بنے ہوئے تھے پھر سب سے بڑھ کر وہ وقت جب آپ گھوڑے سے زمین گرم پر تشریف لا چکے تھے۔ مگر کیا اندازہ ہو سکتا ہے ان برگزیدہ خواتین کے احساس فرائض کا جنھوں نے اس موقع پر بھی اصول شریعت کا احترام ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

جس وقت عبد اللہ بن الحسنؑ نے خیمہ سے تڑپ کر باہر نکلنا چاہا تھا اور حضرت ام کلثومؑ نے دامن پکڑ لیا تھا کہ کہاں جاتے ہو مگر بچہ یہ کہتا ہوا کہ اس عالم میں میں اپنے چچا کو تنہا نہ چھوڑوں گا، دامن ہاتھ سے چھڑا کر روانہ ہو گیا۔ بس اب

ام کلثوم بے بس ہو گئی تھیں اور ایسا نہیں ہوا کہ آپ بچہ کے ساتھ میدان میں آجاتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک خیمہ کے حدود تھے وہاں تک ام کلثوم چلی آئیں اور جہاں سے بچہ اس سے آگے بڑھ گیا بس شاہزادی کے قدم رُک گئے۔

کربلا میں حفظ مراتب کے اصول برتے جا رہے تھے وہاں ہر ادنیٰ اعلیٰ پر قربان ہو رہا تھا۔ اصحاب اعزہ پر قربان ہوئے اور اعزہ امام پر قربان ہوئے اور امام، دینِ خدا پر قربان ہوئے۔ اگر آئینِ اسلام کے حدود میں کچھ بھی گنجائش ہوتی تو اُس وقت جب حسینؑ زخمی ہو چکے تھے اور قریب تھا کہ آپ کے جسم و روح میں مفارقت ہو جائے تمام خاندان بنی ہاشم کی خواتین تلواریں لے کر میدانِ جہاد میں آجاتیں اور حسینؑ کے گرد ایک مرتبہ دشمن پر حملہ کر دیتیں تو یہ کوئی معمولی بات نہ ہوتی بلکہ یقین سمجھنا چاہیے کہ کافی وقت تک حسینؑ کی حفاظت کی جا سکتی تھی اور ضرور واقعۂ کربلا میں ایک نئی نوعیت پیدا ہو جاتی۔ مگر نہ امام حسینؑ اس طرح کی قربانی کو اپنے نظامِ عمل میں جگہ دے سکتے تھے اور نہ وہ مخدراتِ عصمت خون کے انتہائی جوش اور دل کے انتہائی تلاطم کے باوجود کوئی ایک قدم بھی حسینؑ کے مرتب کردہ نقشۂ جنگ کے خلاف اٹھانے کے لیے تیار تھیں اس لیے حسینؑ کی تنہائی بھی دیکھی، دشمن کے حملوں کا خروش بھی سنا، فتح کے باجوں کی آوازیں بھی آئیں اور قتل الحسینؑ کی جگر خراش صدا بھی گوش زد ہوئی۔ مگر وہ جہاں حسینؑ بٹھا گئے تھے وہیں بیٹھی رہیں، اس وقت تک جب تک کہ وہ جگہ باقی رہی۔ ہاں جب خیموں میں آگ کے شعلے بلند تھے اس وقت مجبور ہو کر امام وقت حضرت زین العابدینؑ کے شرعی حکم کے ماتحت میدان میں نکلیں اور پھر بھی اختیار کی رفتار کے ساتھ پردہ کا احساس قائم رہا۔ جب تک چادریں رہیں، چادروں کا پردہ رکھا۔ چادریں نہ رہیں تو بالوں سے منہ چھپائے۔ دربار میں کنیزوں کے حلقہ میں اپنے کو مخفی کیا۔

اور جب یزید کے دربار میں تقریر کی ضرورت محسوس ہوئی تو عزیزوں کے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کیے جانے سے زیادہ دردناک الفاظ میں اس مصیبت کا شکوہ کیا کہ تو نے اپنی عورتوں اور کنیزوں کو تو پردہ میں بٹھایا ہے اور خاندانِ رسولؐ کی خواتین کو اس طرح دربدر پھرا رہا ہے کہ ان کے چہروں پر اپنے پرائے ہر ایک کی نگاہ پڑ رہی ہے۔

ایسے صبر آزما مواقع پر اس فریضۂ اسلامی کی اتنی مکمل نگہداشت کی گئی ہے جو ہمیشہ کے واسطے مسلمانوں کے سامنے ایک زرّیں مثال کی حیثیت سے قائم رہے گی۔

وصیّت:

شریعتِ اسلامی میں وصیّت کا پورا کرنا ایک اہم فریضہ ہے۔ بعض وصیتیں انسان کے ذاتی جذبات و نفسیات کے خلاف ہوتی ہیں مگر مرنے والے انسان کا احترام اسکی وصیت کی تعمیل پر مجبور کرتا ہے۔ بعض وصیتیں بعد کے پیدا شدہ حالات میں دشوار یا عام نگاہوں میں خلافِ مصلحت بھی ہوتی ہیں مگر فرض شناس انسان کو وصیّت کی پابندی موجودہ حالات کے تقاضے پر مقدم محسوس ہوتی ہے۔

حضرت امام حسینؑ نے اپنے بزرگوں کی وصیّت کا جس طرح اور جن جن موقعوں پر لحاظ کیا ہے وہ نہ بھولنے کے قابل ایک سبق ہے۔ رسول اللہؐ کی وفات کے وقت امام حسینؑ بہت کمسن تھے۔ مگر مذہبی روایات متفقہ طور پر یہ بتلاتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنے اس بچہ کی صلاحیتوں کا کمسنی ہی میں اندازہ کر کے اسے اپنے مذہب اسلام کی مستقبل میں حفاظت کرتے رہنے کی وصیّت کی تھی۔ اگر اسے لفظی طور پر کوئی نہ بھی مانے تو اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہؐ کا برتاؤ حسینؑ کے ساتھ اور اسلام کے مفاد پر پیغمبرؐ کا ہر قربانی کے لیے آمادہ رہنا یہ ہر لمحہ حسینؑ کے نزدیک اس وصیّت کی حیثیت رکھتا تھا کہ جب اسلام پر کوئی وقت پڑے تو اپنی جان عزیز نہ کرنا تمھیں اسی دن کے لیے اس محبت و شفقت کی گود میں پالا جا رہا ہے۔ حسینؑ نے اس وصیّت کو مرتے دم تک یاد رکھا اور کربلا کا پورا واقعہ اسی وصیت کی تعمیل تھا۔

حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے اپنی وفات کے قبل امام حسنؑ کو جانشین بناتے ہوئے حسینؑ کو ان کی پیروی کی ہدایت کردی تھی۔ حسینؑ نے بے نظیر طریقہ پر اس فرض کو بھی انجام دیا۔

امام حسنؑ کی وصیت تھی کہ میرے تابوت کو میرے جدِ بزرگوار رسول اللہؐ کے مزار کی طرف وداع کے لیے لے جانا لیکن اگر مزاحمت ہو تو ایک قطرۂ خون گرنے نہ پائے بغیر کسی جنگ و مقاومت کے میرے جنازہ کو واپس لانا اور بقیع میں دفن کر دینا۔ حسینؑ حسب وصیت بھائی کا جنازہ روضۂ رسولؐ پر لے گئے مگر جیسا کہ امام حسنؑ کو اندیشہ تھا وہی ہوا۔ ام المومنین عائشہ اور مروان وغیرہ نے مخالفت کی۔ نوبت یہ پہنچی کہ مخالف جماعت نے تیروں کی بارش کر دی اور کچھ تیر جنازۂ امام حسنؑ تک پہنچے۔ بنی ہاشم کے اشتعال کی انتہا نہ تھی مگر وہ فرض شناس حسینؑ تھے جنھوں نے بھائی کی وصیت کے مقابلہ میں اپنے تمام جوش، ولولہ اور طبیعت کے تقاضوں کا خون کر دیا۔ انھوں نے صبر اور خاموشی کے ساتھ دشمن کی مخالفت کو برداشت کیا اور امام حسنؑ کا تابوت واپس لے جا کر جنت البقیع میں دفن کر دیا۔

اپنے مرحوم بھائی امام حسنؑ کی وصیت کے احترام ہی کی بنا پر کربلا میں اپنے عزیز بھتیجے قاسم بن الحسنؑ کو اجازت جہاد دی جب کہ آپ خود اس لیے اذنِ جہاد میں تامل فرما رہے تھے کہ ابھی قاسم حدِ بلوغ کو نہ پہنچے تھے اور جہاد کی تکلیف عائد نہ تھی۔

اپنی نامزد لڑکی کا یتیم امام حسنؑ کے ساتھ عقد کر دینا بھی اپنے بھائی کی وصیت کی تعمیل ہی میں تھا۔

جب ہی تو حضرت امام حسینؑ کی زیارت میں اس صفت کا خاص تذکرہ ہے کہ والیٰ وصیّة اخیك مسارعا (یعنی) اپنے بھائی کی وصیت کے پورا کرنے میں آپ نے بڑی تعجیل کی کہ کہیں وقت نکل نہ جائے اور وصیت کی تعمیل رہ نہ جائے۔

تلقینِ صبر:

بلند مرتبہ ہستیوں کے مصائب کے تذکرہ پر اشکبار ہونا حقیقتاً ان بلند اوصاف کی

قدر و قیمت کا اظہار ہے جو ان ہستیوں کے ساتھ اُٹھ گئے اور اس لیے یہ آنسو سچائی کی شرط کے ساتھ بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں مگر کسی انسان کا خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبہ ہو خود اپنی مصیبت پر بے تاب ہونا اور بالخصوص جبکہ دشمنوں کو مضحکہ کا موقع ملے، اس انسان کی عظمتِ نفس کے خلاف ہے۔

راہِ حق میں انسان کو خود اگر مصیبت سے دوچار ہونا پڑے تو اسے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرنا شانِ ثبات و استقلال ہے جو مرتبہ کی رفعت کا سبب ہوتی ہے۔

حضرت امام حسینؑ کربلا میں خود صاحب مصیبت تھے اور آپ کی شہادت کے بعد آپ کے اہلِ حرم اور بالخصوص زینبؑ و کلثومؑ صاحبِ مصیبت تھیں۔ حضرت زینبؑ کو محبت بھی اپنے بھائی کے ساتھ غیر معمولی تھی۔ وہ ایک مرتبہ صرف حسینؑ کی زبان سے ان کی شہادت کی خبر کے طور پر کچھ اشعار سن کر بے ہوش ہوگئی تھیں۔ امام حسینؑ کو یہ فکر تھی کہ کہیں میرے غم میں میرے اہلِ حرم اور بالخصوص میری بہن زیادہ اپنا حال تباہ نہ کریں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا فطری اضطراب دشمنوں کے طعن و تشنیع کا ذریعہ بن جائے اس لیے آپ نے اپنی بہن کو بڑے مؤثر انداز میں یہ وصیت فرمائی کہ میرے غم میں گریبان نہ پھاڑنا، منہ پر طمانچے نہ مارنا اور واویلا و اثبورا کہہ کے نوحہ نہ کرنا[1]۔ یقیناً حسینؑ کی سی بلند مرتبہ ہستی کے غم میں یہ تمام باتیں روا تھیں مگر اپنی بہن زینبؑ کو حسینؑ خود صاحبِ مصیبت ہونے کے اعتبار سے اسیری کے ہولناک ماحول اور دشمنوں کے محاصرہ میں ایسے صبر و سکون کا مرقع بنانا چاہتے تھے، جو دنیا کے صاحبانِ مصیبت کے لیے ایک اسوۂ حسنہ ہو سکے اور حضرت زینبؑ نے اس پر ایسے بہترین طریقہ پر عمل کیا کہ خود بے تاب ہونا کیسا، وہ کوفہ کی طرف روانگی کے موقع پر اور مقتلِ شہداء میں سے ہو کر گزرنے کے وقت اپنے بھتیجے امام زین العابدینؑ کو دلاسا دے رہی تھیں جبکہ وہ اپنے باپ کے لاشے کو زمینِ گرم پر بے دفن دیکھ کر اتنا متاثر ہوئے تھے

---

[1] ارشاد ص ۲۴۵

کہ قریب تھا روح جسم سے مفارقت کر جائے۔

شعائرِ الٰہیہ کا احترام:

امام حسینؑ نے کعبہ کے احترام کو مدِ نظر رکھنے کے لیے حج کو ترک کیا اور مسافرت گوارا کی۔ چنانچہ خود فرمایا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے خانہ کعبہ کی حرمت برباد ہو۔

اسلاف کی یاد:

حسینؑ کسی وقت اپنے بزرگوں کو نہیں بھولے۔ جب مدینہ سے روانگی قطعی ہو گئی تھی تو آپ نے آخری شب اپنے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کے لیے مخصوص کی تھی۔

مکہ سے چلتے وقت جو خطبہ پڑھا تھا اس میں بھی فرمایا تھا کہ میں اپنے بزرگوں کی ملاقات کا اتنا مشتاق ہوں جتنا یعقوبؑ، یوسفؑ سے ملاقات کے مشتاق تھے۔

نہم محرم کی عصر کو جس وقت حملہ ہوا ہے تو آپ پر غنودگی طاری تھی۔ جناب زینبؑ نے بیدار کیا تو فرمایا میں نے اپنے نانا کو خواب میں دیکھا وہ فرما رہے تھے کہ اب تم میرے پاس آنے والے ہو[1]

عاشور کے دن آپ نے اپنے جوان فرزند علی اکبر کو اذن جہاد دینے کے بعد خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے اور کہا خداوندا گواہ رہنا کہ وہ جوان جا رہا ہے جو صورت و سیرت و رفتار و گفتار میں تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے۔ جب ہم مشتاق تیرے رسولؐ کی زیارت کے ہوتے تھے تو اس کے چہرہ پر نظر ڈال لیتے تھے۔ اس طرح آپ نے علی اکبر کے غم میں

---

[1] ارشاد ص ۲۴۳

اپنے شدید تاثر کا سبب بھی ظاہر کر دیا۔ بقول عالم نقوی ؎

شہؑ کو غم تھا شبیہِ احمدؐ کا　　کب وہ روتے تھے اپنے اکبر کو

خود داری:

عام انسان ذرا سا سخت موقع آئے تو گڑگڑانے لگتا ہے اور بہت سی ایسی صورتیں اختیار کرتا ہے جو ایک خود دار انسان کے شایانِ شان نہیں ہوتی۔

حضرت امام حسینؑ نے شروع سے آخر تک کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جو عظمتِ نفس کے خلاف ہو۔

اس وقت جب آپ مدینہ سے روانہ ہو رہے تھے تو لوگوں نے کہا تھا کہ عبداللہ بن زبیر کی طرح عام راستے کو چھوڑ دیجیے اور غیر معروف راستے سے روانہ ہو جیے مگر حضرت نے فرمایا تھا کہ میں مجرموں کی طرح چھپ کر جانا نہیں چاہتا۔ میں عام راستے ہی سے جاؤں گا۔

کربلا میں ساتویں تاریخ سے پانی بند ہو گیا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ غذا موجود تھی۔ جیسا کہ جناب شیخ جعفر شوستری نے لکھا ہے۔ یقیناً غذا بھی میسر نہ تھی اور اس لیے امام حسینؑ اور ان کے اہلِ حرم جس طرح تین دن کے پیاسے تھے وہ تین دن کے بھوکے بھی تھے لیکن اس کے باوجود کربلا میں امام حسینؑ نے سوال آب تو بار بار کیا اور پیاس کا مختلف طرح اظہار بھی کیا۔ مگر کوئی تاریخ نہیں بتلا سکتی کہ آپ نے یا آپ کے اعزّہ و انصار میں سے کسی نے کبھی بھوک کی شکایت کی ہو اور غذا کے لیے سوال کیا ہو۔

اس کا کیا سبب ہے؟ صرف یہ کہ پانی مانگنا اصولِ شرافت کے خلاف نہیں ہے ہر آدمی دوسرے سے پانی مانگ لیتا ہے مگر کھانا مانگنا یا بھوک کی تکلیف ظاہر کرنا رکیک بات ہے اور شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں میں سے کسی نے اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کیا۔ بلکہ پانی کا سوال بھی حقیقت

میں کوئی سوال نہ تھا۔ سوال تو اس وقت کہا جا سکتا تھا کہ جب ان کا جمع کردہ کوئی ذخیرہ پانی کا ہوتا اور امام حسینؑ اس میں سے طلب کرتے۔ یہاں تو اللہ کی جاری کی ہوئی نہر سامنے تھی جسے بصورت ظلم و تشدد دشمنوں نے روک رکھا تھا۔ تو جسے سوال کہا جاتا ہے وہ درحقیقت ایک حق کا مطالبہ تھا اور ظلم ناروا کے خلاف احتجاج تھا۔ اس کی نوعیت اس سوال کی ہے ہی نہیں جو کسی بھی منزل پر عزت نفس کے خلاف سمجھا جا سکے۔

خاتمۂ کتاب

عالمِ انسانی کو اصلاحِ عمل اور اتباعِ اسوۂ حسینی کی دعوت

۱۳۶۱ھ میں واقعۂ کربلا کو پورے تیرہ سو برس کا زمانہ گزرا اور اس کی سیزدہ صد سالہ یادگار شرق و غرب عالم میں منائی گئی جس کے ذیل میں ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں نے مل کر حسینؑ ابن علیؑ کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

اسی یادگار کے سلسلہ میں تاریخی کتاب "شہیدِ انسانیت" پیش ہوئی ہے۔

عام طور پر واقعۂ کربلا کو ایک ایسے غمناک حادثہ ہی کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے کہ جس پر ہمارا کام آنسو بہانا اور اظہار رنج و ملال کرنا ہو اور بس۔ مگر یہ تو ایک فطری تقاضائے انسانیت ہے۔ اس کو مقصدِ حسینؑ یا اصل مفادِ واقعۂ کربلا سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

حسینؑ کا بلند نصب العین ہم سے کچھ اور چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم اپنی سیرت زندگی کو حسینی سیرت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہیں۔

امام حسینؑ کو اس اعتبار سے نجات دہندہ سمجھنا غلط ہے کہ آپ نے اپنے معتقدین کو فرائض کی واجبی پابندی سے کلیتہً آزاد کر دیا اور (معاذ اللہ) خود اُن کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر شہید ہو گئے اور یہ سمجھنا بھی کہ امام حسینؑ نے گنہگارانِ امت کے لیے شہادت اختیار کی، اس معنی میں ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا کہ گویا آپ نے ہم کو گناہوں کے ارتکاب کا جواز عطا کر دیا۔ اگر کوئی اس طرح کا عقیدہ رکھتا ہے تو اپنی غلط ذہنیت کی بنا پر شہادتِ حسینؑ کے مقصدِ حقیقی کو فراموش کرنے کا در پے ہوتا ہے۔

حسینؑ یقیناً نجات دہندۂ امت تھے بایں معنی کہ آپ نے نجات کا راستہ نمایاں کر دیا۔ اور ایک ایسی جماعت کی بقا کا سامان کر دیا جو اپنے عمل سے نجات کی حقدار ہو۔ اگر حسینؑ

کا کربلا کا جہاد نہ ہوتا تو دین و شریعت کی اصلی صورت رخصت ہو جاتی۔ بادشاہوں کی سیرت سنتِ الٰہیہ قرار دی جاتی اور ان کی تقلید ہی معیارِ نجات سمجھی جاتی۔ اس طرح امتِ اسلامیہ ابدی ہلاکت میں مبتلا ہوتی۔ حسینؑ نے اپنے اسوۂ حسنہ سے ہم کو نجات کے قابل بنا دیا۔

حسینؑ نے ہمارے قوائے عمل کو معطل و شل نہیں کیا بلکہ آپ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لیے بہترین محرکِ عمل ہو سکتا ہے۔

پیشوایانِ مذہب نے جو گریہ و بکا کی تاکید کی اور اس کے لیے آخرت کے بہترین ثواب بتائے۔ اس کا فلسفہ یہی تھا کہ اگر یہ ثواب ہمارے پیشِ نظر ہوگا تو ہم ان کے حالات کو زیادہ سننے اور یاد کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ ہمارے اعمال پر اس کا اثر پڑے گا۔ اگر اتنی اہمیت اس واقعہ کو بحیثیت مصیبت نہ دی گئی ہوتی تو دنیا کے تمام دیگر واقعات کی طرح یہ بھی تاریخ کے اوراق کے سپرد ہو جاتا اور یہ جو بچہ بچہ اس سے واقف ہے یہ کبھی نہ ہوتا۔ جب ہم اس سے پورے طور پر واقف ہی نہ ہوتے تو سبق کیا حاصل کرتے۔

سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی کو امتیازی شان کے ساتھ قائم کرنے کا بھی اصلی ماحصل یہی ہے۔ حسینؑ کی یاد اگر پوری طاقت اور ایک نئی زندگی کے ساتھ ہمارے دل میں تازہ ہوئی ہے تو اس کا اثر ہمارے کردار پر پڑنا چاہیے۔

واقعۂ کربلا حقیقت میں ایک مدرسۂ تربیت ہے جہاں دنیا کو مذہب، اخلاق اور فرائض شناسی کے اصول بتائے گئے ہیں۔ مبارک ہوں گے وہ افراد جو اس سے سبق حاصل کریں اور اپنے کو عملی حیثیت سے ویسا ہی پیش کریں جیسا کہ حسینؑ دنیا کو بنانا چاہتے تھے۔

